شاہ جہان پور

تاریخ عمومی اور جنگ آزادی

۱۸۵۷ء

روہیل کھنڈ اور جنگ آزادی

بہ شمول

محمدی میں قومی حکومت کا قیام

اور

تذکار مجاہدین آزادی اور سرفروشان وطن

ترتیب و تدوین

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

مجلس یادگار شیخ الاسلام پاکستان کراچی

شاہ جہان پور

تاریخ عمومی اور جنگ آزادی

۱۸۵۷ء

روہیل کھنڈ اور جنگ آزادی

بہ شمول

محمدی میں قومی حکومت کا قیام

اور

تذکار مجاہدین آزادی اور سرفروشان وطن

ترتیب و تدوین
ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

مجلس یادگار شیخ الاسلام پاکستان

اشاعت اول : نومبر ۲۰۱۱ء

کتاب : شاہ جہان پور - تاریخ عمومی اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء

مؤلف : ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

مطبع : المخزن پرنٹر - کراچی

ناشر : مجلس یادگار شیخ الاسلامؒ - پاکستان، کراچی

اسٹاکسٹ

مکتبۂ رشیدیہ

بالمقابل مقدس مسجد، اردو بازار - کراچی 74200

فون: 0092-21-32767232

www.maktaberasheedya.com

E-mail: info@maktaberasheedya.com

رنگین تصاویر کے لیے محترم احمد حسین صدیقی امروہوی کا شکر گزار ہوں!

(ا-س-ش)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شاہ جہان پور

تاریخ عمومی اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء

اجمالی فہرست

پیش لفظ

تاریخ شاہ جہان پور کی تالیف وتدوین کا منصوبہ خاک سار نے مرحوم رشید حسن خاں کے مشورے سے ۱۹۸۷ء میں بنایا تھا۔ فیصلہ یہ کیا تھا کہ تاریخ کے اہم پہلوؤں پر مختلف اصحابِ قلم اور اہلِ ذوق سے مضامین لکھوائے جائیں اور انھیں مرتب کر کے چھپوادیا جائے۔ ہم دونوں میں سے کوئی ایک شخص اپنا پورا وقت اس منصوبے پر صرف کردینے کی ہمت نہ کرسکتا تھا اور نہ کسی اور سے ہم یہ توقع کرسکتے تھے۔ جولائی ۱۹۸۸ء میں ہم دونوں کی ملاقات دہلی میں ہوئی اور کراچی منصوبے کے مطابق کارگزاری کا جایزہ لیا گیا تو راز کھلا کہ ہم دونوں مقصد کے سفر میں چند قدم اٹھانے سے بھی قاصر رہے ہیں۔ ہم دونوں نے اس کے لیے کسی کو ملامت نہیں کی۔ یہ حقیقت عیاں تھی کہ ہم دونوں زندگی کے مسایل وافکار کے یکساں حالات سے گزر رہے تھے۔

جولائی ۲۰۰۵ء میں مجھے ہندوستان کے سفر کا اتفاق ہوا۔ محترم رشید حسن خاں اس وقت تک دہلی سے شاہ جہان پور منتقل ہو چکے تھے۔ ہمیں توقع تھی کہ شاہ جہان پور میں ان سے ملاقات ضرور ہوگی اور ۱۸، ۱۹ سال پہلے کا کراچی منصوبہ زیرِ غور آئے گا۔ ہم یہ بھی جانتے تھے کہ ہمارے پاس زیرِ غور لانے کے لیے اپنے تساہل اور بےعملی کی شرمندگی کے سوا فکر وعمل کا کوئی نکتہ نہ تھا، لیکن اتفاق دیکھیے کہ خاک سار دہلی سے دیوبند، علی گڑھ، لکھنؤ، پٹنہ اور کلکتہ تک جا پہنچا اور جاتے آتے ہوئے دوبار شاہ جہان پور کے بیچ سے گزرا، لیکن حالات ایسے پیش آچکے تھے کہ پروگرام کے مطابق کلکتہ و پٹنہ سے واپسی کے سفر میں شاہ جہان پور اتر جانا ممکن ہی نہ رہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عزیز واقارب اور رشید حسن خاں سے آخری ملاقات کی حسرتیں دل ہی میں رہ گئیں۔ ۲۹ر اگست کی شام کو میں دہلی پہنچ گیا۔ اسی رات کو حضرت مولانا سید اسعد مدنی علیہ الرحمہ نے سمرا نامی ایک ہسپتال میں داخل کرادیا۔ مثانے کے آپریشن سے گزرنا پڑا۔ ۱۰ر

اگست کو رہائی ملی اور سفر کی اجازت! ۱۲ر ستمبر کو میں کراچی لوٹ آیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے حوالے سے میرا یہ سفر علمی اور تحقیقی تھا، لیکن سچ یہ ہے کہ سفر ادھورا اور متوقع نتائج کے لحاظ سے ناکام رہا تھا۔

۲۰۰۵ء اپنی آخری منزل کو پہنچ کر پردہ پوش ہوگیا۔ میں کراچی میں تھا اور پٹنہ میں ہونے والے حادثے کے اثرات ابھی دور نہ ہوئے تھے۔ رشید حسن خاں شاہ جہان پور میں بیمار پڑے تھے۔ ایک روز صبح کو لکھنؤ سے محترم رباب رشیدی صاحب نے ٹیلی فون پر اطلاع دی کہ خاں صاحب کا انتقال ہوگیا- انا للہ انا الیہ راجعون! شاہ جہان پور کی تاریخ کی ترتیب و تدوین کا منصوبہ ہم دونوں نے بنایا تھا۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے سامنے اس کے لیے جواب دہ اور عزم میں ناکامی کے لیے شرمندہ تھے۔ خاں صاحب اپنے دورۂ حیات سے نکل کر کسی کے سامنے جواب دہی سے آزاد اور کسی ناکامی کی شرمندگی سے نجات پا چکے تھے، لیکن میں اپنے دل میں نادم اور خود اپنی نظر میں شرم سار تھا۔

میرے دل پر صورت حال کا خاص اثر تھا۔ ان ہی دنوں برادر عزیز محمد سعید خاں ابن مولانا احسان علی خاں آف بانڈی گاؤں ضلع شاہ جہان پور جو ۱۹۵۰ء سے نواب شاہ (سندھ) میں آباد ہیں، کراچی آئے اور بتایا کہ وہ شاہ جہان پور (انڈیا) جا رہے ہیں، اگر میں کوئی چیز منگوانی چاہوں تو وہ لے آئیں گے، میں نے کہا: شاہ جہان پور کی تاریخ تلاش کرنا، مل جائے تو لے آنا۔ پوچھا: کوئی خاص تاریخ ہے؟ میں نے کہا: چھوٹی بڑی، نئی پرانی کوئی ہو! میرے پاس مولوی صبیح الدین میاں کی ''تاریخ صبیح'' اور مبارک شمیم کا تذکرہ ''سخن ورانِ شاہ جہان پور'' دو کتابیں اور چند شعرا کے مجموعہ ہا کے کلام تھے۔ منشی احسان علی خاں احسان اور خان بہادر مطیع اللہ خاں کی ضخیم تواریخ شاہ جہان پور کے کتابوں میں صرف نام پڑھے تھے۔ سوچا تھا کہ شاہ جہان پور کی تاریخ یا وہاں کی کسی شخصیت پر جو کتاب بھی آجائے گی افادیت سے خالی نہ ہوگی۔

چند ماہ گزرے تھے کہ عزیزم محمد سعید خان (نواب شاہ) نے فون پر بتایا: ''میں شاہ جہان پور سے واپس آگیا ہوں اور آپ کے لیے ایک ضخیم تاریخ شاہ جہان پور لے

کر آیا ہوں۔ کچھ دن ہوئے میں کراچی گیا تھا اور تاریخ آپ کو خود پہنچانے کا ارادہ تھا، لیکن آپ تک نہ پہنچ سکا تھا کہ نواب شاہ سے فون پہنچا کہ فوراً واپس آیئے! میں اسی وقت نواب شاہ لوٹ آیا تھا۔ آپ کی تاریخ بھائی نذیر احمد خاں کو دیے آیا ہوں۔ وہ آپ تک پہنچا دیں گے۔ وہ خود بھی پٹھانوں اور شاہ جہان پور کی تاریخ کے شوقین ہیں اور اسے پڑھنا چاہتے تھے۔ اس لیے آپ تک تاریخ پہنچنے میں شاید چند دن کی تاخیر ہو جائے۔ جتنا پہلے میں خوش ہوا تھا اس اطلاع پر اس سے زیادہ تشویش میں پڑ گیا، لیکن انھوں نے مجھے تسلی دی اور بتایا کہ وہ آپ سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ وہ آپ کے بہت مداح ہیں۔ انھوں نے خان روشن خان (آف نواں کلی) کی تواریخ اور ان پر آپ کے پیش لفظ یا مقدمے، سب پڑھے ہیں۔ آپ کو شاید یاد نہیں، نواب شاہ میں صغیر احمد (میرے بہنوئی) کی والدہ کے انتقال پر ایک مجلس میں آپ سے ان کی ملاقات بھی ہو چکی ہے۔ اس کے بعد سے تو وہ آپ کے بہت فین (Fan) گرویدہ ہو گئے ہیں، خود ہی آپ کے پاس آئیں گے۔ وہ آپ سے ملاقات بھی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ ان کی طرف سے ہرگز بے اطمینان نہ ہوں! عزیز موصوف و مکرم نے جیسا کہا تھا، میں نے ویسا ہی انھیں پایا، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اس سے زیادہ ذمے دار اور اعتماد کی شخصیت ثابت ہوئے۔

جلد ہی ایک روز نذیر احمد صاحب کا فون آیا کہ وہ مجھ سے ملاقات کے متمنی ہیں اور میری امانت بھی مجھے پہنچا دینا چاہتے ہیں۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر کیا خوشی ہو سکتی تھی۔ وہ ایک روز مقررہ وقت پر تشریف لے آئے۔ ''تاریخ شاہ جہان پور موسومہ تاریخ مطیع'' امانت ساتھ لائے تھے، میرے سپرد کی۔ میرے لیے نہایت مسرت افزا اور نذیر احمد صاحب پر اعتماد کو بڑھانے والی تھی۔ ان سے مل کر طبیعت نہایت خوش ہوئی۔

جب میں نے انھیں بتایا کہ پچھلے بیس سال سے شاہ جہان پور کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیے بیٹھا ہوں تو بہت خوش اور مصر ہوئے کہ بس اب آپ لکھنا شروع کر دیجیے، میں نے ان سے کہا کہ اس تاریخ (تاریخ مطیع) کا مطالعہ کرلوں اور اس کا اثر اور ردِ

عمل دیکھ لوں تبھی کچھ کہہ سکوں گا۔ وہ جاتے جاتے یہ کہتے ہوئے اٹھے کہ ''ردِ عمل کا انتظار نہ کیجیے، موڈ بنایئے اور کام کا آغاز کر دیجیے۔ وہ تو چلے گئے، لیکن میرے دل پر اپنے اخلاص و محبت کا گہرا اثر چھوڑ گئے اور جب میں نے انھیں کام کے آغاز کی خوش خبری سنائی تو انھوں نے مجھے اپنی بہترین دعاؤں میں یاد رکھا، ہمیشہ میری ہمت افزائی اور میرے اندر آگے بڑھنے کا جوش اور ولولہ پیدا کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر میرے اندر شاہ جہاں پور کی ایک نئی تاریخ لکھنے اور ۱۸۵۷ء میں شاہ جہاں پور کے کارنامہ عظیم کی داستان مرتب کرنے کا داعیۂ عظیم پیدا ہوا ہے تو یہ ایک مدت سے موجود تھا، مہمیز دینے والی کوئی قوت نہ تھی، شوق موجود تھا، پھر محرکات ایسے پیدا ہو گئے تھے، جنھیں میں نظر انداز نہ کر سکتا تھا۔

پہلا محرک: عزیزم محمد سعید خاں سلمہٗ ابن مولانا احسان علی خاں شاہ جہاں پوری کے تحفۂ بے بہا کی تاثیر ہے اور

دوسرا محرک: میرے اندر جو ولولۂ شوق اور آغازِ کار سے اختتام تک جو استقامت ظاہر ہوئی، وہ خدا کا ایک انعام تھا جس کے لیے برادر مکرم نذیر احمد خاں شاہ جہاں پوری کی مسلسل تاکید اور ہمت افزائی ذریعہ بنی!

والحمدللہ تعالیٰ علیٰ ذالک! میں ان دونوں۔ عزیز و برادر کا نہایت شکر گزار ہوں۔ اللہ ان دونوں کو اسلام کی راہ مستقیم پر چلنے اور نیک کاموں کے ظہور و فروغ کا سبب اور عمل صالح کا محرک بننے کی توفیق بخشے۔

ابو سلمان

۶/اگست ۲۰۱۰ء

بہ روز جمعۃ المبارک

مقدمہ

ہندوستان کی جنگِ آزادی کے ''غدر'' ہونے کا پروپیگنڈا کچھ اس زور سے کیا گیا کہ ہر کہہ ومہہ کی زبان پر غدر ہی چڑھ گیا ہے اور ذہنوں نے اس لفظ کو اس طرح قبول کرلیا ہے کہ غیرارادی طور پر بے تکلف صحیح لفظ کے بجائے غدر کا لفظ ہی زبان وقلم پر آجاتا ہے اور نہایت راسخ الاعتقاد اہلِ علم بھی اس گناہ سے دامن کو آلودہ ہونے سے بچانہ سکے۔ اس لفظ نے ''غدر'' کے اسناد میں بھی جگہ پالی۔ مثلاً ''غدر ۱۸۵۷ء'' یا ''ہندوستان کا غدر ۱۸۵۷ء''۔

حال آں کہ اس سے کہیں اچھا لفظ تو فوج کی سرکشی (Mutiny) تھا اس میں کم ازکم آدھی سچائی تو تھی۔ آدھی اس لیے کہ یہ اقدام محض فوجی بغاوت نہ تھا۔

۱۸۵۷ء کے حادثے کے لیے غدر کا استعمال درست نہ تھا۔ یہ میری رائے، لیکن ممکن ہے میری رائے غلط ہو آپ نہ مانیں! لیکن اگر میں اپنی راے کو کسی سے منوانا چاہوں تو پھر اپنی رائے کو ثابت کرنا مجھ پر فرض ہو جائے گا۔ سب سے پہلے ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ واقعہ کیا پیش آیا تھا؟

الف: سب سے پہلے یہ افواہ اڑی کہ جو نئے کارتوس فوجیوں کے دیے گئے ان میں گائے یا سور کی چربی استعمال کی گئی ہے، جس کا استعمال فوج کے ہندو اور مسلمان دونوں مذہب کے فوجیوں کے لیے ممکن نہ تھا۔

ب: یہ افواہ سننے کے بعد فوجی حکام سے فوجیوں کا ایک وفد ملا اور کہا کہ ایسا سنا گیا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو ان کارتوس کا استعمال کرنا ہمارے لیے ممکن نہ ہوگا۔

ج: لیکن سپاہیوں کو مطمئن نہیں کیا گیا، اگر حقیقت یہی تھی تو اس کا اعتراف اور تدارک نہیں کیا اور افواہ تھی تو غلط فہمی دور نہیں کی گئی۔

د: حکام اقتدار اور حاکمیت کے نشے میں سرشار تھے۔ سمجھتے تھے غلط اور صحیح سب

کچھ ان سے منوالیں گے، دوسرے روز پیریڈ کے موقع پر کارتوس دیے گئے اور انھیں دانت سے کاٹ کر گن لوڈ کرنے کا حکم دیا گیا۔

ہ: لیکن فوجیوں کے فیصلے کے مطابق ایک سپاہی آگے بڑھا اور سلوٹ کر کے تمام فوجیوں کی طرف سے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اُسے اُسی وقت گرفتار کر لیا گیا اور پابجولاں کر کے حوالات میں ڈال دیا گیا۔ سپاہیوں کو یہ بات ناگوار گزری، لیکن بے چینی کے اظہار کے سوا کوئی ہنگامہ برپا نہیں کیا گیا۔

و: دوسرے روز پیریڈ کے وقت گرفتار سپاہی کو زنجیروں میں جکڑا فوج کے سامنے لایا گیا فوج میں غصہ پیدا ہوا، لیکن کسی عملی تشدد کا ابھی اظہار نہیں ہوا تھا۔

ز: لیکن جب فوج کے سامنے لا کر اسے گولی سے اڑا دیا گیا تو فوجیوں کے ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔ اگرچہ غیر مسلح تھے، لیکن حکام کے لیے اپنی جان بچانا مشکل ہو گیا۔ فوجیوں نے آناً فاناً میگزین پر قبضہ کر لیا ایک ہنگامہ برپا ہو گیا انھوں نے توڑ پھوڑ کر کے قیامت برپا کر دی۔ فوجی حکام میں سے چند قتل ہوئے، باقی گھروں میں بند ہو گئے۔ اس کے باوجود کہ سپاہیوں نے اسلحہ پر قبضہ کر لیا اور برٹش حکام پر قابو پا لیا تھا، لیکن انھوں نے خون کی ندیاں نہیں بہائی تھیں۔ اسی رات کو وہ دہلی کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ ایک نہایت ظالمانہ عمل کا شدید رد عمل تھا۔

ابتدائی واقعے کو میں نے دفعات میں بیان کیا۔ اس واقعے کے آغاز سے آخری نقطے تک پہنچنے میں یہ منازل پیش آئے تھے:

۱۔ غلط یا صحیح ایک افواہ کی شہرت۔

۲۔ حکام کو اس کی شکایت اور تدارک کی امید۔

۳۔ حکام کی خاموشی حقیقت کے بیان اور تدارک سے گریز۔

۴۔ فوجیوں کا حکم ماننے سے انکار۔

۵۔ ایک سپاہی کی گرفتاری اور ملکی فوج میں بلا تفریق مذہب اشتعال کا ظہور۔

۶۔ سپاہی کا قتل بغاوت کا اعلان اور ہنگامے کا پھوٹ پڑنا۔

یہ چھ مراحل ہیں جن پر بغاوت اور قانون شکنی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ کسی مطالبے کو

منوانے کے لیے تشدد کے عمل پر ہنگامہ یا غدر، ایک فطری عمل ہے۔ اس وقوعے کے پہلے مرحلے سے اس آخری مرحلے تک تمام دفعات پر غدر یا حکم عدولی اور قانون شکنی کا اطلاق کیوں کیا جاسکتا ہے۔

اگر کسی ہندوستانی کی زبان قلم سے ہنگاموں کے زمانے میں غور وفکر کیے بغیر یہ لفظ نکل گیا تھا تو بلاشبہ حالات کی سنگینی کی رعایت اسے دی جاسکتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس اصطلاح کے استعمال کا سارا کریڈٹ برٹش استعمار کو پہنچتا ہے اور رسوائی کا نقصان اول تا آخر حریت پسندوں اور قوم پروروں کے دامن تاریخ میں آگرتا ہے۔

مجھے معلوم نہیں ''غدر'' کی اصطلاح کے حوالے سے کسی مفکر و مورخ نے اس سے پہلے سوچا تھا یا نہیں۔ میں نے تو اپنے ہی سوچ بچار کے حاصل کو سوادِ تحریر میں بیان کر دیا ہے، لیکن مجھے علی گڑھ مکتب فکر کے ایک ادیب جلیل احمد قدوائی کے قلم سے یہ تحریر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں:

First war of independence of India (1857 A. D.) which the British rulers called.

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے لیے غدر کا لفظ سب سے پہلے سرسید احمد خان نے استعمال کیا تھا۔ ممکن ہے اس وقت بجنور، میرٹھ وغیرہا میں ایسے ہی حالات ہوں، جن پر غدر کا اطلاق کیا جاسکتا ہو، لیکن دہلی، سہارن پور، یوپی کے جنوبی اضلاع مرادآباد، فرخ آباد، اودھ، بہار، گوالیار، جھانسی وغیرہ میں تو حالات ایسے ہرگز نہ تھے۔ یہ اصطلاح چوں کہ انگریزی حکومت کی منشاو مصلحت کے عین مطابق تھی اس نے اسے اپنی ڈھال بنالیا۔ سرسید مرحوم اہل وطن کے دشمن ہرگز نہ تھے، لیکن ان کا طرز سیاست انگریز کے مفادات ہی کا محافظ و پردہ دار تھا، لیکن فضا کے بدلتے ہی جب وہ مسلمانوں کے مقدمے کے وکیل کی حیثیت سے سامنے آگئے تھے تو اتنی جلدی ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ اپنے طرز سیاست اور انداز دفاع کو بدل دیں اس لیے انھوں نے اپنی تحریرات و بیانات میں غدر ہی کی اصطلاح سے کام لیا۔

عجیب بات یہ ہے کہ ان کے مخالفین نے بھی اس بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا حال آں کہ وہ ذرا توجہ فرماتے تو یہ حقیقت سامنے آجاتی کہ سرسید نے اسباب غدر میں یا یوں کہیے غدر کا پس منظر بیان کرتے ہوئے پادریوں کی اہل ہند کو عیسائی بنانے کی تحریک، اور کمپنی کی طرف سے ان کی ہمت افزائی، ہمدردی اور ان کی امداد اور سرکاری سپورٹ، چربی کے کارتوسوں کے بارے میں فوجیوں کے اشتعال اور ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کے بجائے ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ، ان کی قید اور ان کو قتل کی سزا دینے کو غدر کے اسباب اور پس منظر قرار دیا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فوج کے حکام نے غلط طریق حکومت اور تشدد کا رویہ اختیار کیا تھا۔ جب کہ نوجوانوں سے ان کا اسلحہ چھین کر انھیں رام کرنے کے بجائے نافرمانی اور بغاوت کے راستے پر ڈھکیل دیا تھا تو ان پر غدر کا الزام کیوں کر لگایا جا سکتا تھا۔

دوسری طرف کمپنی کے نظام حکومت کے خلاف لاوا پہلے سے پک رہا تھا اس نافرمانی (بغاوت) کو تحریک آزادی کا رخ بدلنے میں دیر نہ لگی۔ سب سپاہی، محب وطن اور حریت پسند افراد اور ان کے ساتھ عوام بھی شامل ہو گئے اور فوجیوں کی شکایت سے اختلاف اور ان کی درستگی سے انکار آزادی وطن کی تحریک بن گیا۔

خاک سار نے سرسید مرحوم کے دفاع میں جو بات کہی ہے وہ اس کے ثبوت ان کی دو مشہور و معروف تالیفات ''تاریخ سرکشی بجنور'' اور ''اسباب بغاوت ہند'' کے عنوانات و مطالب سے نمایاں ہیں۔ جب وہ خود ''غدر'' کو سرکشی اور بغاوت قرار دیتے ہیں اور ان کے اثبات میں دلایل دیتے ہیں تو وہ تسلیم کرتے ہیں کہ عوام اور فوج کے ملازمین کو ایسے حالات سے دوچار کر دیا گیا تھا کہ انھوں نے صورت حال کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا گویا سرکشی کی راہ اختیار کی تھی اور جب انھیں قانون کا مجرم ٹھہرایا گیا اور حالات کی درستگی کے بجائے اُن پر تشدد کیا گیا تو انھوں نے کھلم کھلا بغاوت کر دی۔ یہ گویا ان کی سرکشی کا دوسرا قدم تھا اور اس کے بعد گویا کہ غدر پڑ گیا۔

افسوس کہ سرسید کی رہنمائی اور اہل وطن کی وکالت کو تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا، حالاں کہ اگر صاف دلی سے اور انصاف سے کام لیا جاتا تو خود سرسید کی تحریرات کی

روشنی میں یہ مقدمہ بڑی کامیابی سے لڑا جا سکتا تھا۔

......☆......☆......

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بلاشبہ بے سوچے سمجھے اور عواقب و نتائج پر غور کیے اور منصوبہ بندی کے بغیر کود پڑنے سے بہت خرابیاں پیدا ہوئیں اور نقصانات ہوئے۔ جامع نظام نہ ہونے اور مختلف جہادی گروہوں میں ربط کے فقدان نے بہت الجھنیں پیدا کیں اور مختلف لٹیرے جتھوں کے نکل پڑنے اور ان کے قلع قمع کرنے کے انتظام نہ ہونے کی وجہ سے جنگ آزادی کے نام کو بٹا لگا اور مجاہدوں اور سرفروشانِ وطن کی کوششوں کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور رسوائی ہوئی، لیکن یہ قطعی ہنگامہ، مفسدہ، غدر، حرام زدگی اور لوٹ مار کی گرم بازاری ہرگز نہ تھی۔ انگریزوں نے جن ہزاروں مجاہدین کو جرم بغاوت و فساد اور انگریزوں، ان کی عورتوں اور بچوں کے قتل و خوں ریزی کے جرم میں گولیوں سے اُڑا دیا تھا، پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا تھا، یا توپ دم کر دیا تھا، وہ بے خطا تھے۔ وہ انسانیت کے دشمن اور اپنی قوم اور وطن کے بدخواہ نہ تھے۔ وہ ملک کے دشمنوں سے جنگ کے محاذوں پر نبرد آزما ہوئے تھے۔ انھوں نے انگریز عورتوں کو اغوا اور بچوں کو قتل نہیں کیا تھا بلکہ انھیں بچانے کے لیے اپنی جانوں پر کھیل گئے تھے۔ انھوں نے انسانی ہمدردی، رحم دلی اور اخلاقی پاکیزگی کی مثالیں قایم کی تھیں۔ ان کے مقابلے میں انگریزوں کی وحشت و بربریت اور بہیمیت تھی جس کا ظہور ۱۸۵۸ء کے آخر میں اعلان معافی کے بعد تک جاری رہا۔

......☆......☆......

یہ حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء میں فوجیوں کی شکایت جنگ آزادی کے آغاز کا بہانہ نہ تھا۔ ان کی اپنے حکام سے محکمانہ شکایت تھی جو ان کے حکام کی بدمستی اور غرور سے سپاہیوں کی توہین اور بلاوجہ سزا دینے سے اشتعال کا موجب ہوئی اور آفیسرز کے غلط طرز عمل اور تشدد کا طریق اختیار کرنے سے آگ اور بھڑک اٹھی۔ اگر حکام سمجھ اور حکمت عملی سے کام لیتے تو اشتعال پھیلنے سے روکا جا سکتا تھا، لیکن سپاہیوں کے احساسات کا غلط اندازہ لگایا گیا اور حالات قابو سے باہر ہو گئے۔ اور بارک پور

(بنگال) اور میرٹھ (یوپی) سے لے کر دہلی تک بگڑتے ہی چلے گئے۔ عجیب بات ہے کہ چند ہی دنوں میں فوجیوں کی شکایت انگریزوں سے نجات اور وطن کی آزادی کی تحریک میں بدل گئی۔ پھر کسی نے کارتوسوں میں چربی کے استعمال اور آٹے میں ہڈیوں کے بورے کا نام بھی نہ لیا۔ فوج سے ایک محکمانہ شکایت عظیم ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ بن گیا اور جس تیزی کے ساتھ اس مطالبے کی گونج دور دراز گوشوں تک پھیلی عوام وخواص میں نہ صرف ہمدردی بلکہ عملی تعاون اور تحریک میں شامل ہونے کا جذبہ بڑھتا گیا۔ اور ہر کہہ ومہہ کا مشترکہ نعرہ بن گیا۔ اگر فوج کی بغاوت کا باعث کارتوس ہی تھے تو تعجب کی بات ہے کہ یہ محکمانہ شکایت دنیا کی عظیم الشان تحریک آزادی کیسے بن گئی؟ لیکن میرے خیال میں یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں!

گزشتہ ایک صدی کے حالات میں اس کا واضح جواب ہے۔ انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کی ریشہ دوانیوں، لوٹ کھسوٹ، ہلاکت خیزیوں، ہندوستان کی ریاستوں کے بارے میں ان کے عزائم، ان کے حکمرانوں، زمین داروں، کسانوں کے ساتھ ان کے غیر ہمدردانہ اور غیر شریفانہ معاملات، تعلیمی، معاشی، اقتصادی، تجارتی، صنعتی، اسپورٹ امپورٹ اور دیگر معاملات کے بارے میں کمپنی کی پالیسی اور اس کے ڈایریکٹروں اور عہدے داروں کے اجتماعی اور انفرادی رویوں نے پورے ملک اور عوام کے لیے جو مسایل پیدا کر دیے تھے۔ ان کا سب سے بڑا اظہار ۱۷۵۷ء میں مرشد آباد کے نواب سراج الدولہ کے ساتھ پلاسی کی جنگ اور اس کے پس منظر اور بعد کے حالات میں ہوا اور اس کے چالیس سال کے بعد میسور میں سلطان ٹیپو سے جنگ، اس کی شہادت اور اس کے بعد میسور میں پیش آنے والے حالات کے مطالعے سے کمپنی کی زہرناکی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی زمانے میں دوسری ریاستوں اور ان کے راجوں مہاراجوں کے ساتھ معاملات میں انگریزوں کے رویوں نے ملک کے دانش واروں کو ملک کے مستقبل کے تصور نے تڑپا دیا تھا۔ وہ ملک میں سیاسی حالات، ان کے رخ، ان کی رفتار اور سفر کے انجام سے لرزہ براندام تھے۔

اس قسم کا تیسرا واقعہ شاہ عالم ثانی کے عہد حکومت (۱۸۰۶ء-۱۷۸۹ء) کے

آخری برسوں میں اس وقت پیش آیا، جب اس کے اقتدار پر قبضہ اور بادشاہ کا وظیفہ مقرر کر کے یہ ڈنکا بجا کہ "مخلوق خدا کی، ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا!"

اس ڈنکے کا بجنا اور ہر صبح کو کمپنی بہادر کے نئے قانون کے اعلان اور عوام کی تنبیہ کے لیے اس کا دہرایا جانا لازم ٹھہرا تو عوام کے کان کھڑے ہوئے۔ اس وقت تک مغلیہ حکومت اگرچہ کمزور ہو چکی تھی اور اس کے گورنر اور امرا من مانی پر اتر آئے تھے۔ کئی صوبے مرکز کے دایرۂ اثر سے نکل گئے تھے، لیکن بادشاہ کا احترام ہر طبقے میں یکساں موجود تھا۔ اس بدلی ہوئی صورت حال سے سب چونک پڑے تھے، لیکن اس صورت حال سے عوام وخواص کو آگاہ کرنے اور صورت حال کی نزاکت کا احساس دلانے میں سبقت کا مقام حاصل کرنے کا اعزاز دہلی کے مولانا عبدالعزیز کے حصے میں آیا۔ انھوں نے حالات کا تجزیہ کر کے بتایا کہ قومی حکومت کے ہاتھ سے اقتدار کی باگ ڈور نکل چکی ہے۔ ملک اور قوم کے مفاد میں قانون بنانے، سماجی زندگی کی اصلاح واستحکام اور مختلف طبقات کے مفادات کے تحفظ کے لیے قواعد وضوابط وضع کرنے، ان کے اجرا ونفاذ کا حق بادشاہ کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ ملک کا اقتدار اور نظام کلی طور پر ایک غیر ملکی قوم کے قبضہ وتصرف میں چلا گیا ہے۔ بادشاہ کو اپنے اختیار سے اپنے ملک اور جاگیرات سے خود فایدہ اُٹھانے سے روک دیا گیا ہے اور گزر اوقات کے لیے ایک مقدار میں وظیفہ قبول کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے، جو بادشاہ اور اس کے خاندان کی ضروریات کے لیے قطعی ناکافی ہے۔ اور اگرچہ کہنے کو وہ اب بھی بادشاہ ہے، لیکن بے کسی اور تنگ دستی کی زندگی گزار رہا ہے۔ ہر صبح کو نئے قانون اور قواعد وضوابط کے نفاذ کا اعلان کیا جاتا ہے کہ مخلوق خدا کی ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا! معززین اور اصحابِ اثر ورسوخ کو اجازت نہیں کہ وہ کمپنی کے حکام کی اجازت کے بغیر دہلی میں قدم بھی رکھ سکیں۔ شاہ عبدالعزیز نے واضح کیا اور قانون کے حوالے سے بتایا کہ اب اہل ملک پر فرض ہو گیا ہے کہ وہ غاصب قوت کا مقابلہ کریں۔ اگر مقابلہ نہ کر سکیں تو ملک چھوڑ دیں اور اگر اس کے لیے بھی تیار نہ ہوں تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ غلامی کی زندگی بسر کریں۔ جو سراسر انسانیت کی توہین ہے۔ اور

اسلام اس حالت پر صبر اور ضبط کی اجازت دیتا۔

ان کا ملک کو چھوڑ دینا بھی اس لیے نہ تھا کہ وہ کسی اور ملک میں اپنے لیے عافیت وعشرت کا کوئی گوشہ تلاش کرلیں اور اپنے وطن کی کم زور قوموں کو کس مپرسی اور بدحالی اور ذلت کی زندگی میں چھوڑ جائیں اور ان کو زندگی کی اس لعنت اور عذاب سے نجات دلانے کی کوئی کوشش نہ کریں۔ باہر جانے کا قانون قوم کے ہر زن و مرد کے لیے نہیں ہوسکتا تھا۔ بلکہ ایک جماعت یا کسی مخصوص طبقے کے لیے تھا، جس کا ملک سے باہر جانا قوم کی آزادی اور قوم کی برباد زندگی اور اس کی کھوئی ہوئی عزت وآبرو کی بحالی کے لیے مؤثر اور نتیجہ خیز ہو، یہ وجہ تھی کہ شاہ عبدالعزیز نے قانون اور حکم سنا دینے کے باوجود نہ خود عازم ترک وطن ہوئے اور نہ عوام کو اس پر عمل کرنے کی اجازت دی۔ انھوں نے پیش آمدہ حالات سے نبرد آزما ہونے کو قابض قوت سے مقابلہ اور اپنی آزاد زندگی کے تحفظ ودفاع کی وطن کے اندر رہتے ہوئے، راہ نکالی۔ اس کے لیے انھوں نے خانوادہ ولی اللٰہی کے ایک ارادت مند وعقیدت کیش سید احمد رائے بریلوی کی سربراہی میں قوم کی اصلاح وجہاد کی ایک تحریک پیدا کردی اور ان کی معیت ونصرت کے لیے اپنے بھتیجے اور داماد (شاہ اسماعیل اور مولوی عبدالحی) کو ان کے ساتھ کردیا۔ چند سال کے اندر مساعی دعوت نے ان کے گرد مریدین وعقیدت مندوں کی ہزاروں افراد پر مشتمل ایک جماعت پیدا کردی۔

اب انھوں نے عمل کا دوسرا قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا اور مریدین ومعتقدین کو کے ہجوم کا مجاہدین اور ایثار پیشہ گان وسرفروشان قوم ووطن کی فوج میں بدل دینے کا ارادہ کیا، لیکن اس سے پہلے انھوں نے حجاز کے سفر اور فریضۂ حج کی ادائیگی کا عزم کیا۔ اس کا ایک پہلو یہ تھا کہ ہندوستان سے نکل کر آزاد فضا میں آیندہ پیش آنے والے حالات وخطرات کے ہر پہلو پر غور وفکر کرلیا اور پیش بندی کے بارے میں سوچ لیا جائے۔

تقریباً ایک برس میں یہ جماعت وطن لوٹی تو اس کا صوفیانہ عجز وانکسار مجاہدانہ شان میں بدل گیا تھا۔ وطن پہنچ کر فوجی تربیت، اسلحہ کے حصول اور رسد وکمک کے لیے

ایک نظام کے قیام پر توجہ دی گئی۔ یہ جماعت ۱۸۲۴ء کے آخر یا ۱۸۲۵ء کے شروع میں وطن لوٹی تھی تو حضرت شاہ عبدالعزیز کا انتقال ہو چکا تھا۔ اگر چہ شاہ عبدالعزیز کے پیکر میں وقت کے بہت بڑے مدبر اور رہنما مفکر کی سرپرستی سے جماعت محروم ہو گئی تھی، لیکن تحریک کے اگلے قدم کے بارے میں فیصلہ حضرت شاہ صاحب کی حیات میں ہو چکا تھا۔ اس لیے مقاصد کے سفر میں قدم آگے ہی بڑھانا تھا۔ چناں چہ ملک کی طرف سے افراد اور مال کی فراہمی اور رسد و کمک کے انتظام کی طرف سے جوں ہی اطمینان ہوا اپنے مجاہدین کو لے کر اصلاح و عمل صالح اور ترک رسوم کی شہر بہ شہر دعوت دیتے ہوئے سندھ کی طرف روانہ ہوئے اور تبلیغ جہاد کرتے اور مجاہدین کی نصرت کے لیے زمین ہموار کرتے ہوئے سندھ کے راشدی خاندان کے گل سرسبد حضرت پیر صبغت اللہ شاہ اول بانی تحریک حر کو اپنا حمایتی بناتے اور امداد و تعاون پر آمادہ کرتے ہوئے سکھر، حبیب کوٹ، شکار پور، درہ بولان، کوئٹہ، قندھار، کابل سے ہوتے ہوئے علاقہ پشاور میں آ پہنچے، سب سے پہلے یہاں کی فضا کو ہموار کیا۔ اگر چہ مشکلات بہت پیش آئے لیکن علاقے کے با اثر خوانین کی رقابتوں اور پنجاب کی سکھ شاہی کے اثرات کو مٹا کر علاقے کے خوانین کے تعاون سے ایک آزاد قومی حکومت قایم کر دی۔

اگر چہ تحریک کے آغاز سے لے کر اس کی سرگرمیوں کے پھیلانے اور حجاز سے واپسی کے بعد تحریک کی سرگرمیوں کے بدلے ہوئے انداز سے آیندہ کے خطرات سے انگریز اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے گرگے ناواقف نہیں رہ سکتے تھے، لیکن چوں کہ ملک کے اندر کوئی ہنگامہ پیدا نہیں ہو رہا ہے۔ اس لیے انھوں نے تحریک سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا اور پورا موقع دیا کہ تحریک ملک سے باہر نکل جائے، لیکن جیسے ہی کمپنی کو یقین ہوا کہ خطرہ پشاور کے علاقے تک پہنچ چکا ہے اور اس کا رخ ہندوستان کی طرف ہے، فوراً اس کے تدارک کے لیے مستعد ہو گئی اور اس کے کارندوں کے لیے مشرق سے لے کر شمال مغربی ہند تک تحریک کی امداد و کمک کے لیے سرگرم تھے، مشکلات پیدا ہونا شروع ہو گئیں اور تحریک کی ناکامی کے بعد تو ان کارگزاروں اور ان کے خاندانوں کی زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔

......☆......☆......

تحریک کے حالات میں روز بہ روز مشکلات پیدا ہو رہی تھیں۔ ایک طرف ایک آزاد آشیانے کی تعمیر کے لیے تنکے چنے جا رہے تھے اور وطن کو انگریز اور کمپنی کے پیدا کردہ مفادات و عذاب سے نجات دلانے کے لیے اقدام وسعی کا سفر درپیش تھا۔ دوسری طرف مقامی سیاست کو انگریز کی چیرہ دستی اور سازش نے نہایت مشکل حالات سے دوچار کر دیا تھا۔ ایک طرف تو انگریزوں نے علاقے کے حالات کو اپنی سازشوں سے زہر آلود کر دیا تھا اور دوسری طرف پنجاب کی سکھ حکومت کو مجاہدین کے خطرے سے اس درجے ڈرایا اور وہ راہ دکھائی کہ سکھ فوج کو بالاکوٹ کی پہاڑیوں میں مجاہدین کے سر پر لا کھڑا کیا۔ مجاہدین کی ایک تعداد اس حادثے سے پہلے ہی جب کہ وہ علاقے میں اپنے فرایض کی انجام دہی میں مصروف تھے، ایک سازش کے تحت سوتے جاگتے، مسجدوں میں نماز پڑھتے اور گھروں میں آرام کرتے ہوئے شہید کر دیا تھا۔ غرضے کہ بالاکوٹ کے مقام پر احیائے ملّتِ اسلامیہ کی ایک عظیم الشان تحریک کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ ۶ رمئی ۱۸۳۱ء جمعہ کا دن ۱۱، ۱۲ بجے کا عمل تھا کہ تاریخ اسلامیانِ ہند کے ایک دور کا خاتمہ ہوا اور دوسرے دور کے آغاز کا ورق لوٹ دیا گیا۔ واضح رہے کہ سید احمد شہیدؒ اور اسماعیل شہیدؒ کی تحریک اصلاح و جہاد سر تا سر انگریزوں کو ملک سے نکالنے اور قومی حکومت کے قیام کی تحریک تھی۔ اس کا ایک پہلو پنجاب سکھ حکومت کے دور میں قوم کے ایک طبقے (مسلمان) کے خلاف حکومت یا اکثریت کی سوسایٹی کے رویے کی اصلاح بھی تھی۔

''یہاں تحریک کا خاتمہ'' مجاہدین کی ایک جماعت کے قتل اور نظام کے ٹوٹ جانے کو کہا گیا ہے۔ یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ تحریک کی روح فنا ہو گئی تھی۔ تحریک اپنی فکر اور مقاصد کے لحاظ سے ۱۹۴۷ء تک باقی رہی اور برٹش استعمار کے لیے ہمیشہ دردِ سر بنی رہی۔ ملک کی آزادی کی تحریک میں اس کا ایک حصہ ہمیشہ رہا اور بعض مواقع پر اس سے نہایت اہم کام لیے گئے۔

......☆......☆......

۱۸۵۷ء کا واقعہ اس کے ٹھیک چھبیس سال بعد پیش آیا۔ اس وقت تک سرحد سے لے کر سندھ، راجپوتانہ، یوپی، بہار، اور مدراس و بنگال تک تحریک کی بجھی ہوئی خاکستر میں دبی ہوئی چنگاریاں موجود تھیں، جو موسم کے بدلتے ہی بھڑک کر شعلہ جوالہ بن گئیں۔ غور فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ مذکورہ علاقوں میں مذہبی طبقہ تمام تر زندہ تحریک ولی اللٰہی کی دعوتِ اصلاح و جہاد کے شہدا و مجاہدین کے باقیات دراصل انھیں کی اولاد تھیں، جنھوں نے انگریزوں کے خلاف بھڑک اٹھنے والی آگ، تحریک آزادی کے لیے نہایت سرگرمی دکھائی تھی اور اسے مزید بھڑکانے کے لیے ایندھن فراہم کیا تھا۔

ہمارے وہ بزرگ جو ہندوستان میں انقلاب قومی کو غدر منوانے کے لیے مصر رہے ہیں مشرق میں پلاسی، جنوب میں میسور، مغرب میں بالاکوٹ کے حوادث اور خود اپنے پیروں تلے سرزمین روہیل کھنڈ اور اودھ میں انگریزوں کے پھیلائے ہوئے فساد اور واجد علی شاہ اور ریاست سے ان کے انخلا کے سلسلے میں انگریزوں کے مظالم پر نظر ڈال لیتے تو انھیں ۱۸۵۷ء کی بغاوت اور تحریک جنگ آزادی کا واقعی پس منظر ضرور معلوم ہو جاتا۔ پھر نہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو غدر کہلانے پر کسی کو اصرار ہوتا اور نہ اسے محض چربی کے کارتوسوں کا افسانہ اور فوج کی ناراضگی کا شاخسانہ قرار دیا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ حریت پسندوں اور قوم پروروں کے دلوں میں بالخصوص اور عوام کے دلوں میں بالعموم انگریز دشمنی کا جوالا وا پک رہا تھا، اس کے پکنے اور پھوٹ پڑنے میں شاید کچھ دن اور لگ جاتے، لیکن کسی روز یہ حادثہ پیش ضرور آتا، وہ مئی ۱۸۵۷ء میں نہ سہی، اگلے ایک دو سال میں! اور اس کے لیے نہ چربی والے کارتوسوں کا بہانہ بنتا نہ ہڈی کا برادہ ملے آٹے کی ضرورت پیش آتی!

......☆......☆......

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی نوعیت کے بارے میں جب کبھی سوچا مجھے دیہاتی زندگی میں اس کی بڑی اچھی مثال ملی۔ وہ تمام لوگ جنھوں نے دیہاتی زندگی گزاری ہے یا اس کا مطالعہ کیا ہے میرے بیان کی تصدیق کریں گے۔

اچھے برے، دوست دشمن، اپنے بیگانے، گاؤں میں بھی ہوتے ہیں۔ اب تو

شہروں کی طرح دیہات کی زندگی میں بھی انقلاب آگیا ہے اور دیہات کی سادہ زندگی میں بھی بہت سی برائیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ لیکن بہت سی اچھی رسمیں اور اچھی عادتیں باقی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ اچھائی ہے کہ اگر گاؤں کے کسی گھر میں آگ لگ جائے تو گھر کے کسی ایک مرد عورت کی ایک چیخ پر اس کے پڑوس اور دور نزدیک کا ہر نوجوان بوڑھا مدد کے لیے دوڑ پڑتا ہے۔ کسی ایک شخص کا ہاتھ پانی کے چھوٹے بڑے برتن سے خالی نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ پڑوس کے گھروں کو آگ سے بچانے کے لیے گھروں سے سامان نکالنے میں مدد دیتے ہیں۔ اجتماعی کاموں کے لیے دیہاتی تربیت یافتہ اور فوج کے نظم وضبط سے واقف نہیں ہوتے۔ ایسے اچانک پیش آجانے والے حوادث میں تقسیم کار کے اصول سمجھانے والا کوئی نہیں ہوتا، لیکن دیہات میں دیکھا جاسکتا ہے کہ ایسے مواقع پر ہر شخص اپنی قوت اور موقعے کے مطابق اپنی ڈیوٹی خود اختیار کرلیتا ہے۔ ہر شخص دوسرے کو نظر انداز کرکے اپنے فرض کو ادا کرتا ہے۔ آپس کے لڑائی جھگڑے کو بھول جاتے ہیں، اپنے اختلاف اور دشمنی کی پروا نہیں کرتے۔ ایک مشینی عمل کی طرح کہ مشین کا بٹن دبا دینے کے بعد اس کے کل پرزے اپنا کام انجام دینا شروع کردیتے ہیں اور ہر پرزہ اپنے عمل کے سوا دوسرے کے عمل سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ تا آں کہ آگ بجھ جائے اور مصیبت ٹل جائے، لیکن یاد رکھیے کہ گاؤں میں چور اُچکے بھی ہوتے ہیں اور ایسے ہنگامے اور گاؤں والوں کی مصیبت کے وقت وہ اپنی فطرت اور عادت کے مطابق اپنا ہاتھ دکھا جاتے ہیں۔

۱۸۵۷ء میں دیہاتی زندگی کی اس روایت کی پوری عکاسی ہوتی ہے۔ جیسے جیسے وطن وقوم کی آزادی کی پکار اہل وطن کے کانوں میں پہنچی قوم کی متحدہ زندگی کے تمام عناصر نے مشین کے پرزوں کی طرح اپنا اپنا فرض ادا کرنا شروع کردیا۔ آپس کی لڑائیاں، دشمنیاں دور ہوتی گئیں اور اپنی اپنی قوت اور صلاحیت کے مطابق اپنا کام شروع کردیا۔ عقیدہ و مذہب کا فرق کیے بغیر ہر ہندو مسلمان اپنے ذوق اور ہمت و صلاحیت کے مطابق انتظامیہ، عدلیہ، فوج کی طرف متوجہ ہوتے رہے اور کاندھے سے کاندھا ملائے خدمت میں مصروف ہوتے رہے۔ ان میں برے بھی تھے اور بروں

نے برے کام ہی انجام دیے اور تحریک کے لیے نقصان رساں اور قوم و وطن کے لیے ان کا وجود شرم کا موجب تھا۔ انھوں نے اس موقع پر وہی کیا جو ان کی فطرت کا تقاضا تھا۔ افراتفری اس وقت زیادہ ہوگئی، جب شکستِ دہلی کی خبریں عام ہوئی اور ہمتوں نے جواب دیا۔ ہر کسی کو تحریک آزادی کا انجام نظر آنے لگا۔ اور ہر شخص کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ لیکن تحریک کی عظیم شخصیات نے بہادری کا ثبوت دیا ان کی زبان سے اپنی جان بچانے کے لیے دوسرے پر الزام ڈالنے کا کوئی واقعہ پیش نہ آیا وہ بہادر شاہ ظفر ہوں یا روہیل کھنڈ کے نواب بہادر خاں بہادر ہوں یا کان پور کے نانا صاحب ہوں یا گوالیار کے تانتیا توپے ہوں۔ آزاد اور قومی انتظامیہ و سپاہ کے ہندو مسلمان عام خدمت گاروں سے جو کوتاہیاں ہوئی تھیں، وہ وقت کا تقاضا تھا۔ اس کے لیے کسی کو الزام نہیں دیا جاسکتا کہ کوئی گنگا نہا کر پوتر ہوگیا یا کعبے کی قسم کھا کے پاکیزہ بن گیا تھا۔ قومی تحریکوں کی تاریخ میں نشیب بھی آتے ہیں اور فراز بھی۔ اور آزادی مل جانے کے ساٹھ سال بعد تو اس قسم کے شکوے شکایت اور طعن دینے اور چڑانے کا کوئی موقع اور جواز ہی نہیں رہا۔

......☆......☆......

دہلی میں اگرچہ ایک براے نام اور مجبور و پابند ہی سہی لیکن پہلے سے ایک بادشاہت قایم تھی، جو چند دن کی بحث و نظر کے بعد ایک قومی حکومت کی شکل میں سرگرم عمل ہوگئی تھی۔

اودھ بہر حال ایک ریاست تھی۔ حکمراں موجود تھا اور چند دن کے صلاح و مشورے سے برجیس قدر کو اس کی ماں بیگم حضرت محل کی سرپرستی میں وطن کے مدبرین اور نمایندگان نے نواب تسلیم کرلیا تھا۔

گوالیار صدیوں سے ایک آزاد ریاست تھا اور اب تانتیا توپے کی سربراہی اور آزاد قومی نظام کے قیام پر سب کا اتفاق ہوگیا تھا۔

جھانسی اب بھی اپنی آزاد حکمراں کے تحت آزاد ریاست تھی اور اسی حیثیت میں قومی جذبات کے احترام میں اس نے اپنی ریاست اور اپنی جان کو داؤں پر لگا دیا تھا۔

روہیل کھنڈ اپنی تاریخ کے آغاز سے ایک آزاد ریاست تھا اور اس کی آزادی کا خاتمہ شجاع الدولہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی سازش کے نتیجے میں حافظ الملک کے خاندان کے حق حکمرانی سے محرومی پر ہوا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں بدلے ہوئے حالات سے حافظ الملک کے پوتے نے اہل وطن کے ایماواصرار سے آزاد حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے حلف اٹھایا اور ایک ریاست کے تمام بنیادی اصولوں اور حکومت کے شعبہ جات کے قیام کے ساتھ اپنی ذمے داریوں کو اٹھانے کا عہد کیا تھا اور روہیل کھنڈ کے پورے تاریخی رقبے پر نہ سہی، بریلی، بدایوں، پیلی بھیت اور شاہ جہان پور کے اضلاع پر ۳۱ر مئی ۱۸۵۷ء سے سیکڑوں مربع میل کے رقبے اور اس کے لاکھوں باشندوں پر حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تھی۔ ان کے دائرۂ اثر میں حکومت کو غدر سے تعبیر اور ان کے استحقاق حکمرانی کو کون چیلنج کرسکتا تھا؟

شاہ جہان پور کا نظام حکومت ریاست روہیل کھنڈ کا ایک حصہ تھا، لیکن اپنے انتظام وانصرام اور خصوصیات وامتیازات میں خود ایک مستقل ریاستی نظام تھا۔

الہ آباد میں مولوی لیاقت علی خان نے اپنے اثرات سے ایک آزاد قومی حکومت کا رنگ جما دیا تھا۔

کان پور میں وہاں کے سابق حکمران خاندان کے وارث نانا صاحب نے نہایت نازک حالات میں قیام نظام حکومت کی ذمے داری اٹھائی تھی۔ ان کے پیچھے ان کے علاقے کے حمایتیوں اور ان کے پرستاروں کی ایک بڑی تعداد تھی اور یوپی کے اضلاع اور اودھ کے پورے علاقے میں ان کے مخلصین ومحبین کی ایک بڑی تعداد پھیلی ہوئی تھی۔

فرخ آباد میں پہلے سی ایک آزاد ریاست تھی۔ ۱۸۵۷ء میں اس کے حکمران نواب تفضل حسین خان تھے جو فرخ آباد کے بانی اور حکمران خاندان کے وارث اور فرخ آباد کے جائز حکمران تھے، وہاں ایک لمحے کے لیے بھی غدر کی کیفیت پیدا نہ ہوئی تھی۔

بجنور میں ایک شدید کش مکش کے بعد نواب محمود خاں کی حکومت باقاعدہ قایم

ہو گئی تھی اور انھوں نے بڑی حد تک حالات قابو کر لیا تھا۔

سہارن پور میں حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی سر براہی میں ایک نظام قایم تھا اس کے دیگر ارکان میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حافظ محمد ضامن شہیدؒ، محمد منیر نانوتوی تھے، ان کا نظام حکومت کے کئی اہم شعبوں کی نمایندگی کرتا تھا۔ ان کے علاقے میں ایک دن کے لیے بھی غدر کی حالت پیدا نہ ہوئی۔

مراد آباد اور اس کے قصبے سنبھل اور امروہہ وغیرہ کا علاقہ گرد و پیش کے تمام انقلابی محاذوں سے دور تھا ایک بجنور میں نواب محمود خان اپنے مقامی مسایل میں الجھے ہوئے، رام پور ملکہ وکٹوریہ کے فرزند دل بند کے زیر حکومت تھا۔ نہ وہ مراد آباد پر قبضہ کر سکتا تھا، نہ اس حلقے میں پھیلے ہوئے قومی جذبات اور انقلابی قوتوں سے نبرد آزما ہو سکتا تھا۔ بریلی اور فرخ آبادی قومی حکومتیں اپنے زیر انتظام واثر لینے کی متحمل نہ ہو سکتی تھیں۔ درمیان کے اس علاقے میں برٹش حکام کے لیے بھی مشکل تھا کہ وہ نظام کو برقرار رکھ سکیں۔ انھیں اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ مجو خاں نواب عظمت خاں افغان کے خاندان کے ایک بہادر، صاحب ہمت، محبت وطن اور قوم پرور شخص تھا۔ اس کے بزرگ ایک صدی سے مراد آباد میں آباد تھے اور عوام وخواص میں صاحب رسوخ شخص تھا۔ وہ سرکار کا ملازم بھی نہ تھا۔ اس کی گردن میں کمپنی کی وفاداری کا کوئی حلقہ پڑا ہوا نہ تھا، نہ اس نے وفاداری کا حلف اٹھایا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور مراد آباد کو اپنا مرکز قرار دے کر اس کے گرد و پیش کے علاقے کا انتظام سنبھال لیا اور اپنی قوت اور صلاحیت کا پورا وزن قومی تحریک کے پلڑے میں ڈال دیا۔ وہ اگر چہ استعمار کی گولی سے مارا گیا اور شہادت پائی، لیکن قومی تحریک کی عزت کو داغ دار نہ ہونے دیا۔ اس رویے کو کیوں کر باغیانہ اور اس کے علاقے کو غدر اور فساد کا مرکز کیوں کر قرار دیا جا سکتا تھا؟

محمدی میں آزاد قومی حکومت کا قیام۔ محمدی کا شمار روہیل کھنڈ میں نہیں ہوتا، وہ اودھ کے ضلع کھیری لکھیم پور کا ایک قصبہ ہے۔ اس میں غدر اور بغاوت کے حالات پیدا نہیں ہوئے، مولوی احمد اللہ شاہ نے پہلے ہی حملے میں اس پر قبضہ کر لیا اور قومی

حکومت قایم کردی۔ اس کی انتظامیہ و عدلیہ کے شعبے تھے۔ ریاست محمد کی ایک قومی مرکزی شوریٰ تھی جو ہندو مسلمان ممبروں پر مشتمل تھی۔ خود مولوی احمد اللہ شاہ اس کا فاتح، حکومت کا سب سے بڑا حاکم اور شوریٰ کا صدر تھا۔ عام مقدمات کی سماعت اور فیصلوں کے لیے عدلیہ اور مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے خاص مقدمات کے لیے قاضی اور پنڈت مقرر تھے۔ محمدی پر قبضے کے بعد کوئی فساد پیدا نہیں ہوا۔ قومی حکومت کا جھنڈا بلند تھا، کوچہ و بازار میں اس کا سکہ رواں تھا۔ دورانِ حکومت قومی میں ہنگامہ و فساد کا اس وقت تک کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ تا آں کہ برٹش حکومت نے دوبارہ اپنی حکومت بحال نہیں کر لی۔ اب انگریزوں نے اپنے ملازموں، حکومت میں مقامی حکام اور عوام میں سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ ان لوگوں سے انتقام لینا شروع کیا جن کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ انھوں نے تحریک آزادی وطن اور محمدی کی آزاد قومی حکومت کے قیام میں سرگرم حصہ لیا تھا[1]۔

......☆......☆......

مذکورہ انقلابی حکومتوں کے کم و بیش حالات میرے سامنے ہیں۔ میں نے زیر

---

[1] زیرِ نظر تالیف کا میٹریل کے تلاش کے دوران ۱۸۵۷ء میں قایم ہونے والی قومی حکومتوں کے حالات سامنے آئے تو میں انھیں بھی جمع کرتا رہا اور خدا کا شکر ہے کہ اچھا خاصا سامانِ تعمیر جمع ہو گیا اور بعض قیمتی ماخذ تک رسائی ہو گئی۔ اگر خدا نے مہلتِ حیات کو دراز کیا اور توفیق عمل بخشی تو یہ کام بھی انجام کو پہنچ جائے گا۔

میرا منصوبہ انھیں قومی حکومتوں کے اجزا کی تالیف و تدوین تک محدود نہ رہے گا۔ میں نے سوچا ہے کہ اس میں ان موقتہ حکومتوں کے حالات اور خدمات کے آثار بھی سمیٹ لیے جائیں جو تحریک آزادی کے مختلف ادوار میں ملک میں اور بیرون ملک میں قایم کی گئی تھیں۔ مثلاً

۱۔ ۱۹۱۵ء میں آزاد ہندوستان کی حکومت جو راجہ مہندر پرتاب اور مولانا برکت بھوپالی نے جرمن ترکی مشن کے مشورے سے قایم کی تھی اور مولانا عبید اللہ سندھی کو وزیر داخلہ کی حیثیت سے اس میں شامل کیا گیا تھا۔

۲۔ جاپان کے تعاون سے ۱۹۴۲ء میں سبھاش چندر بوش کی قایم شدہ حکومت۔

۳۔ ۱۹۴۲ء میں پیر پگاڑا صبغت اللہ شاہ کی قایم کردہ آزاد حکومت جو سندھ میں قایم ہوئی تھی۔ وغیرہا

نظر تالیف کو جس انداز سے مرتب کیا ہے، اس میں کوشش کی ہے کہ روہیل کھنڈ بریلی کی مرکزی حکومت شاہ جہان پور کی حکومت اور محمدی کی انقلابی حکومت کو اس طرح مرتب کیا جائے، جس سے ایک منظم حکومت کا خاکہ نظر کے سامنے آجائے۔ جن حضرات کی نظر سے اسی موضوع پر سید خورشید مصطفیٰ رضوی، ڈاکٹر محمد ایوب قادری، ڈاکٹر مسز عابدہ سمیع الدین کی تالیفات گزری ہیں، وہ ترتیب وتدوین کی اس خوبی کو فوراً محسوس کرلیں گے کہ یہ محض ہنگامہ پرور گروہ نہیں تھے جو شہروں میں حالات نے پیدا کردیے تھے، بلکہ منظم حکومتیں تھیں جو بلند مقاصد کے حصول کے لیے قایم کی گئی تھیں اور بدقسمتی سے وسایل جنگ کی کمی اور نظم وضبط کے فقدان، بعض مواقع پر آپس کے اختلاف، عدم تعاون اور سازشوں کے نتیجے میں صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔

ان میں سے کسی حکومت پر غدر اور بغاوت کا الزام صادق نہیں۔ کمپنی کی حکومت اور اس کی لوٹ مار اور انسانیت سوز رویے سے ملک نالاں تھا۔ فوجیوں کی شکایت اور ان کے حکام کے غلط رویے اور تشدد نے انھیں مشتعل کردیا اور جب بات آگے بڑھی تو ملک کے حریت پسندوں، وطن دوستوں اور قوم پروروں نے جو حالات سے فایدہ اٹھانے کے لیے جنگ آزادی کے میدان میں کود پڑے تھے، انھیں باغی فوجیوں کو استعمال کیا اور عوام نے ان کا ساتھ دیا، لیکن جیسا کہ وسایل جنگ اور اسلحہ کی کمی، نظم و ضبط کے فقدان نے انھیں ناکامی سے ہم کنار وشرم سار کیا۔ اور پورا براعظم ہند پاکستان اگلے نوے سال کے لیے غلامی کے عذاب میں پھر مبتلا ہوگیا۔ اس دور میں اگرچہ حکومت کی نوعیت قدرے بدل گئی تھی لیکن ملک وقوم کی لوٹ مار کے دروازے اسی طرح کھلے ہوئے تھے۔

......☆......☆......

(۲)

اولاً جب اپنے بزرگ دوست اور عزیز مرحوم رشید حسن خان کے ساتھ شاہ جہان پور کی تاریخ لکھنے کا عزم کیا تھا تو شاہ جہان کی تاریخ اور اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مختلف اہلِ قلم کے مضامین کے ایک مجموعے کا منصوبہ بتایا تھا، لیکن جب مجھے تنہا یہ بوجھ اٹھانا پڑا تو میں نے پہلے منصوبے کو ترک کر دیا اور اپنے ذوق کے مطابق شاہ جہان اور ۱۸۵۷ء کو موضوع بنایا، اس میں ایک طرح سے میری خاندان پرستی کا عنصر بھی شامل تھا۔ اس میں نواب بہادر خاں بانی شاہ جہان پور کی اولاد کے کئی اشخاص جنگ آزادی کے شہدا اور مجاہدین میں شامل تھے، جن سے رشتے کا اور جن کے خلف ہونے کا فخر مجھے حاصل تھا۔ میرے استاذ و مربی اور فخر خاندان مولانا عبدالہادی خان علیہ الرحمہ کا یہ بیان ہمیشہ میرے کانوں میں گونجتا رہا تھا کہ مولوی صبیح الدین شاہ جہان پوری نے اپنی تاریخ شاہ جہان پور میں جنگ آزادی کے شہدا و مجاہدین کو نظر انداز کر کے ان کے خاندانوں پر ظلم اور تاریخ نویسی میں بددیانتی کی ہے۔ جس شہر کے ہر خاندان کے کسی بزرگ نے اپنی وطن دوستی اور قوم پروری کا اور اپنا خون بہا کے اور گھر بار لٹا کے اور جاگیر ضبط کرا کے اپنی ایثار پیشگی کا ثبوت دیا تھا ان کا تذکرہ نہ کر کے اُن کے اخلاف سے رشتے کا فخر بھی چھین لیا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ تحریک خلافت و ترکِ موالات کے بعد قدرت نے قوم کے نوجوانوں اور بچوں کے دلوں سے برٹش استعمار سے خوف کو نکال پھینکا تھا اور تاریخ صبیح کا مؤلف ۱۹۳۰ء میں تاریخ میں ان شہدا اور مجاہدین کا نام لیتے ہوئے لرز رہا تھا۔ جب میں نے یہ موضوع منتخب کیا تھا تو میرے ذہن میں آں مرحوم کے وہ خیالات موجزن اور اظہار کے لیے کوئی راستہ ڈھونڈ رہے تھے۔

......☆......☆......

میں نے کام شروع کیا تو دو پہلوؤں سے مجھے اپنے پیش نظر موضوع میں توسیع

کرنی پڑی۔ مجھے یقین ہے کہ شاہ جہان پور اپنی تاریخ کے حسن وکمال کے لیے کسی اور شہر سے سامان آرایش اور زیبایش مستعار لینے کا محتاج نہیں ہے۔ اس کے تاریخی، سیاسی، تہذیبی، معاشرتی، اور قدرتی محاسن جن کا تعلق زمین اور زمین کی پیداواروں، موسموں کے لطف، آب وہوا، دیگر عمرانی اموراور ہمسایہ اقوام اور ہم وطنوں اور ان کے ذوق ومزاج کی ہم رنگی اور ہم آہنگی سے ہوتا ہے، اس میں وہ اپنے کسی پڑوسی شہر سے کم تر درجہ نہیں رکھتا۔

لیکن تاریخ جنگ آزادی کا ایک واقعہ ایسا ہے کہ شاہ جہان پور آزاد قومی نظام میں بریلی کے مرکز سے وابستہ تھا۔ اور اس کے باوجود کہ تاریخ میں مرکز کا کوئی فیصلہ اس کے مزاج پر گرانی کا موجب نہیں ہوا اور نہ اس کے نظام میں بریلی کے مرکز کو مداخلت کی کبھی ضرورت پیش آئی۔

بریلی، بدایوں اور پیلی بھیت سے شاہ جہان پور کا ایسا تعلق تھا کہ ان کے تذکرے کے بغیر شاہ جہان پور اور ۱۸۵۷ء کی تاریخ کے بعض گوشے تاریخ کی پوری روشنی میں نہیں آسکتے تھے، جن کے بغیر شاہ جہان پور کی داستان مکمل نہیں ہوسکتی تھی۔ اس لیے بریلی اور اس کے نظام سیاسی کے بعض خصایص اور دوسرے اضلاع بدایوں اور پیلی بھیت کی تاریخ کے بعض اجزا کو بھی دایرۂ تحریر میں سمیٹ لینا پڑا۔

دوسرا پہلو جس میں میرے لیے توسیع ناگزیر ٹھہری یہ تھا کہ اولاً میں نے سوچا تھا کہ شاہ جہان پور کے قیام کی تاریخ، اس کے متعلقات اور شہر کی تعمیرات، اس کے آثار قدیمہ، تعلیم، زبان، تہذیب وتمدن، میلوں ٹھیلوں اور دیگر معلومات کا تذکرہ شامل نہیں کروں گا، پھر میری راے بدل گئی اور نہایت ضروری معلوم ہوا۔ اس کے بغیر شاہ جہان پور کی اہمیت اور گرد وپیش کے شہروں کے مقابلے میں اس کے حسن وامتیاز کا نقش اُجاگر نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لیے ۱۸۵۷ء کی داستان سرائی سے پہلے ایک طویل مضمون کا اضافہ کرنا پڑا، جس کا تعلق شاہ جہان پور- تاریخ وعمران اور تہذیب وتمدن- نیز دیگر خصوصیات سے ہے۔

......☆......☆......

میں نے عرض کیا کہ میرا اصل موضوع ''شاہ جہان پور اور ۱۸۵۷ء'' تھا۔ اور صرف شاہ جہان پور کی تاریخ کی تکمیل و جامعیت کے نقطہ نظر سے بریلی کی مرکزیت سے وابستہ بریلی اور پیلی بھیت اور بدایوں کی تاریخ تحریک آزادی ۱۸۵۷ء کے بعض اجزا کو بھی شامل کرلیا ہے۔ تکملہ کی تمام تحریرات کو اصل موضوع کے درمیان مناسب مقامات پر یا آخر میں بطور ضمیمہ شامل کی جانا چاہیے تھا لیکن اس سے ۱۸۵۷ء کے ساتھ رشتۂ انسلاک کی فطری ترتیب بگڑ جارہی تھی۔ چوں کہ بریلی اور اس کے مرکزی نظام سے وابستہ اضلاع میں مشترک مضمون ۱۸۵۷ء تھا اس لیے ضروری یہ معلوم ہوا، کتاب میں مضامین کی یہی ترتیب مناسب ہوگی کہ بریلی کا ذکر پہلے لایا جائے اور اس کے وابستہ اضلاع کے حالات کو بھی اس کے ساتھ بیان کردیا جائے۔ اور اگرچہ محمدی کی آزاد قومی حکومت کا واقعہ روہیل کھنڈ کا واقعہ نہیں تھا، لیکن اس کا ذکر بھی اسی مقام پر مناسب معلوم ہوا۔ شاہ جہان پور کی تاریخ اور اس کے مختلف اجزا ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہوگئے ہیں کہ نہ ان کے مابین کوئی خلا ہے اور نہ کوئی مضمون یا بحث موجبِ فصل بنی ہے۔

......☆......☆......

حصۂ اوّل

شاہ جہان پور

تاریخ عمومی کے آئینے میں

ترتیب وتدوین

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

شاہ جہان پور تاریخ عمومی کے آئینے میں

حصہ اوّل

پیش لفظ

یہ مولوی حافظ محمد اسماعیل مرادآبادی وکیل عدالت ججی شاہ جہان پور کا ایک لیکچر ہے جو انھوں نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے دسویں اجلاس منعقدہ شاہ جہان پور میں مورخہ ۲۹ر دسمبر ۱۸۹۵ء کو پڑھا تھا۔ میرے علم کے مطابق تاریخ شاہ جہان پور کے موضوع پر یہ پہلا مقالہ ہے یا بلحاظ الفاظ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ پہلا مقالہ ہے جو میری نظر سے گزرا ہے۔

خان بہادر مولوی مطیع اللہ خاں صاحب تاریخ شاہ جہان پور موسومہ تاریخ مطیع کی روایت کے مطابق یہ اجلاس محسن الملک مولوی مہدی علی کی صدارت میں ہوا تھا اور اس میں سرسید احمد خان اور ان کی جماعت کے خاص ارکان شمس العلماء مولوی نذیر احمد دہلوی، شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی نے ان کے نامور بیٹے سید محمود نے اور علی گڑھ کالج کے پرنسپل مسٹر بیک اور پروفیسران سے آرنلڈ، تھیوڈر ماریسن، کالج کے ٹرسٹیان اور مختلف اضلاع ہند کے عمایدین نے شرکت فرمائی تھی۔

تاریخ شاہ جہان پور ایک تاریخی مقالہ ہے اور ایک تاریخی موقع پر پیش کیا گیا تھا۔ اگرچہ اس میں بعض بیانات کم زور تھے جن کی طرف صاحبِ ''تاریخِ مطیع'' نے اشارہ کیا ہے اور صاحب ''تاریخ شاہ آباد'' موسوم بہ ''نامۂ مظفری'' نے نقد کا فرض ادا کیا ہے۔ اس لیے خاک سار نے ایک تاریخی و تعلیمی کانفرنس سے وابستہ یادگار مقالہ کو محفوظ کردینے کے خیال سے منتخب کرلیا ہے اور اس کی کم زور روایت پر نقد میں ''نامۂ مظفری'' کے فاضل مؤلف کی ایک تحریر بہ طور ضمیمہ شامل کردی ہے۔

یہ لیکچر ایجوکیشنل کانفرنس کی روداد میں شامل کیے جانے کے علاوہ مطبع مفید عام۔ آگرہ سے بہ اہتمام محمد قادر علی خاں صوفی کتابی شکل میں بھی چھاپ دیا گیا تھا۔ میرے پیش اس کی یہی اشاعت ہے۔

ابوسلمان شاہ جہان پوری

باب اول:

تاریخ شاہ جہان پور

مولوی حافظ محمد اسماعیل مراد آبادی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب صدر انجمن و بزرگان قوم!

شاہ جہان پور میں جب کانفرنس کا اجلاس قرار پایا تو میں نے خیال کیا کہ یہ شاہ جہان پور مسلمانوں ہی کا آباد کیا ہوا ہے اور جو اس کے آباد کرنے والے تھے انھیں کی نسلیں اب تک اس میں آباد ہیں، اگر اس کانفرنس میں اس کی آبادی کی تاریخ اور اس کے بانی کی مختصر سوانح عمری اور حالات پیش کیے جائیں تو خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اس میں دو فایدے ہیں؛

ایک اپنے بزرگوں کے پچھلے کارناموں سے واقفیت!

دوسرے ان کی اولوالعزمی اور استقلال اور جواں مردی کے حالات سن کر موجودہ نسل کو کہ جو انھیں کے اخلاف کہے جاتے ہیں اس بات پر غور کرنے کا موقع ملے گا کہ وہ کون سے اسباب تھے جن کی وجہ سے ہمارے بزرگوں نے کیسے کیسے اعلا مرتبے اور مدارج حاصل کیے اور کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ باوجودے کہ انھیں کے گوشت پوست اور خون ہیں اس ذلت اور پستی کی حالت میں پڑے ہیں؟

کیا بعید ہے کہ ان حالات کو سن کر عرقِ حمیت جوش میں آئے اور خواب غفلت سے بیدار ہو کر اپنی نکبت اور ذلت کا سبب دریافت کر کے اس کی مدافعت کی طرف متوجہ ہوں اور اس زمانے کے حالات کے مطابق جو ترقی اور عزت حاصل کرنے کے ذرایع ہیں، ان کے حاصل ہونے کی کوشش کریں۔ بناءً علیہ مختلف کتب تواریخ سے وہ حالات کہ جو بالخصوص شاہ جہان پور کے بانیوں اور ان کی اولاد یا شاہ جہان پور کی آبادی سے تعلق رکھتے ہیں اقتباس کر کے آپ صاحبوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں

اور شکر یہ ادا کرتا ہوں نواب عبداللہ خاں صاحب کا جو آخر یادگار اس شہر کے بانی کی ہیں کہ انھوں نے براہِ مہربانی اپنے خاندان کی پرانی تاریخ کی کتابیں مجھ کو عنایت فرمائیں اور انھیں کی بہ دولت میں اپنے قصد پر کامیاب ہوا۔

حضرات! یہ شہر بسایا ہوا نواب عمدۃ الملک بہادر خان بہادر چغتا کا ہے، جس کا اصلی نام سرابدال خان تھا۔ نواب بہادر خان کا باپ دریا خان ابن ابراہیم خان قوم افغان باقرزئی تھا۔ داؤدزئی ایک بڑی قوم پٹھانوں کی ہے۔ اسی کی ایک شاخ باقرزئی ہے وطن اصلی ان کا نواح پشاور میں قصبہ بربر تھا۔ قصبۂ مذکورہ اور اس کے گرد و پیش جس قدر مواضعات تھے، ان میں باقرزئی اور داؤدزئی پٹھان آباد تھے۔ پٹھانوں کا دستور ہے کہ ہر قوم میں ایک رئیس و سردار ہوتا ہے اور اس کو لقب خان بولتے ہیں۔

اس قصبہ بربر اور مواضعات ملحقہ کا خان اور سردار دریا خان اپنے باپ دادا کے وقت سے چلا آتا تھا۔ دریا خان کاشت کار پیشہ تھا اور گھوڑوں کی سوداگری بھی کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ہندوستان بھی گھوڑے لے کر آیا اور گھوڑوں کی خرید وفروخت کرتا ہوا قصبہ حسن پور میں کہ جو ایک قصبہ لبِ دریاے گنگ مراد آباد کے ضلع میں واقع ہے، فروکش ہوا۔

یہ زمانہ سلطنت نور الدین جہاں گیر بادشاہ کا تھا اور انھیں دنوں میں حسن خان قوم افغان بازید خیل نے یہ قصبہ حسن پور آباد کیا تھا۔ حسن خان اور رکن الدین خان دو حقیقی بھائی تھے۔ بڑا بھائی رکن الدین خان ایک عالم فاضل اور ساتھ اس کے مرد درویش اور صاحبِ نسبت تھا۔ اور چھوٹا بھائی حسن خان دربار شاہی میں ایک معزز نوکر اور صاحب منصب تھا جب دریا خان حسن پور میں ٹھیرا تو حسن خان نے ہم قومی کے تعلق سے اس کو اپنے یہاں مہمان کیا اور اس کی بہت کچھ خاطر و مدارات کی اور اپنے بڑے بھائی رکن الدین خان سے کہ جو بسبب کمال اتقا اور زہد و ورع کے شیخ رکن الدین کہے جاتے تھے ملاقات کرائی۔ شیخ رکن الدین نے دریا خان کو مرد قابل دیکھ کر اور از روے مکاشفہ (یا آج کل کے نئی روشنی کے خیالات کے مطابق) فراست و ذہانت طبع سے معلوم کر کے کہ یہ شخص کوئی صاحب اقبال و ذی عزت و مرتبت ہوگا، اپنے بھائی حسن خان سے کہا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنی لڑکی سے (جن کا بڑی بی بی لقب تھا) دریا

خان سے نکاح کر دوں مگر دریا خان کے حسب ونسب کا حال معلوم نہیں تمہاری اس میں کیا رائے ہے؟ حسن خان نے بھی بھائی کی رائے سے اتفاق کیا اور کہا کہ حسب نسب دریا خان کا میں تحقیق کرلوں گا۔ اور اس کے بعد دریا خان سے اس کے خاندان کا شجرہ اور محضر نامہ لے کر ایک قاصد کو تصدیق کی غرض سے قصبہ بر بر کو روانہ کیا۔ قاصد نے وہاں پہنچ کر قصبہ بربر اور اس کے مواضعات ملحقہ میں شجرے کی تصدیق کی اور محضر نامہ پر گواہیاں لکھوا کر واپس آیا۔ غرض کہ حسن خان اور شیخ رکن الدین نے بعد اطمینان حالات دریا خان کے بڑی بی بی کا نکاح دریا خان کے ساتھ کر دیا۔ کچھ روزوں دریا خان سسرال میں رہے پھر ہوائے وطن نے کشش کی، شیخ رکن الدین سے رخصت چاہی۔ انھوں نے دریا خان کو بڑے ساز وسامان کے ساتھ رخصت کیا۔ وطن پہنچ کر ان بی بی سے تین لڑکے پیدا ہوئے، بڑے سر ابدال خان ملقب بہ بہادر خان کہ جو بانی شاہ جہان پور ہیں۔ دوسرے محمد خان، تیسرے عنایت خان۔ اور جب ان بی بی کا انتقال ہو گیا تو اپنے چچا کی بیٹی سے شادی کی۔ جس سے جلال خان اور یوسف خان، دو بیٹے پیدا ہوئے۔ چوں کہ مشیت ایزدی میں دریا خان اور اس کی اولاد کا ہندوستان کے ان نام ور لوگوں میں شامل ہونا تھا کہ جن کے حالات سے سیکڑوں صفحے تواریخ کے مامور ہیں اور جن کے کارناموں نے ہندوستان سے لے کر بلخ اور بدخشان تک اپنی شجاعت اور استقلال کا ڈنکا بجا دیا تھا تو اس کا سامان تقدیر سے اس طرح پر ہوا کہ عہد جانگیر بادشاہ میں ایک افغان پیر خان نامی قوم لودی منصب دار شاہی تھا، اس نے مزاج بادشاہ میں رفتہ رفتہ اس قدر دخل پایا کہ اول صلابت خان، پھر خان جہان خان اور آخر میں یار وفادار سپہ سالار خان جہان خان کے خطاب سے سرفرازی حاصل کی اور تمام ہندوستان کی افواج شاہی کا سپہ سالار ہو گیا۔ خان جہان خان ایک مرتبہ اپنے وطن افغانستان میں تھا کہ جب اتفاق بہ تقریب شکار دریا خان کے قصبہ میں اس کا گذر ہو گیا۔ دریا خان چوں کہ اپنی سسرال کے تعلقات سے امرائے ہندوستان کا مزاج شناس ہو چکا تھا۔ خان جہان خان کو نہایت تعظیم وتکریم سے اپنے مکان پر لایا اور اس کی شان کے موافق مراتب تواضع و مدارات کے بجالایا۔ خان

جہان خان دریا خان کے اس حسن سلوک سے نہایت خوش ہوا۔ اور بہ اصرار تمام اس کو ملازمت شاہی پر آمادہ کر کے جب وہ خود ہندوستان کو واپس ہوا تو اس کو بھی اپنے ساتھ لیتا آیا اور دربار شاہی میں پیش کر کے اس سے نذر دلوائی اور اس کی شرافتِ خاندانی اور موروثی اعزاز کی بہت کچھ مدح کی اور اپنے ساتھ جو اس نے برتاؤ عمدہ کیا تھا وہ بھی بیان کیا۔ خود بادشاہ نے بھی بہ نظر عزت افزائی دریا خان سے مخاطب ہو کر مختلف حالات دریافت فرمائے اور خلعت اور منصب سے سرفراز فرمایا۔ پھر تو دریا خان اور خان جہان کے درمیان اس قدر دوستی اور محبت کو ترقی ہوئی کہ طرفین سے صیغہ اخوت بڑھ گیا اور باہم پگڑی بدلی گئی۔ دریا خان خدماتِ شاہی بھی عمدہ طور پر بجالایا اکثر معرکوں میں افواج شاہی کے ساتھ شریک ہو کر فتوحات حاصل کیے کہ جس کے صلے میں ہزار سے لے کر دو ہزار اور سہ ہزاری ذات اور سہ ہزار سوار اور دو سواسپ ذاتی کا منصب حاصل کیا اور اس قدر رسوخ بڑھایا کہ بالآخر شاہ زادۂ خورم یعنی حضرت شاہ جہان کا بادشاہ نے اتالیق مقرر فرمایا اور اس کا بڑا بیٹا سر ابدال خان سلک مصاحبت شاہ زادہ خورم میں منتظم ہوا۔

مگر اس کے بعد ایک نیا واقعہ پیش آیا کہ شاہ جہان کی جاگیر میں پرگنہ دھول پور تھا اور دریا خان شاہ زادہ کی طرف سے اس جاگیر کا ناظم تھا کہ بادشاہ کے حضور سے بہ وجہ رنجش نور جہاں بیگم کے پرگنہ شاہ جہان کی جاگیر سے نکل کر شاہ زادۂ شہریار کی جاگیر میں داخل کیا گیا۔ شاہ زادۂ شہریار نے شریف الملک اپنے ملازم خاص کو پرگنہ دھول پور کا ناظم مقرر فرمایا۔ جب شریف الملک نے جاگیر پر قبضہ کرنا چاہا تو دریا خان شاہ جہان کی طرف سے مقابلے پر پیش آیا۔ طرفین میں سخت محاربہ و مقابلہ ہو کر شریف الملک مارا گیا اور دریا خان بہ دستور قابض رہا۔ شاہ جہان نے اس کی وفاداری اور اطاعت شعاری سے خوش ہو کر خلعت فاخرہ عطا فرمایا۔ یہ واقعہ ۱۰۳۲ ہجری کا ہے۔ اب اس کے بعد جہانگیر بادشاہ اور شاہ جہان میں کھلم کھلا مخالفت ہوگئی۔ اور شاہ جہان نے بغاوت اختیار کر کے ملک بنگالہ پر خروج کر دیا اور اکثر سرداران شاہی کو اپنے موافق کر کے مع دریا خان اور سر ابدال خان کے ابراہیم خان صوبے دار بنگالہ پر

چڑھائی کی اور بہت بڑی لڑائی کے بعد جس میں دونوں طرف ہزاروں جانیں ضایع ہوئیں شاہ زادے نے فتح پائی۔ اور اس کے بعد تمام ممالک شرقی پر تا بہ اودھ شاہ زادے نے قبضہ کر کے صوبہ الہ آباد عبداللہ خان اور صوبہ اودھ دریا خان کے سپرد فرمایا۔ نور جہاں نے جب یہ اخبار متوحش سنے تو اس نے شاہ زادہ پرویز کو بادشاہ کی طرف سے شاہ جہان کے مقابلے کے واسطے مامور کیا۔ اور تمام سرداران شاہی جن کو شاہ جہان نے اپنی رفاقت میں لے لیا تھا، ان کے نام فرامین معافی قصور جاری کرا کے امیدوار مکرمت شاہی کا کیا۔ چناں چہ اکثر شاہ جہان سے کنارہ کر کے لشکر شاہی میں جا ملے۔ جب شاہ جہان نے دیکھا کہ اس کی جمعیت ٹوٹ گئی اور بہت تھوڑے آدمی اس کے ساتھ رہ گئے تو وہ بھی مصلحت وقت سمجھ کر دکن کو چلا گیا۔ دریا خان کے نام بھی فرمان عفو تقصیر من جانب بادشاہ اور خان جہان کا خط پہنچا۔ لہٰذا دریا خان نے بھی علاحدگی اختیار کی لیکن اس قدر وضع داری برتی کہ لشکر شاہی کے ساتھ ہو کر شاہ جہان کے مقابلے پر آنا بھی گوارا نہ کیا اور برہان پور اپنے دوست خان جہان کے پاس چلا گیا۔ مگر سرابدال خان بیٹا دریا خان کا برابر شاہ زادہ کے ساتھ رہا اس نے نہ رفاقت شاہ جہاں کی چھوڑی، نہ اس بارے میں باپ کا ساتھ دیا۔

۲۷ر صفر ۱۰۳۷ ہجری کو جہانگیر بادشاہ نے بہ مقام لاہور دنیا سے رحلت فرمائی شاہ جہان کو جب یہ خبر پہنچی تو شاہ زادہ ممدوح نے بہ مقام اکبر آباد پہنچ کر ۸ر جمادی الثانی ۱۰۳۷ء ہجری کو تخت سلطنت پر جلوس فرمایا۔ تمام سرداران اور رفقا کو انعام و اکرام عطا ہوئے۔ سرابدال خان کو بھی عمدۃ الملک نواب بہادر خان خطاب ہوا اور خلعت خاصہ مع خنجر مرصع اور اسپ و فیل اور منصب سہ ہزاری ذات اور دو ہزار سوار کا دیا گیا اور پندرہ ہزار رُپیہ نقد مرحمت ہوئے۔ شوال ۱۰۳۷ ہجری میں دریا خان بھی حاضر ہوا اس کا قصور بھی معاف فرما کر خلعت خاصہ اور منصب چار ہزاری ذات اور سہ ہزاری سوار سے ممتاز فرمایا۔ اور اس کے بعد ۲۵ر ذی الحجہ ۱۰۳۷ھ کو خلعت خاصہ اور جمدھر مرصع مع فیل اور تیس ہزار رُپیہ نقد دریا خان کو مرحمت ہو کر ملک دکن میں تعینات کیا گیا۔ لیکن اس اتفاق تقدیری کو ملاحظہ کیجیے کہ خان جہان خان جن کی بہ

دولت دریا خان نے یہ مرتبہ پایا تھا اسی کی دوستی اور اتحاد کی بہ دولت دریا خان نے سخت مصیبتیں اٹھائیں یہاں تک کہ اپنی جان سے بھی ہاتھ اٹھایا مگر اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے خان جہان خان بزمانۂ مخالفت و بغاوت شاہ جہان کے طرف دار اور مشیر خاص نور جہاں بیگم کا تھا۔ جب شاہ جہان بادشاہ ہوا تب اس نے یہ خیال کر کے کہ اب بہ جز اطاعت کے چارہ نہیں، ایک عرض داشت بہ اظہار اطاعت مع نظیر معقول بادشاہ کے حضور میں روانہ کی۔ بادشاہ نے بھی اس کے حالات ماسبق سے درگذر فرما کر فرمان معافی قصور اور خلعت وغیرہ سے ممتاز فرمایا۔ مگر باوجود اس کے اس کا دل بادشاہ کی طرف سے مطمئن نہ ہوا اور جس قدر مکرمت شاہی کا اظہار ہوتا تھا، اس کی بدگمانی ترقی پکڑتی تھی۔ بالآخر نوبت بانیجار رسید کہ ایک روز کھلم کھلا بغاوت اختیار کر کے مع اپنے یار وفادار دریا خان کے پانچ گھڑی رات گزری تھی کہ دارالسلطنت آگرہ سے نقارہ پر چوب دیتا ہوا نکل بھاگا مگر دریا خان کے متعلق تین روایتیں ہیں۔ ایک تو یہی آگرہ سے اس کے ساتھ روانہ ہونا۔ دوسری یہ کہ دریا خان اس زمانے میں دکن اپنے مقام تعیناتی پر تھا۔ جب خان جہان خان ملک دکن میں پہنچا تو وہاں سے دریا خان کو بھی اپنے ساتھ لے لیا اور تیسری روایت یہ ہے اور اسی کو ان کے خاندان والے صحیح سمجھتے ہیں کہ جس رات خان جہان خان بھاگا تھا اس کی صبح کو حسب معمول دریا خان حاضر دربار ہوا اس وقت بادشاہ غصہ میں بھرا بیٹھا تھا۔ اور جو سردار آتے جاتے تھے خان جہان خان کے مقابلے پر مامور ہوتے جاتے تھے۔ دریا خان جب سامنے آیا تو اس کا ربط وضبط خان جہان کے ساتھ اور نیز دریا خان کا بھی ایک مرتبہ باغوائے خان جہان خان منحرف ہو جانا اس کو یاد آیا اور اسی عالم غیظ میں دریا خان سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ (او دریا خان شنیدہ ام کہ ننگ افغانستان از گورستان میمز و خو کہ افغان بانام ونشان ہستی درین وقت مصیبت شریک یار وفادار خود نشدی) دریا خان نے اس کے جواب میں دست بستہ عرض کیا: ''بلے پیر و مرشد الامر فوق الادب'' یہ کہہ کر اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا اور مکان پر آ کر اپنا مال واسباب اور بچے اور عورتیں اور اپنے ہم راہی سوار پیادے اور تمام عزیز واقارب کو ساتھ لے کر نقارہ پر

ڈنکا دیتا ہوا آگرہ سے نکل کر خان جہان خان سے جاملا۔ مگر بہادر خان نے باپ کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ بہ دستور بادشاہ کی خدمت میں حاضر رہا۔ شاہ جہان کو اس وقت دریا خان کے چلے جانے سے یہ گمان نہ تھا کہ اس سے یہ کج ادائی وقوع میں آوے گی مگر جب بادشاہ کو دریا خان کی مغروری کی کیفیت معلوم ہوئی تو اس کی نسبت بھی وہی حکم صادر ہوا، جو خان جہان خان کے حق میں ہوا تھا۔ غرضے کہ خان جہان خان دریائے چمبل پر کہ جو دھول پور کے قریب آگرہ سے پندرہ کوس کے فاصلے پر واقع ہے، پہنچا تھا کہ لشکر شاہی نے اس کو جا کر گھیر لیا۔ خان جہان خان نے بہ سرعت تمام اہل وعیال اور مال واسباب کو دریا کے پار اتارا اور آپ مورچہ باندھ کر لشکر شاہی کے مقابل ہوا۔ اور اسی طرح لڑتا بھڑتا ہوا ملک دکن تک پہنچ گیا۔ آگے آگے خان جہان خان کا لشکر تھا اور پیچھے اس کے شاہی فوج تھی۔ یہاں تک کہ نظام الملک کے علاقہ میں پہنچ گیا۔ چوں کہ نظام الملک کو خان جہان خان کی رعایت بہر طور منظور تھی، لہٰذا اس کے پاس پہنچ جانے سے بادشاہ کو زیادہ تشویش ہوئی اور خود بادشاہ بہ نفس نفیس غرہ ربیع الثانی ۱۰۳۹ھ کو متوجہ ملک دکن ہوا اور وہاں پہنچ کر اول یہ انتظام کیا کہ لشکر کے تین حصے کر کے ایک حصہ کا سردار نواب بہادر خان کو اور دوسرے حصہ کا شایستہ خان کو اور تیسرے حصہ کا اعظم خان کو مقرر کیا۔ اور کل فوج کی ذمہ داری نواب بہادر خان کے متعلق کر کے خود برہان پور چلا گیا۔ بعد کو یہ معلوم ہوا کہ شایستہ خان اور اعظم خان کے باہم کچھ شکر رنجی ہے تو شایستہ خان کی جگہ عبداللہ خان فیروز جنگ مقرر ہوئے اور شایستہ خان کو بادشاہ نے اپنی خدمت میں طلب فرمالیا۔ شایستہ خان اپنے مختصر گروہ کے ساتھ بادشاہ کے پاس جاتا تھا کہ اثنائے راہ میں نظام الملک کی بارہ ہزار فوج نے جو خان جہان خان کے ساتھ تھی شایستہ خان کو گھیر لیا۔ سخت مقابلہ ہوا جن میں بہت سے سپاہی اور سردار لشکر شاہی کے جو شایستہ خان کے ساتھ تھے مارے گئے شایستہ خان نے بہ ہزار دشواری اپنی جان بچائی۔ بہادر خان اور اعظم خان کو اس واقعے کی جب اطلاع ہوئی تو وہ واسطے مدد شایستہ خان کے روانہ ہو کر اس وقت موقع پر پہنچے کہ خان جہان خان اپنی فوج میں شایستہ خان کا مال لوٹا ہوا تقسیم کر رہا تھا۔ اسی حالت میں ان لوگوں نے خان

جہان خان کو گھیر لیا۔ سب سے پہلے نواب بہادر خان حملہ آور ہوا اور جنگ عظیم پیش آئی
جس میں نواب بہادر خان کمال شجاعت اور جواں مردی کے ساتھ لڑا۔ نواب بہادر
خان کے مقابلے کے واسطے خان جہان خان کا بھتیجا جس کا بہادر خان نام تھا اور عمر و
شجاعت و جسامت میں بھی ہم پلہ نواب بہادر کا تھا، سامنے آیا۔ اس کی دوستی بھی نواب
بہادر خان سے کسی زمانے میں بہت تھی۔ جس وقت بہادر خان مذکور مقابلے پر آیا
باوجودے کہ نواب بہادر خان چند زخم تلواروں کے کھائے ہوئے تھا اس کے مقابلے پر
کھڑا ہو گیا اور ایسا لڑا کہ بہادر خان مذکور تلوار اور نیزوں کے پیہم زخم کھا کر بے ہوش
زمین پر گرا۔ مگر وہ بھی ایسا دلیر تھا کہ پھر اپنے آپ کو سنبھال کر نواب بہادر خان کے
مقابلے پر آیا اور اب اس نے نواب بہادر خان کو ایسا زخمی کیا کہ یہ بے ہوش ہو کر زمین
پر گرے۔ مگر یہ بھی فوراً سنبھل کر پھر اس کے مقابلے پر آئے اور اب طرفین سے تیر
اندازی ہونے لگی۔ آخر کار بہادر خان مذکور تیروں کے بہت سے زخم کھا کر زمین پر گرا
اور اب (گویا وہ حالت نزع میں تھا کہ پرسرام راجپوت لشکر شاہی سے اس کا سر کاٹنے
جھپٹا، جیسے ہی اس کے قریب پہنچا ہے کہ اس نے اسی حالت نزع میں اپنی کمر سے
چھری کھینچ پرسرام کا چہرہ بھی زخمی کیا اور ایک کان بھی اس کا کاٹ لیا۔ مگر پرسرام نے
سر اس کا تن سے جدا کر کے اس کی انگوٹھی جس پر اس کا نام کندہ تھا، مع اس کے گھوڑے
اور ہتھیاروں کے اپنے قبضے میں کر لی۔ اس نوجوان بھتیجے کا مارا جانا خان جہان خان کو
بہت شاق گزرا اور اب وہ ایسی حالت میں کہ لشکر شاہی کشتوں اور زخمیوں کے انتظام
میں مصروف تھا موقع پا کر میدان چھوڑ بیجا پور کی طرف چل دیا۔ نواب بہادر خان نے
شایستہ خان کو اس کے تعاقب میں روانہ کیا اور خود اسی جگہ بہ غرض علاج زخمیوں کے
قیام کر کے ایک عرض داشت متضمن حالات جنگ معہ سر اور انگشتری بہادر خان مقتول
کی حضور میں بادشاہ کے روانہ کی۔ چناں چہ بادشاہ کے حضور سے ان خدمات پسندیدہ
کے صلے میں خلعت خاصہ اور جمدھر مرصع و فیل معہ مادہ فیل و اسپ باساز و زین طلائی
نواب بہادر خان کو آیا اور اس کے ساتھیوں کو انعام اعلیٰ قدر مراتب عطا ہوا۔

الغرض خان جہان خان اور دریا خان وہاں سے بھاگ کر پریشان اور سرگرداں

پھرتے ہوئے آخر کار ملک مالوہ میں راجہ بکرماجیت پسر جیمار سنگھ بندیلہ علاقے کی سرحد پر پہنچے۔ پہلے بھی ایک مرتبہ خان جہان خان اس راجہ کے ملک سے ہو کر گزرا تھا مگر اُس دفعہ جو اس نے خان جہان خان کی خاطر تواضع کی سنی تو بادشاہ کا اس پر عتاب ہوا تھا۔ اس وجہ سے اب کی دفعہ اس نے یہ ارادہ کیا کہ خان جہان خان کو گرفتار کر کے بادشاہ کے پاس پہنچا دوں تاکہ پچھلے قصور کی تلافی ہو جائے اور بہ حیلۂ استقبال خان جہان خان کی طرف بڑھا، لیکن اتفاق کی بات کہ خان جہان خان تو اس کے ارادے سے مطلع ہو کر اس سے بچ کر نکل گیا۔ اس کے ایک میل پیچھے لشکر دریا خان کا تھا۔ اور وہ بالکل بے خبر تھا۔ جیسے ہی وہ راجہ کے قریب پہنچا ہے کہ راجہ نے دفعتہً دریا خان پر حملہ کر دیا بندوق کی گولی دریا خان کی پیشانی پر لگی دریا خان تو بے ہوش گھوڑے سے گرا۔ مگر اس کے ساتھی پٹھانوں سے اور راجہ کی فوج سے خوب جنگ ہوئی کہ اس اثنا میں لشکر شاہی بھی جو ان کے تعاقب میں تھا پہنچ گیا اور اس نے پہنچتے ہی لوٹ مار شروع کر دی اور دریا خان کے عیال و اطفال کو بھی قتل و قید کرنا چاہا کہ نواب بہادر خان نے بہ آواز بلند للکار کر کہا: ''بس خبردار! کیا تم نہیں جانتے ہو کہ یہ کس کا ناموس ہے۔ میرے بھائیوں اور عورتوں بچوں کو بے عزت کرنا چاہتے ہو۔ میں نے بادشاہ کے حکم کی تعمیل کی اور بپاس حق نمک خواری باپ کا قتل تک گوارا کیا لیکن اپنے ناموس کا بے عزت ہونا کسی طرح نہیں دیکھ سکتا۔'' یہ سنتے ہی لشکر کے سردار اور سپاہی اپنے ارادے پر منفعل ہو کر علاحدہ ہو گئے اور نواب بہادر خان گھوڑے سے اتر کر باپ کی لاش کے پاس گیا۔ اس وقت دریا خان میں کچھ جان باقی تھی بیٹے کو سرہانے بیٹھا دیکھ کر آنسو بھر لایا۔ اور ایک آہ سرد کھینچ کر بیٹے کو ہدایت کی کہ میرا تو کام تمام ہوا لیکن اب یہ کیا ضرور ہے کہ کوئی دوسرا آدمی میرا سر کاٹ کر بارگاہ شاہی سے عزت حاصل کرے اور تو محروم رہ جائے۔ لہٰذا تو اپنی انگوٹھی کہ جس میں نام تیرا کندہ ہو میرے منہ میں ڈال دے تاکہ جس وقت میرے منہ سے تیری انگوٹھی برآمد ہو تو تیرے ہی ہاتھ سے میرا قتل ہونا ثابت ہو۔ اور آخر میں یہ کہا کہ اپنی اولاد اور عورتوں کو تیرے سپرد کرتا ہوں اور تجھ کو خدا کے سپرد کرتا ہوں اور یہ کہہ کر بہ نام خدا جان بہ حق تسلیم ہوا۔ بعد جان نکلنے کے بہادر خان

باپ کی فہمایش کے مطابق انگوٹھی اس کے منہ میں ڈال کر باپ کے غم میں روتا ہوا اپنے مقام پر آیا۔ اس کے بعد ایک راجپوت نے دریا خان کا سر کاٹ کر نواب بہادر خان کے سامنے پیش کیا کہ جو بہ ذریعہ عرض داشت کے حضور میں بادشاہ کے پہنچایا گیا اور ایک خفیہ خط نواب بہادر خان نے اپنے وکیل کو کہ جو دربار شاہی میں حاضر رہتا تھا لکھ بھیجا کہ جس وقت یہ سر بادشاہ کے سامنے پیش ہو تم جا کر عرض کرنا کہ منہ کھول کر دیکھا جائے! غرض کہ جس وقت دریا خان کا سر مع عرض داشت نواب بہادر خان کی بہ مقام برہان پور بادشاہ کے حضور میں پیش کیا گیا ہے اس وقت بادشاہ دریائے تپتی میں کشتی میں سوار دریا کا تماشہ دکھ رہے تھے چناں چہ اس پر بادشاہ نے فی البدیہ حسب حال یہ شعر تصنیف کر کے اسی وقت ارشاد فرمایا:

رفتم بسیر دریا دیدم عجب تماشہ
دریا درون کشتی کشتی درون دریا

الحاصل! بہادر خان کا وکیل بھی اس وقت حاضر تھا اور اس کی التماس پر منہ کھولا گیا تو اس میں نواب بہادر خان کی مہر نکلی۔ اس پر بادشاہ نے خلعت خاصہ و انعام بیکراں نواب بہادر خان کو معہ خطاب نوابی کے عطا فرمایا۔ غرض کہ اس طرح پر ۱۵ر جمادی الثانی ۱۰۳۹ھ کو دریا خان اپنے دوست خان جہان خان پر تصدق ہو گئے۔ اس وقت دریا خان کی عمر ۴۹ برس کی تھی۔ دریا خان کا سر دہلی میں قریب مزار حضرت خواجہ باقی باللہ کے اور لاش دھول پور میں دفن ہوئی۔ اب خان جہان خان کا حال بھی سن لیجیے کہ اس کا خاتمہ کیوں کر ہوا۔ جب دریا خان مارا گیا تو خان جہان خان کی کمر ہمت ٹوٹ گئی اور وہ نہایت پریشانی اور اضطراب کی حالت میں کئی کئی دن کی راہ ایک ایک روز میں طے کرتا ہوا آگے بڑھا۔ اور اس کے پیچھے شاہی لشکر تھا جس سے برابر لڑائی ہوتی جاتی تھی جب قصبہ کالنجر کے پاس پہنچا تو نواب بہادر خان اور سید مظفر بارہہ اور راجہ مادھو سنگھ نے اس کو ہر طرف سے گھیر کر سخت عاجز و مجبور کیا اس وقت وہ آمادۂ مرگ ہو کر سامنے آیا اور نہایت جی توڑ کر لڑا اور جب تک کہ سید مظفر کی ضربات پیہم کے صدمات سے زمین پر نہ گرا تلوار ہاتھ سے نہ چھوڑی۔ اس کے گرتے ہی شاہ قلی گر

زبردار نے اس کا سرتن سے جدا کیا کہ جو نواب بہادر خان نے بذریعۂ عرض داشت بادشاہ کی خدمت میں روانہ کیا۔ اتفاق کی بات جس وقت یہ سر بادشاہ کے حضور میں پہنچا ہے طالب کلیم جو ایک مشہور اور نامی شعرا میں سے تھا وہ بھی اس وقت بادشاہ کی خدمت میں حاضر تھا اور اس نے اسی وقت یہ رباعی تصنیف کر کے بادشاہ کو سنائی جس کے صلے میں داد و تحسین حاصل کی

ایں مژدۂ فتح از پے ہم زیبا بود
ایں کیف دو بالا چہ نشاط افزا بود
از کشتن دریا سر پیراہم رفت
گویا کہ سرا و حباب ایں دریا بود

الغرض بعد حاصل کرنے اس فتح کے نواب بہادر خان اپنے چاروں بھائی محمد خان، عنایت خان، جلال خان، اور یوسف خان، اور نیز پسران خان جہان خان کو ساتھ لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا بادشاہ نے بہ کمال مکرمت ارشاد فرمایا کہ گو تیرا باپ خان جہان خان کور باطن کے فریب میں آ کر مارا گیا، لیکن اب میں تیرا باپ ہوں۔ نواب بہادر خان بھی آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور بادشاہ کا شکریہ ادا کر کے عرض کیا کہ وہ تو جو کچھ قسمت میں لکھا تھا پورا ہوا لیکن اب یہ میرے چھوٹے بھائی اور خان جہان خان کی اولاد حضور میں حاضر ہے ان سب کی پرورش کا کفیل میں ہوا ہوں۔ میری خاطر سے حضور ان کی جان بخشی فرمائیں۔ بادشاہ نے لقب چغتا سے کہ جو خاص خاندان تیموریہ کا لقب تھا اور اس وقت تک اور کسی کو دیا بھی نہیں گیا تھا، نواب بہادر خان کو سرفراز کیا۔ اور علاوہ دیگر انعامات و نقد و خلعت وغیرہ کے کالپی اور قنوج جاگیر میں عطا فرمائی۔ اور مزید بر آن لقب چغتا کی رعایت سے خاندان تیموریہ کی ایک شاہ زادی بھی نواب بہادر خان کے نکاح میں دی گئی۔ اور دیگر فرزندان دریا خان اور خان جہان خان کے بقیۃ السیف بیٹوں کی جان بخشی فرما کر ان کو بھی منصب اور خطاب اور جاگیریں عطا فرمائیں۔

حضرات! دریا خان کا حال تو آخر تک آپ نے سن لیا اب میں یہ چاہتا ہوں کہ

حالات آبادی شاہ جہان پور اور یہ کہ کیا سبب اس شہر کے بسانے کا ہوا اور کس طرح پر آباد کیا گیا آپ کی خدمت میں عرض کروں۔

نواب بہادر خان نے پہلے تو اپنی ننہال حسن پور سے پانچ چھ کوس پر گنگا کے کنارے ایک قصبہ بہادر گڑھ آباد کر کے اس میں مع اہل وعیال کے سکونت اختیار کی۔ لیکن جب قنوج اور کالپی میں جاگیر ہونے کے تعلق سے قیام کا زیادہ اتفاق ہوا تو قنوج میں مکانات سکونت تیار کرا کے اہل وعیال کو وہاں رکھا اور خود بھی دہلی میں حاضر دربار رہتا تھا۔ جس مقام پر کہ شاہ جہان پور آباد ہے یہاں پہلے جنگل خاردار اور راستہ نہایت دشوار گذار تھا۔ تین راجہ خودسر اور خودمختار حکومت کرتے تھے جن کا جائے قیام تین گڑھیاں تھیں۔ ایک گڑھی کھیڑا نونہر پر جو دریائے گرا کے کنارے اس جگہ واقع تھی جہاں شاہ جہان پور کا قلعہ بنایا گیا تھا۔ دوسری موضع لوہی کھیڑا پر اور تیسرے موضع بنجارے کھیڑا پر، جہاں ایک موضع چنوراب آباد ہے۔ گڑھی نونہر کا راجہ منکھی سنگھ اور لوہی کھیڑا کا بھولا سنگھ اور بنجارے کھیڑا کا جھمی سنگھ تھا اور ماتحت اور توابعین میں باون راجا اور تھے۔ رہزنی اور غارت گری ان کا پیشہ تھا۔ ایک مرتبہ نواب بہادر خان نے دہلی سے قنوج کو پانچ لاکھ روپیہ مع دیگر اسباب کے اپنے نوکروں کے ساتھ روانہ کیا۔ وہ لوگ اتفاق سے راستہ بھول کر اس مقام کے قریب سے جہاں شاہ جہان پور آباد ہے گزرے تو ان راہ زنوں نے گھیر کے سب روپیہ اور مال واسباب ان سے چھین لیا جمعدار اور اکثر سپاہی نواب بہادر خان کے مارے گئے۔ چند آدمی جو اپنی جان بچا کر بھاگ گئے تھے، انھوں نے نواب بہادر خان سے جا کر سب حال بیان کیا۔ اس پر نواب بہادر خان نے بادشاہ سے اپنی جاگیر پر جانے کی اجازت حاصل کی اور چلتے وقت بادشاہ سے ان لوٹیروں کا حال عرض کر کے ان کی گوشمالی کی بھی درخواست کی اور بادشاہ سے منظوری حاصل کر کے سات ہزار سوار جرار اپنی قوم کے ساتھ لے کر اس مقام پر پہنچا اور یک بارگی سب گڑھیوں پر حملہ کر دیا۔ گڑھی نونہر پر خود نواب بہادر خان اور لوہی کھیڑا پر ان کے بھائی جلال خان اور بنجارے کھیڑا پر شہباز خان جو متبنیٰ نواب بہادر خان کے تھے حملہ آور ہوئے۔ ادھر سے تینوں راجہ بھی مع اپنے ماتحت راجاؤں

کے مقابلے پر آئے۔ جُبھی سنگھ اور شہباز خان میں محاربہ عظیم پیش آیا۔ شہباز خان کے ساتھی بہت سے مارے گئے خود شہباز خان کے ایک زخم گولی کا اور ایک زخم تیر کا بازو پر لگا مگر شہباز خان برابر لڑتا رہا یہاں تک کہ جُبھی سنگھ نے آخر کار مجبور ہو کر راہ فرار اختیار کی مگر شہباز خان نے اس کا تعاقب کر کے گرفتار کر لیا۔ عرض کہ تینوں راجہ مع اپنے باون ماتحت راجاؤں کے مارے گئے اور گیارہ ہزار ان کے ساتھی قتل ہوئے اور بہت سی عورتیں اور بچے گرفتار ہوئے اور تینوں گڑھیاں نواب بہادر خان کے قبضے میں آگئیں، جن کے ساتھ غنیمت بے شمار ہاتھ آئی۔ نواب بہادر خان کی فوج کے بھی ایک ہزار آدمی قتل ہوئے۔ نواب بہادر خان نے چند روز یہاں قیام کر کے تینوں گڑھیاں مسمار کرائیں اور پورے طور پر اس مقام کا انتظام کر کے مع قیدیوں اور مال غنیمت کے قنوج اپنی جاگیر کو روانہ ہوئے۔ اور وہاں پہنچ کر ایک عرض داشت بادشاہ کے حضور میں روانہ کی جس میں حالات جنگ و پیکار اور مژدہ فتح کے لکھنے کے بعد اس مقام کے آباد کرنے کا اور ایک مکان اپنی سکونت کے واسطے بنانے کی اجازت چاہی۔ بادشاہ نے اس فتح کے صلے میں نواب بہادر خان اور جلال خان اور شہباز خان اور دیگر عہدے داروں کو اعلیٰ قدر مراتب خلعت و انعام سے سرفراز فرمایا اور حسبِ التماس نواب بہادر خان بیس ہزار بیگہ پختہ زمین واسطے آبادی شہر کے، علاوہ اس کے سولہ محال اور بہ طور جاگیر عطا ہو کر سند آل تمغا نسلاً بعد نسلٍ و بطناً بعد بطنٍ مرحمت ہوئی۔ نواب بہادر خان اس کی آبادی کا انتظام کر رہے تھے کہ بادشاہ کا حکم واسطے جانے ملک توران اور تسخیر ملک بدخشان کی بہ معیت شاہ زادہ مراد بخش صادر ہوا نواب بہادر خان تو ادھر روانہ ہوئے اور جلال خان کو اس مقام پر مامور کر کے یہ ہدایت کی کہ جنگل کٹوا کر زمین ہموار کرائے اور آبادی کا بندوبست کرے۔ اور ایک مکان بہ طور قلعہ کھیڑا نو نہر پر دریا کے کنارے تعمیر کرائے۔ اور قلعہ کے گرداگرد وہ لوگ بسائے جائیں کہ جو اس لڑائی میں مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں اور باقی شہر کی آبادی اس طرح پر ہونا چاہیے کہ شہر کے وسط میں ساہوکار، مہاجن اور دیگر اہلِ تجارت و اہلِ حرفہ بسائے جائیں اور کنارے کنارے شہر کے پٹھان آباد کیے جائیں کہ جس سے پوری حفاظت شہر کی رہے۔ بعض

دریا خان والد گرامی نواب بہادر خان

نواب بہادر خان بانی شاہ جہان پور

نواب دلیر خان بانی شاہ آباد

نواب عزیز خان چغتا ابن نواب بہادر خان

لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ جن کے عزیز ویگانہ آپ کے ہاتھ سے قتل ہوئے اور مال و اسباب لوٹا گیا، انھیں کو اپنے گھر کے پاس بسانا بہ مصداق قول سعدی ''افعی کشتن و بچہ اش را نگاہ داشتن۔'' خلاف مصلحت ہے۔ نواب بہادر خان نے جواب دیا کہ یہ بھی شیخ سعدی ہی کا قول ہے ع

دشمن چہ کند چو مہربان باشد دوست

ہمارا تمہارا خدا حافظ و ناصر ہے۔ سوائے اس کے یہ لوگ قوم کے شریف راجپوت ہیں۔ امید ہے کہ تعلیم پا کر قابل ہو جائیں گے ان کو اپنے پاس سے ہرگز علاحدہ نہ کرنا چاہیے۔ اور پھر ان سب کو ایک جگہ جمع کر کے ان کی کامل دل جوئی اور تشفی کی اور کہا کہ تم کو تا زیست میں بہ مثل اپنی اولاد کے عزیز رکھوں گا اور یہی وصیت میری اپنی بھائیوں اور اولاد کو ہے کہ وہ بھی ایسا ہی سمجھیں اور یہ کہہ کر اسی وقت وہ مال غنیمت اور اسباب جو اس لڑائی میں ہاتھ لگا تھا انھیں کو دے دیا اور اس طور پر شہر کی آبادی کا انتظام اور ہدایتیں کر کے دہلی کو روانہ ہو گیا۔ اور دہلی پہنچ کر وہاں سے خواجہ بلند کو مع انور معمار کے بہ غرض تعمیر قلعہ اور آبادی شہر کی، جلال خان کے پاس روانہ کیا اور خود شاہ زادہ مراد بخش کے ساتھ مہم بدخشان پر روانہ ہوا۔ یہ واقعہ مہینے ذی الحجہ ۱۰۵۵ھ کا ہے۔ ۱۰۵۷ھ میں جب اس مہم سے ہندوستان کو مراجعت کی تو واپسی کے وقت ایک مہینہ کابل میں آ کر قیام کیا اور کابل اور اس کے نواح کے تمام نام ور پٹھانوں اور قبیلوں کے سرداروں کو ایک روز معین کر کے بہ تقریب دعوت اپنے پاس جمع کیا اور بعد فراغت طعام اس جماعت سے ایک طولانی تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ ہندوستان میں ایک مقام دو دریاؤں کے بیچ میں واقع ہے جس میں غارت گر لوٹیرے آباد تھے اور ان سے آیند و روند کو سخت تکلیف اور نقصان پہنچتا تھا۔ میں نے اس مقام کو بادشاہ کے حکم سے فتح اور مسخر کیا اور اب میں نے اس مقام کو اپنا وطن قرار دیا ہے اور جلال خان اپنے بھائی کو بہ غرض انتظام آبادی اس جگہ چھوڑ آیا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ شہر خاص میری قوم سے آباد کیا جائے اور ہندوستان میں ایک ٹکڑا افغانستان کا قایم کر دیا جائے تا کہ مجھ کو اور میری اولاد اور عزیزوں کو اس سے پوری قوت رہے۔

اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو لوگ میرے ساتھ چلیں گے میں ان کا ہمیشہ مدد ومعاون رہوں گا اور جس کی جس قدر جائیداد یہاں پر ہے اس کے المضاعف ہندوستان میں دلواؤں گا۔ ان لوگوں نے اس کا یہ جواب دیا کہ ہم آپس میں مشورہ کر کے آپ کو جواب دیں گے اور اس کے بعد باہم مشورہ کر کے ایک روز معین کیا جس کی نواب بہادر خان کو بھی اطلاع دے گئی اور بہ روز معین ہر قوم اور قبیلہ کے سربراہ اور اہل الرائے اشخاص ایک میدان میں آکر جمع ہوئے۔ نواب بہادر خان بھی معہ اپنے رفقا کے حسب الطلب تشریف لائے اور ایک مسند پر جو خاص ان کے لیے ایک درخت کے نیچے بچھائی گئی تھی باعزاز تمام بٹھائے گئے۔ ایک بوڑھے سردار کے مشورہ سے اس درخت پر جہاں نواب بہادر خان کی مسند تھی پہلے سے ایک لڑکا بٹھا دیا گیا تھا غرض جس وقت نواب بہادر خان مسند پر بیٹھے اور ادھر ادھر کی باتیں شروع ہوئیں، اس لڑکے نے درخت کے اوپر سے نواب کے اوپر پیشاب کرنا شروع کر دیا کہ جس سے پگڑی اور لباس نواب کا بالکل تر ہو گیا۔ مگر نواب اسی طرح بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ اور اس نے اس حرکت ناشایستہ کی مطلق پروا نہ کی۔ تب وہی بوڑھا سردار کھڑا ہوا اور نواب سے دست بستہ عرض کیا کہ ہم آپ سے معافی چاہتے ہیں آپ خود بہ نظر انصاف ملاحظہ فرمائیں کہ اپنا وطن اصلی اور آبادی اجدادی جگہ چھوڑ کر ایک ایسے ملک میں کہ جو دور دراز مقام پر واقع ہو، وہاں کی آب و ہوا اور طرز معاشرت بھی بالکل نرالی اور مختلف ہو، سکونت قبول کرنا بغیر اطمینانِ کامل کیوں کر ہو سکتا ہے؟ مگر چوں کہ اب ہم نے آپ کا امتحان کر لیا جس سے ہم کو پورا یقین اس امر کا ہوتا ہے کہ آپ ہماری حرکات جا و بیجا کا تحمل و برداشت کریں گے اور آپ کی مہربانی کی نگاہ کسی حالت میں ہم سے نہیں پھرے گی، تو اب ہم کو وطن چھوڑنا کیا آپ کے غلاموں پر اپنی اولاد عزیز کو نثار کر دینے میں بھی کچھ دریغ نہیں ہے۔ چناں چہ اسی وقت پانچ ہزار افغان مختلف قبائل سے اپنے اہل و عیال اور مال و اسباب لے کر نواب بہادر خان کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئے۔ نوابؒ ان کو ساتھ لے کر پشاور آئے اور اس نواح کے پٹھانون کو بھی جمع کر کے اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کیا۔ چناں چہ چار ہزار افغان مختلف قبایل کے یہاں سے بھی ہمراہ ہوئے۔ اور

پشاور کے کھتریوں کو بھی اپنے ساتھ لیا۔ لیکن ابھی پشاور سے روانہ نہیں ہوئے تھے کہ ایک اور واقعہ پیش آ گیا! وہ یہ کہ بدخشان کی لڑائی میں شاہ زادہ اورنگ زیب عالم گیر کی شان میں کچھ کلمات گستاخانہ ایک روز میدان کارزار میں نواب بہادر خان سے سرزد ہو گئے تھے۔ شاہ زادہ نے وہاں تو تحمل اور سکوت کیا لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب بادشاہ کو اس کا علم ہوا تو نواب بہادر خان کے نام بہ مقام پشاور فرمان عتاب بادشاہ کے حضور سے اس مضمون کا صادر ہوا کہ اس سخت گوئی اور بے ادبی کی پاداش میں جو تم سے شاہ زادہ اورنگ زیب بہادر کی شان میں ظہور میں آئی تمہاری جاگیر کالپی اور قنوج ضبط ہو کر شامل خالصۂ سرکار کی گئی تا کہ تم کو چشم نمائی ہو اور آئندہ ایسی گستاخی نہ کرو۔ نواب بہادر خان اس حکم سے سخت پریشان ہوا مگر بہ جز صبر و سکوت کے کیا کر سکتا تھا لاچار اپنے ہم راہی پٹھانوں کی جماعت تو نیک نام خان اپنے چچا کے ساتھ بغرض آبادی شہر جلال خان کے پاس روانہ کی اور خود دہلی کو روانہ ہوا اور نیک نام خان کو اس امر کی تاکید کر دی کہ ہر قبیلے اور خیل کے نام کا جدا جدا محلّہ آباد ہو اور اسی محلّہ میں اس قبیلے اور قوم کے لوگ آباد کیے جائیں اور ایک قوم کا آدمی دوسری قوم کے محلے میں نہ بسنے پائے اور کہا کہ نام اس شہر کا ''شاہ جہان پور'' رکھنا اور جو کچھ متعلق آبادی شہر کے ضروری ہدایتیں تھیں وہ بھی اس کو سمجھا دیں۔ بادشاہ نے نواب بہادر خان کی جاگیر ضبط شدہ کا انتظام جلال خان اس کے بھائی کے سپرد فرمایا چناں چہ جلال خان جاگیر پر گیا اور شہباز خان اور نیک نام خان نے مل کر بہ مشورہ جلال خان شہر کی آبادی شروع کی۔ اور باون محلے ہر قبیلہ اور ہر قوم کے نام سے آباد کیے گئے اور ہر قوم اپنے نام کے محلے میں بسائی گئی۔ اور بعض محلے نواب بہادر خان کے عزیزوں اور رفیقوں نے اپنے اپنے نام سے بھی موسوم کیے جیسے کہ جلال خان نے جلال نگر اور شہباز خان نے شہباز نگر اور نیک نام خان نے نیک نام پورہ اور حیات خان اور فتح خان اور ہنڈال خان نے حیات پورہ اور فتح پورہ اور ہنڈال خیل اپنے اپنے نام سے آباد کیے۔ خواجہ بلند مہتمم عمارت نے ایک مسجد مع چاہ وسط شہر میں بنائی جو اَب کانچ کی مسجد کر کے مشہور ہے اور جس پر قطعۂ تاریخ سال تعمیر یہ کندہ ہے

شد مرتب بدورِ شاہِ جہان
در وطن دل کشا بہادر خان
مسجد و چاہ ساخت خواجہ بلند
سال و تاریخ "نغز" شد بجہان

اس قطعے میں لفظ "نغز" سے ۱۰۵۷ھ سال بنائے مسجد نکلتا ہے۔ اب نواب بہادر خان کے عفوِ تقصیر کے سامان غیب سے اس طور پر ظہور میں آئے کہ اخبار نویس شاہی نے عرض داشت بھیجی کہ نواب بہادر خان نے جو نیا شہر آباد کیا ہے اس میں ایک نہایت وسیع قلعہ جس کے چار برج عالی شان تجویز ہوئے ہیں بہ کمال استحکام و مضبوطی تعمیر ہو رہا ہے۔ اس پر نواب بہادر خان سے استفسار ہوا کہ تم کو صرف مکان سکونت بنانے کی اجازت ہوئی تھی نہ یہ کہ ایسا وسیع اور مضبوط قلعہ بناؤ۔ نواب بہادر خان نے عرض کیا کہ غلام تو وقت آبادی شہر سے ممالک بدخشان و بلخ پر تعینات رہا اب واپس آیا تو حضور میں حاضر ہے مجھ کو نہیں معلوم کہ ایسا قلعہ بنایا گیا ہے۔ اور کیا صورت آبادی شہر کی ہے۔ ارشاد ہوا کہ وسعت قلعے کی کم کرو اور جو برج بن گئے ہیں وہ گرا دیے جائیں۔ چناں چہ اسی وقت نواب بہادر خان نے شہباز خان اور نیک نام خان کو لکھا کہ جو برج تیار ہو گئے ہیں فوراً گرا دو اور قلعہ کی وسعت کم کر کے اس کے عرض و طول سے اطلاع دو اور ایک نقشہ قلعہ کا بنوا کر روانہ کرو۔ چناں چہ نیک نام خان نے برج گروا دیے اور قلعے کی وسعت کم کر کے نواب بہادر خان کو اطلاع دی کہ اب قلعے کا طول ۳۵۰ گز اور عرض ۲۵۰ گز قرار دیا گیا۔ اور قلعے کا نقشہ بھی روانہ کیا۔ نواب بہادر خان نے وہی تحریر نیک نام خان کی مع نقشہ کے حضور میں پیش کر دی اور شاہی اخبار نویس نے بھی برجوں کے گرا دینے اور قلعے کی وسعت کم ہو جانے کی اطلاع دی۔ بادشاہ نے نواب بہادر خان کی اس اطاعت اور فرمان برداری پر بہت کچھ اظہارِ خوش نودی فرمایا اور جاگیر مقروقہ بھی واگذاشت کر کے بدستور نواب بہادر خان کو عطا فرمائی۔ اور صوبۂ ملتان کا صوبہ دار مقرر فرما کر فوراً روانگی صوبہ ملتان کا حکم دیا۔ نواب بہادر خان نے عرض کیا کہ اس قدر مہلت چاہتا ہوں کہ جو نیا شہر میں نے آباد کرایا ہے

اس کو ایک نظر دیکھ لوں اور اپنی اہل و عیال کو وہاں آباد کر کے صوبہ ملتان کو جاؤں۔
بادشاہ نے یہ درخواست بھی نواب بہادر خان کی منظور فرمائی۔ تب نواب بہادر خان
نے دہلی سے چل کر اپنے پہلے آباد کیے ہوئے قصبہ بہادر گڑھ میں اول دو روز قیام
فرمایا اور وہ قصبہ اپنے بھائی عنایت خان کو عنایت کر کے وہاں سے شاہ جہان پور آیا۔
یہاں آکر نو دن یا بارہ دن صرف قیام کر کے ایک محلہ جس کا نام بہادر گنج ہے اپنے نام
کا بسایا۔ شاہ جہان پور سے واپس ہو کر پھر دہلی گیا اور کیفیت آبادی شہر کی حضور بادشاہ
میں بیان کر کے آخر میں یہ بھی عرض کیا کہ نام اس شہر کا میں نے شاہ جہان پور رکھا ہے
بادشاہ نے اور بھی اپنی رضا مندی اور خوش نودی کا اظہار فرمایا۔ اور خلعتِ فاخرہ سے
ممتاز کیا۔ غرض کہ یہ قطعۂ زمین جس پر شاہ جہان پور بسا ہے ۱۰۵۵ھ میں فتح ہوا اور
اسی سنہ میں اس کی آبادی شروع ہوگئی اور ۱۰۵۷ھ میں کامل طور آباد ہو گیا۔ اب نواب
بہادر خان بادشاہ سے رخصت ہو کر اپنی جائے تعیناتی صوبہ داری ملتان پر روانہ ہوئے
اور وہاں پہنچ کر کچھ روزوں قیام کیا تھا کہ قندھار کی مہم پر تعیناتی ہوگئی اور وہاں پہنچ کر
ہمیشہ کے لیے دنیا کے جھگڑوں اور قضیوں سے نجات حاصل کی کیفیت اس کی یہ ہے کہ
قندھار کے انتظام کے لیے بادشاہ نے شاہ زادہ دارا شکوہ کو مامور فرمایا تھا اور وہ کئی مہینے
وہاں رہا مگر کچھ انتظام نہ ہوا تب بادشاہ نے نواب بہادر خان کو مع اس کے لشکر کے
قندھار جانے کا حکم دیا۔ نواب بہادر خان ایک ایک دن میں کئی کئی منزلیں طے کر کے
بہت جلد قندھار پہنچا اور شاہ زادہ کی خدمت میں حاضر ہو کر لڑائی کا انتظام کیا مگر اس
اتفاق تقدیری کو ملاحظہ کیجیے کہ جو روز دھاوے کا مقرر کیا گیا تھا اور سرداران لشکر کو جمع
کر کے ضروری ہدایتیں بھی کر دی گئیں اسی رات میں یعنی بہ تاریخ ۱۹/ جمادی الثانی
۱۰۵۹ھ اس دار فانی سے عالم جاودانی کو انتقال فرمایا۔ اسباب مرگ میں اختلاف
ہے۔ اہل تواریخ نے ضیق النفس کی بیماری باعث موت لکھی ہے، لیکن ان کے اہل
خاندان کی یہ روایت ہے کہ شاہ زادہ دارا شکوہ نواب بہادر خان سے اپنے دل میں کچھ
رنج رکھتا تھا مزید بر آں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر بہادر خان نے اس لڑائی میں
کامیابی حاصل کر لی تو میری کمال سبکی ہوگی۔ غرض ان خیالات فاسد کی بنا پر شاہ زادہ

نے ایک قاب حلوائے گرم کی یا بقولے نصف سردا کابلی زہر ملا کر اپنے چوبدار کے
ہاتھ بہ طور اوش نواب بہادر خان کے پاس بھیجا باوجودے کہ چوب دار نے خفیہ نواب
سے کہا بھی کہ یہ مشکوک ہے۔ مگر نواب نے یہ کہہ کر کہ شاہ زادہ کی طرف سے خانہ زاد
موروثی ایسی بدگمانی نہیں کر سکتا اور اگر ایسا ہے تو ہو، یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ شاہ زادہ کا
عطیہ ضایع کروں اور حکم کی تعمیل نہ کروں! اسی وقت عطیہ مسموم نوش جان کر لیا اور
چوب دار کو انعام دے کر رخصت کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد طبیعت بگڑنی شروع ہو گئی اور
آثار روایت ظاہر ہونے لگے، تب نواب نے اپنی زندگی سے مایوس ہو کر اپنے چچا
نیک نام خان کو بلایا اور کہا کہ میں تو اب بچوں گا نہیں مگر دو وصیتیں کرتا ہوں ایک تو یہ کہ
میرے مرنے کی کسی کو خبر نہ ہونے دینا اور علی الصباح لشکر ترتیب دے کر میری لاش
ہودہ دار ہاتھ پر بیٹھا کے خدا کے نام پر دھاوا کر دینا ان شاء اللہ ضرور قلعہ فتح ہوگا۔ اور
دوسری وصیت یہ ہے کہ میری لاش شاہ جہان پور لے جانا اور محلہ بہادر گنج میں دفن
کرنا۔ غرض یہ دو وصیتیں کر کے نواب صاحب السلام علیکم کہہ کر رخصت ہوئے اور پھر
بجز یادِ الٰہی کے مرتے وقت تک اور کچھ بات نہ کی اور آخر شب میں قبل صبح صادق سفرِ
آخرت اختیار کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جب صبح ہوئی تو مطابق وصیت کے نواب
بہادر خان مرحوم کی لاش ہودہ میں بٹھا کر دشمنوں پر حملہ کر دیا۔ اور بعونہ تعالیٰ تھوڑی سی
دیر میں قلعہ فتح ہو گیا۔ غرض کہ جب کامل طور پر تسلط ہو گیا تب نواب صاحب کی وفات
کا اعلان کیا گیا۔ شاہ زادہ والا جاہ بھی نمازِ جنازہ میں شریک ہوئے اور بہ موجب
وصیت نواب صاحب کی لاش شاہ جہان پور کو روانہ کی گئی اور محلہ بہادر گنج میں دفن کی
گئی۔ اور بہت بڑا مقبرہ بنایا گیا۔ کہ جو اب تک ان کی عالی شان اور منزلت رفیع کی یاد
کو تازہ کر رہا ہے۔ نواب بہادر خان کی صرف ۵۲ برس کی عمر تھی جب انتقال ہوا ہے
۱۰۱۷ھ میں پیدا ہوا اور ۱۰۲۸ھ میں ۱۸ برس کی جب عمر ہوئی تو شاہ زادہ خورم کی
مصاحبت میں داخل ہوا اور ۱۰۳۷ھ میں جس وقت ۲۸ برس کی عمر تھی ملازم شاہی ہو کر
بیس برس نوکری کی اور اسی نوکری کی حالت میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ بادشاہ کو جب
وفات کی خبر پہنچی تو نہایت افسوس کیا اور اس کی وفاداری اور جان نثاری کی بے حد

تعریف کی۔

جناب صدر انجمن! شاہ جہان پور کی آبادی کا سبب اور اس کے آباد کرنے والے کے مختصر حالات عرض کرنے کے بعد اس قدر عرض کرنے کی اور اجازت چاہتا ہوں کہ اب دریا خان اور نواب بہادر خان کے حالات میں اجمالی نظر سے یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ وہ کون سے اسباب تھے جنھوں نے ان کو اس عروج پر پہنچایا؟ اور پھر جس طور پر کہ ان کا انجام ہوا اس کے وجوہ کیا واقع ہوئے؟ پہلے دریا خان کے واقعات پر میں نظر کروں گا۔

جناب من! یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ دریا خان اگر چہ سردار اپنی قوم کا تھا، لیکن ثروت کے اعتبار سے وہ ایک معمولی کاشت کار یا گھوڑوں کا ایک سوداگر تھا۔ مگر چوں کہ زمانے کی ضرورتوں سے واقف اور مصلحت وقت کے سمجھنے کی پوری قابلیت رکھتا تھا۔ مزید برآں خدا کے فضل سے اولوالعزمی اور استقلال کا مادّہ بھی طبیعت میں موجود تھا اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ خان جہان خان جب شکار کھیلتا ہوا اس کے گاؤں میں گزرا ہے تو اس نے محض اس خیال سے کہ یہ شخص رکن اعظم سلطنت ہندوستان کا ہے، اس کے ساتھ اس خوبی سے پیش آیا کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں اس کا والا وشیدا ہو گیا اور ہندوستان اپنے ساتھ لا کر بادشاہ سے اس کو منصب دلوایا۔ اور اسی قابلیت اور مزاج دانی کا اثر تھا کہ صرف دو دن کی ملاقات میں شیخ رکن الدین اور حسن خان سے مردم شناس اور تجربہ کار زمانہ اس بات کے آرزو مند ہوئے کہ ان کی دختر دریا خان کی زوجیت کا شرف حاصل کرے، مگر افسوس ہے کہ ہمارے وقت میں نہ تو زمانہ کی ضرورتوں پر نگاہ ہے، نہ اپنی ترقی کے اسباب مہیا کرنے کی طرف توجہ!

دوسری صفت دریا خان میں پابندی وضع اور مستقل مزاجی کی تھی۔ خان جہان نے جو اس کے ساتھ سلوک کیا تھا وہ اس کو تا دم مرگ نہ بھولا۔ اور صرف اسی کی وجہ سے آپ دیکھیں کہ کس قدر تکلیفیں اٹھائیں۔ برسوں جنگلوں اور پہاڑوں میں پریشان اور سرگردان پھرا کیا۔ نہ دن چین تھا، نہ رات۔ مگر جب تک کہ جسم میں روح اور قالب میں جان باقی رہی پائے ثبات کو لغزش نہیں ہوئی۔ اور باوجود اس کے پھر آپ ملاحظہ

فرمائیں کہ مصلحت وقت اور مآل اندیشی کو نہ چھوڑا۔ اور یہ سوچ کر کہ میرا کام تو بگڑ ہی گیا، بیٹے کے پاؤں میں کیوں کلہاڑی ماروں۔ اور اپنے ساتھ میں اپنے خاندان کو کیوں تباہ کروں۔ بہادر خان کو بادشاہ ہی کی خدمت میں رہنے دیا۔ اور مرتے وقت بھی ایسی حالت میں کہ سراسر زخموں سے چور زمین پر پڑا تھا بیٹے کو یہ صلاح دے کر کہ اپنی مہر اس کے منہ میں ڈال دے، اپنی بے نظیر اور لاثانی خدمات کا بادشاہ کے دل پر ایسا گہرا نقشہ جما گیا کہ جس کو کوئی مٹا ہی نہیں سکتا تھا۔ اسی دور اندیشی کی آج ضرورت ہے کہ اپنی ترقی کرنے اور زمانہ موجودہ کے لحاظ سے تعلیم خود حاصل کرنے کا تو اب وقت نہیں رہا لیکن اپنی اولاد کے حق میں کیوں کانٹے بوتے ہیں، ان کو آج کل کے زمانے کے مطابق کیوں لائق بنانے کی کوشش نہیں کرتے؟

اب رہے حالات نواب بہادر خان کے اس شخص کو خدا نے عجیب دماغ کا آدمی بنایا تھا۔ باپ دریا خان تھا تو بیٹا سمندر خان، شجاعت، سخاوت، ہمت، اولوالعزمی، اطاعت، فرماں برداری، جاں نثاری، یہ تمام صفتیں جو انسان کو اعلا درجے کا انسان ہونے کے لیے ضروری ہیں، وہ سب اس میں بہ درجۂ کامل موجود تھیں۔ یہ سرزمین جہاں آج کانفرنس کا اجلاس کس شان وشکوہ سے ہو رہا ہے، آپ سن چکے کہ رہ زنوں اور ڈاکوؤں کا مامن تھا یا خار دار جھاڑیوں کا جنگل تھا اور درختوں کا ایک بن! نواب بہادر خان کا ہی طفیل ہے کہ اس نے صرف رہ زنوں اور ڈاکوؤں ہی کو مار کر زیر نہیں کیا بلکہ ایک مضبوط اور بہادر قوم کا شہر آباد کر کے تمام قرب و جوار کے مقامات کو ایک مطمئن حالت میں کر دیا اور وہ مقام جو کبھی کسی بادشاہ کی تحتِ حکومت نہیں ہوا تھا اپنے قبضے میں کر کے اپنے آقاے ولی نعمت کی سلطنت پر وہ بھاری احسان کیا کہ جتنی اس کی قدر اور عزت کی جاتی بجا تھی۔ اس کی شجاعت کے حالات علاوہ ان کے جو اوپر بیان ہو چکے ہیں، میں سب یک جا جمع کر کے آخر میں کہوں گا۔ اسی طرح آپ اس کے تمام اوصاف کا اندازہ میرے اوپر کے بیان سے کر سکتے ہیں۔ بالخصوص گورنمنٹ کی سچی اطاعت اور فرمان برداری کہ یہی ایک ایسی اولین اعلا درجے کی صفت تھی کہ جس نے اس کو اس اعلا درجے پر پہنچایا۔ اب میں آخر میں صرف اس کی عظمت اور قابلیت کے

اندازے کی غرض سے نواب بہادر خان کی تصنیف کی ہوئی ایک غزل آپ کو سنا کر اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

غزل

ترک سرکردن بہ میداں شیوهٔ رندان بود
مشکل است این کار لیکن پیش مرد آسان بود
برنگر دانم ز دشمن روے در میدانِ جنگ
میکنم جنگ و جدل گر رستم دستان بود
روے او از قبلہ برگردد بوقتِ ہر نماز
ہر کہ از کفار روزِ جنگ روگردان بود
قوت بازو شود اندر مصاف از زخمِ تیر
پر برآمد برتنم صد تیر گر پران بود
اے برادر! در جہاں ہر باغ دارد میوئے
میوه در باغِ بہادر خنجر و پیکان بود

ضمیمہ-۱

تواریخ شاہ جہان پور❶

تفصیل مہمات مع مختصر حالات جن میں نواب بہادر خان شریک تھا:

اول: ۱۰۳۸ھ میں بہ مقابلہ جھار ولد بدسنگھ بندیلہ کے جس نے بغاوت اختیار کی تھی بہادر خان کو حکم ہوا کہ بہ ہمراہی عبداللہ خان فیروز جنگ کے روانہ ہو کر اس کا استیصال کرو جس میں بہادر خان نے کمال شجاعت اور جواں مردی فتح نمایاں حاصل کی اور اس کے حملہ میں نقارۂ نقرہ نواب بہادر خان کو عنایت ہوا اور لقب بہادر خان کے ساتھ لفظ بہادر اور زیادہ کیا گیا یعنی نواب بہادر خان بہادر قرار دیا گیا۔

دوسری: لڑائی خان جہان کے مقابلے میں بہادر خان لڑا جس کا مفصل بیان اوپر ہو چکا ہے۔

تیسری: بعد قتل ہونے خان جہان خان کے ۱۰۳۹ھ میں نواب بہادر خان واسطے نتیجہ اور تادیب نظام الملک کے بھیجا گیا اور تین سردار نامی شہباز خان اور رشید خان انصاری اور یوسف خان تاشقندی نواب موصوف کے ساتھ کیے گئے۔ ایک قلعہ کے قریب جو پہاڑوں میں واقع تھا، لشکر نظام الملک سے مقابلہ ہو گیا اس قلعے میں نظام الملک کی فوج کثیر جمع تھی اور لشکر شاہی جو نواب بہادر خان کے ساتھ تھا، بوجہ خرابی راستہ اور دشوار گذار گھاٹیوں کے بہت قلیل تھا۔ نظام الملک کی فوج نے خبر قلتِ فوجِ شاہی معلوم کر کے لشکر شاہی کو گھیر کے دھاوا کر دیا نواب بہادر خان باوجود قلت فوج کے خوب دل کھول کر لڑا، یہاں تک کہ نواب بہادر خان اور یوسف خان زخموں سے چور ہو کر بے ہوش زمین پر گرے۔ سرداران مخالف اسی حالتِ بے ہوشی میں نواب بہادر خان اور یوسف خان کو اپنے لشکر میں اٹھا کر لے گئے جس وقت بادشاہ کو یہ خبر پہنچی فوراً یمین الدولہ کو لشکر جرار ساتھ کر کے روانہ کیا، جنھوں نے بہت جلد وہاں پہنچ

---

❶ جو شب ۲۹ ردسمبر ۱۸۹۵ء کو پڑھا گیا۔

کر قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ سرداران نظام الملک نے تنگ آ کر مصالحت چاہی اور بالآخر اس شرط سے کہ ہمیشہ مطیع بادشاہ کے رہیں گے اور پیش کش اور نذر معقول حاضر کریں گے اور نواب بہادر خان اور یوسف خان رہا کردیے جائیں گے صلح ہوگئی۔ چناں چہ نواب بہادر خان اور یوسف خان باعزاز تمام رخصت ہوئے اور چالیس لاکھ روپیہ نقد داخل خزانہ عامرہ کیا گیا۔ جس وقت نواب بہادر خان وہاں سے چھوٹ کر بادشاہ کے حضور میں پہنچا بادشاہ عالم پناہ کمال بندہ نوازی نواب بہادر خان سے بغل گیر ہوا اور شمشیر و سپر، مع خلعت خاصہ، معہ کمر بند مرصع اور نقارۂ نقرئی اور فیل با عماری اور اسپ بازین طلائی اور پچیس ہزار روپیہ نقد بہادر خان کو اور اسی طرح یوسف خان کو مع بیس ہزار روپیہ نقد کے مرحمت کر کے سرفراز فرمایا۔ اور نواب بہادر خان کو جاگیر پر جانے کی رخصت دی نواب بہادر خان حضور بادشاہ سے رخصت ہوا اور اسی وقت یہ شعر تصنیف کر کے اپنی مہر پر کندہ کرایا:

چوشد بجنگِ دکن جانفشاں بہادر خان
حیات یافت دوبارہ زلطف شاہِ جہان

چوتھی: ۱۰۴۰ھ میں بادشاہ کو معلوم ہوا کہ ملک ملکوسہ کے سرکشوں نے جو ہمیشہ سے باغی تھے رعایا گردونواح کو عاجز کر رکھا ہے اور قریب تیس ہزار آدمی کے مسلح جمع ہیں جسب الحکم بادشاہ معدلت دست گاہ نواب بہادر خان ان کے انتظام کے واسطے روانہ ہوا اور بعد سخت مقاتلہ اور محاربہ کے ان کو زیر کیا اور اس ملک کا انتظام کر کے حضور شاہی میں حاضر ہو کر حضور بادشاہ میں حاضر ہوا۔ اس ملک پر اس سے پہلے کسی بادشاہ کو تسلط نصیب نہیں ہوا تھا۔

پانچویں: ۱۰۴۴ھ میں بادشاہ کو معلوم ہوا کہ ساہو نے کچھ ملک نظام الملک سے حاصل کر کے اور بعض حصہ جات پر خود متصرف ہو کر بغاوت اور سرکشی اختیار کر لی ہے اس پر فوج کشی کا حکم ہوا اور تین دستے فوج کے مرتب ہو کر روانہ ہوئے ایک دستے کا سردار خان دوران بہادر مقرر کیا جس کے ہمراہ راجہ جے سنگھ کیا گیا اور دوسرے گروہ کا سردار خان زمان خان کو کیا جس کے ہمراہ نواب بہادر خان اور سید شجاعت خان اور

راجہ بہار سنگھ کیے گئے اور تیسرے لشکر کا سردار شایستہ خان کو مقرر فرمایا اور الہ وردی خان اور شیخ فرید اور راجہ سکرم ان کے ہمراہ کیے گئے۔ غرض اسی طرح پر تیس ہزار فوج نے ساہو پر چڑھائی کر کے اس کو شکست دی قلعہ چتر نواب بہادر خان نے فتح کیا۔ آخر ساہو نے عاجز آ کر اطاعت قبول کی اور محصول مقررہ سالانہ ادا کرنے کا اقرار کیا۔

چھٹی: ۱۰۴۸ھ میں بادشاہ نے ملک قندھار کی تسخیر کا ارادہ کیا۔ اس وقت میں علی مردان خان بادشاہ ایران کی طرف سے ناظم قندھار تھا اس نے شاہ ایران کو شاہ جہان کے ارادے سے اطلاع دی مگر بادشاہ ایران نے اس خبر کو غیر واقعی تصور فرما کر علی مردان خان کی بغاوت پر محمول کیا۔ جب علی مردان خان کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے گھبرا کر شاہ جہان کو لکھا کہ آپ کوئی افسر اپنا مع فوج کے روانہ کر دیں تو میں قلعۂ قندھار اس کو خالی کر دوں چناں چہ شاہ جہان نے فوج کثیر قندھار کو روانہ کی۔ نواب بہادر خان کو بھی حکم پہنچا کہ وہ بھی شاہ زادہ شجاع کی معیت میں قندھار کو روانہ ہوں۔ شاہ ایران کی طرف سے سیاوش واسطے حفاظت قندھار کے مع لشکر جرار بھیجا گیا۔ علی مردان خان نے قلعہ لشکر شاہ جہانی کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد فوج شاہ جہانی اور سیاوش سے جنگ و پیکار ہوئی سیاوش پریشان بہ حال تباہ ایران کو بھاگ گیا۔ اس مہم میں بھی نواب بہادر خان سے کارہائے نمایاں ظہور میں آئے کہ جس کے صلے میں حضور شہنشاہ سے خلعت و انعام حاصل کیا۔

ساتویں: ۱۰۴۹ھ میں پرتھی راج جو یار سنگھ بندیلہ کا بیٹا پھر باغی ہو گیا۔ عبداللہ خان فیروز جنگ تعینات ہوئے لیکن ان سے ٹھیک انتظام نہ ہو سکا۔ تب نواب بہادر خان خود درخواست کر کے اس ملک کے انتظام کے لیے مقرر ہوا اور صوبہ داری اسلام آباد کی جو نواب بہادر خان کو دی گئی۔ نواب بہادر خان نے بندیل کھنڈ پہنچ کر اس ملک کا جنگل جس سے تمام راستے دشوار گزار تھے کٹوا کر بالکل صاف کر دیا۔ اور باغیوں کو قتل و قید کر کے اس ملک پر پورا تسلط کر لیا۔ جس کے صلے میں نواب بہادر خان کے نام فرمان خوش نودی مزاج مع دیگر انعامات کے حضور بادشاہ سے بھیجا گیا اور نواب موصوف بہ دستور اس ملک کا منتظم رہا۔

آٹھویں: ۱۰۵۱ھ میں راجہ جگت سنگھ باغی ہو گیا اور اس نے قلعہ تاراگڑھ وغیرہ اپنے قبضے میں کرلیا۔ اس کی سرکوبی کو تین لشکر جس میں ساٹھ ہزار فوج تھی روانہ کیے گئے اور اس کا اہتمام شاہ زادہ مراد بخش کے سپرد تھا۔ چوں کہ وہ ملک بالکل پہاڑ اور جنگل تھا اور راجہ کے قبضے میں نہایت مضبوط چند قلعے ایسے تھے کہ جن پر غالب ہونا نہایت مشکل تھا۔ سخت جنگ پیش آئی اور بہت سی فوج اُس لڑائی میں کام آئی۔ تب آخر کو نواب بہادر خان کو حکم ہوا کہ شاہ زادہ مراد بخش کی خدمت میں مع لشکر جرار روانہ ہو۔ چناں چہ نواب بہادر خان تین ہزار سوار اور تین ہزار پیادہ لے کر بہ سرعت تمام پہنچا۔ اول قلعہ مئو پر کئی روز سخت آتش پیکار گرم رہی۔ ہزاروں آدمی مارے گئے۔ نواب بہادر خان نے اس لڑائی میں بھی بڑی بہادری سے قلعہ فتح کیا کہ جس کے صلے میں منصب چار ہزاری ذات سے اضافہ ہو کر پنج ہزاری ذات اور چار ہزار سوار دو اسپہ و سہ اسپہ نواب بہادر خان کا کیا گیا۔ اور اسی طرح دیگر قلعہ جات بھی نواب موصوف کی کوشش سے فتح ہوئے۔ بالآخر درخواست معافی قصور راجہ مذکور بوساطت شاہ زادہ مراد بخش منظور ہو کر حضور بادشاہ میں حاضر ہوا۔ اور اس فتح کے صلے میں نواب بہادر خان کو دس ہزار روپیہ نقد عطا فرمایا۔ علاوہ اس کے نواب بہادر خان نے درخواست کی کہ من جملہ مال غنیمت تاراگڑھ کے گھڑیال جو دروازۂ تاراگڑھ کے اوپر سے اتارا گیا ہے، وہ بھی مجھ کو عنایت ہو! چناں چہ بادشاہ نے نہایت مسرت کے ساتھ وہ گھڑیال اور نقارہ نقرئی نواب بہادر خان کو مرحمت فرمایا۔

نویں: نذر محمد خان والی بلخ و بدخشان نے کابل پر چڑھائی کی تھی اس سے مزاج بادشاہ کا برافروختہ ہو گیا تھا۔ سوائے اس کے اُس کے ملک میں بھی کمال بدنظمی اور بے امنی ہو رہی تھی۔ رعایا از حد تباہ اور خستہ حال تھی۔ اس پر بادشاہ نے فوج کشی کی اور آخر سال ۱۰۵۵ھ میں شاہ زادہ مراد بخش کو معہ پچاس ہزار سوار اور دس ہزار پیادہ کے بلخ کو روانہ فرمایا اور تمام فوج کی ہراولی نواب بہادر خان کے نام پر مقرر ہوئی۔ ۲۱ر جمادی الاول ۱۰۵۶ھ کو شاہ زادہ مراد بخش بہ کمال شان و شکوہ بلخ میں پہنچے۔ باوجودے کہ بادشاہ کی طرف سے نذر محمد خان کو ہر طرح کا اطمینان دلایا گیا لیکن وہ ایسا متوحش

ہوا کہ واسطے تہیہ سامان ضیافت شاہ زادہ شہرت دے کر اپنے بال بچوں کو شہر میں چھوڑا
اور جو کچھ نقد و جواہر لے سکا اپنے ساتھ لے کر شہر سے نکل بھاگا جب شاہ زادہ کو معلوم
ہوا کہ وہ بہ نیت فاسد فرار ہوا ہے تو شاہ زادہ نے نواب بہادر خان اور اصالت خان کو
اس کے پیچھے روانہ کیا اور شہر بلخ میں داخل ہو کر تمام خزانہ و مال و دولت پر قبضہ کر لیا
نواب بہادر خان اور اصالت خان نذر محمد خان کے پیچھے چلے جاتے تھے کہ آگے چل کر
خان مذکور کے ساتھ چار ہزار آدمی ہو گئے اور انھوں نے خان کے ساتھ ہو کر شاہی فوج
سے مقابلہ کیا مگر تھوڑی ہی لڑائی میں وہ تاب مقابلہ نہ لاکر بھاگ نکلے و نذر محمد خان بھی
فرار ہو گیا اس اثنا میں شاہ زادہ مراد بخش نے اس مضمون کی عرض داشت بادشاہ کے
حضور میں بھیجی کہ معتمدان حضور والا سے کوئی شخص مامور فرمایا جائے تا کہ یہ ملک سپرد
کر کے شرف آستانہ بوسی حاصل کروں بادشاہ نے یہ بے وقت درخواست شاہ زادے
کی ایسی حالت میں کہ نہ ملک کا انتظام ہوا ہے نہ ابھی نذر محمد خان سے یک سوئی ہوئی
ناپسند فرمائی اور فرمان متضمن ناخوشی مزاج اقدس صادر ہوا جس میں آیندہ ایسی
درخواست کرنے سے متنبہ کیا گیا، لیکن شاہ زادے نے پھر باصرار تمام قصد ہندوستان
آنے کا کیا اور دوسری عرض داشت روانہ کی جس پر بادشاہ نے برہم ہو کر شاہ زادہ کا
منصب اور جاگیر توڑ کر واسطے قیام ملتان کے حکم صادر فرمایا۔ اور سعد اللہ خان کو مدار
المہام مقرر کر کے روانہ فرمایا اور ہدایت کی کہ شاہ زادے کو جا کر سمجھاؤ کہ وہ اب بھی
مان جائے تو بہتر ہے، ورنہ اس طرح پر انتظام کیا جائے کہ استیصال اہل تمرد اور تمامی
نظم و نسق ولایت مفتوحہ بہادر خان کے سپرد کرو اور خزانہ اور سپاہ اور حراست اور
داد و ستد رعایا کی خدمت اصالت خان کے سپرد کرو، گویا کہ منصب دیوانی اصالت
خان کے سپرد ہوا اور فوجی انتظام نواب بہادر خان کے متعلق کیا گیا اور دیگر ہدایات
ضروری سعد اللہ خان کو کر کے روانہ فرمایا۔ چناں چہ ۸ر رجب ۱۰۵۶ھ کو سعد اللہ خان
نے بلخ پہنچ کر واسطے فسخ عزیمت کے بہت کچھ عرض کیا مگر شاہ زادے کے دل میں کچھ
اثر نہ ہوا۔ تب مطابق ارشاد بادشاہ صوبہ داری بلخ کی نواب بہادر خان اور اصالت
خان کے سپرد کی۔ اور ان کے مشورہ سے انتظام ملک کا شروع کیا۔ جہاں معلوم ہوا کہ

فلاں جگہ باغیوں اور متمردوں نے فساد برپا کیا تو نواب بہادر خان نے وہاں پہنچ کر باغیوں کو بھگا دیا اور ملک کا پورا پورا انتظام کر دیا جب نواب بہادر خان کو یہ معلوم ہوا کہ عبدالعزیز خان والی خراسان کا ارادہ بلخ پر چڑھائی کرنے کا ہے تو انھوں نے بہ ذریعہ عرض داشت کے اس کی اطلاع کی اور اس پر حضور شہنشاہ سے شاہ زادہ اورنگ زیب بہ تاریخ ۱۵ر محرم الحرام ۱۰۵۷ھ کو روانہ کیے گئے اس عرصے میں نذر محمد خان خستہ و پریشان پھرتا پھراتا بادشاہ ایران کی خدمت میں بہ امید کمک پہنچا وہاں خان کی خاطر و مدارت تو بہت ہوئی مگر جس امید پر گیا تھا وہ پوری نہ ہوئی۔ پندرہ روز رہ کر بے نیل مرام وہاں سے بھی چل دیا اور ادھر شاہ زادہ اورنگ زیب ۱۵ر محرم کو لاہور سے روانہ ہو کر غرۂ جمادی الاول کو بلخ پہنچا مگر دس روز شہر بلخ کے اندر نہ گیا فرودگاہ نواب بہادر خان پر قیام فرما کر آج کے روز اندر اور باہر کے قلعہ کو ملاحظہ فرمایا۔ اور لشکر کو ترتیب دے کر ہراول تمام فوج کا نواب بہادر خان کو مقرر فرمایا تیمور آباد پر لشکر اوزبکیہ سے مقابلہ ہوا اور طرفین میں جنگ عظیم شروع ہوئی نواب بہادر خان خدا کا نام لے کر مخالفین پر حملہ آور ہوا اور اُدھر سے بھی تلوار کی لڑائی شروع ہوئی اور ایک دم میں صفیں کی صفیں الٹ گئیں۔ نواب بہادر خان کا یہ حال تھا کہ کسی کو تلوار سے مارا کسی کو گھوڑے سے اٹھا کر زمین پر دے پٹکا اور یہی حال ان کے ساتھیوں کا تھا یہاں تک کہ نواب بہادر خان کی زرہ پر اس روز خون کے لوتھڑے جم گئے تھے اور باوجودے کہ خود بھی سخت مجروح ہو گیا تھا مگر برابر لڑ رہا تھا اور آگے کو بڑھتا چلا جاتا تھا آخر کار گروہ لشکر اوزبکیہ مجبور ہو کر تاب مقاومت نہ لا سکا اور راہ فرار اختیار کی۔ اس لڑائی میں نواب بہادر خان سے وہ شجاعت اور جواں مردی ظہور میں آئی کہ امرائے ایران اور سادات بارہہ اور راجگان راجپوت جو اس لڑائی میں شریک تھے اور اپنے مقابل کسی کو نہیں سمجھتے تھے، انھوں نے بھی بعد معاودت اپنی اپنی کمروں سے تلواریں کھول کر بہادر خان کے آگے رکھ دیں اور کہا کہ در حقیقت تلوار آپ کا حصہ ہے اور آپ کے سامنے تلوار باندھنا مقام شرم ہے! بہادر خان نے سرداران موصوف کو لپٹا لیا اور کہا کہ میں تنہا کیا کر سکتا تھا در حقیقت تمھاری ہی سعی اور کوشش کا اثر ہے کہ اس میں شاہ زادہ اورنگ زیب بھی

تشریف لائے اور نواب بہادر خان کے حق میں کلماتِ تحسین و آفرین ارشاد فرمائے لیکن نواب بہادر خان جو اس وقت لڑائی کے جوش میں بھرا تھا اس کی زبان سے کچھ کلمات گستاخی شاہ زادہ کی شان میں نکل گئے اور اسی کے جوش میں نواب بہادر خان حضور بادشاہ سے معتوب ہوا کہ جس کا حال اوپر بیان ہو چکا ہے۔ غرضے کہ اس کے بعد چند روز اور اس ملک میں قیام کیا بعدہٗ ۴ر شعبان ۱۰۵۷ھ کو شاہ زادہ اورنگ زیب نے مع تمام سرداران اور لشکر شاہی کے بلخ سے کوچ فرمایا اور وہاں سے لڑتے لڑتے کابل پہنچا۔ کابل آکر نواب بہادر خان سے شاہ زادہ نے اجازت لے کر ایک مہینہ قیام فرمایا اور وہاں کے پٹھانوں کو واسطے آبادی شاہ جہان پور کے آمادہ کیا جس کا حال آپ اوپر سن چکے ہیں۔ شاہ زادہ نے ہندوستان کو فوراً مراجعت فرمائی۔

دسویں: مہم وہ آخری مہم ہے جس میں واسطے انتظام قندھار کے نواب بہادر خان تعینات ہوئے تھے اور وہیں انھوں نے انتقال کیا اور اس کا مفصل حال بھی آپ کو اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ جس کا اعادہ فضول ہے۔

ضمیمہ-۲

مرتبہ: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

نواب دلیر خان کا کھیڑا نونہر ولوہی کھیڑا کو فتح کر کے اپنے بھائی نواب بہادر خان کی طرف سے شاہ جہان پور آباد کرنا:

یہ تو مجمل طور پر پیشتر بیان ہو چکا ہے کہ شاہ جہان بادشاہ کے عہد میں قنوج و کالپی کی جاگیران دونوں بھائیوں کو دی گئی تھی اور یہ ہر دو برادر وہاں قیام رکھتے تھے اور وہاں انھوں نے عالی شان عمارتیں بنوائی تھیں۔ چناں چہ قنوج میں درگاہ شیخ کبیر بالا پیر صاحب پر یہ عبارت کندہ ہے:

"کتبہ (درخانہ اول)

ایں گنبد عالی در زمان دولت نواب معلی القاب بہادر خان ابن دریا خان
افغان غوریہ خیل داؤدزئی عمارت پذیرفت۔

(درخانہ دوم)

ایں گنبد عالی در سنہ ہزار و پنجاہ و ہفت ہجری در عہد سلطنت ابو المظفر
شہاب الدین محمد صاحب قِران ثانی شاہ جہان بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و
سلطنتہ تعمیر پذیر شدہ۔"

سرکار قنوج پر ان کا تصرف تو ان جلی حرفوں سے ثابت ہو گیا غرضے کہ ان کی آمد و رفت دہلی و قنوج سے اکثر رہا کرتی تھی ایک بار پانچ لاکھ رُپے اور بہت سا اسباب نواب بہادر خان نے دہلی سے قنوج کو بھیجا تھا اتفاق سے جن لوگوں کے ہمراہ وہ زرِ نقد و سامان بھیجا تھا وہ کانٹ ہو کر نکلے جس مقام پر کہ اب شاہ جہان پور آباد ہے وہاں کثرت سے جنگل خاردار تھا اور تین خودسر لوٹیرے راجہ آباد تھے، انھوں نے اپنے راجپوت وغیرہ غارت گری کو بھیجے، چناں چہ ان آدمیوں نے آکر وہ سب سامان و رُپیہ لوٹ لیا۔ اس مقابلے اور مقاتلے میں اکثر سپاہی و جمعدار نواب بہادر خان کے

جان سے مارے گئے۔ چند آدمی جو جان بچا کر بھاگ گئے تھے، انھوں نے جا کر نواب بہادر خان سے سب حال عرض کیا نواب بہادر خان یہ حال سن کر نہایت غصے میں آئے اور شاہ جہان بادشاہ سے حقیقت بیان کی اور کہا کہ بجائے ان مفسدوں کے خود اپنا وطن آباد کر کے اس سرزمین کو آباد کروں۔ بادشاہ نے ان کی درخواست کو منظور فرما کر چودہ موضع کہ ہر ایک موضع ایک محال کے برابر تھا ان کے نام معاف فرمائے تب نواب بہادر خان نے اپنے بھائی نواب دلیر خان کو اپنا نایب مقرر کر کے ان مفسدوں کے استیصال کے لیے رخصت کیا۔ دلیر خان اس جگہ آئے اور قریب کھیڑا نونہر کے تین راجہ جو یہاں بستے تھے وہ اپنی جماعت کثیر مقابلے کو لائے۔ فریقین میں نہایت سخت لڑائی ہوئی بعد ایک بڑے معرکے کے دلیر خان کو فتح حاصل ہوئی، یہ تینوں راجہ ہاتھی نشین تھے اور ان کے ماتحت وتابع باون زمین دار جو چھوٹے چھوٹے تھے، تعلقہ داروں کی حیثیت رکھتے تھے وہ معہ گیارہ ہزار تین سو مرد وعورت کے قتل ہوئے اور ایک ہزار ایک سو پٹھان جو نہایت جری تھے، وہ سب شہید ہوے دو زخم ایک گولی اور دوسرے تیر کا شہباز خان کے بازو پر لگا، مگر زخم کارگر نہ ہوا چھبے سنگھ راجہ بھاگ گیا دلیر خان فتح مند ہو کر خیمہ میں داخل ہوئے اور جنگل کاٹنے کا حکم دیا اور راجپوت و باچھل وغیرہ جو گرفتار ہوئے تھے وہ قید کیے گئے اور جو پٹھان کام آئے تھے وہ سب موضع چنور میں دفن کیے گئے چناں چہ بعد عید کے ان کی فاتحہ خوانی کی غرض سے ہر سال جانے کا دستور تھا جو رفتہ رفتہ چنور کے میلہ سے موسوم ہو گیا اس فتح کے بعد مفصل حالات کا ایک عریضہ دلیر خان نے اپنے بڑے بھائی بہادر خان کو بھیجا۔ بہادر خان اس فتح عظیم کو سن کر نہایت خوش ہوئے اور شاہ جہان بادشاہ کے حضور میں جا کر اس فتح کی مبارک بادی میں نذر دی۔ شاہ جہان بادشاہ نے خلعت بہادر خان، دلیر خان، شہباز خان کے لیے مرحمت فرمائے۔ بہادر خان نے وہ خلعت اور ایک نوشتہ خواجہ بلند کے ہاتھ دلیر خان کو بھیجا۔ بہادر خان نے دلیر خان کو جو مکتوب بھیجا تھا اس میں یہ مرقوم تھا کہ مسمی بلند خواجہ سرا اور انور معمار اس برادر کے پاس پہنچتے ہیں۔ لازم ہے کہ قلعے کی بنا ڈال کر اس میں مکانات اور محل سرا ہمارے اور اپنے لیے مناسب جگہ پر تجویز کر کے

بنواؤاور کل امورات شاہ جہان پور کی آبادی کے متعلق خواجہ سرا اور معمار مذکور کو سمجھا دو اور پسران راجپوت کو دین اسلام سے مشرف کر کے ان کو بھی وہیں آباد کر و اس کے بعد تم چلے آؤ۔ دلیر خان نے اپنے بھائی کے ارشاد کے بہ موجب قلعے کی تعمیر کھیڑا نونہر پر تجویز کی، کیوں کہ وہ مقام بلندی پر تھا اور اس کے ارد گرد دو دریا گرّا اور کھنّوت جاری تھے شاہ جہان پور کی آبادی قلعہ کے اوتر [شمالی] دروازے کی طرف قرار دی اور جس جگہ پر [جلال خان عرف] دلیر خان کو فتح حاصل ہوئی تھی وہاں پر لکھ پیڑا باغ لگانے کا حکم دیا اور دوسرا باغ جس کا نام بعد کو دلیر باغ رکھا گیا تھا نصب کرایا اور ایک بہت بڑا محلہ جس کو قصبہ سمجھنا چاہیے اپنے نام کا جلال نگر آباد کرایا اور جس جگہ پر شہباز خان نے بعد فتح کے اپنا خیمہ نصب کیا تھا وہاں پر شہباز نگر بسانا تجویز کیا ان سب تجویزوں کے بعد دلیر خان نے خواجہ بلند کو میر اہتمام مقرر کیا اور کل عمارتوں کے قرینے انور معمار کو سمجھا دیے کہ کوئی شخص ان کے حکم کے خلاف ایک شمہ بھی اپنے رائے سے عمل نہ کرے اور پسران راجپوت اور دیگر قوم جو...... مقید تھے ان کو دین اسلام سے مشرف کر کے خاص خیلوں کا خطاب عنایت کیا، ان سب انتظامات کے بعد دلیر خان درگاہ سلطانی کی طرف متوجہ ہوئے۔ جب دلیر خان شاہ جہان بادشاہ کے حضور میں پہنچے، مورد عنایت شاہی ہوئے اور رخصت کیے گئے چوں کہ اس زمانے میں نواب بہادر خان بدخشان کی مہم پر متعین ہوئے تھے، دلیر خان اپنے بڑے بھائی سے ملنے گئے جب بہادر خان نے دلیر خان کو دیکھا ان کے سر اور آنکھوں کو بوسہ دے کر فرطِ محبت سے لپٹ گئے اور بہت مربیانہ عنایتیں فرمائیں۔ چوں کہ ولایت پشاور اور اطراف قندھار دروہ و بدخشان بلخ و ملتان وغیرہ میں لاکھوں افغان ان کے ہم قوم اور برادر آباد تھے جب جنگ بدخشان سے فرصت کر چکے تو ان دونوں بھائیوں نے وہاں کے افغانی سرداروں کو جو بہ لقب خان اور ملک کے مشہور تھے جمع کیا اور اپنے شہر نو آباد شاہ جہان پور میں چل کر آباد ہونے کی درخواست کی چناں چہ نو ہزار افغان سٹر بن وغیرہ ہر ایک خیل کے شاہ جہان پور آنے کے لیے تیار ہوئے۔ چناں چہ وہ جماعت ان کے ہمراہ آئی۔ بہادر خان نے ہر ایک قبیلہ کو علاحدہ علاحدہ کیا اور ہر خیل میں جو لائق و مدبر تھا

اس کو افسر کر کے ملک کے خطاب سے ممتاز کیا۔ کل خیل باون شمار میں آئے اور ان گروہوں کے ہر ایک سرگروہ اور ملک محلے سے کہا کہ علاحدہ علاحدہ اپنا خیل شاہ جہان پور میں آباد کریں اور جس خیل کا محلّہ جس جگہ آباد ہو اس محلے کو اس خیل کے نام سے نام زد کریں اور ایک خیل دوسرے خیل میں نہ آباد ہو اور شہر کے اردگرد افغانوں کی آبادی اور درمیان میں دیگر دکان دار اور رعایا اور قلعے کے قریب خاص خیل نو مسلم بسائے جائیں اور اسی طرح ہر بات پٹھانوں کو سمجھا دی اور اس جماعت کو اپنے چچا نیک نام خان اور برادر یوسف خان کے ہمراہ شاہ جہان پور آباد کرنے کی غرض سے روانہ کیا۔ جب ہر دو یہ خان موصوف وہ جماعت لے کر شاہ جہان پور آئے تو حسب قرار داد منشا شہر آباد کیا نیک نام خان نے اپنے نام کا ایک محلّہ اوتر [شمال] کی طرف نیک نام پورہ آباد کیا۔ روایت ہے کہ بعد آبادی شاہ جہان پور اور تعمیر قلعہ کے نواب بہادر خان اور نواب دلیر خان دونوں صاحب تشریف لائے۔ شہر اور قلعہ کو بہ نظر غور دیکھا اور حکم فرمایا کہ بہادر گنج اور دلیر گنج ہمارے نام کے آباد کیے جائیں۔ بعض روایت کرتے ہیں۔ بارہ روز نواب بہادر خان نے شاہ جہان پور میں قیام کیا اس کے بعد دوسری بار زندگی میں شاہ جہان پور میں تشریف لانے کا اتفاق نہ ہوا۔

یہ کل مضمون تاریخ ''اخبار محبت'' کا ہے جو ایک پرانی مستند کتاب اسی خاندان کے نواب محبت خان نے لکھی ہے۔ ہم بہ مقابلہ اس کے کسی زبانی روایت یا کسی اور رسالہ کو تسلیم نہیں کرتے۔

حافظ اسماعیل صاحب مراد آبادی وکیل شاہ جہان پور نے جو لیکچر بہ تقریب کانفرنس محمڈن کالج علی گڑھ جب سر سید احمد خان ۱۸۹۵ء میں شاہ جہان پور تشریف لائے ہیں۔ شاہ جہان پور کی تاریخ پر لکھا تھا اس میں تحریر کیا ہے کہ نواب بہادر خان نے خود آ کر باغی راجاؤں کو قتل و اسیر کیا ہے اور پھر اپنی جاگیر پر پہنچ کر بادشاہ کی خدمت میں باغیوں کی گوشمالی اور محال وطن پانے کی درخواست بھیجی ہے۔ چناں چہ بہ موجب عرض داشت شاہ جہان پور آباد کرنے کی اجازت شاہ جہان نے مرحمت فرمائی۔ اسی عرصے میں مہم بدخشان پر جانے کا حکم ان کے نام صادر ہوا اور بہادر خان

نے اپنے بھائی دلیر خان کو شاہ جہان پور آباد کرنے کی غرض سے اس طرف روانہ کیا اور بدخشان کی واپسی میں نواح کابل و پشاور وغیرہ سے پٹھانوں اور کھتریوں کو ساتھ لیا۔ جب سرحد ہندوستان پر پہنچے تو خود دہلی گئے اور اس جماعت کو اپنے چچا نیک نام خان کے ہمراہ اپنے بھائی جلال خان عرف دلیر خان کے پاس شاہ جہان پور بھیجا اور دلیر خان نے اپنے انتظام سے شاہ جہان پور آباد کیا چوں کہ بہادر خان نے کچھ کلمات گستاخانہ شاہ زادہ اورنگ زیب کو کہے تھے، اس لیے شاہ جہان نے ان کی جاگیر ضبط کر لی اور ان کے بھائی جلال خان عرف دلیر خان کو وہ جاگیر مرحمت فرمائی چناں چہ حسب الحکم شاہی دلیر خان شاہ جہان پور سے قنوج وکالپی کی جاگیر پر گئے۔ اس بیان اور ''اخبار محبت'' کے بیان میں کسی قدر اختلاف ہے۔

راقم کو نواب بہادر خان کو خود آکر شاہ جہان پور فتح کرنا کسی طرح ثابت نہیں ہوا۔ اسی لیے بنا بر رفع اختلاف کتاب ''اخبار محبت'' اور لیکچر مذکور حافظ اسماعیل صاحب کے پاس راقم لے کر چلا گیا اور ہر دو مضامین دکھلا کر دریافت کیا کہ آپ نے اس لیکچر میں جو نواب بہادر خان کا ذکر شاہ جہان پور کے باغی راجاؤں کو قتل کر کے آباد کرنا تحریر کیا ہے، آپ نے کسی کتاب یا روایت سے لکھا ہے؟ حافظ صاحب نے یہ جواب دیا کہ مجھے یہ روایت زبانی طور پر کسی نواب صاحب سے پہنچی تھی جن کا نام یاد نہیں رہا مگر جو کچھ اس کہنہ کتاب اخبار محبت میں تحریر ہے وہ صحیح ہے۔ لہٰذا حضرات ناظرین! اس لیکچر کو ملاحظہ کر کے اس بات کا یقین نہ کر لیں کہ راقم نے غلطی سے نواب دلیر خان کا باغی راجاؤں کو تاراج و پسپا کر کے شاہ جہان پور آباد کرنا تحریر کیا ہے بلکہ اصلی واقعہ ہے نواب بہادر خان کو مہمات سے مہلت ہی نہیں ملی، جو آسکتے۔ صرف ایک بار اپنے شہر کو دیکھنے البتہ آئے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ نواب دلیر خان نے اپنے بھائی کی طرف سے ان کی ہدایت کے بہ موجب شاہ جہان پور آباد کیا ہے۔ دفعِ مغالطہ کے لیے اس اختلاف کا ظاہر کر دینا مناسب سمجھا گیا۔

اور مہم بدخشان میں انتظامی بے عنوانی اور حاسدین کی فتنہ پردازی تو ضرور نواب بہادر خان کے متعلق تاریخوں سے ثابت ہے مگر شاہ زادہ اورنگ زیب کو کلمات

نازیبا کہنا بہ جز زبانی روایت کے کہیں ثابت نہیں ہوتا۔

شاہ جہان پور کی آبادی کا زمانہ ۱۰۵۷ھ اس کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے جو کانچ کی مسجد پر چسپاں ہے۔ اس سے قبل کا کوئی کاغذ و کتبہ نہیں پایا جاتا۔ تعمیر مسجد کا یہ قطعہ کندہ ہے، جس کا مادّہ ''نغز'' ہے۔

شد مرتب بدورِ شاہ جہان
در وطن دل کشا بہادر خان
مسجد و چاہ ساخت خواجہ بلند
سال و تاریخ نغز شد بہ جہان

۱۰۵۷ھ

باب دوم:

تاریخ شاہ جہان پور کے چند پہلو

خان بہادر مولوی مطیع اللہ خان

(۱)

بنائے شاہ جہان پور

شاہ جہان پور قسمت روہیل کھنڈ کے سب شہروں سے عمر میں چھوٹا مگر وسعت و مردم شماری میں سوائے بریلی کے سب سے بڑا ہے۔ وہ روہیل کھنڈ کے شرقی و جنوبی گوشے میں عرض البلد شمالی ۲۷ درجے ۵۳ دقیقہ اور طول البلد شرقی ۷۹ درجے ۵۴ دقیقہ پر ضلع کے وسط میں واقع ہے۔ یہاں سے بریلی ۴۷، فرخ آباد ۴۶، سیتاپور ۵۲، شاہ آباد ۱۵ اور کھیری ۶۳ میل ہے۔ نقشہ اُس کا یہی ہے۔

شہر کا بڑا حصہ دو آبہ گرّا و کھنّوت کی مرتفع زمین پر جو بہ شکل مربع مستطیل نظر پڑتا ہے، آباد ہے۔ اسی حصے کے منتہائے جنوب میں قلعے کی شان دار عمارت واقع تھی جس کا ذکر بشپ ہیبر نے اپنے ''روزنامچۂ سیاحت میں کیا ہے۔ (گزیٹیر شاہ جہان پور) اسی حصے کے شرق میں ندی کھنّوت کہیں آبادی سے بالکل ملی ہوئی اور کہیں کچھ ہٹی ہوئی بہتی ہے۔ اور محلہ وفازئی سے ذرا آگے چل کر شہر کو دو غیر مساوی حصوں میں تقسیم کرتی ہوئی گرّا کی قدمبوسی کے لیے جنوب کو چلی جاتی ہے۔ اس پر اس جگہ پل پختہ بنا ہوا ہے، جو تفرق میں اتصال پیدا کرتا ہے۔ اس مقام کا منظر حسن خداداد کی وجہ سے ایسا نظر فریب و دل کش ہے کہ پل پر سے گزرنے والوں کی نگاہیں اس کے نظارے میں اُلجھ جانے سے زنجیر بن کر قدم بڑھانے سے کچھ دیر کے لیے روک دیتی ہیں۔

اس بڑے حصے کے غرب میں ندی گرّا ہے جو شہر کے شمالی کنارے سے بہت فاصلے پر اور جنوبی کنارے سے بالکل مس کرتی ہوئی بہتی ہے۔ یہ مقام ''راج گھاٹ''

مشہور ہے۔

دونوں ندیاں جو دوآبہ کے قطعے کو شرق و غرب سے گھیرے ہوئے ہیں، ایک دوسرے سے بغل گیر ہونے کے اشتیاق میں بہت دور سے جھکتی ہوئی چلی آتی ہیں جس کی وجہ سے قطعۂ دوآبہ مثلث غیر مساوی الاضلاع کی شکل میں ہوجاتا ہے اور شہر سے دو میل جنوب میں روسر کے قریب گرّا اپنی آغوش میں کھنّوت کو لے کر اس ضلع میں چند میل بہنے کے بعد بہ طور حدِ فاصل روہیل کھنڈ و اودھ بہتی ہوئی اودھ کے حدود میں داخل ہوتی ہے۔

بلند و ڈھلوان حصہ دوآبہ کے دونوں بغلوں سے ندیوں کی ساحلی زمینیں ملی ہوئی چلی گئی ہیں جن کی وجہ سے بارش کا پانی بہ آسانی خارج ہوجانے سے شہر کی صفائی کو قیمتی مدد ملتی ہے اور دور تک وسیع سبزہ زار دونوں پہلوؤں میں موجود ہونے سے موسم خزاں میں بہار کا عالم پیش نظر رہتا ہے۔

شہر کا چھوٹا حصہ جو کھنّوت کے بائیں کنارے کی ترائی سے ملا ہوا بلند زمین پر بستا ہے وہ گاڑی پورہ کہلاتا ہے اور ضمنی تفریق کے لحاظ سے کئی محلوں میں منقسم ہے، جو افغانی قبایل کے نام سے منسوب ہیں۔

بڑے حصے کی آبادی جنوباً شمالاً قلعے سے ہاتھی تھان تک تقریباً تین میل اور شرقاً غرباً کہیں ڈیڑھ میل اور کہیں ایک میل کے قریب ہے۔

وسطِ شہر خصوصاً اُن محلوں کی آبادی جہاں ہندو زیادہ تر رہتے ہیں گھنی و گنجان ہے باقی محلے کشادہ آباد ہیں۔ حواشی شہر کے محلے آبادی کے چھلکے ہونے اور ہر طرف مزروعہ وافتادہ قطعات و باغات اندرون و بیرون آبادی موجود ہونے سے صحرائی منظر پیش کرتے ہیں۔

ان محلوں میں شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جس میں ایک یا دو بلند سایہ دار درخت موجود نہ ہوں جو زیادہ تر نیب (نیم) کے ہیں۔ بڑے گرجا ڈونڈا باغ کی چوٹی پر کھڑے ہوکر دیکھنے سے شہر ایک گھنا باغ معلوم ہوتا ہے جس میں سنہری مسجد کے طلائی کلسوں کی چمک اور مقبروں کے گنبدوں کی رفعت و شکوہ عجیب دل فریب نظارہ پیدا

کرتی ہے۔ شاہ جہان پور اس خوش نما منظر کے لحاظ سے بریلی و مراد آباد سے بالکل مختلف اور فرخ آباد سے نہایت مشابہ ہونے کی وجہ سے انھیں الفاظ کا مصداق ہے، جو مفتی ولی اللہ نے اپنی تاریخ میں فرخ آباد کی نسبت لکھے ہیں:

"بالجملہ اگر کسے این شہر را از بیرون بیند، معلوم کند کہ روضۂ رضوان سنت کہ درختانش طوبی دار ظلِ گستر ساکنیں بلدۂ خلد بنیانست۔"

(تاریخ فرخ آباد۔ مفتی ولی اللہ)

آب و ہوا اور موسم:

شہر کی آب و ہوا عمدگی و لطافت میں ہمیشہ سے ضرب المثل چلی آتی ہے۔ خوبی آب و ہوا کی بنا پر اس صوبے کا کوئی شہر شاہ جہان پور سے تفوق کا دعویٰ نہیں کر سکتا ہے۔ پانی یہاں کا عموماً شیریں و ہاضم ہے۔ صرف گاڑی پورہ کے بعض چاہات ندی کھنوت کے سیلاب کے اثر سے کھاری تھے جو اب نیم شیریں ہو گئے ہیں۔ بریلی و مراد آباد کی طرح یہاں پانی باہر سے لانے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ ہر مکان میں ایک یا دو کچے کوئیں آب نوشی کے لیے ضرور ہوتے ہیں جو پختہ جگت بنا دینے سے بیسیوں برس تک قایم رہتے ہیں اور اس ذریعے سے ہر وقت ٹھنڈا و لطیف پانی ہر گھر میں بہ آسانی مل سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ سے یہاں سقوں کی آبادی برائے نام ہے۔ پہلے فرخ آباد کی طرح رُپے سوا رُپے کی لاگت میں کچا کنواں یہاں تیار ہو جاتا تھا (تاریخ فرخ آباد از مفتی ولی اللہ) مگر اب آٹھ دس رُپے لگتے ہیں۔ (ایضاً)

شہر کی "آب و ہوا اور موسم" کے عنوان سے ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

شہر شاہ جہان پور کا نام بہ وجہ عمدگی آب و ہوا اس صوبے کے صحت آور مقامات کی فہرست میں بہت اونچے نمبر پر درج ہے۔ مگر ضلع کی آب و ہوا عمدگی میں مختلف مدارج پر ہے۔ بلند زمینوں کی عموماً عمدہ اور نشیبی جگہوں خصوصاً بن کٹی کی خراب اور شمالی قطعات جنگل کی نہایت ردی ہے۔ بارش ختم ہونے پر ملیریا بخار و تپ ولرزے کے حملے ترائی کی طرح وہاں بھی شروع ہو جاتے ہیں۔ گومتی کے کنارے اور جھو کنا و بھینسی کے دو آبے میں ملیریا و تپ ولرزہ ہمیشہ خیمہ زن رہتا ہے۔ استسقا و دیگر مہلک عوارض پیدا

ہوا کرتے ہیں۔

دوآب سے اس ضلع کی آب و ہوا زیادہ مرطوب ہے۔ سردی میرٹھ ڈویژن سے زیادہ اور گرمی لکھنؤ و آگرہ ڈویژن سے یہاں کم ہوتی ہے۔ شدید لوہ بعد غروب آفتاب یہاں کبھی نہیں چلتی ہے۔ بندیل کھنڈ کی لوہ کے لحاظ سے یہاں کی لوہ کو صرف گرم ہوا کہہ سکتے ہیں۔

شروع میں موسم بارش بہ لحاظِ صحت بریلی سے کسی قدر اچھا ہوتا ہے مگر اگست و ستمبر کے مہینے برائے نام خوش گوار ہوتے ہیں۔

سرما میں مقیاس الموسم انتہائی سطح زیریں تک پہنچ جاتا ہے۔ پالا عموماً گرتا ہے اور کبھی کبھی سخت کہرا بھی رات میں پڑتا ہے۔ سال میں اصلی ٹمپریچر سایے میں عموماً قریب ۷۵ درجے کے ہوتا ہے اور کبھی اتفاق سے ۱۰۵ بھی ہو جاتا ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس شہر کی آبادی اس مبارک زمانے میں ہوئی جب کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے جاہ وجلال کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا اور دہلی کے مشہور تخت طاؤس پر سلسلۂ سلاطین تیموریہ کا پانچواں تاج دار صاحب قران ثانی شاہ جہان بادشاہ غازی انار اللہ برہانہ جلوہ افروز تھا۔ اس کی منظوری سے عمدۃ الملک نواب بہادر خان چغتا نے اس شہر کی بنا ڈالی اور اس کے نام کے انتساب سے اس کا نام شاہ جہان پور رکھا۔

مسٹر فشر نے لکھا ہے کہ شاہ جہان پور کا پرانا نام کانٹ ہے اور وہ ایک وقت میں اسی نام سے مشہور تھا (گزیٹیر شاہ جہان پور، مسٹر فشر)۔ یہ بیان محض لا اُبالی ہے۔......

یہ کبھی نہیں ہوا کہ شاہ جہان پور کو کانٹ کہتے ہوں یا دستاویزوں و سرکاری تحریروں میں اس طرح لکھتے ہوں۔

دستاویزوں میں اس طرح لکھنے کا رواج اُس وقت متروک ہوا جب کہ ۱۸۱۳ء میں ضلع شاہ جہان پور عہد ایسٹ انڈیا کمپنی میں قایم ہو کر صدر مقام اس کا شاہ جہان پور اور کانٹ اس کا پرگنہ (ضلع) مقرر ہوا۔

(۲)

تاسیس و وجوہ تعمیر شاہ جہان پور

محبت خان و احمد خان سال تاسیس و وجوہِ تعمیر شاہ جہان پور کی بابت مختلف بیان ہیں۔ اول الذکر ''اخبار محبت'' میں بیان کرتے ہیں کہ

''دارالخلافہ شاہ جہان آباد کی آبادی کے زمانے میں نواب بہادر خان نے پانچ لاکھ رُپے اور کچھ بیش قیمت سامان و اسباب دہلی سے قنوج بھیجا تھا جو اُن دنوں ان کی جاگیر میں تھا۔ لانے والے راستہ بھول کر کانٹ چلے آئے باچھل و گوڑ راجپوتوں نے ان کو گھیر لیا، تلوار چلی، گارد محافظ کے جمعدار و سپاہی مارے گئے اور سارا خزانہ و اسباب لٹیرے لوٹ لے گئے۔ جب اس سانحے کی اطلاع نواب بہادر خان کو ملی تو انھوں نے بادشاہ کے حضور میں سارا ماجرا بیان کر کے اس مقام کو اپنا وطن بنانے کی درخواست کی جو منظور ہو کر چودہ مواضع کہ اس میں سے ہر ایک بہ منزلہ محال کے تھا بارگاہ شاہی سے بہ طور معافی عطا ہوئے۔ تب بہادر خان نے اپنے بھائی دلیر خان کو تنبیہ مفسدین کے لیے معہ فوج روانہ کیا دلیر خان نے سخت حملے کر کے نونہر دلوئی و بنجاری و چنور کی گڑھیاں فتح کیں اور بہادر خان کو اطلاع دی۔ مژدہ فتح سن کر وہ نہایت مسرور ہوئے اور بادشاہ کے حضور میں نذر و مبارک باد فتح پیش کی۔ حضور سے خلعت خاصہ ان کو و دلیر خان کو عنایت ہوا۔ بہادر خان نے خلعت خواجہ بلند کے ہاتھ دلیر خان کے پاس روانہ کیا اور انور معمار کو تعمیر قلعہ کے لیے ان کے ہمراہ کر کے دلیر خان کو لکھا کہ مناسب مقام تعمیر محل سرا کے لیے تجویز کر کے بہت جلد کام جاری کیا جائے اور وہاں کے انتظام سے فارغ ہو کر جلد ہمارے پاس آنا چاہیے۔

بہ تکمیل مدعیت ... معظم ... خاں امور ضروری کو جلد طے کر کے دہلی پہنچے بادشاہ نے عنایات شاہان ان پر مبذول فرمائیں بہادر خان اس وقت دہلی میں نہ تھے مہم بلخ پر روانہ ہو چکے تھے۔ لہٰذا وہ بادشاہ سے اجازت لے کر ان کے پاس گئے اور مورد الطاف بزرگانہ ہوئے۔" (انتہی ملخصاً)

آخر الذکر ... بحار البحر" میں لکھتے ہیں کہ

"نواب بہادر خان کو قنوج میں فرمانِ شاہی پہنچا کہ فوراً بلخ پہنچ کر شریک مہم ہو ... بہت جلد روانہ ہو کر اس سرزمین پر پہنچے جہاں اب شاہ جہان پور آباد ہے ... اس کی نزہت و لطافت کی وجہ سے وہاں شہر آباد کرنے اور توطن اختیار کرنے کا فیصلہ کر کے اپنے وکیل کو جو پایۂ تخت میں حاضر رہتا تھا لکھ بھیجا کہ دو آبہ گرّا و کھنوت کا قطعہ بہ طور التمغا حاصل کرنے کی کوشش کر ... مطابق اس کے اس نے بارگاہِ شاہی میں التمغا ہونے کی درخواست کی اور بادشاہؒ نے درخواست منظور فرما کر فرمان التمغا بیس ہزار بیگہ اراضی دو ... بہ بنا بر آبادی قصبہ در سولہ محال متعلقہ کانٹ و گولہ مثل موضع اندریا جس کو اب بادشاہ نگر کہتے ہیں وسہرا مئو خاص معہ مزرعہ جات ٹپہ بھٹکر و خان پور بھر کا ٹپہ حویلی نافذ فرمایا، جو وکیل نے بلخ میں بہادر خان کے پاس بھیج دیا۔ جب مہم بلخ سے ان کو فراغت حاصل ہوئی تو وہ افغانستان گئے اور کوشش کر کے وہاں سے افغانی قبایل کو آباد ہونے کے لیے روانہ کیا اور آبادیٔ شہر شروع ہوئی۔" (انتہی مختصراً)

تحقیق وجوہ و سال بنائے شاہ جہان پور:

ہماری تحقیق وجوہ تعمیر و سال تاسیس شاہ جہان پور کی بابت یہ ہے کہ آبادی شاہ جہان پور سے پہلے یہ زمین گھنے جنگل کی شکل میں تھی جس میں گوجروں یعنی ہیروں کی کچی پکی متعدد گڑھیاں بنی ہوئی تھی۔ وہ مویشی کثرت سے پالتے اور اسی جنگل میں چراتے تھے اور اپنی ضرورت کے لایق کچھ زمین جوت بو لیتے تھے آب پاشی و آبنوشی

کی غرض سے انھوں نے جا بہ جا پختہ کنوئیں بنائے تھے۔ ان کی جماعت ہزاروں پر تھی جس کے سرغنہ بھولا و منگئی تھے اور ان کی مضبوط اور وسیع گڑھیاں دوہر، چنور و سجارے تھیں۔ اور اس سے چند میل کے فاصلے پر شرق میں کھوت پار تھی لونی اور غرب و جنوب میں کانٹ کے آس پاس کے موضعات میں باچھل راجپوتوں کی کافی آبادی تھی اور ان کی پختہ و خام گڑھیوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ اور شرق و جنوب میں گوڑ راجپوت کثرت سے آباد تھے جن کا صدر مقام سہرا موتھا۔ اور شمال میں کچھ فاصلے پر کٹھیر یا راجپوتوں کی آبادی تھی جن کا صدر مقام گولہ تھا، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ کانٹ سے جنوب میں ملا ہوا مہر آباد (جلال آباد) کا علاقہ تھا جو پرگنہ شمس آباد سرکار قنوج میں شامل تھا۔ (آئین اکبری) شاہ جہان نے پہلے سال جلوس میں کالپی جاگیر بہادر خان میں دیا اور ۴ سال جلوس میں قنوج بھی کالپی کے ساتھ لگا دیا۔ (بادشاہ نامہ) جس کی وجہ سے ان کی جاگیر کے حدود مقطع کانٹ و گولہ سے ملحق ہو گئے تھے۔

۱۰۴۱ھ و ۵ سال جلوس شاہ جہانی میں رام سنگھ کٹھیریا نے جس کا دارالریاست چوپالہ تھا سرکشی کی رستم خان اس کی تنبیہ کے لیے مامور ہوا اس نے رستمانہ حملے کر کے چوپالہ پر قبضہ کر لیا۔ رام سنگھ لڑائی میں مارا گیا رستم خان نے اس کے خاندان کو خارج کر کے بجائے چوپالہ کے رستم نگر اپنے نام سے آباد کیا مگر بادشاہ کے معترض ہونے پر اس کا نام مراد آباد رکھا جو زبان زد خلایق ہے۔

چوپالہ کی بربادی اور خاندان رام سنگھ کی پامالی سے کٹھیریوں میں بے چینی پیدا ہو گئی تھی جس کی آگ آہستہ آہستہ سلگ رہی تھی جو ۱۰۴۷ھ و ۱۱ سال جلوس میں قوت حاصل ہو جانے سے یکایک بھڑک اٹھی اور سارا کٹھیر شعلہ جوالہ بن گیا۔ مرشد قلی خان ترکمان المخاطب مروت خان اس وقت ناظم بریلی تھا۔ وہ فوج لے کر باغیوں سے مقابل ہوا مگر لڑائی میں مارا گیا۔ (ماثر الامرا، جلد سوم، صفحہ ۴۲۲) تاہم فوج نے باغیوں کو منتشر کر دیا کٹھیریوں کی پشت ہا پشت سے یہ پالیسی چلی آئی تھی کہ جب ان کو شکست ہوتی تھی تو بھاگ کر شرقی و شمالی جنگلوں میں گھس جاتے تھے۔ اس موقع پر بھی انھوں نے اسی دیرینہ پالیسی پر عمل کیا اور علاقہ بریلی سے بھاگ کر اس ضلع کے جنگلوں میں

جمع ہوئے۔ مقامی قزاق و لٹیرے قدیم دستور کے موافق ان کے شریک حال و مددگا
بن گئے، جس کی وجہ سے ان کی قوت و جمعیت میں معقول اضافہ ہو گیا اور انھوں نے ہر
طرف لوٹ مار شروع کر دی۔ لہٰذا عمدۃ الملک بہادر خان سرحدی امیر کو جو اس وقت
قنوج میں معہ زبردست فوج کے موجود تھے شاہ جہان نے باغیوں کی گوشمالی کر کے
امن قایم کرنے کا حکم بھیجا۔ بہ تعمیل حکم انھوں نے فوج کا ایک دستہ اپنے چھوٹے بھائی
جلال خان کو (جو بعد میں خطاب دلیر خان سے معزز ہوئے)، دے کر اس مہم پر روانہ
کیا انھوں نے اچانک پہنچ کر نونہر، چنور، بنجارے، لوئی ئی گڑھیوں کا محاصرہ کر لیا۔ ہر
جگہ لڑائی ہوئی مگر گڑھی چنور پر سخت رن پڑا۔ جس میں کئی ہزار باغی اور کئی سو سپاہی فوج
شاہی کے کام آئے۔ شہباز خان متبنیٰ بہادر خان جو جلال خان کے ساتھ آئے تھے
زخمی ہوئے۔ جبھی زمین دار سلمان پور بھاگ نکلا۔ سب گڑھیوں پر قبضہ ہو گیا اور غنیم
کے بہت آدمی قید کر لیے گئے۔ بعد فتح جلال خان نے شہدا کو میدان جنگ میں موضع
چنور کے قریب دفن کرایا۔ وہ گنج شہیداں آج بھی موجود ہے۔ اور بہادر خان کو اس
مقام کی معرفت دنیا اور لطیف آب و ہوا سے اطلاع دی اور اس کو وطن بنانے کے لیے
بہترین مقام بتا کر شہر آباد کرنے اور محل سرا بنانے کی سفارش کی۔ (اخبار محبت، انہار البحر)

بہادر خان عرصہ دراز سے وطن بنانے کے لیے موزوں مقام کے متلاشی تھے اور
کچھ دن پہلے انھوں نے گڑھ مکھ ٹیشر کے قریب گنگا کے کنارے اس نیت و ارادے
سے منظوری بادشاہ کے بہادر گڑھ کی تعمیر شروع کر دی تھی مگر دلیر خان کی رپورٹ سے
ان کے خیال نے پلٹا کھایا نو مفتوحہ مقام کو شہر بسانے و وطن بنانے کے لیے بہادر گڑھ
سے زیادہ موزوں و مناسب سمجھ کر دربار سے منظوری طلب کی جس کے حاصل ہونے
میں دیر نہیں لگی۔ وجہ یہ تھی کہ کٹھیر تمرد و سرکشی میں ہمیشہ سے مشہور چلا آتا تھا کثرت
جنگل و کمی آبادی کی وجہ سے سلطنت کو زمین کی قدرتی خوبیوں سے فایدہ اٹھانے کا
موقع نہیں ملتا تھا اور قیام امن میں ہمیشہ مشکلات پیش آتی تھی۔ اس لیے شاہ جہاں
چاہتا تھا کہ اس ملک میں جا بہ جا اسلامی نو آبادیاں شہر و قصبہ و گاؤں کی شکل میں قائم
ہو جائیں، جو امن عامہ کی کفیل اور ترقی زراعت کی معاون و افزایش محاصل کا مستقل

ذریعہ ہوں۔ اسی خواہش کا اقتضا تھا کہ کچھ مدت پہلے بجائے چوپالہ کے مرادآباد اور بجائے لاکھنور کے شاہ آباد و دیگر قصبات و دیہات امرائے دربار و جاگیرداروں نے کٹھیر میں آباد کیے تھے۔ لہٰذا درخواست بہادر خان پر بادشاہ نے بیس ہزار بیگہ آراضی آبادی شہر کے لیے کام میں لانے کی اجازت دے دی۔ اس کے ملنے پر بہادر خان نے جلال خان کو جو فوج لیے ہوئے موقعہ پر پڑے تھے کام شروع کرنے کا حکم بھیج دیا اور انور معمار کو جو اس وقت قنوج میں کام کر رہا تھا معہ کاری گروں کے قلعہ بنانے کے لیے ان کے پاس تعینات کر دیا اور خواجہ بلند کو تعمیر شہر کا نگراں و مہتمم مقرر کیا اور شہر کا نام بادشاہ کے نام پر شاہ جہان پور رکھا۔ جلال خان نے بھائی کا حکم پا کر باغ لکھ پیڑا حسب رواج خراسان بہ طور یادگارِ فتح نصب کرایا۔ (تاریخ بیہقی و اخبار محبت) جلال نگر و بہادر گڑھی کی بنیاد ڈالی۔ (اخبار محبت و دستاویزات قدیم) اور ان میں ان افاغنہ کو آباد کیا جو ان کے ہمراہ آئے تھے۔ شہباز خان نے شہباز نگر میں بسیت اختیار کی۔ (اخبارِ محبت) اور گڑھی نونہر پر جو سب سے زیادہ خوش منظر و پرفضا موقع تھا بہادر خان کی سکونت کے لیے قلعہ تعمیر ہونے لگا۔ فوج موجودہ قنوج میں سے جس نے اس نئے شہر میں آباد ہونا پسند کیا، بہادر خان نے جلال خان کے پاس بھیج کر لکھا کہ ضرورت و حیثیت درجے و رُتبے کے موافق مکان و باغ وغیرہ کے لیے اُس کو زمین دی جائے۔

یہ ایک عیاں بات ہے کہ بہادر خان و دلیر خان کی فوج کے سارے سپاہی و سرداران کی برادری سے تھے اور باہم اتحاد و یک جہتی کا رشتہ مضبوط بنیادوں پر قایم تھا اس لیے ان کی سپاہ کے کثیر افراد کا اس شہر کو وطن بنانا قدرتی بات تھی۔ بدیں وجہ جنگل صاف ہو کر اس ویرانے کے آباد ہوئے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

ہم نے یہ رائے قیاسات پر قایم نہیں کی ہے، بلکہ مضبوط و صاف شہادت پر کی ہے، جس کی تشریح ہم ذیل میں کرتے ہیں؛

شہادت اول: اسناد مہری نواب بہادر خان و جلال خان و خواجہ بلند ہیں جن کو انگریزی عدالتوں نے اب سے ایک سو برس پہلے صحیح و اصلی مان کر مقدمات کا فیصلہ کیا ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حسن بخش خان ساکن گاڑی پورہ کے خاندان کے قبضے میں آراضی معافی موسومہ چک بارا ان کے مورثوں کے عہد سے چلی آتی تھی۔ انگریزی عمل داری آنے پر اس کے متعلق طول طویل عاملانہ تحقیقات ہوئی اور دعاوی بھی عدالتوں میں دایر ہوئے ان مقدمات میں جس قدر کاغذات انھوں نے عدالت میں داخل کیے اور جو نقول عدالتی کارروائیوں کی انھوں نے حاصل کیں، ان سب کو ایک مجلد کتاب میں دور اندیشی کی نظر سے جمع کیا تھا وہ پرانی کتاب ہماری نظر سے گزری ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ بارا خان مہمند یوسف خیل کو جو حسن بخش خان کے مورث اعلا تھے نواب بہادر خان نے افغانستان سے بلا کر اپنی فوج میں نوکر رکھا تھا۔ جب شاہ جہان پور آباد ہونے لگا اور بارا خان نے وہاں توطن پسند کیا تو نواب صاحب نے ۳۰ر شعبان ۱۰۵۴ھ کو ایک شقہ بہ نام جلال خان جو شاہ جہان پور میں موجود تھے۔ بدیں مضمون لکھا کہ

> ''اندر حدود قصبہ شاہ جہان پور کے دو سو بیگہ پختہ آراضی مکان و باغ کے لیے بارا خان کو جس موقع پر وہ پسند کریں دے دی جائے۔''

جلال خان نے بہ تعمیل ارشاد برادر معظم کے خواجہ بلند کو دو سو بیگہ پختہ آراضی پر بعد حد بندی کے بارا خان کو قبضہ دے دینے کا حکم دیا اور ۷ار شوال ۱۰۵۱ھ کو سند اس کی اپنی اور میر دیس کی مہر سے مرتب کر کے ان کے حوالے کی۔ بارا خان کے انتساب سے وہ آراضی بعد میں چک بارا مشہور ہوئی اور آج تک اسی نام سے مشہور ہے اور ٹکڑا دوم میں شامل ہے۔ نومبر ۱۸۰۱ء میں جب ضلع شاہ جہان پور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ ہوا تو آراضی کی ملکیت کے متعلق تحقیقات ہو کر ایک رجسٹر مرتب کیا گیا جس کا نام دفتر کی اصطلاح میں ''کتاب دہ سنی'' (یعنی سنہ دس فصلی کی کتاب) تھا۔ اس تحقیقات کے وقت سند بہادر خان و سند خواجہ بلند بابت معافی چک بارا پیش ہو کر درج رجسٹر ہوئی [1]۔

---

[1] خان بہادر مولوی مطیع اللہ خاں صاحب تاریخ مطیع نے اس مقام پر دستاویزات کی صحت کے بہت دلایل پیش کیے ہیں اور فارسی زبان میں اصل کیفیت بھی نقل کر دی ہے۔ اگر کوئی صاحب ذوق اس کے تفصیلی و تحقیقی مطالعے کے شایق ہوں، انھیں تاریخ مطیع حصہ اول کے صفحہ ۱۲۳ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

اس مقدمے کی تحقیقات کے سلسلے میں کلکٹر نے بہ ذریعہ خط نوابان قلعہ سے بھی دریافت کیا تو نواب احمد خان ونواب محمد خان ونواب غلام حسین خان ونواب اسد اللہ خان نے جنوری ۱۸۳۳ء کی مختلف تاریخوں میں جدا جدا خطوط بہ نام کلکٹر جواب میں لکھے جن میں ان تمام مراتب کی تصدیق کی جو مدعا علیہم نے بیان کیے تھے۔ ان تمام خطوط سوالی وجوابی کی نقل اس کتاب میں موجود ہے مگر طوالت کے خیال سے ہم اس کو نظر انداز کرتے ہیں۔ ۱۸۳۴ء [1] میں ایک خاص افسر باضابطہ تحقیقات معافیات اضلاع روہیل کھنڈ کے لیے مقرر ہوا۔ اس نے معافی چک بارا کے متعلق بھی تحقیقات کی اس وقت منگل خان پدر حسن بخش خان نے نقل سند خواجہ بلند مرقوعہ ۱۷ر شوال ۱۰۵۴ھ ونقل سند نواب بہادر خان مورخہ ۳۰ر شعبان ۱۸ جلوس و۱۰۵۴ھ کچہری نظامت کلکٹری شاہ جہان پور میں پیش کی اور عدالت نے نواب محمد خان ونواب احمد خان ونواب بختور بہادر خان کے بیانات باجراے کمیشن قلم بند کرائے اور محمد شریف خان ملک محلہ ترین گاڑی پورہ وغلام جیلانی خان ملک محلہ ترین وسید محمد شاہ عرف سوالن میاں وشیخ عبدالوہاب ومیاں جی محمد اعظم ومیاں نور علی زمیندار گوبرسنڈہ وحافظ غلام محی الدین خان ملک محلہ ضیا خیل وحاجی مہمند ساکن گاڑی پورہ ودلیل خان ساکن گاڑی پورہ کی شہادت ۱۵ر جولائی ۱۸۴۰ء کو عدالت میں لی گئی سب نے معافی کا عطیہ نواب بہادر خان ہونا بیان کر کے اسانید پیش شدہ کو ثابت کیا۔......

ان کاغذات سے جن کو عدالت نے صحیح تسلیم کیا ہے، امور ذیل ثابت ہوتے ہیں:

(الف) ۱۰۵۴ھ سے پہلے تاسیس وتعمیر شاہ جہان پور جاری تھی۔ چاہات پختہ تیار ہو چکے تھے۔ باغات بھی نصب ہو گئے تھے۔ خواجہ خضر وخواجہ نیاز وخان زادے جو نبی اعمام نواب بہادر خان کا لقب ہے یہاں آباد ہو چکے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو چک بارا کے حدود اربعہ میں ان کے چاہ وباغ کا حوالہ نہ دیا جاتا۔ چاہ خواجہ خضر جو حد شمالی

---

[1] اس مقام پر کتاب میں سنہ میں پہلا اور آخری عدد ۴..... اء درج ہے یہاں قیاساً ۱۸۳۴ء درج کیا گیا۔ (ا۔س۔ش)

میں لکھا ہے چک خواجہ خضر سے تعلق رکھتا ہے جو چک بارا سے ملا ہوا شمال میں واقع ہے۔ اور آج تک اسی نام سے مشہور ہے۔ خواجہ خضر مستند عالم تھے، شیخ عثمان صاحب متانی کوان سے تلمذ تھا ان کے قرآن شریف پر ایک یادداشت اس مضمون کی تحریر ہے:

''ختم بارواح استادان مثل ملا عبدالکریم وملا یوسف وملا یعقوب.....

وملا سید احمد وملا جمال وخواجہ خضر من الاستادین۔''

ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب بہادر خان نے خواجہ خضر کو وقت آبادی شاہ جہان پور ۱۰۵۴ھ سے کئی سال پہلے افغانستان سے بلا کر شاہ جہان پور میں آباد کیا تھا اور بہ طور مدد معاش ان کو وہ آراضی عطا کی تھی جو چک خواجہ خضر مشہور ہے اور انھوں نے اس آراضی میں پختہ کنواں تعمیر کیا تھا جو ۱۰۵۴ھ سے پہلے تیار ہو چکا تھا اور وقت عطائے سند چک بارا موجود تھا۔

(ب) ۱۰۵۴ھ میں خواجہ بلند شاہ جہان پور میں موجود تھا اور تعمیر قلعہ کے اہتمام میں مصروف تھا۔

(ج) جلال خان فاتح چنور ۱۰۵۴ھ میں شاہ جہان پور میں موجود تھے اور جو افاغنہ اس نئے شہر میں آباد ہونا چاہتے تھے، ان کو باغ و مکان کے لیے زمین بہ حکم نواب بہادر خان تقسیم کرنے کی خدمت انجام دیتے تھے۔

شہادت دوم: نواب احمد خان نے انہار البحر میں نقل کیا ہے کہ جب نواب بہادر خان نے شاہ جہان پور آباد کرنا شروع کیا تو اپنے پیر و مرشد شیخ آدم بنوریؒ سے درخواست کی کہ وہ چند خلفا کو اس نئے شہر میں آباد ہونے کے لیے بھیجیں اور حضرت شیخ نے ان کی درخواست منظور فرما کر شیخ عثمان صاحب متانی و شاہ امان اللہ صاحب و شاہ عبدالغنی صاحب و شاہ سید احمد صاحب کو بھیجا جو یہاں مستقل طور سے آباد ہوئے اور ان کے مزارات موجود ہیں۔

تاریخ سے شیخ آدم بنوریؒ کا ۱۰۵۲ھ میں حج و زیارت کے لیے روانہ حجاز ہونا اور مدینہ منورہ میں ۱۰۵۳ھ میں وفات پانا معلوم ہوتا ہے۔ (سلسلہ مشائخ نقش بندی)
مزار اُن کا جنت البقیع میں قریب قبہ مزارِ حضرت عثمانؓ کے۔ (تاریخ فرخ آباد)

پس ظاہر ہے کہ ۱۰۵۲ھ سے پہلے آبادی شاہ جہان پور شروع ہوگئی تھی اور خلفائے شیخ آباد ہونے کے لیے آگئے تھے۔

شہادت سوم: مشہور ہے کہ فتح تاراگڑھ کے وقت خدمات کے صلے میں شاہ جہان نے وہاں کے مال غنیمت میں گھڑیال اور نقارہ بہ طور نشان اعزاز وامتیاز بہادر خان کو عنایت کیا تھا جو انھوں نے قلعہ شاہ جہان پور میں استعمال کے لیے فوراً بھیج دیا تھا۔ فتح تاراگڑھ آغاز ۱۰۵۲ھ کا واقعہ ہے اگر اس وقت شاہ جہان پور اور قلعہ کا وجود نہ ہوتا تو گھڑیال ونقارہ کیوں بھیجا جاتا۔

شہادت چہارم: شیخ کبیر بالا پیر صاحب اپنے بیٹے کی شادی کے لیے یہاں آنا، معقول وجوہ سے جن کو ہم اس کتاب کے حصہ دوم میں ان کے حالات لکھنے کے وقت بیان کریں گے، ثابت ہے وفات ان کی ۱۰۵۴ھ کا واقعہ ہے پس ظاہر ہے کہ شاہ جہان پور اس سے پہلے آباد ہو چکا تھا اور اُن کے بڑے بھائی شیخ محمد اصل صاحب یہاں گھر بنا کر رہنے لگے تھے۔

پس واقعات مصرحۂ بالا سے جو روایتاً و درایتاً صحیح پائے جاتے ہیں، مجموعی طور پر جلوس شاہ جہانی کے قریب فتح چنور ہونا اور اس کے بعد ہی آبادی شاہ جہان پور شروع ہو جانا صاف طور سے ثابت ہوتا ہے اور اس میں شک وشبہ کرنا وسواس ہے۔ لہٰذا ہم سال تاسیس وسنہ تعمیر شاہ جہان پور ۱۰۴۷ھ قرار دیتے ہیں جو مسجد کا نچ کے مرتب ومکمل ہونے سے دس برس پہلے کی بات ہے۔ ومن دونہ خرط القتاد!

(۴)

توسیع و تنظیم شاہ جہان پور

فتح چنور کے بعد ۱۰۴۷ھ میں سنگ بنیاد قلعۂ شاہ جہان پور نصب ہو کر تعمیر اس کی زیر نگرانی خواجہ بلند جاری ہو گئی تھی۔ جلال نگر و بہادر گڑھی بھی ایک حد تک آباد ہو گئے تھے اور دیگر حصص و اطراف شہر میں بھی کچھ نہ کچھ عمرانی صورت بہ ذریعۂ تعمیر مکانات و چاہات و تقریس باغات پیدا ہو چکی تھی اور قصبے کا نام بھی شاہ جہان پور قرار پا کر مشہور ہو گیا تھا مگر اب تک جو لوگ اس قصبے کو وطن بنا کر آباد ہوئے تھے وہ نواب بہادر خان کی فوج کے سپاہی و سردار تھے جو جلال خان کے ہمراہ اس مقام کو فتح کرنے کی غرض سے آئے تھے یا قنوج سے جہاں بہادر خان کی فوج کی چھاؤنی تھی یہاں آباد ہونے آئے تھے اور کچھ غالباً افغانستان سے بھی آئے تھے کیوں کہ بہادر خان آغاز ۱۰۴۸ھ سے جمادی الثانی ۱۰۴۹ھ تک افغانستان میں تھے اور وہاں سے لوگوں کو یہاں بھیجنے کا ان کو موقع حاصل تھا۔

بہادر خان اس نو آباد قصبے کو بہ طور التمغا حاصل کرنے کے آرزومند تھے۔ مگر اس کے لیے درخواست کرنے کا موقع مناسب نہیں پاتے تھے۔ توسیع و تنظیم کے کام کو جو التمغا ملنے کے بعد ہونا ہر پہلو سے موزوں خیال کرتے تھے، روکے ہوئے تھے۔ ۱۰۵۵ھ میں جب وہ نہایت اہم خدمت یعنی مہم بلخ پر مامور ہوئے تو انھوں نے فضائے دربار کو اپنے موافق دیکھ کر التمغا عنایت ہونے کے لیے درخواست پیش کی۔ کیوں کہ اسے موقعوں پر منصب و جاگیر و انعام نقد و خلعت و خطاب و نشان امتیاز عطا کرنا سلاطین تیموریہ کے معمولات میں داخل تھا اور عن قریب اس کی منظوری حاصل ہو جانے کی امید میں انھوں نے افغانستان میں لوگوں کو یہاں آنے پر رضامند کرنے کی کوشش شروع کی۔ شاہ جہان نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جمادی الثانی ۱۰۵۵ھ سے

ربیع الثانی ۱۰۵۶ھ تک لگاتار دس مہینے ان کا قیام پشاور میں رہا، جس کے نواح میں ان کا قدیم وطن بر بر واقع تھا جہاں اور جس کے اطراف و جوانب میں ان کے ہم قوم قبایل غوریا خیل آباد تھے۔ اس وقت انھوں نے ملوک قبایل وخوانین اُلوس کو ہم وار کر کے لوگوں کو شاہ جہان پور آ کر مستقل آباد ہونے پر راضی کر لیا۔

شاہ جہان پور کا بہ طور التمغا ملنا:

اسی زمانے میں شاہ جہان نے ۱۸ر ربیع الثانی ۱۰۵۶ھ و ۲۰ سال جلوس کو فرمان التمغا قصبہ شاہ جہان پور و ۱۶ مواضع، محال پرگنہ کانٹ و گولہ صادر کیا۔ وہ فرمان ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ انگریزی عمل داری آنے پر جب تحقیقات آراضی لاخراجی شروع ہوئی تو آراضی شاہ جہان پور کے معافی ہونے کے ثبوت میں وہ محکمہ تحقیقات میں پیش کیا گیا جو واپس نہیں ملا اور ۱۸۵۷ء میں دفتر کلکٹری کے نذر آتش ہونے پر تلف ہو گیا۔ فرمان عالم گیری ۴۷ سال جلوس موسومہ نواب غیرت خان ابن نواب بہادر خان کی باضابطہ نقل ہمارے سامنے موجود ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

> ''درین ایام فجستہ آغاز میمنت انجام معروض فیض اندوز آں حضور موفور السرور عالی متعالی گردید کہ بہ موجب یادداشت واقعہ عہد حضرت فردوس آشیان مرقوم ہیجدہم ربیع الثانی ۲۰ سال جلوس قصبہ شاہ جہان پور باشانزدہ (۱۶) موضع پرگنہ کانٹ و گولہ سرکار بدایوں مضاف صوبہ دارالخلافہ شاہ جہان آباد و در وجہ انعام عمدۃ الملک بہادر خان چغتا مرحوم بافرزندان بہ طریق التمغا مقرر بود۔''

اس فرمان و واقعات مندرجہ بادشاہ نامہ و روایاتِ صحیحہ سے امورِ ذیل روشنی میں آجاتے ہیں:

(۱) یہ کہ فرمان التمغا شاہ جہان پور کا ۱۸ر ربیع الثانی ۲۰ سال جلوس مطابق ۱۰۵۶ھ کو صادر ہوا تھا اور یہ وہ تاریخ ہے جس پر بہادر خان نے مع فوج ہراول کابل سے بہ جانب بلخ کوچ کیا تھا۔

(۲) یہ کہ شاہ جہان پور کے ساتھ ۱۶ مواضع، محال پرگنہ کانٹ وگولہ جن کی تفصیل نام بہ نام فرمان میں موجود ہے عطا ہوئے تھے اور ہر محال میں کئی کئی مواضع شامل تھے۔

(۳) شاہ جہان پور اس وقت آباد تھا اور مثل محالات دیگر جو فرمان میں مندرج ہیں معین و مشخص تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو فرمان میں اس کا نام نہ آتا۔ معدوم کو وجہِ انعام میں عطا کرنا داخل تمسخر تھا، جو ایک شہنشاہ کی شان سے بعید تھا۔

(۴) ۱۸ ربیع الثانی ۱۰۵۶ھ سے پہلے شاہ جہان پور خالصہ تھا، جو اس فرمان کے بہ موجب التمغا قرار پایا۔ اگر پہلے سے وہ التمغا ہوتا تو اس فرمان کا جاری ہونا بے معنی ہوتا۔

ان امور کے روشنی میں آجانے سے ۱۰۵۷ھ سال بنا ہونا اور شاہ جہان پور کا وقت آبادی خالصہ ہونا اور دس سال تک اسی حیثیت میں رہنا، صاف نظر آتا ہے جس سے بہت سے پیچیدہ مسایل کے سلجھانے میں قیمتی مدد حاصل ہوتی ہے۔

افغانی قافلے کا افغانستان سے آنا:

التمغا مل جانے پر بہادر خان نے نو ہزار افاغنہ کو جو باون خیل کے تھے، سواری و بار برداری دے کر معہ عیال و اطفال شاہ جہان پور روانہ کیا۔ ہر ایک سے اس کی ملکیت افغانستان سے دوچند آراضی شاہ جہان پور میں دینے کا وعدہ کیا اور نیک نام خان اپنے چچا اور یوسف خان اپنے بھائی کو اس عظیم الشان قافلے کو آرام و آسایش کے ساتھ شاہ جہان پور پہنچانے کے لیے معین کیا اور ہر خیل میں ایک لئیق شخص کو ملک مقرر کیا اور ہدایت کی کہ ہر خیل جدا جدا آباد ہو اور اس کا محلہ اس کے نام سے موسوم کیا جائے اور محلوں کی ترتیب و سلسلہ بندی ان شعاب کے شجرۂ انساب قبایل کے لحاظ سے کی جائے یعنی ہر اُلوس کے خیل وزئی پاس پاس آباد کیے جائیں اور ہر قبیلے کے پاس وہ قبیلہ بسایا جائے جو نسب میں اس سے قریب تر ہو۔ حواشی شہر پر افاغنہ اور وسط شہر میں رعایا یعنی ہنود اور زیر قلعہ نو مسلم خاص خیلوں کو آباد کیا جائے۔ جس کا عمل درآمد نیک نام خان و

یوسف خان نے بہت احتیاط سے کیا۔ اس قافلے کے آنے سے شہر ہاتھی تھان سے گاڑی پورہ تک آباد ہوگیا منتشر آبادی پیوستہ و مسلسل ہوگئی اور کٹھیر میں افغانستان کے نمونے کی ایک نوآبادی قایم ہوگئی اور افغانستان سے ترکِ وطن کر کے یہاں آنے کا راستہ صاف ہوگیا، جس کی وجہ سے چھوٹے قافلے بعد میں آتے رہے اور مردم شماری میں اضافہ ہوتا رہا۔

مسامحات محبت خان و احمد خان:

دونوں راویوں نے بعد انفراغ جنگ بلخ بہادر خان کا افغانستان میں ٹھہر کر افاغنہ کو رضامند کر کے شاہ جہان پور روانہ کرنا غلطی سے بیان کیا ہے یہ واقعہ قبل روانگی بلخ اس وقت کا ہے جب کہ پشاور میں جنگ بلخ کے لیے لام باندھا جا رہا تھا اور بہادر خان دس ماہ تک وہاں مقیم تھے۔ جیسا کہ بہ حوالہ شاہ جہان نامہ ہم نے بیان کیا ہے۔ کیوں کہ بعد جنگ بلخ بہادر خان کو افغانستان میں ٹھہرنے اور اس کام کے کرنے کا موقع کہاں تھا۔ ۴ر شعبان ۱۰۵۷ھ کو بادشاہ نے بلخ سے واپس ہونے کا فوج کو حکم بھیجا، تب بہادر خان وہاں سے روانہ ہوئے اور ہزاروں صعوبتوں اور مصیبتوں کو طے کرتے ہوئے دارالخلافہ پہنچے۔ (بادشاہ نامہ جلد دوم) اور ۱۰۵۸ھ میں وہاں پہنچ کر چھ ماہ تک معتوب رہے۔ بعدۂ صوبہ دار ملتان مقرر ہوئے اور ۱۰۵۹ھ میں قندھار پر لڑتے ہوئے راہی دارالبقا ہوئے۔ جس کو ہم تفصیل سے ان کے ترجمہ میں بیان کریں گے۔ نواب محبت خان جو بہادر خان کے بلخ سے واپس آنے کے وقت اپنے جد امجد دلیر خان کا ان کے ہمراہ ہونا کہتے ہیں، وہ قطعاً غلط ہے۔

بادشاہ نامہ صاف بیان کرتا ہے کہ دلیر خان مہم بلخ پر مامور نہیں ہوئے۔ وہ اس وقت حاضر رکاب شاہی تھے اور ۲۰ سال جلوس و ۱۰۵۶ھ میں جب کہ جنگ بلخ کا شباب تھا بیس لاکھ رُپے ذوالقدر خان قلعہ دار کابل کے پاس پہنچا کر واپس چلے آئے تھے۔ (بادشاہ نامہ جلد دوم: صفحہ ۶۰۵)

نواب احمد خان جو اپنے نام در جد اعلیٰ بہادر خان کا افغانستان سے ہمراہ قافلہ

افغانی شاہ جہان پور پہنچ کر بھولا کو گڑھی نو نیر سے خارج کر کے قلعہ کا سنگ بنیاد نصب کرنا کہتے ہیں وہ کسی طرح صحیح نہیں۔ بھولا کا گڑھی نو نیر سے اخراج اور قلعے کی تاسیس اس سے آٹھ سال پہلے ۱۰۴۷ھ کا واقعہ ہے۔ صحیح اس قدر ہے کہ جب بہادر خان کو مہم بلخ پر جانے کا بادشاہ نے حکم بھیجا تو وہ یہ سمجھ کر کہ اس دور دراز وخون ریز مہم سے خدا جانے واپسی ہو یا نہ ہو اور کب ہو، قلعہ وقصبہ دیکھنے کے لیے جو زیر تعمیر تھا قنوج سے شاہ جہان پور آئے اور ضروری ہدایات آیندہ کے لیے دے کر اور خواجہ بلند وانور معمار کو سب باتیں سمجھا بوجھا کر راہی دارالخلافہ آگرہ ہوئے اور دلیر خان کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ دلیر خان چوں کہ اس مہم پر مامور نہیں ہوئے تھے، اس لیے وہ پایۂ تخت میں مقیم رہے۔ بہادر خان بلخ چلے گئے۔ ان واقعات کا صحیح سلسلہ اور اس کا سنہ وسال ان دونوں نواب زادوں کو محدود معلومات کی وجہ سے دریافت نہیں ہوا اور جذبات آویزش خاندانی نے اس میں آمیزش کرنے پر برانگیختہ کیا۔ لہٰذا روایت کی صورت مسخ ہوگئی اور پیچیدگی واقعات نے غلط نتایج پیدا کر دیے۔

بعض ناواقف خیال کرتے ہیں کہ بیس ہزار بیگہ آراضی جو شاہ جہان نے آبادی شہر کے لیے معاف کی تھی اس کو افاغنہ پر تقسیم کرتے ہوئے نواب بہادر خان نے صرف حقِ آسایش ان کو عطا کیا تھا اور حقِ ملکیت اپنے لیے محفوظ رکھا تھا۔

یہ خیال سراسر باطل وبے بنیاد ہے جس کے وجوہ یہ ہیں؛

(۱) یہ کہ جو اسناد بابت اس آراضی کے بہادر خان کے حکم سے مرتب ہوئیں، ان میں بصراحت حق ملکیت عطا کرنا تحریر ہے، جن میں سے بارا خان کی سند کا ہم قبل ازیں ذکر کر چکے ہیں۔

(۲) بیسیوں دستاویزیں گیارھویں صدی کی ہماری نظر سے گزری ہیں، جن سے آبادی شہر پر پچاس سال گزرنے سے پہلے آراضی کی بیع وشرا ہونا اور ان پر جانشینان بہادر خان کی گواہیاں ہونا عیاں ہوتا ہے، جو حق ملکیت حاصل ہونے کا قطعی ثبوت ہیں۔

(۳) نواب احمد خان جو اپنے زمانے میں جانشین بہادر خان تھے "انہار البحر"

میں لکھتے ہیں کہ نواب بہادر خان نے افغانستان میں شاہ جہاں پور آنے کی صلاے عام دیتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ جو شخص جس قدر زمین کا افغانستان میں مالک ہے اس سے دو چند زمین اس کو شاہ جہان پور میں دی جائے گی۔

''ہر کس در ینجا بہر قدر ملکیت داشتہ باشد المضاعف آن درانجا سلوک خواہم شد۔'' (انہار البحر۔ قلمی)

پھر اس معاہدے کے خلاف وہ کیسے کر سکتے تھے۔ انھوں نے تو اپنے وعدے کا اس حد تک لحاظ رکھا کہ جو لوگ افغانستان میں مالک آراضی نہ تھے ان کو بھی ان کی ضرورت کے موافق مکان و باغ و قبرستان کے لیے آراضی دی۔ احمد خان کہتے ہیں:

''وکسانیکہ در ولایت وجہ معیشت داشتند المضاعف آن بانہا حسب قرارداد خود عطا نمودہ۔ وسوائے آن ہر کس راہر قدر کہ مناسب دانستہ برائے نہادنِ باغ و مکان وہم برائے مقابر عطا نمودہ۔'' (انہار البحر۔ قلمی)

اس غلط خیال کے بعض دماغوں میں جاگزیں ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جو آراضی ہنود کو نواب صاحب نے آباد ہونے کے لیے دی تھی اس میں حق ملکیت اپنا محفوظ رکھ کر صرف حق آسایش بہ طور رعایا کے ان کو عطا کیا تھا۔ ناواقفوں کو افاغنہ و ہنود کے حقوق کا فرق محسوس نہ ہوا۔ سب کو یکساں سمجھ کر تاریخ میں ایک غلطی کا اضافہ کر دیا۔ بیس ہزار بیگہ آراضی جو شہر بسانے کے لیے ملی تھی اس کے بڑے حصے پر شہر آباد ہے۔ جیل، ہائی اسکول قدیم و جدید، پولیس لاین، ٹون ہال، سول لاین اور اس کے قرب و جوار کے بنگلے بنے ہوئے ہیں اور ایک جز اس کا کنٹونمنٹ میں شامل ہو گیا ہے۔ باقی مزرعہ ہے۔ ٹکڑا دوم و محال بستی بیگم بھی اسی کے اجزا ہیں۔

جلال نگر کے حدود:

بعد فتح چنور کے جلال نگر و بہادر گڑھی جو سب سے پہلے آباد کیے گئے تھے۔ اُن میں سے بہادر گڑھی تو ترین بہادر گنج میں جذب ہو گیا۔ جلال نگر اپنے قدیم نام سے آج تک مشہور ہے۔ اس میں سات محلے ہاتھی تھان، دلازاک، ترین جلال نگر، ایمنی

ی، نصر زئی، بی بی زئی ہدف، مہمند جلال نگر فی زمانناشامل سمجھے جاتے ہیں۔ مگر چند بیع نامے آراضی واقع محلہ باڑوزئی نوشتہ ۱۱۹۷ھ و ۱۲۰۱ھ ہمارے پاس موجود ہیں۔ جن میں محلہ باڑوزئی کا نام "خلیلان جلال نگر" درج ہے۔ جس سے اس بات کا پتا چلتا ہے ۔ جلال نگر کے حدود کی وسعت اس محلہ تک تھی۔

جلال نگر نام سے اب ایک موضع سرکاری دفتر میں قایم ہے۔ اس کی آبادی تو رقبہ شاہ جہان پور میں داخل ہے جس کا موضع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر صحرائی آراضی کا...... شہر سے بالکل علاحدہ ہے۔ اور اس پر مال گذاری مشخص ہے۔

یہ موضع قدیم سے چھ تھوک پر منقسم ہے۔ تھوک دلازاک، تھوک ترین جلال نگر، تھوک ایمنی زئی، تھوک نصر زئی، تھوک مہمند جلال نگر، تھوک بی بی زئی ہدف۔ ہاتھی تھان کے نام سے کوئی تھوک نہیں ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ہاتھی تھان دراصل ایک ٹکڑا محلہ ترین جلال نگر کا ہے، مستقل محلہ نہیں ہے۔ ان چھ تھوکوں میں سے تھوک دلازاک کنٹونمنٹ کے حدود میں آجانے سے قبضۂ سرکار میں چلا گیا ہے۔ باقی پانچ تھوک کا زیادہ حصہ آج بھی مقبوضہ افاغنہ ہے۔ یہ موضع ہمیشہ سے بہ شکل بھیاچارہ قبضۂ افاغنہ میں چلا آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جلال خان نے ان افاغنہ پر جو جلال نگر کے محلوں میں آباد تھے کل رقبہ صحرائی ہر ایک کی حیثیت وضرورت کے لحاظ سے کسی وقت میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس وجہ سے ہر ایک محلے کا مقبوضہ اس کے انتساب کی وجہ سے ایک جداگانہ تھوک بن گیا۔ جلال نگر کا لگان جارج کری صاحب کے بندوبست کے ختم ہونے تک بالکل نرالے طریقے سے مقرر تھا یعنی نقدی لگان جو کچھ قرار پاتا تھا اس کے علاوہ کاشت کار کو پیداوار آراضی میں سے فی بیگہ خام ۵ ماریا ۲ر غلہ اور بہ حالت کاشت نیشکر فی بیگہ خام ۸ر (آٹھ آنے) سے ایک رُپیہ تک مالک آراضی کو ادا کرنا ہوتا تھا اور اس کا نام زمین داری تھا۔ مگر اب بہ وجہ تغیر حالات حق زمین داری خال خال باقی ہے اور برائے نام کہیں کہیں وصول ہوتا ہے۔

اوپر جو ہم بیان کر آئے ہیں اس سے نتایج ذیل صحت کے ساتھ مستنبط ہوتے ہیں۔ اور ان کی مدد سے وہ تمام معاقد اطمینان کے ساتھ حل ہو سکتے ہیں جو نواب

زادوں کی باہمی آویزش ورقابت خاندانی دلیر خانیوں و بہادر خانیوں نے اور ناواقف وکم مایہ نامہ نگاروں نے تاریخ شاہ جہان پور میں پیدا کر دیے ہیں۔

(۱) بہادر خان نے بہ حکم شاہ جہان ۱۰۴۷ھ میں بسر کردگی جلال خان اپنے چھوٹے بھائی کے، قنوج سے فوج بھیج کر گوجروں و باچھلوں کو ان کی گڑھیوں سے بے دخل کر دیا اور بعد فتح چنور کے جلال خان نے جلال نگر و بہادر گڑھی کی بنا ڈالی اور لکھ پیڑا نصب کیا اور جلال نگر میں قیام کیا ان کا فیل خانہ اس مقام سے متصل تھا جہاں محلہ ہاتھی تھان آباد ہے اور یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔

(۲) بادشاہ کی اجازت سے ۱۰۴۷ھ میں شاہ جہان پور آباد ہونا شروع ہوا۔ کھیڑا نونیر پر جلال خان نے قلعے کی بنیاد نصب کی۔ انور معمار و خواجہ بلند مہتمم مقرر ہوا۔ اس وقت تک شہر بہ طور التمغا بہادر خان کو عنایت نہیں ہوا تھا۔

(۳) ۱۰۵۵ھ میں بہادر خان بلخ جانے کے وقت شاہ جہان پور و قلعہ دیکھنے آئے مگر جلد واپس گئے۔ ان کی معیت میں جلال خان بھی دار الخلافہ تک گئے۔

(۴) ۱۰۵۶ھ میں شاہ جہان پور معہ ۱۶ محال دیگر بہ وجہ انعام بہ طور التمغا بہادر خان کو عنایت ہوا۔ تب انھوں نے اس کو وسعت دے کر افغانی نو آبادی بنانے کا انتظام، ان اصول کو پیش نظر رکھ کر کیا جو افغانستان میں مروج تھے۔

(۵) ۱۰۵۵ھ ۱۰۵۶ھ میں بلخ جانے سے پہلے جب دس مہینے تک بہادر خان افغانستان میں مقیم تھے اس وقت نو ہزار افاغنہ کو معہ متعلقین شاہ جہان پور میں آباد ہونے کے لیے انھوں نے روانہ کیا اور وہ اسی سنہ میں یہاں پہنچ کر آباد ہو گئے اور باون محلے ہر ایک خیل کے نام سے قایم ہوئے۔

(۶) ۱۰۵۷ھ میں مسجد کا نچ کی تعمیر ختم ہوئی۔

(۴)

شاہ جہان پور کے محلے

نواب بہادر خان نے جو اصول آبادی شہر کے معین کیے تھے ان سے ان کی غایت متانت و سنجیدگی کا پتا چلتا ہے۔ افاغنہ کھلے میدانوں اور صاف ہواؤں میں رہنے بسنے کے عادی تھے صحت بدنی کے لیے ان کا حاشیہ شہر پر آباد کرنا اور قبیلہ وار محلے ہم قوم ملک کے زیر اثر اور شجرہ انساب کے لحاظ سے ان کا تسلسل وارتباط افغانستان کے جمہوری نظام اور قدیم اصولِ حمایت و ہمدردی و معاونت الاقرب بالاقرب کے بانی وقایم رکھنے کے لیے لازمی تھا۔

علاوہ بریں اس زمانے میں تمام ہندوستان مسلح تھا۔ رعایا میں جنگی جوش موجود تھا شہر کے آس پاس راجپوتوں کی آبادی تھی۔ ان کی مدافعت و شہر کی حفاظت کے لیے بجائے اینٹ و پتھر کی مردہ شہر پناہ بنانے کے گوشت و پوست کی زندہ چار دیواری بنانا زیادہ مناسب تھا کیوں کہ بنیے بقال جو خود اپنی حفاظت کرنے سے فطرتاً معذور تھے بغیر انتظام حفاظت کے یہاں آباد ہونے پر آمادہ نہیں ہو سکتے تھے اور بغیر ان کے آباد ہونے کے بنج بیوپار کا کام نہیں چل سکتا تھا۔ ''خاص خیل'' نواب صاحب کے چیلے تھے وہ جنگ چنور میں اسیر ہو کر مسلمان ہو گئے تھے، یا اسیرانِ جنگ کی اولاد سے تھے ان کا آقا کے زیر سایہ رہنا ہر پہلو سے مناسب تھا۔ علاحدہ محلوں میں رہنے اور افاغنہ میں خلط ملط ہو جانے سے آیندہ نسب افاغنہ کے بگڑنے کا احتمال تھا۔ خطاب ''خاص خیل'' جوان کے لیے تجویز کیا تھا اس میں ان کے نومسلم ہونے کا اخفا۔ چیلہ ہونے کا تستر اور اسی کے ساتھ ان کے افغان نہ ہونے کا اشارہ اور تالیف قلب کا مؤثر جادو موجود تھا۔ جس کا یہ اثر تھا کہ وہ لوگ فخریہ لہجے میں اپنے آپ کو خاص خیل کہتے اور لکھتے تھے۔ ہماری نظر سے گیارھویں و بارھویں صدی کے نوشتہ کئی قبالے گزر چکے ہیں، جن میں

گواہانِ حاشیہ میں بعض ناموں کے ساتھ لفظ ''خاص خیل'' خود گواہ کے قلم کا لکھا ہوا موجود تھا جو اس کے دل پسند ہونے کا ثبوت ہے۔

نواب بہادر خان کے مجوزہ اصول آگے چل کر افغانی نوآبادیاں قایم کرنے والوں کے لیے دستور العمل بن گئے۔ پچھتّر سال بعد جب نواب محمد خان بنگش نے فرخ آباد کی بنا ڈالی تو انھیں اصول کو پیش نظر رکھ کر آبادی شہر کا انتظام کیا۔ (تاریخ فرخ آباد از مفتی ولی اللہ) ہر قوم کے لیے جداگانہ محلّہ قایم کرنے کا اصول پہلی کھیپ آنے کے بعد یہاں قایم نہ رہ سکا۔ بعد میں جو چھوٹے چھوٹے قافلے وقتاً فوقتاً افغانستان سے آتے رہے وہ اس اصول کی پابندی نہ کر سکے۔ جہاں جگہ ملی آباد ہو گئے۔ وجہ یہ تھی کہ نواب بہادر خان فوت ہو چکے تھے۔ دلیر خان شاہ آباد چلے گئے تھے کوئی سردھرا یہاں باقی نہ تھا۔ بیس ہزار بیگہ آراضی میں سے جس قدر بعد تقسیم بچ رہی تھی اس کو اولا د نواب صاحب نے توسیع آبادی کے لیے صرف کرنا پسند نہیں کیا۔ لہٰذا وارد ین کو جس نے اپنا شریک حال کرنا پسند کیا وہیں اس نے ڈیرا ڈال دیا اور کچھ زمانہ گزرنے پر بہ ذریعہ توریث وبیع وشرا آراضی کا ایک خیل سے دوسرے خیل میں منتقل ہونا شروع ہو گیا جس کا لازمی نتیجہ ایک خیل کے افراد کا دوسرے خیل کے محلے میں آباد ہونا پیدا ہوا۔

مشہور ہے کہ شاہ جہان پور میں باون محلے تھے۔ اس شہرت میں اصلیت صرف اس قدر ہے کہ باون محلے ان باون خیلوں کے نام سے منسوب تھے جو افغانستان سے آکر بسے تھے، ورنہ دراصل محلے اس سے زیادہ تھے اور وہ اور ناموں سے منسوب تھے۔

تاریخی سند کی بنا پر باون محلوں کے ناموں کی فہرست مرتب کرنا ناممکن ہے کیوں کہ ''بہادر خانی'' و ''اخبار محبت'' و ''انہار البحر'' میں ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔ پرانی دستاویزوں کی چھان بین اور زبانی روایاتِ ثقات سے جو کچھ وثوق کے ساتھ دریافت ہوا اس سے قدیم ناموں کے فہرست ہم ذیل میں لکھتے ہیں:

فہرست نمبر۱:

ان باون محلوں کی تفصیل جو قبایل افغانی کے نام سے آباد کیے گئے۔

نمبر ۱ تا ۴: مہمند گاڑی پورہ، چمکنی گاڑی پورہ، ترین گاڑی پورہ، شیرانی گاڑی پورہ۔ ان میں سے تین محلے اب تک آباد ہیں۔ شیرانی محلہ جو نہایت مختصر تھا، ترین گاڑی پورہ میں جذب ہو گیا۔ شیرانی نسل کا اب کوئی شخص اس محلے میں آباد نہیں ہے۔

۵و۶: اختیار خیل گاڑی پورہ و مہمند گاڑی پورہ۔ ان دونوں محلوں کے نام سے سوائے پرانی دستاویزوں کے اور کوئی واقف نہیں۔

۷و۹: باقر زئی و اوپے زئی یا وظا زئی آباد ہیں۔

۸: کاکر۔ مدت ہوئی ویران ہو گیا۔ کسی کو نام بھی یاد نہیں۔ بازار بھولا گنج اب اس جگہ آباد ہے۔

۱۰: نوحانی یا لوہانی۔ یہ محلہ اب تلیا گھورن کے نام سے مشہور ہے۔ پرانا نام مدت ہوئی مٹ گیا۔

۱۱و۱۲: زا خیل یا ضیا خیل و متانی یا متنیہ۔ آباد ہیں۔

۱۳: آفریدی۔ ہنوز زیادہ تر آباد ہیں اور آفریدی برائے نام۔

۱۴ تا ۱۷: تراہی، بالا تراہی، مانوزئی اور بازید خیل۔ آباد ہیں۔

۱۸: سدی خیل۔ ویران ہو کر بازید خیل میں جذب ہو گیا۔

۱۹ و ۲۱ تا ۲۳: یونس خیل، اورک زئی، بنگش و مدرا خیل۔ آباد ہیں۔

۲۰: بلیامین۔ ندی گرّا کے کنارے یونس خیل و مانوزئی کے بیچ میں آباد تھا۔ مدت ہوئی دریا برد ہو گیا۔

۲۴: مہمند گڑھی۔ سین زئی سے ملا ہوا جنوب میں جامع مسجد کے قریب آباد ہے۔

۲۵: بی بی زئی چوراہا۔ آباد ہے مگر افاغنہ کی آبادی برائے نام ہے۔

۲۶: مہمند عقب مسجد کا نچ۔ ہنود آباد ہیں یا دوسری قوموں کے مسلمان۔ افغان برائے نام ہی ہیں۔

۲۷ تا ۳۳: سین زئی، بابوزئی، محمد زئی، بی بی زئی (قریب بجلی پورہ) چمکنی بہادر گنج، تاجو خیل و خلیل سب آباد ہیں۔

۳۴: اوڑمران: جھنڈا اور تاجوخیل کے درمیان آباد تھا۔ تاجوخیل میں مخلوط ہو کر نسباً منسیاً ہوگیا۔ جہاں گیر خان صاحب صوفی کا مکان اسی محلے میں ہے اور نسباً اوڑمر ہیں۔

۳۵، ۳۷، ۳۸: قاضی خیل، ملاخیل وعلی زئی۔ آباد ہیں۔

۳۶: سلیمانی، بہت چھوٹا محلہ ہے۔ ایک یا دو خاندان تھے۔ ان میں سے چند افراد باقی ہیں۔

۳۹: نیکوزئی۔ علی زئی میں جذب ہوگیا۔

۴۰: ماموری یا ماموزئی۔ علی زئی کے پہلو میں آباد تھا۔ اب علی زئی میں شامل ہوگیا۔ تاہم کچھ لوگ اس کے نام وحدود سے واقف ہیں۔

۴۱: علیکوزئی یا لیکوزئی۔ علی زئی سے ملا ہوا تھا۔ اسی میں جذب ہوگیا۔

۴۲، ۴۴: تلی زئی و باڑوزئی۔ آباد ہیں۔

۴۳: ترین بہادر گنج۔ آباد ہے۔ بہادر گڑھی اسی محلے میں جذب ہوگیا۔

۴۵، ۴۶: ہدی زئی وابراہیم زئی۔ اب ان دونوں محلوں کو بارہ دری کہتے ہیں۔

۴۷: ماموڑی متصل ہدف۔ آباد ہے۔ دراصل ماموزئی ہی کثرت استعمال سے ماموڑی ہوگیا ہے۔

۴۸: پشائی۔ آباد ہے۔ اب اس کو پشاوری کہتے ہیں۔

۴۹، ۵۰: مہمند جلال نگر و بی زئی ہدف۔ آباد ہیں۔

۵۱: گدون۔ تالات پختہ محلہ باڑوزئی کے شمالی کنارے سے ملا ہوا آباد تھا اور اس کے غرب میں بی بی زئی ہدف تھا۔ مدت ہوئی ویران ہوگیا۔

۵۲: ترین جلال نگر۔ آباد ہے۔ ہاتھی تھان اسی محلے کا جز ہے۔

۵۳، ۵۴، ۵۵: ایمنی زئی، نصر زئی یا نصرت زئی و دلازاک۔ آباد ہیں

فہرست نمبر۲:

ان محلوں کی فہرست جو دوسرے ناموں سے آباد کیے گئے تھے:

۱۔ نیک نام پورہ عرف بجلی پورہ: نیک نام خان عم بہادر خان نے اپنے نام سے آباد کیا تھا۔

۲۔ حسین پورہ: نواب بہادر خان کے بیٹے حسین خان نے اپنے نام سے آباد کیا تھا۔

۳۔ حیات پورہ: برادر عم زاد بہادر خان نے اپنے نام سے آباد کیا تھا۔

۴۔ ہندال خیل: ہندال خان عم بہادر خان نے اپنے نام سے آباد کیا تھا۔

۵،۶۔ فتح پور منگھی ٹولہ: فتح خان ابن بہادر خان کے نام سے منسوب تھا۔ منگھی گوجر کی اولاد بعد قبول اسلام آباد ہوئی۔ اس لیے اس کے نام سے منسوب ہوا۔

۷۔ مامون خیل: قلعے سے ملا ہوا آباد تھا۔ مدت ہوئی ویران ہو گیا۔ نواب احمد خان نے انہار البحر میں وجہ تسمیہ یہ بیان کی تھی کہ ابنائے بہادر خان کے ماموں اس میں آباد تھے۔

۸۔ بکسریاں: بکسریہ راج پوت جو قلعۂ بہادر خانی میں پہرہ چوکی کے کام پر مامور تھے، اس محلے میں رہتے تھے۔ اس لیے اس کا نام بکسریاں ہو گیا۔

۹۔ زیر قلعہ: نومسلم خاص خیل آباد تھے۔

۱۰۔ بھاٹن ٹولہ: نواب بہادر خان کے بھاٹ آباد تھے، جن کو موضع ستی کھیڑا بہ طور معافی نواب صاحب نے عطا کیا تھا۔

۱۱۔ قاضی ٹولہ: قاضی پیر محمد کے آباد ہونے سے یہ نام مشہور ہو گیا۔

(اخبار محبت وانہار البحر و بہادر خانی)

قدیم محلے اس شہر کے وہی ہیں جو فہرست نمبر (۱) و (۲) میں درج ہیں۔ مگر انقلاب لیل ونہار و تغیر احوال نے زمانہ گزرنے پر اور بہت محلے پیدا کر دیے ابنائے بہادر خان نے شہر کی ترقی سے ضروریات معاشرت و معیشت میں اضافہ ہونے پر بہت سے گنج وکڑے قایم کر کے تجارت پیشہ اقوام ہنود کو ان میں آباد کیا، جیسے بہادر گنج، دلیر گنج، دلاور گنج، مظفر گنج، مسجد گنج، عبداللہ گنج، چوک، کڑا خام، بزریا ملّو۔ وہ سب بمرور ایام مستقل محلے بن گئے اور علاوہ ان کے افاغنہ کی بربادی اور ہنود کی آبادی نے

ہندوانی ناموں سے جیسے بہارت دواجی، کوچہ لالہ، چوکسی، کٹیا ٹولہ، دیوان جوگراج چھوٹے چھوٹے محلے افغانی محلوں میں پیدا کردیے۔

بعض بڑے محلے زمانہ مابعد میں کئی کئی ٹکڑوں میں منقسم ہو کر مقامی خصوصیات و امتیازات کی وجہ سے جدا جدا محلے بن گئے جیسے باڑوزئی میں ''پختہ تالاب''، لال املی باڑوزئی پیشاوری، ترین میں ترین بہادر گنج، ترین ٹکلی، ترین رنگین چوپال، عقب ترین خلیل میں اٹاو چوبرجی۔ باقرزئی میں قلعہ ورنگ محلہ۔ بابوزئی میں گوہر پورہ۔ ضیا خیل میں مہمان شاہ۔ ترین گاڑی پورہ میں باغ خواجہ فیروز۔ ترین جلال نگر میں ہاتھ تھان۔ تل زئی میں جنگلہ۔ محلہ مہمند جلال نگر میں بزریا لالہ تیلی۔

اور کچھ محلے آبادی بڑھنے سے قایم ہو گئے جیسے گاڑی پورہ میں نئی بستی۔ محلہ ترین میں صدر بازار و باغ کہرنی۔ بعض محلے میونسپلٹی نے اپنے وارڈوں کی حد بندی ۱۸۸۴ء و ۱۹۱۶ء میں کرنے کے وقت محلوں کی قدیم حد بندی کو جو گلیوں و کوچوں کے ذریعے سے قایم کی گئی تھی نظر انداز کر کے سڑکوں کے لحاظ سے اس کو قایم کیا جس کے اثر سے محلوں کی تجزی ہو کے ان کے نئے نام تصنیف کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی وہ نو تصنیف نام مردم شماری کے وقت ٹکٹ لگا کر مشتہر کیے گئے۔ جس کے اثر سے وہ زبان عوام پر جاری ہو گئے۔ جیسے خلیل شرقی و خلیل غربی۔ باڑوزئی اول، باڑوزئی دوم جن سے زمانہ سابق میں کسی کے کان آشنا نہ تھے۔ اور بعض دیہات چونگی وصول کرنے کے لیے اندر حدود میونسپلٹی داخل کر کے شہر کے محلے قرار دیے، جیسے احمد پور، نیاز پور، عزیز گنج، سرائے کائیاں۔ ککرا خورد و کلاں، جس کی وجہ سے ہماری قدیم روایات کو سخت صدمہ پہنچا اور گزیٹیر شاہ جہان پور کے مؤلف کو یہ لکھنے کا موقع ملا کہ شاہ جہان پور میں اب صرف ۱۹ محلے افغانی قبایل کے نام سے موسوم ہیں۔ حال آں کہ قدیم تعداد کے لحاظ سے ۴۰ محلے اور موجودہ تعداد کی رو سے اس سے بہت زیادہ آج بھی افغانی قبایل کے نام سے منسوب و معروف ہیں۔ ہمارا قومی فرض ہے کہ قدیم روایات کو زندہ رکھنے کی غرض سے اپنی خانگی تحریروں میں محلوں کے قدیم ناموں کا استعمال جاری رکھیں اور میونسپلٹی کی جدت کو اس کے لیے چھوڑ دیں۔

نواب محبت خان اُن سب خیلوں کو جو افغانستان سے آ کر یہاں آباد ہوئے سٹربنی نسل سے بتاتے ہیں جو شجرۂ انساب کے خلاف ہے مگر اس میں شبہ نہیں ہے کہ ان میں سے اکثر سٹربنی اور سٹربنی میں سب سے زیادہ غوریا خیل تھے جن کے قبایل کے ناموں سے دو ثلث کے قریب محلے منسوب ہیں اور ایک ثلث میں بیٹنی۔ غرغشتی متی اور وصلی ہیں۔ اگر اس کی تفصیل معلوم کرنے کا شوق ہو تو ہماری کتاب انساب قبایل افغانی پر نظر ڈالو۔

ہمارے سامنے پرانی دستاویزوں کا کافی ذخیرہ موجود ہے جن میں اس زمانے کے رواج کے مطابق ناموں کے ساتھ قومیت بھی درج ہے۔ ان سے علاوہ ان اُلوس کے، جن کے نام سے محلے منسوب ہیں مفصلۂ ذیل خیلوں، قبیلوں کا یہاں آنا ثابت ہوتا ہے۔

غرغشتی، خویشگی، اوڑمر، اتمان خیل، اکوزئی، گل گیانی، لودی، خٹک، گوجر خیل وردک، امان زئی، یعقوب زئی، حاجی زئی، کاسی، یوسف زئی، غل زئی، باجوری، سالار زئی، نیازی، زکریا زئی، شیر زاد، بڑیچ، کاکر، بیزوال، صافی، فرملی، برکی زوزان، پنی، مشوانی، روہیلہ۔

یہ احصا استقرائی ہے ممکن ہے کہ اس کے سوا اور اقوام کے افراد بھی یہاں آ کر آباد ہوئے ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان قوموں کے قلیل افراد بعد آبادی شاہ جہان پور کے یہاں وارد ہو کر سکونت پذیر ہوئے اور قلت افراد و آراضی نہ ملنے کی وجہ سے جداگانہ محلے قایم نہ کر سکے۔ روہیلے غالباً علی محمد خان و حافظ رحمت خان کے زمانے میں یہاں آ کر بس گئے۔ جن کے چند گھر اب تک یہاں موجود ہیں۔

(۵)

مدوجزر شاہ جہان پور

شاہ جہان پور کا نشوونما اس سرعت کے ساتھ ہوا کہ اس کی ہم عمر نو آبادیوں میں اس کی نظیر نظر نہیں آتی ہے۔ اس کی بنا پر تیس سال سے زیادہ نہیں گزرے تھے کہ اورنگ زیب تخت حاصل کرنے کے لیے دکن سے دارالخلافہ کی طرف بڑھا اور داراشکوہ نے شکست کھا کر اپنے بیٹے سلیمان شکوہ کو جو بنگال کا صوبہ دار تھا کمک کے واسطے طلب کیا۔ اس وقت بہادر خان کے چھوٹے بھائی نواب دلیر خان اس کے اتالیق تھے، انھوں نے شاہ زادہ سے کہا کہ اگر شاہ جہان پور ہو کر دہلی چلنا پسند ہو تو پندرہ ہزار فردِ شمشیر زن اپنے ہم قوم شاہ جہان پور سے بھرتی کر کے فوج کو مضبوط کرنے کا ذمہ لیتا ہوں۔ (ماثر الامرا (ذکر دلیر خان) خافی خان۔ تاریخ ہند از ذکاء اللہ) جس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ اس وقت مجموعی تعداد شیخ و شاب نسل افغان کی یہاں پچاس ہزار سے کم نہ ہوگی ورنہ پندرہ ہزار جوان تلوار اٹھانے والے کیسے مل سکتے تھے۔ اس کے بعد بھی عمرانی حالات کے لیے آب و ہوا اس شہر کی ایسی خوش گوار رہی کہ محمد شاہ کے ۲۶ سال جلوس میں جب کہ آبادی شاہ جہان پور پر ایک صدی گزرنے والی تھی، افغانی جمعیت کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہو گیا کہ منان بی بی زوجہ نواب تہور خان المخاطب خان بہادر خان نبیرہ نواب بہادر خان چغتا کے استغاثے پر جب بادشاہ نے نواب عبداللہ خان کی گرفتاری کا حکم ابوالمنصور خان صفدر جنگ صوبے دار اودہ کے نام بھیجا اور صفدر جنگ نے اس کی تعمیل کے لیے شاہ آباد پہنچ کر عبداللہ خان کی قوت و جمعیت کا پتا چلایا تو اس کو ستر ہزار افاغنہ کا شاہ جہان پور میں ہونا دریافت ہوا۔ تب اس نے مجبور ہو کر بادشاہ کو لکھا کہ عبداللہ خان کی قومی جماعت ستر ہزار سے کم نہیں ہے۔ اس کے مغلوب کرنے میں ہزاروں تن بے سر ہو جائیں گے اور دوآبہ گرّا اور کھنوت میں تیسری

ندی خون کی بہہ نکلے گی۔(اخبار محبت وانہار البحر)

ممکن ہے کہ اس روایت میں جس کے راوی محبت خان واحمد خان ہیں کچھ مبالغہ ہو! کیوں کہ قوموں ولشکروں کی تعداداور مال ودولت کا اندازہ لگانے میں ہمیشہ غلطی ہو جاتی ہے، مگراس میں شک نہیں کہ آبادی شاہ جہان پوراس وقت بہت بڑھ گئی تھی۔

مسٹرفشرومسٹرنیول آبادی شاہ جہان پور میں سرعت سے اضافہ ہونے کی بابت یہ رائے لگاتے ہیں کہ قدیم باشندے اس مقام کے جو ہندو تھے بہ زور شمشیر مسلمان کرلیے گئے تھےان کی رائے کا ماخذ غالباً نواب محبت خان کی یہ روایت ہے۔

"وطفلان راجپوتان۔قوم باچھل وگوڑ ودیگراقوام اراذل وغیرہ کہ دربندی مقید بودند بہ شرف دین محمدی آوردہ آنہارا خطاب خاص خیل بخشید۔انتہیٰ"

مگراس روایت سے صرف لاوارث بچوں کا جو فاتحین کے ہاتھ آئے تھے مسلمان کرلینا ظاہر ہوتا ہے کسی عاقل وبالغ کا جبراً مسلمان بنانا مترشح نہیں ہوتا ہے، نہ ایسا ہوسکتا تھا کیوں کہ کسی کو جبراً مسلمان کرنا تعلیم قرآن کے سراسر خلاف ہے: لا اکراہ فی الدین۔(سورۂ بقرہ:۲۵۶، ترجمہ: دین کے معاملے میں جبر نہیں) نص قطعی ہے۔

علاوہ بریں اسلام کو اپنے دایرۂ اعتقاد میں کھینچ لینے کے لیے جبر وتشدد کی ضرورت نہیں ہے، اس کی سادہ تعلیمات، عام فہم معتقدات، قانون فطرت سے مطابقت، عملی صداقت ومساوات، مفتوح اقوام سے ہم دردی وانصاف، غیر مذاہب سے بے تعصبی ورواداری ایسے دل کش ومؤثر جذبات ہیں جو دوسری قوموں کو اپنے میں جذب کرلینے اور غیروں کو اپنا بنالینے کے لیے کافی ہیں جس کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ مدت سے مسلمانوں کے ہاتھ میں تلوار نہیں ہے، حکومت ودولت ان کے قبضے سے نکل چکی ہے، نکبت وادبار کی دلدل میں ان کا قومی جہاز پھنسا ہوا ہے مگر اشاعتِ اسلام آج بھی تیزی سے جاری ہے۔اور باوجود باضابطہ مشن نہ ہونے کے میدانِ اشاعت میں وہ تمام مذاہب سے دوقدم آگے ہے۔اور یورپ وامریکا کی مشنری سوسائٹیوں کو سالانہ کروڑوں رُپے خرچ کرنے اور شب وروز اسی دھن میں مصروف

رہنے پر اس کے مقابلے میں ہر موقع پر فاش زک اٹھانی پڑتی ہے۔ جس کا اعتراف پروفیسر آرنلڈ نے "پریچنگ آف اسلام" میں بلند آواز سے کیا ہے۔

حال میں جنیوا یونی ورسٹی کے ایک مشہور عیسائی پروفیسر نے پیرس کے فرانس کالج میں اشاعت اسلام پر لیکچر دیتے ہوئے بیان کیا تھا کہ اسلام جزیرہ نما عرب سے نکل کر جس سرعت کے ساتھ دنیا میں پھیلا اور اب تک جس تیزی سے وہ پھیل رہا ہے، اس کی نظیر دیگر مذاہب بہت کم پیش کر سکتے ہیں۔ اس کی سرعت اشاعت کے دو قوی اسباب ہیں۔

اول محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے پیرووں کا اخلاص، شدتِ اعتقاد، مذہبی جوش جس نے بت پرستی کا دنیا سے خاتمہ کر دیا۔

دوسرا وطنیت وقومیت کا احساس۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسلام کی سنگ دلی و قوت شمشیر سب سے بڑی وجہ اس کی اشاعت کی ہے، لیکن واقعات اس رائے کی تکذیب کرتے ہیں اور ان لوگوں نے اشاعت اسلام کے مختلف اسباب پر غور نہیں کیا ہے۔ اسلام کی خصوصیات میں ہے کہ وہ انسان کے عقاید پر چھا جاتا ہے۔ اس کے دل اور جسم دونوں پر قابض ہو جاتا ہے۔ حمیت، غیرت، جوش بھی پیروانِ اسلام کا خاص وصف ہے۔ ایک محقق کا قول ہے کہ جب ہم اس مجموعی نتایج کا جو افریقہ میں عیسائیت اور اسلام کی اشاعت سے پیدا ہوئے ہیں، باہم مقابلہ کرتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ عقلی، اخلاقی، معاشرتی حیثیت سے اسلام عیسائیت سے فائق ہے۔ اور اس میں اشاعت وترقی کی قوت موجود ہے اور تبلیغی مذاہب میں اس کو بلند درجہ حاصل ہے۔ کچھ بعید نہیں اگر آیندہ زمانے میں اسلام کو غیر معمولی اور فوق العادت اشاعت وترقی حاصل ہو۔ (الندوہ دسمبر ۱۹۱۱ء)

لور پول میں اسٹوڈنٹ والنٹیر مشنری یونین کی ایک کانفرنس ۱۵ر جنوری ۱۹۱۲ء کو منعقد ہوئی تھی اس کے اجلاس میں ہیرائس فیلڈ نے مذہبِ اسلام کے متعلق جو بیان کیا تھا، اس کا خلاصہ یہ ہے:

"اگرچہ مشنری جماعتوں کو مسلمانوں میں مذہبِ عیسوی کے پھیلانے کی

ترغیب دی گئی ہے۔ مگر اس بات کا بھی اقرار کیا گیا ہے کہ مذہب عیسوی کے مقابلے میں مذہب اسلام نے ہمیشہ فتح پائی ہے اور اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے، جس کے سامنے تاریخ عالم کے عظیم الشان معرکوں میں عیسائیت نے شکست پائی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے تئیں یہ فریب دینا چھوڑ دیں کہ اسلام کی فتوحات تلوار کی وحشیانہ طاقت کے ذریعے سے حاصل کی گئی ہیں۔ انجیل کو مسلمانوں تک پہنچانے میں عیسائیوں پر یہ خوف صدیوں سے طاری رہا ہے کہ مذہب اسلام کے حملے سے وہ خود کہیں مغلوب نہ ہوجائے۔ آج بھی عیسائیوں کے مسلمان ہوجانے سے پیروانِ اسلام کی تعداد میں جس قدر اضافہ ہوتا ہے، وہ ان مسلمانوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے جو عیسائی مشن کی کوشش سے مرتد ہوکر عیسائیت کے حلقے میں آتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ مسلمان مختلف فرقوں میں منقسم ہیں مگر اسلام ایک ایسا زندہ وطاقت ور اتحاد ہے جس کی نظیر دنیا نے مذہب اسلام سے پہلے نہیں دیکھی۔" انتہٰی

رہا لاوارث بچوں کا پرورش کرنے کے لیے مسلمان کرلینا وہ سراسر انسانی ہم دردی کا تقاضہ تھا۔ ایک مسلمان دوسری قوم و مذہب کے لاوارث بچے کی پرورش سوائے مسلمان کر لینے کے دوسرے طور سے کرہی نہیں سکتا تھا۔ آج مشنری سوسائٹیوں کے یتیم خانوں اور سالویشن آرمی کی تادیب گاہوں میں یہی طریقہ پرورشِ یتامیٰ کا جاری ہے اگر وہ اخلاقی گناہ نہیں ہے تو مسلمانوں کا طرزِ عمل کیوں مذموم خیال کیا جاتا ہے۔

مسٹر فشر و مسٹر نیول کی رائے کے غلط ہونے کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ برخلاف دیگر اضلاع روہیل کھنڈ کے شاہ جہان پور میں تیلی، تمبولی، بڑھئی، لوہار، حلوائی، دھوبی، مالی، سنار حتیٰ کہ چکوے بھی ہندو ہیں، ایک بھی مسلمان نہیں! اگر اسلام زبردستی حلق میں اتارنے کا طریقہ گذشتہ دور میں رائج رہا ہوتا تو کم از کم ان کم زور قوموں میں سے آدھے تہائی ضرور مسلمان ہوجاتے۔ "نزلہ برعضوِ ضعیف می ریزد" مثل مشہور ہے۔

رہا ہزار پانسو بچوں کا مسلمان کر لینا، وہ مؤثر ذریعہ ترقی آبادی نہیں ہوسکتا۔ نہ دلیر خان ان کو اپنا ہم قوم بتا کر شاہ زادہ سلیمان شکوہ کی فوج میں بھرتی کرا سکتے تھے، نہ صفدر جنگ ان کو حامی و ہم دردِ عبداللہ خان خیال کر کے خوف زدہ ہوسکتا تھا، نہ ان کی وجہ سے حکم گرفتاری واپس لینے کی محمد شاہ سے تحریک کر سکتا تھا؟

وجوہ ترقی آبادی:

ہمارے نزدیک آبادی شہر میں سرعت کے ساتھ ترقی ہونے کے وجوہ یہ تھے:

(۱) سات ہزار فوج افغانی جس نے میدان چنور میں فتح پائی تھی، اس کا بڑا حصہ شروع ہی سے جلال نگر و بہادر گڑھی میں آباد ہو گیا۔

(۲) نو ہزار کا قافلہ ایک وقت میں افغانستان سے آ کر یہاں آباد ہوا۔

(۳) سپاہ زیر کمانڈ بہادر خان میں سے بہت لوگ ان کی حیات میں اور کچھ ان کی وفات کے بعد یہاں آ کر آباد ہوئے۔

(۴) نواب بہادر خان نے فواید توطن شاہ جہان پور کا اعلان اس بلند آہنگی سے افغانستان میں کیا تھا کہ ان کی وفات کے بعد تک اس کی صدائے بازگشت افغانستان کی پہاڑیوں سے آ رہی تھی اور اس کے اثر سے چھوٹے چھوٹے قافلے مختلف قبایل کے وقتاً فوقتاً افغانستان سے آ کر یہاں آباد ہو رہے تھے اور آبادی میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا تھا۔

(۵) بہادر خان و دلیر خان قبل آبادی شاہ جہان پور کے، قنوج میں رہتے تھے جو شاہ جہان پور سے بہت دور نہ تھا۔ جب شاہ جہان پور آباد ہوا تو وہاں کے ہنود جو ان کے دست گرفتہ تھے خود بہ خود یہاں چلے آئے۔ اسی وجہ سے قنوجیا برہمن یہاں زیادہ آباد ہیں اور ان کا بڑا جمگھٹ بہادر گنج میں ہے جو خاص قبضۂ نواب صاحب میں تھا۔

شاہ جہان پور کی بڑھتی ہوئی آبادی کو بہت جلد چشم زخم پہنچا جس کے وجوہ یہ تھے:

وجوہ تنزل آبادی:

اول: یہ کہ نواب بہادر خان ۱۰۵۹ھ میں راہی عدم ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد ہزاروں افاغنہ جوان کے ساتھ قندھار میں تھے اور یہاں آباد ہونا چاہتے تھے دوسرے امرا کی فوجوں میں نوکر ہو کر شاہ جہان پور سے بے تعلق ہو گئے۔ تعمیر عمارات و کٹرا و گنجیات و استحضار اہل حرفہ کا انتظام باقی نہ رہا، جس کی وجہ سے شہر کی حرفتی ترقی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔

دوم: یہ کہ نواب دلیر خان و اولاد بہادر خان میں ناچاقی ہوگئی اس لیے دلیر خان نے شاہ جہان پور کو چھوڑ کر شاہ آباد کو وطن بنایا عہد اورنگ زیب میں ان کی شہرت و ناموری کا غلغلہ ہندوستان سے افغانستان تک بلند ہو رہا تھا۔ لہٰذا ان کی وجاہت و رسوخ کی تند ہواؤں نے رخ افغانی بادلوں کا جو افغانستان کے بلند پہاڑوں سے اٹھ کر شاہ جہان پور پر برسنا چاہتے تھے۔ شاہ آباد کی طرف پھیر دیا یعنی افغانستان سے آنے والے قافلے بجائے شاہ جہان پور کے شاہ آباد جانے لگے اور بہت لوگ جن کے خاص مراسم دلیر خان سے تھے یا جن کی توقعات ان کی ذات سے وابستہ تھیں شاہ جہان پور سے اُٹھ کر شاہ آباد جا بسے، جس سے شاہ جہان پور کی ترقی کو سخت ٹھوکر لگی اور اس کی چڑھی ہوئی کمان اتر گئی۔

سوم: یہ کہ اورنگ زیب کے عہد میں کسی وجہ سے جس کا مفصل ذکر کسی تاریخ میں نہیں ملتا۔ صرف مآثر الامرا میں اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے بعض افاغنہ شاہ جہان پور نے سرکشی کی اور سلطنت کو اس کے دبانے کے لیے فوج سے کام لینا پڑا۔ اُس کے بعد سے اورنگ زیب کی نظر میں اس کا اعتبار کم ہو کر سدِ راہِ ترقی ہوا۔

چہارم: یہ کہ اورنگ زیب کے بعد ملک میں دورِ طوائف الملو کی شروع ہو گیا۔ روہیلے اس ضلع پر قابض ہو گئے جن کی ملازمت کرنا یہاں کے افاغنہ کو پسند نہ تھا اس لیے بہت لوگ نظام الملک آصف جاہ کی سرکار میں جس کی قدر شناسیوں سے صوبہ داری کھٹیر کے وقت سے وہ واقف ہو چکے تھے۔ معاش تلاش کرنے وقتاً فوقتاً دکن چلے گئے اور بعد مسافت اور مشکلات سفر کی وجہ سے اسی جگہ رہ گئے۔

ان وجوہ سے شاہ جہان پور کا عظیم الشان افغانی نو آبادی بننا رک گیا اور بہادر خان کا منصوبہ پورا نہ ہوا مگر محمد شاہ کی وفات تک رفتار تنزل زیادہ تیز نہ تھی کسی نہ کسی طریقے سے بدل ما یتحلل ہوتا رہتا تھا۔ جب اس کے جنازے کے ساتھ ساتھ دولت تیموریہ کا بھی جنازہ اٹھا اور طوائف الملوکی کے غلبے نے پرانے خاندانوں کو رقیب سمجھ کر دبانا اور کچلنا شروع کیا، اس وقت سے اس شہر میں افغانی مردم شاری روز بہ روز گھٹنے لگی اور اس کی آبادی پر پونے دو سو برس گزرنے کے بعد جب انگریزی عمل داری آئی اور ۱۸۱۳ء میں شاہ جہان پور اس ضلع کا صدر مقام قرار پایا تو اس وقت مردم شاری اس کی صرف پچاس ہزار نفوس تخمینہ کی گئی جس میں ہر طبقے اور درجے کے ہندو مسلمان شامل تھے گویا ۲۶ سالِ جلوس محمد شاہ میں نواب عبداللہ خان و صفدر جنگ کی ملاقات کے وقت جس قدر افغانی آبادی اس شہر میں تھی وہ آدھی سے بھی کم رہ گئی تھی۔

(۶)

ضلع شاہ جہان پور کا قیام

۱۸۱۳ء میں ضلع شاہ جہان پور بنایا گیا۔ شاہ جہان پور، مروری، پوایاں، پرم نگر، میران پور کٹرا، کھیرا گڑھ معہ پلیا، بڑا گاؤں، تلہر، مہر آباد، نگوہی، کانٹ، جلال پور، کھیڑا بجھیڑا، گولا، پورن پور ستنا، کھوٹار، ضلع بریلی سے اور تین پرگنے بن گاؤں، امرت پور، کھاکھٹ مئو، ضلع فرخ آباد سے لے کر شامل کیے گئے۔ مگر ۱۸۱۶ء میں پرگنہ کھیڑا گڑھ نواب وزیر کو معہ علاقہ ترائی و کنچن پور و دیگر قطعات جنگل دے دیا گیا اور پلیا ضلع شاہ جہان پور میں شامل رہا۔ (ہسٹوریکل اکاؤنٹس بریلی)

بعد میں تغیرات اس ضلع کی حدود میں وقتاً فوقتاً ہوتے رہے۔ شروع میں وہ تمام رقبہ جو گنگا و رام گنگا کے درمیان سرحدِ اودھ تک پھیلا ہوا ہے، شامل تھا۔ ۱۸۲۹ء میں پرگنات امرت پور، بن گاؤں، کھاکھٹ مئو، پرم نگر ضلع فرخ آباد کو منتقل کیے گئے۔ مگر ۱۸۴۲ء میں پرگنہ بن گاؤں پھر فرخ آباد سے واپس لے کر پرگنہ مہر آباد میں ملا دیا گیا جو اب تک تحصیل جلال آباد میں شامل ہے۔

۱۸۴۱ء میں مروری اس ضلع سے نکال کر ضلع بریلی کو دیا گیا جو تحصیل بیسل پور میں شامل ہے۔

۱۸۶۵ء میں پرگنہ پلیا ضلع کھیری میں اور پورن پور (سبنا) ضلع بریلی میں شامل کیا گیا۔

۱۸۵۰ء میں انتظامی پیچیدگیوں کے رفع کرنے کی غرض سے پرگنات فرید پور، جلال پور، میران پور کٹرا کی جدید حد بندی کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پرگنہ میران پور کٹرا کا آدھا رقبہ ضلع بریلی کو دے دیا گیا جس کی وجہ سے وہ پرگنہ بہت چھوٹا ہو گیا۔ مگر کھیڑا بجھیڑا کا پرگنہ اضلاع شاہ جہان پور و بدایوں میں رام گنگا حدِ فاصل قرار پانے سے

پرگنہ سلیم پور جھک ضلع بدایوں کا کثیر رقبہ پا جانے سے بہت وسیع ہو گیا۔

بعد میں اندرونی تغیرات حدود پرگنات ضلع ہذا میں کیے گئے۔ ابتدا میں ضلع بنانے کے وقت پرگنات کانٹ و شاہ جہان پور کو ملا کر ایک پرگنہ شاہ جہان پور کے نام سے قایم کیا گیا تھا۔ مگر کری صاحب نے بندوبست ۱۸۶۹ء کے وقت پرگنے شاہ جہان پور سے تین پرگنے جغرافیائی اصول کے لحاظ سے بنائے ندی گرّا سے پورب کا حصہ جس میں شاہ جہان پور واقع ہے، پرگنہ شاہ جہان پور گرئی و گرّا کا دوآبہ پرگنہ جمور اور گرئی پار کا حصہ جس میں کانٹ واقع ہے پرگنہ کانٹ قرار پایا اور پرگنات مہرآباد و بن گاؤں کو ملا کر ایک پرگنہ جلال آباد کے نام سے قایم کیا۔

تحصیلیں اور ان کا ردوبدل:

ابتدائی کمپنی نے اس ضلع میں چھ تحصیل اور دو پیش کاریاں قایم کی تھیں۔ ہر تحصیل میں ایک تحصیل دار اور ہر پیش کاری میں ایک پیش کار رہتا تھا۔

(۱) تحصیل شاہ جہان پور میں صرف ایک پرگنہ شاہ جہان پور تھا جس میں موجودہ پرگنہ کانٹ و جمور کا رقبہ شامل تھا۔

(۲) تحصیل جلال آباد میں اولاً پرگنات پرم نگر، امرت پور، کھاکھٹ مئو، بن گاؤں، مہرآباد، جلال آباد شامل تھے مگر ۱۸۴۳ء میں بن گاؤں و مہرآباد و جلال آباد رکھے گئے باقی نکال دیے گئے۔

(۳) تحصیل پوایاں میں پرگنات پوایاں و بڑا گاؤں شامل تھے۔ کھوٹار و پورن پور کی پیش کاریاں اس کے ماتحت تھیں۔

(۴) تحصیل تلہر میں دو پرگنے تلہر و نگوہی تھے۔

(۵) تحصیل خدا گنج میں پرگنات مروری، جلال پور، میران پور کٹرا شامل تھے۔

(۶) تحصیل کھیڑا بجھیڑا میں صرف ایک پرگنہ اسی نام کا تھا۔

(۷) پیش کاری کھوٹار۔ اس میں اولاً تین پرگنے کھیڑا بجھیڑا کھوٹار، پلیا شامل تھے مگر کھیڑا گڑھ سرکار اودھ کو دے دینے کے بعد دو پرگنے رہ گئے۔

(۸) پیش کاری پورن پور میں صرف ایک پرگنہ اسی نام کا تھا۔
۱۸۵۰ء میں تحصیل خدا گنج و تحصیل کھیڑا انجھیڑا توڑ دی گئیں اور علاقہ ان کا تحصیل تلہر میں ملا دیا گیا۔ (گزیٹیر شاہ جہان پور از مسٹر فشر: صفحہ ۱۷۸)
اس وقت سے اس ضلع میں چار تحصیلیں رہ گئیں جو اب تک قایم ہیں۔ ۱۸۶۵ء میں پیش کاری پورن پور تحصیل پیلی بھیت ضلع بریلی میں ملائی گئی۔ اور پیش کاری کھوٹار علاقہ پلیا کے ضلع کھیری میں نکل جانے کی وجہ سے ۱۸۷۱ء میں شکست کردی گئی۔ اور پرگنہ کھوٹار تحصیل پوایاں میں شامل کر دیا گیا۔ (گزیٹیر شاہ جہان پور از مسٹر فشر: صفحہ ۱۷۸)
فی زمانہ ضلع شاہ جہان پور میں بارہ پرگنے ہیں جو چار تحصیل میں حسب ذیل شامل ہیں:

تحصیل شاہ جہان پور: شاہ جہان پور، جمور، کانٹ
تحصیل تلہر: تلہر، نگوہی، کھیڑا انجھیڑا، جلال پور، میران پور کٹرہ
تحصیل پوایاں: پوایاں، بڑا گانوں، کھوٹار
تحصیل جلال آباد: جلال آباد

محل وقوع، رقبہ اور آبادی:

☆ موجودہ ضلع عرض البلد شمالی ۲۷ درجے ۳۵ دقیقے سے ۲۸ درجے ۲۹ دقیقے تک اور طول البلد شرقی ۷۹ درجے ۳۷ دقیقے ۸۰ درجے ۲۳ دقیقے تک پھیلا ہوا ہے طول اس کا ۵۷ میل انتہائی عرض تقریباً ۳۸ میل اور
☆ کل رقبہ ۱۷۲۶ میل مربع یا ۱۱۰۴۵۵۹ ایکڑ ہے مگر ندی گرا کی گہرائی دھار مابین پرگنہ جمور و تحصیل شاہ آباد ضلع ہردوئی سرحد قرار پانے سے کس قدر گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ (گزیٹیر شاہ جہان پور از مسٹر فشر: صفحہ ۱۷۸)
☆ شمالی و مغربی سرحد پر اس کی زمین کا سطح سمندر سے ۵۴۵ فٹ بلند ہے جو شرق و جنوب کو فی میل دو فٹ کے انداز سے ڈھلوان ہوتا چلا گیا ہے اس لیے سرحد ضلع ہردوئی پر پہنچ کر صرف ۴۸۰ فٹ بلند رہ جاتا ہے۔ (گزیٹیر شاہ جہان پور از مسٹر فشر: صفحہ ۱۷۸)

۱۹۱۴ء میں ضلع کا کل رقبہ مزروعہ ۱۴۱۸ میل مربع یا ۹۸۳۴۳ء۷ ایکڑ مال گذاری ۱۱۸۴۹۹۱ رُپیہ ابواب ۱۱۸۱۴۳ رُپیہ انکم ٹیکس ۴۱۰۳۹ رُپیہ۔ آب کاری ۳۵۵۶۹۸ رُپیہ اسٹامپ ۳۴۹۷۰۷ رُپیہ تھی۔ بہ موجب مردم شماری ۱۹۱۱ء تعداد آبادی ۹۴۵۷۷۵ نفوس شہر وقصبات ودیہات میں جو شمار میں ۲۰۶۴ تھے، پائی گئی تھی۔

۱۸۱۳ء میں ضلع قایم ہونے پر کلکٹر متعین ہوا اور سرکاری عمارت نہ ہونے کی وجہ سے دفاتر قلعہ بگھابی بی میں رکھے گئے کیوں کہ نواب وزیر کے عہد میں عامل جب کبھی شاہ جہان پور آتا تھا تو اسی جگہ قیام کرتا تھا پھر موضع سرائے چھتونہ میں ندی کھنوت کے کنارے چھاؤنی سے شرق میں دفتر کلکٹری کی عمارت بنائی گئی جو اب تک موجود اور کوٹھی چھتونہ کے نام سے مشہور ہے مگر اب رہایش حکام کے کام میں آتی ہے بعدہٗ قریب کچہری کھرنی باغ میں لاین سواران کلکٹری تعمیر کی گئی اور ۱۸۵۹ء میں اسی کے قریب دیوانی کی کچہری بنائی گئی۔

سرکاری زبان اور بعض اصطلاحات کی تبدیلی:

کمپنی نے ملک مسلمانوں سے پایا تھا اور وہ حکومت اسلامیہ کی جانشین ہوئی تھی، لہٰذا عہدوں وعدالتوں کے نام اور ہر چیز میں اسلامی حکومت کا رنگ قایم تھا۔ پرانے کاغذوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری کاغذات میں کلکٹری کو کچہری نظامت لکھتے تھے اور دفتروں وعدالتوں کی زبان فارسی تھی۔ ۱۸۳۶ء میں عدالتوں کی زبان اردو قرار پائی تب سے لفظ نظامت اڑا کر کچہری کلکٹری شروع ہوا۔ سول عدالتوں کو عدالتِ دیوانی اور سب سے اعلا عدالت دیوانی وفوج داری کو صدر نظامت آگرہ اس وقت تک سرکاری تحریروں میں لکھتے تھے۔ بعد غدر الہ آباد میں ہائی کورٹ قایم ہوکر صیغۂ دیوانی کا نظم ونسق دوسرے طور پر کیا گیا۔

ضلعی حکام اور عملہ:

۱۸۲۵ء تک مال وفوج داری کے لیے یہاں کلکٹر اور ایک جوائنٹ مجسٹریٹ

رہتا تھا اور کبھی کبھی ایک اسسٹنٹ مجسٹریٹ بھی تعینات ہوتا تھا جب لارڈ ولیم بنٹنگ نے عہدۂ ڈپٹی کلکٹر ہندستانیوں کے لیے قایم کیا تو اسٹاف ضلع میں ایک ڈپٹی کلکٹر کا اضافہ ہوا۔ غدر ۱۸۵۷ء تک اس سے زیادہ تعداد اسٹاف ضلع کی نہ تھی۔ بعد غدر جب ہندوستان میں کمپنی کی حکومت ختم ہو کر تاج سے اس کا تعلق ہوا اور ترقی کام نے بیشی تعداد افسران کا سختی سے مطالبہ کیا تو علاوہ کلکٹر و جوائنٹ مجسٹریٹ کے ڈپٹی کلکٹران کی تعداد میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہا۔ اب منظور شدہ اسٹاف ضلع ایک کلکٹر، ایک جوائنٹ مجسٹریٹ ایک اسسٹنٹ مجسٹریٹ، تین ڈپٹی کلکٹر درجۂ اول اور ایک درجہ دوم اور چار تحصیل دار ہیں۔ مگر کثرت کام کی وجہ سے منظور شدہ تعداد سے زیادہ تعینات رہتے ہیں اور آنریری مجسٹریٹیاں مزید برآں جو ہر تحصیل میں نظر پڑتے ہیں صرف شہر میں ان کی تعداد ڈیڑھ درجن کے قریب ہے۔

(۷)

قریات

شاہ جہان پور، تلہر، کانٹ، جلال آباد، پوایاں، میران پور کٹرا اور خدا گنج کے سوا جن میں ایکٹ میونسپلٹی یا ایکٹ ۲۰ ۱۸۵۶ء جاری ہے۔ اس ضلع میں حسب ذیل دیہات و محالات ۱۹۰۹ء میں تھے:

تحصیلیں، پرگنے اور دیگر مواضع اور محالات:

نام تحصیل	نام پرگنہ	تعداد مواضعات	تعداد محالات
جلال آباد	جلال آباد	۳۹۹	۷۴۴
پوایاں	پوایاں	۴۲۷	۶۰۶
پوایاں	بڑاگانوں	۱۲۵	۱۹۲
پوایاں	کھوٹار	۲۵۷	۳۰۸
تلہر	تلہر	۲۱۱	۳۲۳
تلہر	جلال پور	۱۱۲	۲۲۲
تلہر	میران پور کڑا	۱۲	۲۲
تلہر	کھیڑا بجھیرا	۱۴۵	۱۹۵
شاہ جہان پور	جمور	۱۲۷	۲۲۱
شاہ جہان پور	کانٹ	۲۱۷	۳۴۸
شاہ جہان پور	شاہ جہان پور	۱۹۳	۳۲۲
۴	۱۱	۲۲۲۵	۳۵۰۳

ان محالات میں سے ۱۰۶۰ محال مفرد ملکیت شخص واحد اور ۱۴۱۷ محال ملکیتِ مشترکہ کئی اشخاص کے تھے۔ ۷۷۷ محالات پٹے داری مکمل، ۳۹۶ پٹی داری غیرِ مکمل اور ۱۳۳ محال بھیا چارہ شکل میں تھے۔

۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے وقت ۲۰۴۰ دیہات آباد باقی غیر آباد پائے گئے تھے۔ آباد دیہات میں ۱۸۹۹ء کی مردم شماری کم از ایک ہزار اور ۱۱۵ کی ایک ہزار سے دو ہزار تک اور ۲۰ کی دو ہزار سے زیادہ اور پانچ ہزار سے کم اور ۶ کی پانچ ہزار سے زیادہ تھی۔ مگر ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے وقت ۲۰۶۲ دیہات آباد باقی غیر آباد پائے گئے تھے۔

(۸)

شاہ جہان پور کی آبادی

۱۹۰۱ء میں

مجموعی آبادی:

باعتبار مذہب تقسیم میزان شمار ۱۹۰۱ء اس طرح پائی جاتی ہے:

ہنود: مرد ۴,۲۴,۰۳۴ + عورت ۳,۵۹,۸۸۱ = ۷,۸۳,۹۱۵

مسلمان: مرد ۶۸,۵۱۲ + عورت ۶۴,۹۷۶ = ۱,۳۳,۵۹۲

عیسائی ۸۶۳,۸۱،۸۱، آریا ۶۴۶,۱، سکھ ۱۸۴، جین ۳۱، پارسی ۳، بودھ ایک۔

کل آبادی میں ہنود ۸۵.۷۲، مسلمان ۱۴.۱۳ فی صدی تھے۔ اس ضلع میں پرتہ آبادی ہنود تمام اضلاع روہیل کھنڈ سے بہت زیادہ ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ اس ضلع میں اسلامی نو آبادیاں بہت کم قایم ہوئیں۔ اور یہ ضلع کبھی حکومتِ اسلامیہ کا مرکز نہیں رہا۔ بریلی، مراد آباد، سنبھل، امروہہ، بدایوں سلاطین اسلام کے زمانے میں ناظم نشین مقامات تھے اور فوجی چھاؤنیاں بھی وہاں قایم تھیں اور روہیلوں کی حکومت میں سوائے شاہ جہان پور کے سب اضلاع روہیل کھنڈ میں خود روہیلے پھیلے ہوئے تھے اور متعدد مقامات ان اضلاع کے ان کے دارالریاست تھے۔ اس لیے وہاں اسلامی آبادی کا بہ مقابلۂ شاہ جہان پور زیادہ ہونا لازمی تھا۔ یہاں اس قدر آبادی اسلامی ہونا نواب بہادر خان کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے اگر وہ شاہ جہان پور نہ بساتے تو آج چند ہزار سے زیادہ مسلمان اس ضلع میں نہ ہوتے۔

مسلمان آبادی:

مسلمانوں کی آبادی کا پرتہ بہ مقابلہ کل آبادی ضلع کے ۱۸۸۱ء میں ۱۴.۰۳ اور ۱۸۹۱ء

میں ۱۴.۰۷ اور ۱۹۰۱ء میں ۱۴.۰۳ تھا، جس سے ان کی تعداد میں بہ مقابلہ ہنود کے مستقل ترقی ہونا پایا جاتا ہے جس کی وجہ قوی و تر و تازہ غذا اور زیادتی عمر خیال کی جاتی ہے۔

مسلمان ہر حصۂ ضلع میں مساوی طور سے پائے نہیں جاتے ہیں۔ وہ تحصیل شاہ جہان پور میں ۲۲.۳، تلہر میں ۱۳.۶، پوایاں میں ۱۵.۳، جلال آباد میں ۹.۰۱ فی صدی کل آبادی کا ہیں۔

دیگر اقوام:

مردم شماری کے پرتے میں اپنی زیادتی ثابت کرنے کے لیے ہنود تمام اچھوت ذاتوں کو جس کے مس کرنے سے وہ نجس ہو جاتے ہیں۔ اپنی قوم کا ایک جز قرار دیتے ہیں۔ مثلاً چمار جو اس ضلع کی ہندو آبادی میں سب سے زیادہ تعداد میں ہیں اور اصلی باشندگان ہند کی اس قدیم قوم سے ہیں، جو جنگل نربدا و سوتی و مہاندی و کوہستان سرگوچہ و ناگ پور کو چک میں بھیل، گونڈ، مینا، کول کے ساتھ آباد ہیں اور چوار کہلاتے ہیں اور عقاید میں ہندو مذہب سے قطعاً جداگانہ ہیں۔ اگر اس قسم کی قومیں علاحدہ کردی جائیں تو ہنود کا شمار مسلمانوں سے ہرگز زیادہ نہیں ہے۔

عیسائی جو ۱۹۰۱ء کے شمار کے وقت ۱۸۶۳ پائے گئے تھے۔ ان میں سے صرف ۱۲۴ یورپین و یوریشین و ۱۷۳۹ دیسی عیسائی تھے۔

۱۸۷۲ء میں دیسی عیسائی ۱۸۱ تھے جو بیس برس گزرنے پر دس گنے ہو گئے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس مدت میں ملک میں کئی سخت قحط پڑے، جنھوں نے نہایت بے رحمی سے ہزاروں بچوں کو یتیم اور ہزاروں عورتوں کو بیوہ بنا کر عیسائی جماعت کی تعداد بڑھانے میں بیش بہا مدد دی اور اچھوت ذاتوں کو دایرۂ عیسایت میں شکم پروری کی غرض سے داخل ہونے پر مایل کیا۔

مشنری ایجنسی:

مشنری ایجنسی اس ضلع میں ریورینڈ جی ڈبلیو وگ نے ۱۸۵۹ء میں جاری کی تھی

اور سب سے پہلا اور بڑا کام اس مشنری ایجنسی نے یہ کیا کہ ایک اسکول شہر شاہ جہان پور میں جاری کیا جواب بہ طور امدادی ہائی اسکول کے قایم ہے۔

۱۸۶۱ء میں ایک یتیم خانہ بریلی سے شاہ جہان پور منتقل کیا گیا، جو شاہ جہان پور سے شرق کھنّوت پار لودی پور میں قایم کیا گیا اور اسی جگہ صدر مقام مشن قایم ہوا۔ پھر ایک بیوہ خانہ اس کے قریب جاری کیا گیا۔ اور یتیم خانے کے سلسلے میں ۱۸۶۹ء میں شاہ جہان پور سے دس میل کے فاصلے پر ۹۰۰ ر ایکڑ آراضی جنگل کی ضلع کھیری میں خرید کر ایک زراعتی نوآبادی عیسائیوں کی وہاں قایم کی گئی جس کا نام پناہ پور ہے۔ مگر عام طور سے لآب مشہور ہے۔ چند سال ہوئے شہر کے قریب سول لاین میں بنگلے خرید کر کے ہیڈ کوارٹر مشن کا لودی پور سے منتقل کیا گیا اور ایک شاخ مشن کی محلہ دلاور گنج میں اندرون شہر قایم کی گئی۔ اور ایک چھوٹا گرجا جس میں فوج والے و ریل والے انگلش سروس کرتے ہیں قریب ریلوے اسٹیشن شاہ جہان پور بنایا گیا اور پوایاں، تلہر، کٹرہ، کھوٹار، رامان پور (یہ موضع شاہ جہان پور سے شرق میں دو میل کے فاصلے پر ہے اور راقم کی زمین داری میں ہے۔ (مؤلف)، جلال آباد، کھیڑا بجھیڑا اور دو مواضعات اودھ میں اس کی شاخیں قایم کی گئیں۔ رامان پور میں سب سے پہلے ایک نٹ جرایم پیشہ عیسائی ہوا جس کی بہن کو ایک باچھل راجپوت باشندۂ رامان پور نے اپنے گھر میں ڈال لیا تھا اور اس سہارے سے وہ بھی وہاں رہنے لگا تھا۔ اس کے ترغیب دینے پر ایک حجام اور دو کسان عیسائی ہوئے۔ بعدہٗ ایک باچھل راجپوت کا لڑکا عیسائی کر لیا گیا جو تمام باچھلوں پر شاق ہوا اور انھوں نے اپنے قوم کے ناتجربہ کار نوجوان کے تحفظ کے لیے عیسائیوں سے علاحدہ رہنے کی پالیسی اختیار کی۔ جس سے عیسائیوں کو اپنے کام میں رکاوٹ پیدا ہونے کا اندیشہ ہوا۔ تب انھوں نے راجپوتوں کو اشتعال دلانے کے لیے ان کے کنویں سے پانی بھرنا شروع کیا۔ راجپوت مانع ہوئے۔ عیسائیوں نے عدالت فوج داری میں استغاثہ دایر کیا جس کی سماعت مسٹر جے ایس پورٹر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے خود کی اور راجپوتوں کو سزا دی۔ مجبور ہو کر راجپوتوں نے وہ کنواں چھوڑ دیا اور اپنے مکانوں کے اندر چاہات آب نوشی بنائے۔ ایک مختصر خام گرجا بھی اس نٹ نے اپنے مکان میں

بنالیا ہے۔

بڑا گرجا جو سول لائین شاہ جہان پور میں واقع ہے ۱۸۴۸ء میں تعمیر کیا گیا، جو ۶۰ فٹ بلند ہے اور خوش نما ہے۔

آریہ سماج:

آریہ سماج کی ایک شاخ ابتدا ہی میں یہاں قایم ہوگئی تھی، مگر ہنود کی ممانعت کی وجہ سے عرصے تک اس کا نشو ونما رکا رہا۔ ۱۸۹۱ء میں تعداد ممبران سماج ۶۴۰ تھی جو ۱۹۰۱ء میں ترقی کر کے ۱۶۴۶ تک پہنچ گئی۔ سماج نے جلسوں کے لیے ایک عمارت شاہ جہان پور میں تعمیر کی ہے اور ایک اسکول قایم کیا ہے جس کی شاخیں تلہر و ضلع کے دیگر مقامات تک پھیلی ہوئی ہیں۔

آریہ سماج کی بنا سوامی دیانند سرستی نے ڈالی، جو کاٹھیاواڑ کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۷۵ء میں سب سے پہلے انھوں نے بمبئی میں سماج قایم کی مگر شجرِ تحریک نے اس تیزی سے بڑھنا شروع کیا کہ ۱۸۸۳ء میں ان کی وفات کے وقت پنجاب و ممالک متحدہ میں تین سو سے زیادہ سماجیں موجود تھیں۔ سوامی جی نے متعدد کتابیں و رسالے شایع کیے، جن میں سب سے زیادہ مشہور ''سیتارتھ پرکاش'' ہے......

آریوں میں ذات پات کا بندھن گذشتہ سالوں سے بہت زیادہ ڈھیلا ہو چلا ہے۔ غیر ذات کے لوگوں کے ساتھ کھان پان کی بندش مفقود ہو رہی ہے۔ مختلف ذاتوں کے افراد باہمی شادیاں کرنے لگے ہیں اور بیواؤں کی شادی کا بھی رواج ہو چلا ہے۔ صغرسنی کی شادی کے بھی آریا خلاف ہیں۔ آریوں کی وسیع تعلیمی سرگرمی صرف اس امر سے ظاہر ہوتی ہے کہ پنجاب میں ان کا اول درجے کا کالج، تین گروکل، ۱۶ ہائی اسکول ہیں اور پرایمری اسکولوں کی کثیر تعداد ہے۔ علاوہ بریں ان کا ایک مخصوص کالج اور پچاس پاٹ شالے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ہیں۔

(رپورٹ مردم شماری ۱۹۱۱ء از مسٹر بلینٹ)

(۹)

قدیم زمین داریاں

پٹھانوں کی زمین داریاں:

"اخبارِ محبت" کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف نواب عبداللہ خان کی زمین داری میں تین ہزار مواضعات تھے و دیگر افاغنہ کی زمین داریاں اس کے علاوہ تھیں۔

روہیلوں کی حکومت کے زمانے میں مسلمانوں کی زمین داری میں پرگنہ پوایاں و کھوٹار و بڑا گاؤں میں سیکڑوں دیہات تھے، جن میں کا بڑا حصہ ریاست پوایاں میں شامل ہوگیا اور بہت دیہات نواب وزیر کی سخت گیری و زیادہ ستانی اور انگریزی عہد میں بندوبست کی سنگینی اور پہلے آئینی بندوبست کی تحقیقات کے وقت مالکان سابق کی غیر حاضری ولا پرواہی و بے ترتیب پیروی کی وجہ سے نکل گئے۔

غدر ۱۸۵۷ء سے پیشتر کئی بڑے بڑے تعلقے پٹھانوں کے قبضے میں تھے، جن میں سے ایک علاقہ نواب کرامت اللہ خان کا پرگنہ نگوہی میں تھا جن میں رحمٰن خان تراہی کی زمین داری میں بہت مواضعات تھے جو فروخت ہوکر زیادہ تر کلواروں کے قبضے میں پہنچ گئے۔ شاہ جہان پور کے مشرق و جنوب و مغرب میں بہت دیہات اولاد نواب بہادر خان کی زمین داری میں تھے جو وقتاً فوقتاً قرضہ کی علت میں بیع و نیلام ہوکر بیشتر بنیوں کے پاس چلے گئے۔

غدر ۱۸۵۷ء تک اولاد نواب بہادر خان میں سے نواب غلام قادر خان کا ایک علاقہ بادشاہ نگر تھا جس میں مواضعات بادشاہ نگر، جلال پور، دلاور پور، دیوکلی، اونتھا، شجاعت پور، مونڈ گنواں، میاں پور وغیرہ شامل تھے۔

دوسرا علاقہ جموہی و برنئی وغیرہ کا تھا۔

تیسرا علاقہ عزیز گنج کا تھا، جس میں عزیز گنج اکرا، رسول پور، منڈہا، بکیان، رم پورا، سہوا پور، بھید پور، پپر ولا، احمد پور وغیرہ شامل تھے۔

چوتھا علاقہ بتیا کا تھا، جس میں بہت مواضعات تھے علاوہ بریں چکات و معافیات شہر اور کئی بازاران کی ملکیّت تھے سب علاقے ضبط ہو کر خیر خواہوں کو دے دے ❶۔

نواب قادر علی خان کے پاس مواضعات سنسی، پینتھی، پنچولی، سریانگ پور، کیلیا، کاکر وغیرہ اور کئی بازار تھے۔ ان میں سے کچھ ضبط اور کچھ بیع و نیلام ہو کر اوروں کے قبضے میں چلے گئے۔ نواب احمد علی خان کے پاس نہایت عمدہ علاقہ تھا جس میں مواضعات معظم پور، جمکا، رامان پور، برکت پور، بھوری، نگوہنا، چھیتے پور، رسول پور، رائے پور، فیروز پور، پینگ، تونی، ہتوڑیا، کروندا، چک پرمالی، چک ہنڈا، چکات دلاور پور بھکرا، چک نصرت پور، چک پتھواری، چک زین الدین نگر وغیرہ شامل تھے جو ان کی بیگم صاحبہ کے مرنے کے بعد ورثا کو ملا اور بہت جلد سیلابِ اسراف میں غرقاب ہو کر تباہ ہو گیا۔

حکیم مہدی علی خان لکھنوی کے مواضعات دولت پور، ستوان خرد، ڈھکیا، سندھوی، الرا، کٹیا ۱۸۸۸ء کے قریب نیلام ہو گئے اور جلال آباد کے پٹھانوں کی کثیر جائیداد اور سیدوں کے مواضعات گرا، بھو لی ایک بقال اگروال کے قبضے میں چلے گئے۔ تلہر کے پٹھانوں میں نصراللہ خان و نظام علی خان کے علاقے اور شاہ جہان پور میں عبدالرؤف خان و نظام علی خان کے دیہات بغاوت ۱۸۵۷ء کے الزام میں ضبط ہو گئے۔ اور چھوٹی چھوٹی حقیّتین یا ایک دو مواضعات ملکیّت مسلمانوں کے تو اس کثرت سے ضبط سرکار یا قرضے میں منتقل ہوئے کہ ان کی تفصیل اس جگہ درج کرنے کی گنجائش نہیں۔

---

❶ خیر خواہوں سے مراد انگریزوں کے خواہ ہیں یعنی وہ لوگ اور خاندان جنھوں نے مجاہدین آزادی کا ساتھ دینے کے بجائے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ (ا۔س۔ش)

راجپوت اور ناہل زمین دار:

فی زمانہ اس ضلع میں سب سے بڑے علاقہ دار راجہ صاحب پوایاں ہیں۔ جن کے خاندان کی تاریخ آگے چل کر محل مناسب پر بیان کی جائے گی مگر قدامت کے لحاظ سے ناہل کے راؤ صاحب کا خاندان زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ گو اس کے قبضے میں آج زیادہ علاقہ نہیں ہے۔ یہ خاندان کٹھیر یا راجپوتوں کا ہے۔ یہ پہلے گولہ میں جو سرکاری دفتر میں گورائے پور لکھا جاتا ہے، آباد تھا۔ اس خاندان کا مورث اعلا ہری سنگھ تھا۔ جس کے جانشین بکرم سنگھ تھے۔ ۱۶۵۹ء میں جب کہ رائے مکرند ناظم کٹھیر تھا اورنگ زیب سے خطاب راؤ اور بہت پرگنہ گولہ کی سند حاصل کی۔ اس کے خوش کرنے کے لیے ناہل کا نام اسلام آباد رکھا اور گولہ سے وہاں جا کر آباد ہوا۔ بکرم سنگھ کی اولاد میں راؤ گوپال سنگھ ہوا اس نے اٹھارہویں صدی میں، جب کہ روہیلے اس ضلع پر قابض تھے اپنی ریاست کو وسیع کرنے کے ارادے سے نوابان شاہ جہان پور کے دیہات پر جو ناہل کے نواح میں واقع تھے، دست درازی کی جس کی وجہ سے لڑائی ہوئی جس میں وہ مارا گیا اور افاغنہ نے ناہل پر قبضہ کر لیا مگر اس لڑائی کا نتیجہ فریقین کے حق میں برا نکلا یعنی گور راجپوتوں کی ریاست پوایاں میں قایم ہوئی جس نے ناہل کے بہترین حصے اور افاغنہ کے سرسبز علاقوں کو اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔ اس وقت سے افاغنہ کی زمین داریاں ضلع کے شمالی حصے میں معدوم ہو گئیں۔ دیہات کے نام البتہ پرانے قاضیوں کی یاد دلاتے رہتے ہیں۔

اس خاندان کی ایک شاخ کھوٹار میں آباد ہے، جس کے قبضے میں پہلے سے زیادہ علاقہ تھا جو ۱۸۳۸ء میں میور صاحب کے بندوبست کے وقت نکل گیا۔ اب صرف ۹ مواضعات اور ۷ پٹیاں ہیں، جن کا رقبہ ۱۴۳۱/۸ ایکڑ ہے اور مال گذاری ۲۸، ۲۸ رُپے ہے۔ خاندان مراد پور اسی خاندان سے ہے۔ جس کا مقبوضہ اس کے علاوہ ہے۔

اس کے علاوہ اور کئی خاندان راجپوتوں اور برہمنوں کے ہیں، جن میں سے بعض خوش حال اور بعض خستہ حال ہیں۔

شاہ جہان پور میں دس ہزار سے زیادہ مال گذاری ادا کرنے والے متعدد خاندان پٹھانوں کے موجود ہیں، مگر افراد سات ہزار سے زیادہ مال گذاری ادا کرنے والے اب مفقود ہیں۔ ایک ہزار سے دو ہزار تک مال گذاری ادا کرنے والے بہت ہیں۔ گزیٹیر میں جو فہرست بڑے مال گذاروں کی دی ہے وہ نامکمل ہے اس میں قدیم خاندان زمین داراں کے جواب تک پانچ ہزار سے زاید مال گذاری ادا کرتے ہیں، درج ہونے سے چھوٹ گئے ہیں۔

قیمت اراضی:

برٹش حکومت کے عہد میں قیمت اراضی میں خواہ وہ زیر آبادی وشہری ہو یا زرعی ودیہی، جو حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے، اس کی نظیر ومثال تاریخ ہندوستان میں نظر نہیں آتی ہے۔

(۱۰)
تعلیم

جب شاہ جہان پور آباد ہوا تو سلطنت نے مقامی ضرورت کے لحاظ سے کسی عظیم مدرسہ کا قایم کرنا ضروری نہ سمجھ کر امدادی طریقے سے کام لینا مناسب سمجھا۔ آبادی شہر کے استقلال کرنے پر اورنگ زیب نے وفات پائی اور ملک میں طوائف الملوکی کی ہوا چلنے لگی جس نے نظام سلطنت کو درہم برہم کر دیا اسی دور میں روہیلے اس ضلع پر قابض ہوئے انھوں نے علما کے وظایف مقرر کر کے سرشتہ تعلیم کی جدید تنظیم کی اور درس و تدریس کے حلقے ہر طرف قایم ہو گئے۔ اسی زمانے میں مولوی بحر العلوم صاحب لکھنؤ چھوڑ کر شاہ جہان پور میں اقامت گزین ہوئے۔ حافظ الملک نے ان کے لیے ندی کھنوت کے کنارے پر فضا مقام پر محلہ باقر زئی میں مدرسہ تعمیر کیا جو برسوں تک مستفیضان علم کے لیے چشمۂ آبِ حیات بنا رہا۔

روہیلوں کی جانشین اس ملک میں حکومت اودھ ہوئی، وہ علم و علما کی قدیم دشمن تھی۔ قصبات پورب میں جو علمی چشمے صدیوں سے جاری تھے اس حکومت کی بدسلوکیوں سے خشک ہو گئے تھے ضبطی مددِ معاش علما و اوقاف مدارس سے اہل علم پریشان و منتشر مدارس و خوانق ویران اور علمی خزانے تباہ و برباد ہو گئے تھے۔ شاہ جہان وفورِ علم و دانش کی وجہ سے جن قصبات پورب کو شیراز ہند کہا کرتا تھا وہ فقدان علم و علما سے دشت قبچاق ہو رہے تھے۔...... جس کے ثبوت ہم آزاد بلگرامی و فیض بخش کی چشم دید شہادت قبل ازیں نقل کر چکے ہیں۔ ایسی گورنمنٹ سے کیا امید ہو سکتی تھی کہ وہ ایک جدید علاقے میں شجر علم کی آبیاری کرے۔ اس نے سنگین مالیہ لگا کر نوابوں و متقدر مسلمانوں کو اس قدر سراسیمہ و پریشان کیا کہ ان کو خدمت علما کی استطاعت باقی نہ

رہی۔ مولانا بحرالعلوم ❶ شاہ جہان پور پر قبضہ ہوتے ہی رام پور چلے گئے دیگر علما نے بھی نواب فیض اللہ خان والی رام پور ہی کو قرب وجوار میں قدردان اہل کمال سمجھ کر اس طرف کا رخ کیا اور جو علمی نہر کھنوت کے برابر برابر بہہ رہی تھی وہ جلد خشک ہوگئی۔

ان اوراق کے نظر ڈالنے والوں میں سے ممکن ہے کوئی یہ خیال کرے کہ مسلمانوں کا سرشتہ تعلیم اہلِ اسلام کی تعلیم تک محدود تھا، غیر مسلم رعایا کے لیے کوئی انتظام نہ تھا اس لیے ہم یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ سلطنت کے ضوابطِ جہاں بانی ملکی ضرورت اور وقتی مصلحت کی بنا پر ترتیب دیے جاتے ہیں اور انھیں کے لحاظ سے ان کی ترمیم و تنسیخ ہوتی رہتی ہے۔ مسلمان فاتح کی حیثیت سے ہند میں داخل ہوئے تھے۔ رعایا قومیت، مذہب، زبان، معاشرت، جذبات، محسوسات غرضے کہ ہر چیز میں مختلف ومغائر اور چھوت چھات وتوہمات کے خیالات سے لبریز تھی۔ اگر اس زمانے میں حکومت اس کی تعلیم کے لیے مدارس قایم کرتی تو ناممکن تھا کہ ان میں داخل ہوکر اسلامی علوم وفنون سے متمتع ہونا شروع کردیتے حکومت اسلامیہ میں صدیاں گزرنے کے بعد جب سکندر لودی نے ہنود کو تعلیم دلانے کا انتظام کیا تو سوائے کایستھون کے جو آریا اقوام سے نہ تھے اور کوئی قوم مدارس میں داخل ہونے پر راضی نہیں ہوئی۔ کیوں کہ اس کے عقیدے میں اسلامی علوم وزبان سیکھنا اپنے آبائی مذہب سے دست بردار ہونا تھا۔ اس لیے حکومت سوائے اس کے کہ مسلمانوں کی تعلیم کا انتظام کرے اور کوئی مسلک اختیار نہیں کرسکتی تھی۔ انگریزی حکومت کے لیے نشر تعلیم میں وہ دقتیں نہ تھیں جو مسلمانوں کے لیے تھیں۔ ہنود چھ سو برس تک مسلمانوں کی رعایا رہ کر غیر قوم سے اختلاط کرنے کا ملکہ حاصل کرچکے تھے اور کایستھون کی بیش بہا کامیابیوں نے حکمران زبان سیکھنے کے فواید اُن پر اچھی طرح ظاہر کردیے تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر ان کے دلوں میں اس کے سیکھنے کا میلان ورجحان پیدا ہوگیا تھا۔ انگریز اس ملک میں

---

❶ حضرت بحرالعلوم مولانا عبدالعلی بن ملا نظام الدین، پیدایش ۱۷۲۹ء، وفات ۱۸۱۰ء بہ مقام مدراس۔ مدفن مسجد والا شاہی (مدراس) ''تذکرہ علماے فرنگی محل'' از مفتی عنایت اللہ فرنگی محلی، ۱۹۸۸ء، لکھنؤ، صفحہ ۱۲-۲۰۷ (ا-س-ش)

تاجرانہ حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔ بنگال و مدراس میں مدت تک تجارت کرنے کی وجہ سے باشندگانِ ملک سے تجارتی تعلقات و کاروباری مراسم قایم ہو کر اختلاط ہو چکا تھا، جس نے توحش و اجنبیت کو ایک حد تک کم کر دیا تھا۔ سلطنت قایم ہونے پر ان تعلقات میں زیادہ قربت پیدا ہوئی۔ لہٰذا انگریزی مدارس کھولنے پر ہنود کو ان کا خیر مقدم کرنے میں تامل نہ ہوا۔ مگر مسلمان جن کی حالت تخت چھوڑ کر رعیت کی صف میں کھڑے ہونے سے اس وقت، وہ ہوگئی تھی جو ہنود کی اسلامی سلطنت کے آغاز میں تھی، ان میں داخل ہونے پر تیار نہیں ہوئے۔ ان کو دعویٰ تھا کہ ان کے قبضے میں کافی ذخیرۂ علم موجود ہے ان کا عقیدہ تھا کہ عربی علوم ان کے لیے کافی ووافی ہیں۔ انھیں اجنبی زبان سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ اور انگریزی اسکولوں میں تعلیم پانے کے لیے داخل ہونا جائز نہیں۔ پس یہ خیال کرنا کہ مسلمانوں کی تعلیمی پالیسی صرف مسلمانوں کی فیض رسانی تک محدود تھی، غلط ہے۔ اس کی تحدید ہنود کے تعصبات و خیالاتِ مذہبی کا نتیجہ تھی۔ حکومت کی حیثیت سے بے توجہی ولا پروائی نہ تھی جس طرح کہ مسلمانوں کی ابتدا میں انگریزی مدارس سے علاحدگی گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی کا قصور نہ تھا، بلکہ خود مسلمانوں کے توہمات بے جا کا نتیجہ تھا۔ اور یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں بلکہ انسانی فطرت کا میلان ورجحان ہے۔ جب کوئی قوم تخت سے اتر کر صف نعال میں کھڑے ہونے پر مجبور ہوتی ہے تو ایک ہی دن میں وہ اپنی قدیم روایات و شاندار ماضی اور اپنی قومی تہذیب و شایستگی کو فراموش نہیں کر دیتی ہے۔ اس کے مفتوح ہوتے ہی اس کے قومی جذبات و محسوسات دوسری قوم کے محکوم نہیں ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہونے میں بہت مدت لگتی ہے۔

کمپنی کی تعلیمی پالیسی:

سرکار اودھ کی قایم مقام اس ملک میں ایسٹ انڈیا کمپنی ہوئی۔ اس نے قبضہ پانے کے بعد پچاس برس تک تعلیم کی طرف اپنا خیال ہی رجوع نہیں کیا۔ اس کے نزدیک رعایا کو تعلیم دلانا گویا فرایض گورنمنٹ کے احاطے میں داخل ہی نہ تھا۔ اس

لیے ۱۸۵۰ء تک اس ضلع میں سوائے دیسی مدارس و خانگی مکتبوں کے کوئی سرکاری تعلیم گاہ نہ تھی۔

۱۸۴۷ء میں تعلیم السنہ مشرقیہ کی حالت کے متعلق سرکاری طور سے سرسری تحقیقات ہوکر رپورٹ تیار کی گئی اور ۲۸۷ مکتب اس ضلعے میں اس تفصیل سے دکھائے گئے:

اندرونِ شہر ۱۰۳

عربی مدارس ۵، ہندی مکتب ۹، مکتب سنسکرت ۱۴، مکتب فارسی ۷۴، مکتب انگریزی ۱۔

انگریزی مکتب جو اس رپورٹ میں دکھایا گیا ہے وہ ۱۸۴۶ء میں کچہری کلکٹری کے ایک کرانی کلرک نے بہ طور خود اپنے مکان پر قایم کیا تھا، جس میں وہ اوقات کچہری کے باہر چند لڑکوں کو تعلیم دیا کرتا تھا۔

مفصلات ۱۸۴

مکتب سنسکرت ۱۹، مکتب ہندی ۶۷، مکتب فارسی ۹۸

سب مکتبوں میں ۴۰۰۵ طلبہ زیرِ تعلیم تھے جن میں سے ۶۶۹ مسلمان تھے۔

اس رپورٹ میں جو اعداد مکاتب و طلبہ درج تھے۔ وہ اس صوبے کے تمام اضلاع کے اعداد سے بہت زیادہ ہونے کی وجہ سے یہاں کی رعایا میں شوقِ علم اور اضلاع سے زیادہ ہونے کا عمدہ ثبوت ہے۔ لہٰذا یہ ضلع ان آٹھ اضلاع کی فہرست میں جگہ پانے کا مستحق تسلیم کیا گیا، جن میں گورنمنٹ دیہاتی اسکولوں کی نگرانی کے لیے باقاعدہ انتظام ۱۸۵۰ء میں امتحاناً جاری کرنا چاہتی تھی۔ مئی ۱۸۵۰ء میں تحصیلی اسکول ہر چہار تحصیلات و پیش کاری کھوٹار میں کھولے گئے اور ۱۸۵۴ء میں حلقہ بندی اسکول جملہ تحصیلات میں جاری ہوئے جن کی تعداد ۱۸۵۶ء میں ۱۲۳ علاوہ پانچ تحصیلی اسکولوں کے تھی۔ ایک اینگلو اورینٹل اسکول شہر شاہ جہان پور میں ۱۸۵۵ء میں کھولا گیا۔

غدر تک تعلیم رعایا کے لیے گورنمنٹ نے جو کچھ کیا، وہ صرف اسی قدر تھا۔ بعد غدر جب تاج کی حکومت قایم ہوئی تو سر رشتہ تعلیم کا از سر نو انتظام ہوا اور ۱۸۵۸ء میں

ایک ہائی اسکول انگریزی تعلیم کے لیے شہر میں کھولا گیا اور اس کے بعد بہت جلد دیگر مدارس بھی جاری کیے گئے۔ اور تحصیلی اسکول بدستور قایم کیے گئے اور حلقہ بندی اسکولوں کی تعداد وقتاً فوقتاً بڑھائی گئی۔

۱۸۵۸ء میں امریکن مشن نے ایک یتیم خانہ لودی پور میں اور ۱۸۶۰ء میں ایک انگریزی اسکول قایم کیا۔ ۱۸۶۲ء میں سررشتہ تعلیم نے ۲۱- اسکول لڑکیوں کے قایم کیے جو پہلے کبھی اس ضلع میں نہ تھے۔ ان میں سے ۱۰ پوایاں اور ۵ جلال آباد اور ۶ دیگر مقاموں میں تھے سب میں ۴۶۹ لڑکیاں زیر تعلیم تھیں۔

۱۸۶۵ء میں دو اینگلو اورینٹل اسکول جلال آباد و پوایاں میں کھولے گئے۔

۱۸۶۷ء میں ایک ہائی اسکول دو اینگلو اورینٹل اسکول، پانچ تحصیلی اسکول، ۱۰۶ حلقہ بندی، ۶۲ دیسی مکتب، ۲۱ گرلز اسکول علاوہ یتیم خانہ وامریکن مشن اسکول کے ضلع میں موجود تھے۔ جن میں ۵۰۶۴ لڑکے اور ۴۶۹ لڑکیاں تعلیم پاتی تھیں۔

۱۸۷۲ء میں تحصیلی اسکول کھوٹار بند کیا گیا اور اس کے دو برس بعد ایک پرگنہ اسکول کٹرا میران پور میں کھولا گیا اور اسی سال میونسپل اسکول شاہ جہان پور میں کھولے گئے۔

۱۸۷۶ء میں گرلز اسکول ضرورت سے زیادہ ثابت ہونے پر صرف پانچ رکھے گئے اور ۱۸۸۱ء میں وہ بھی بند کر دیے گئے۔ اب تیس سال بعد پھر ان میں سے چند کھولے گئے ہیں۔ اینگلو اورینٹل اسکول پوایاں و جلال آباد بھی جاری ہونے سے تھوڑے دن بعد بند کر دیے گئے۔

۱۸۷۶ء میں ۲۷۵ طلبہ تحصیل اسکولوں میں ۳۲۲۱ طلبہ، ۱۰۵ حلقہ بندی اسکولوں میں اور ۱۱۶۹ طلبہ ۶۴ دیسی مکتبوں میں تھے۔ ان اعداد میں مشن اسکول اور میونسپل اسکول شاہ جہان پور کے طلبہ شامل نہیں ہیں۔

۱۸۸۴ء سے تعداد طلبہ میں بتدریج بیشی شروع ہوئی اور دیسی مکاتب سے ترقی طلبہ میں زیادہ مدد ملی۔

۱۹۱۵ء میں اسلامیہ مکاتب جاری کرنے کا طریقہ جاری ہوا۔ جن کی نگرانی ہر

ضلع میں ایک کمیٹی کے سپرد ہے، جس کے اراکین مسلمان ممبرانِ ڈسٹرکٹ بورڈ و بیرونی ہوتے ہیں۔ اور اکثر ایک مسلمان ڈپٹی کلکٹر اس کا پریسیڈنٹ ہوتا ہے۔ مگر مسلمانوں نے اس تجویز کا اب تک سرگرمی کے ساتھ خیر مقدم نہیں کیا ہے، جس کے وجوہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

ضلع میں اب بھی بہت دیسی مکاتب جاری ہیں، جو سرکار سے امداد نہیں لیتے ہیں اور شہر میں تو قدیم سے دستور چلا آتا ہے کہ رؤسا اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے اپنے مکان پر معلم نوکر رکھ لیتے ہیں، جس میں محلے کے غریب بچے بھی تعلیم پاتے ہیں۔ دیہات میں بھی بعض شریف و معزز زمین داروں کے مکان پر معلم اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں۔

غرضے کہ اعداد مصرحہ بالا سے ہم اس نتیجے پر بہ آسانی پہنچتے ہیں کہ قبل غدر اس ضلع میں جو کثرت طلبہ کی سرکاری اسکولوں میں تھی، حال آں کہ اُس وقت اب سے بہت زیادہ دیسی مکاتب قایم تھے، جن میں لڑکے بہت پڑھا کرتے تھے، بعد غدر وہ جوش تعلیم یہاں آج تک پیدا نہ ہوا اور سرکاری اسکولوں میں باوجود گھٹ جانے تعداد دیسی مکاتب کے، پھر اس قدر طلبہ جمع نہ ہوئے، جس کی وجہ صرف یہ پائی جاتی ہے کہ اس وقت مصارف تعلیم برائے نام تھے اور تمام ضروریات زندگی کے ارزان ہونے سے بچوں کو تعلیم میں مشغول رکھنا آسان تھا۔ اب ایک طرف مصارف تعلیم بہت بڑھ گئے ہیں اور دوسری طرف روزمرہ کی ضروریات کی قیمت بڑھ جانے سے بار مصارف ہر خاندان پر اس قدر زیادہ ہو گیا ہے کہ غریب خاندانوں کا کیا ذکر متوسط طبقے کے لوگ بھی مصارف تعلیم کو پورا نہیں کر سکتے ہیں۔ اور غربا بجائے تعلیم دلانے کے شکم پروری کے لیے چار پیسے پیدا ہونے کی امید میں بچوں کو محنت مزدوری پر لگا دینے کے لیے مجبور ہوتے ہیں اور شریف بچے جو گھاس کھودنا بوجھ اٹھانا یا خدمت گاری کی نوکری کرنا معیوب سمجھتے ہیں آوارہ ہو کر خاندان، قوم و شہر کے لیے آفت اور جیل کے لیے باعث زینت ہوتے ہیں:

جو کچھ خدا دکھائے وہ ناچار دیکھنا!

۱۹۰۸ء میں حسب ذیل اسکول اس ضلعے میں تھے۔

انگریزی ہائی اسکول ۱، مڈل اسکول ۷، اپر پرایمری اسکول ۳۲، لویر پرایمری اسکول ۸۵، ایڈڈ گرلز اسکول ۳، کورٹ آف وارڈس اسکول ۵، میونسپل اسکول ۲۸۔

میونسپلٹی شاہ جہان پور اور بھی کئی قسم کے اسکولوں کو امداد دیتی ہے۔ امریکن مشن کا ایک ہائی اسکول اور کئی پرایمری اسکول شہر میں، اور ایک صنعتی اسکول لودی پور میں ہے۔ ہائی اسکول پہلے محلہ محمد زئی میں چکلے کے وسط میں واقع تھا جو اب محلہ گوہر پورہ جن کو ایک خوش نما عمارت بنا کر منتقل کر دیا گیا ہے۔......شاہ جہان پور خاص میں تین مدرسے عربی کے ہیں، جو چندے سے چلتے ہیں اور دو مدرسے سنسکرت کے ہیں جن کو میونسپلٹی معقول امداد دیتی ہے۔

ایک عربی مدرسہ بہ سرپرستی انجمن علمیہ ۱۰ر مئی ۱۸۹۱ء کو قایم ہوا تھا۔ جس کا باضابطہ افتتاح ۲۶ر اگست ۱۸۹۱ء کو ایک شان دار جلسے میں مسٹر ایچ سی اروِن کلکٹر وچیرمین نے کیا تھا، جس کی روئیداد آریا درپن پریس شاہ جہان پور میں چھپ کر شایع ہوئی۔ مدرسے کے مصارف عام چندے سے پورے کیے جاتے تھے چار سو رُپے سالانہ میونسپلٹی دیتی تھی۔

اس مدرسے کے مدرس اول مولوی نادر الدین صاحب تلمیذ شمس العلماء مولوی عبدالحق خیر آبادی مقرر کیے گئے تھے اور چار مدرس عربی فارسی وحساب وغیرہ کی تعلیم کے لیے تھے۔ چند سال بعد بند ہو گیا۔

دسمبر ۱۸۹۵ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس زیر صدارت محسن الملک مولوی مہدی علی صاحب یہاں منعقد ہوا۔ سرسید احمد خاں صاحب، سید محمود صاحب، شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی، شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی پروفیسر علی گڑھ کالج، مسٹر بیک پرنسپل، مسٹر آرنلڈ پروفیسر علی گڑھ کالج، مسٹر تھیوڈر ماریسن پروفیسر علی گڑھ کالج وٹرسٹیان علی گڑھ کالج ودیگر عماید مختلف اضلاع ہندوستان کے شریک ہوئے جس کی مفصل کیفیت روئیداد مطبوعہ میں مندرج ہے۔

تین سال بعد مارچ ۱۸۹۹ء میں ندوۃ العلماء کا اجلاس یہاں ہوا اور تخمیناً ستر

ہزار چندہ بہ شکل نقد و زیور و جائیداد و کتب خانہ وصول ہوا۔ جس کی تفصیل روئیداد مطبوعہ میں مندرج ہے۔ مفصلات میں اب تک آریہ سماج کا اسکول نہیں ہے۔

نقشہ جات مردم شماری کے بہ موجب اوسط خواندہ مردوں کا اس ضلع میں ۷ء۳ فی صدی ۱۸۸۱ء میں اور ۴ فی صدی ۱۸۹۱ء میں اور ۴۱ء۴ فی صدی ۱۹۰۱ء میں تھا اور اوسط خواندہ عورت کا ۱۸۸۱ء میں ۳۰ء۰ فی صدی تھا۔ یہ اوسط صوبے کے اوسط سے زیادہ ہے اور تعلیم نسواں میں ترقی ہونا ظاہر کرتا ہے۔ لڑکوں کی تعلیم کے متعلق شاہ جہان پور سوائے بریلی کے جملہ اضلاع روہیل کھنڈ سے آگے بڑھا ہوا ہے۔

اس ضلع میں اوسط مسلمانان ۸۸ء۵ فی صدی اور ہنود ۰۴ء۴ فی صدی ہے ❶۔

نقشہ جات مردم شماری ۱۹۰۱ء خواندہ آبادی میں سے ۵۳ فی صدی ناگری خواں اور ۳۴ فی صدی فارسی دان اور دس فی صدی دونوں جاننے والے باقی ماندہ اور زبانیں خصوصاً انگریزی جاننے والے ظاہر کرتے ہیں۔ مگر زبان و نوشتہ خواند کے متعلق ہمارے تجربے میں نقشہ جات مردم شماری قطعاً ناقابل اعتبار ہیں جس کو اپنا نام ٹوٹا پھوٹا لکھنا آتا ہے وہ بھی خواندہ کے ذیل میں دکھایا جاتا ہے۔

اعداد مصرحہ بالا سے بہ ظاہر تعلیم کی ترقی مسلمانوں میں پائی جاتی ہے جو کھلا ہوا مغالطہ ہے۔ انگریزی تعلیم میں جس کا مطالبہ زمانہ اور ادبی تعلیم میں جس کا مطالبہ مذہب کرتا ہے شرفا یہاں کے بہت پیچھے ہیں۔ جس کی وجہ سے اعلا طبقے میں افلاس روز بہ روز ترقی کرتا جاتا ہے اور معزز خاندان پستی کی طرف تیزی سے جھکتے چلے جاتے ہیں۔ مذہب روح علوم عربیہ سے بے لگاؤ ہونے کی وجہ سے روز بہ روز ضعیف ہوتی جاتی ہے جس کی وجہ سے اسلامی اخلاق انحطاط پر ہے اردو کی شد و بود ان امراض کا علاج نہیں۔

بیس سال گذشتہ میں ہنود نے بہت ترقی کی ہے۔ پہلے سارے شہر میں چار گریجویٹ بھی نہ تھے، مگر اب ایک درجن سے زیادہ ہیں۔

---

❶ یہ اوسط شاہ جہان پور کے ضلعے میں تعلیم کا ہے۔ (ا۔س۔ش)

(۱۱)

تصنیف و تالیف

گزشتہ زمانے میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ اگرچہ گرم جوشی کے ساتھ یہاں جاری نہیں رہا، مگر ایسی سرد مہری بھی نہیں رہی جو قابل استعجاب ہو! ہر زمانے میں یہاں فصیح و بلیغ شعرا و نثر نگار اور تصنیف و تالیف کرنے والے موجود تھے مگر ان کے کارناموں کو اخلاف کی لاپرواہی نے ضایع کر دیا۔

جدید گزیٹیر میں جو فہرست مصنفین دی ہے اس میں صرف نواب محبت خان، چندن رائے، مکرند رائے کا نام ہے اور انہار البحر کو جو نواب احمد خان کی تصنیف ہے ایک شخص نام نامعلوم کی تصنیف لکھا ہے حال آں کہ انہار البحر کے دیباچے میں صاف طور پر نام مصنف دیا ہوا ہے جس کی عبارت یہ ہے:

"این ہیچمدان امیدوار رحمت ایزدمنان احمد خان قادری و رزاقی متوطن شاہ جہان پور این چند اوراق از حالات بزرگان خود مسمی بانہار البحر برعایت لفظ دریانمودہ۔"

گزیٹیر نگار کو کمی معلومات کی وجہ سے اس شہر کے مشاہیر اہل قلم کا جیسے نواب غلام حسین خان حسینؔ، عوض رائے مسرتؔ، سیوارام جوہرؔ، مولوی غلام جیلانی رفعتؔ، احمد خان اظہرؔ، نواب محمد خان، مولوی احمد علی خان لودی کا نام تک معلوم نہ ہوا حال آں کہ ان کی تصانیف کا جس قدر حصہ بعد بربادی بچ رہا ہے وہ ان کی ادبی میدان میں سرگرمیاں دکھانے کا کافی ثبوت ہے۔ اس وقت اگرچہ کوئی اخبار یا علمی رسالہ یہاں سے نہیں نکلتا ہے مگر انجمن وایڈورڈ گزٹ و شاہ جہان پور گزٹ، و شاہ جہان پور پنچ و آریا درپن و ارمغان و سراج سخن و لیل و نہار کے فایل اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ ۱۸۶۰ء سے جب کہ ہندوستان میں اخبار نویسی پر توجہ ہوئی یہاں بھی بار بار اس کی

طرف میلان ہوا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ کس پائے کے تھے اور کس نظر سے دیکھے جانے کے قابل ہیں۔

بعض اصحاب غلطی سے یہ خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں اخبار نویسی کا رواج نہ تھا۔ تاریخ پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت میں اس وقت اخبار نویسی کا سررشتہ قایم تھا، جب کہ یورپ کو اس کی خبر تک نہ تھی۔.........

موجودہ طرز اخبار نویسی اور اس کی عمومیت یورپ کی ایجاد ہے، جس کو پریس نے زیادہ ترقی دی ہے۔ یہ امر ضرور قابل افسوس ہے کہ اس ضلع میں کوئی پبلک کتب خانہ نہیں اور جو مطبع جاری ہیں وہ علمی خدمت نہیں کرتے ہیں تاجرانہ اشتہار و شادی بیاہ کے رقعے وغیرہ چھپا کرتے ہیں۔

(۱۲)

زبان

اس ضلع کی زبان اردو ہے شہرو دیہات کی بول چال میں فصیح وغیر فصیح کا فرق ہے۔

شہری گواہ، مقدمہ، اظہار، عرضی، درخواست، سوال، دفتر، حضور اور
دیہاتی گیاہ، مکدمہ، اجہار، ارجی، درکہاست، سبال، دپھتر، حجور بولتا ہے۔

جن میں سوائے اختلاف اصوات ومخارج حروف کے اور کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں لفظ کے مفہوم کو یک ساں سمجھتے ہیں اوران کا ٹھیک استعمال کرتے ہیں۔ گزیٹر کا دیہاتی زبان کو مشابہ کنوجیا [قنوجیا] اور شہری کو اردو قرار دینا غلط ہے۔

اردو کی تولید واسباب:

اس مسئلے کی توضیح کرنے کے لیے اردو کی پیدائش کے وجوہ واسباب بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

سنو! اردو کسی ملک وقوم کی قدیم ومخصوص زبان نہیں ہے بلکہ وہ سنسکرت، بھاشا، عربی، فارسی، ترکی، پشتو، اور ہندوستان کی دیگر زبانوں کی معجون مرکب ہے، جس میں ایک صدی سے انگریزی تریاق بھی مخلوط ہو گیا ہے۔ اس کی بنا کسی مذہبی سیاسی یا کسی فرمانروا کی کوشش سے نہیں پڑی بلکہ تمدن ومعاشرت اس کے ظہور کا باعث ہوئے، یہ خیال محض بے بنیاد ہے کہ اس کی ولادت عہد شاہ جہان میں ہوئی وہ اس سے کئی سو برس پہلے پیدا ہوئی اور اس کی ولادت کے اسباب تو محمد بن قاسم ثقفیؒ کے حملے کے بعد ہی جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔

سندھ میں مسلمانوں کا ورود:

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب عماد الدین محمد قاسم ثقفیؒ پہلی صدی ہجری میں بہ عہد ولید بن عبدالملک اواسط ۹۲ھ سے آغاز ۹۵ھ تک سندھ و ملتان وغیرہ فتح کرتا ہوا آگے بڑھا اور خلیفہ کا فرمان بہ دست سفرا راجہ قنوج کے پاس بھیج کر خراج اطاعت و فرمان پذیری کا مطالبہ کیا۔ اس وقت سے آغازِ پانچ ویں صدی تک سندھ سے دیپال پور تک مسلمانوں کے قبضے میں تھا اور خلفاے مروانیہ وعباسیہ کے گماشتے اس پر حکومت کرتے تھے۔ ۱۰۱۷ء میں سلطان محمود غزنوی نے خلیفہ القادر باللہ ابن المقتدر باللہ عباسی کے والی سے سندھ کا انتزاع کر کے سلطنت غزنی کا بیرونی صوبہ اس کو قرار دیا۔ (مآثر الکرام، صفحہ ۵) اس تین سو برس کی طویل مدت میں سیکڑوں ہزاروں عرب و ترک وافغان خاندان اس ملک میں آباد ہو گئے۔ جن میں نامور علما و اولیا و اصفیا اور عامی و سپاہی ہر قسم کے لوگ تھے ابو جعفر ربیع بن صبیح السعدی البصری جو حسن بصریؒ و عطا جیسے ائمہ دین کا شاگرد اور سفیان ثوریؒ و وکیع و ابن مہدی جیسے عمایدِ ملّت کا استاد اور اسلام میں پہلا مصنف کہا جاتا ہے اور اتباع تابعین وثقات محدثین سے بتایا جاتا ہے سندھ میں موجود تھا اور اسی جگہ فوت ہوا۔ المغنی کہتا ہے: مات بارض السندہ سنة ستین و مائة. ان پردیسیوں کے دیسیوں کے ساتھ ایک سرزمین پر مجتمع و آباد ہونے سے ملکی و معاشرتی و اقتصادی و تمدنی ضرورتوں نے گہرے تعلقات قایم کیے جس کی وجہ سے ایک زبان پر دوسری زبان کے الفاظ چڑھنے لگے اور وہ اس کے معنی و مفہوم سے رفتہ رفتہ آشنا ہونے لگے اور ان کو اپنی زبان کے ساتھ ملا کر اظہار ما فی الضمیر کے لیے بولنے لگے جس کی وجہ سے پیدائش اردو کے اسباب مہیا ہونے لگے۔ علاوہ اس کے بغداد و ہندوستان کے سیاسی تعلقات قایم ہونے سے سنسکرت کی علمی کتابیں منصور اور رشید کے زمانے میں بغداد لائی گئیں اور ہندوستان کے پنڈت و بید بلا کر نوکر رکھے گئے اور ان کی امداد سے ترجمہ ان کا عربی میں کیا گیا جب مامون خلیفہ ہوا تو اس کی علمی سرگرمیوں نے سرشتۂ ترجمہ کو زیادہ وسعت دے کر ہندی علوم کا معقول ذخیرہ عربی کی تحویل میں منتقل کر دیا اور مسلمانوں کے علمی جذبات کو اس قدر

گرمایا کہ سنسکرت میں درجۂ کمال پیدا کرنے کا ولولہ ان کی طبیعتوں میں پیدا ہوگیا اور وہ تکمیل فن کے لیے ہندوستان آنے لگے۔ محمد بن اسماعیل تنوخی ہندوستان آکر برسوں تحصیل سنسکرت میں مصروف رہا ابومعشر فلکی نے دس سال ہندوستان میں تحصیل علوم میں صرف کیے اور استاد ابوریحان بیرونی نے سولہ برس ہندوستان میں رہ کر سنسکرت میں کمال پیدا کیا اور ہنود کے علوم وفنون و اخلاق و عادات وتمدن و معاشرت اور ہندوستان کے حالات پر ایک مبسوط کتاب لکھی جس کا نام ''کتاب الہند'' ہے اور بہت سی مفید کتابوں کے خلاصے وترجمے کیے اور بعض عربی تصانیف کو ہندوستان کے لیے ان کی زبان میں ترجمہ کیا۔ قاضی رکن الدین سمرقندی نے بعد تکمیل فن سنسکرت کی مبسوط و دقیق کتب کا بلا اعانت غیرے ترجمہ کیا مسعودی مورخ خود کھمیات آیا اور تحقیق احوال کر کے واپس گیا۔

ان علمی سرگرمیوں نے ہنود و مسلمانوں میں روابط قایم کر کے اختلاط السنہ کے ذریعے سے اسباب پیدائش اردو میں ایک مؤثر سبب کا اضافہ کیا۔

عہد سبکتگین:

چوتھی صدی ہجری میں سبکتگین نے ملتان کو غزنی کا صوبہ بنا کر ہنود کے لیے ملازمت کا دروازہ کھول دیا اور ایک فوج ان کی بھرتی کر کے پایۂ تخت غزنیہ میں تعینات کی جب محمود فرمانروا ہوا تو اس نے مقبوضات ہند کو وسیع کر کے سندھ پنجاب کو غزنی کا صوبہ بنایا اور لشکر ہنود میں بہت اضافہ کیا۔ سندر وناتھ اسی لشکر کے سپہ سالار تھے۔ اس کے زمانے میں سول محکموں میں بھی ہنود کو معزز عہدے دیے گئے۔ تلک جو مسعود کے زمانے میں نیالتگین کی بغاوت فرو کرنے کے لیے عظیم الشان لشکر کے مامور ہوا تھا خواجہ احمد ابن حسن میمندی کے دفتر میں مترجم رہ چکا تھا۔ (تاریخ بیہقی و تاریخ فرشتہ) اس کے زمانے میں ہزاروں مسلمان غزنی سے آکر لاہور و ملتان میں آباد ہوگئے اور متفرق طور پر ان تمام مقامات میں جہاں جہاں سیلابِ فتوحات محمودی و مسعودی پہنچا تھا کم وبیش پھیل گئے۔ علاوہ اس کے لاکھوں اسیران جنگ خراسان و خوارزم سے محمود

نے لاہور بھیج کران کواسی جگہ رہنے کا حکم دیا۔بیہقی کہتا ہے شوال ۴۰۷ھ میں خوارزم شاہ بہنوئی امیر محمود کا مارا گیا۔اس کا قصاص لینے کے لیے محمود خوارزم پر چڑھ گیا،تمام ملک کوتہ وبالا کرڈالا اوراسیران جنگ اس کثرت سے ہندوستان روانہ کیے کہ بلخ سے ملتان ولاہور تک تانتا لگا ہوا تھا۔(بیہقی:صفحہ۸۵۲) شیخ الہ یار بلگرامی نے لکھا ہے کہ ۴۰۹ھ میں سلطان محمود نے قنوج فتح کر کے محمد یوسف بن عاصم بن خالد بن داؤد عثمانی کو جوسلطان کی خدمت میں رہتا تھا۔قاضی بلگرام مقرر کیا اورایک دستہ فوج کا اس کی حفاظت کے لیے متعلق کیا۔مینے ایک بیع نامہ قطعہ آراضی واقعہ بلگرام مرقومہ چہارم شہر جمادی الاول ۴۲۱ھ دیکھا،جس پر طغرا ونشان قاضی محمد یوسف کا بنا ہوا تھا۔(حدیقۃ الاقالیم قلمی) ان مسلمانوں میں جو آلِ سبکتگین کے عہد میں ہندوستان آبسے تھے جلیل القدر علما ومشہور ادیب ونامور شعرا ومشائخ تھے۔

عہد سلطان مسعود:

مسعود سعد سلمان رازی عہد سلطان مسعود کا نامور شاعر ۴۳۰ھ میں لاہور پہنچ گیا تھا۔اس نے وہاں رہ کر ہندی زبان میں ایسا کمال حاصل کیا کہ اپنے خیالات مثل اہل زبان کے اس میں موزوں کرتا تھا اور دیوان ہندی مرتب کیا تھا۔ملا عبدالقادر بدایونی اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''واو دیوانِ عربی وفارسی وہندی دارد۔''(تاریخ بدایونی:جلداول،صفحہ۳۸)

استاد ابوالفرج رونینی مداحِ سلطان مسعود وسلطان ابراہیم بھی نواح لاہور کا رہنے والا تھا۔(تاریخ بدایونی:صفحہ۳۷) مولانا حسن صغانی لاہوری کا خاندان کئی پشت سے لاہور میں مرکز فضایل ظاہری وباطنی چلا آتا تھا اوراسی جگہ ۵۷۰ھ میں آپ کی ولادت ہوئی۔(تحفۃ العقلا:صفحہ۴۸)

صاحب کشف المحجوب علی بن عثمان الہجوری المتوفی ۴۶۵ھ وشیخ فخر الدین زنجانی پیرارشاد شیخ سعدالدین حموی لاہور میں اورشاہ یوسف گردیزی المتوفی ۵۵۰ھ ملتان میں تھے۔(آثرالکرام:صفحہ۶)

ہند غزنی تعلقات کا نتیجہ:

غرضے کہ ہندوستان و غزنی میں مستقل طور پر سیاسی تعلقات قایم ہو جانے سے سلسلۂ ایاب و وذہاب نہایت وسیع ہو گیا، عوام ہنود شاہی ملازمت میں داخل ہونے کے لیے اور راج گان ہند اوران کے سفرا سیاسی مقاصد اور ملکی ضرورتوں سے وہاں جاتے تھے جس کا ذکر تاریخ بیہقی کے صفحات پر موجود ہے۔ اور ہزاروں مسلمانوں کو بلا کران کے کمال سپہ گری کی وجہ سے اپنی فوجوں کی درستی کے لیے نوکر رکھتے تھے، جس کی وجہ سے ان کی خاصی تعداد ہندوستان میں جمع ہو گئی تھی۔ (تاریخ فرشتہ مقالہ دوم: ص ۸۸) جن میں سے بعض کے نام پرتھی راج رائسا میں چند کی زبان سے سنائی دیتے ہیں۔

اس اختلاط وارتباط کے اثر سے ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں مخلوط ہو کر ملک میں تیزی سے پھیلنے لگے اوران کے صحیح مفہوم سے واقف ہو جانے کی وجہ سے شعرا نے ان کا استعمال شروع کر کے اس رفتار کو اور تیز کر دیا۔

پرتھی راج رائسا کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بیسوں الفاظ عربی، فارسی، ترکی، پشتو کے جیسے پیغام، شاہ، سلطان، بادشاہ، خَلق، فرمان، حضرت، آواز وغیرہ شاعر کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ جن کو وہ بے تکلف موزوں کرنا چلا جاتا ہے۔

راجہ شیو پرشاد سی ایس آئی جو اردو زبان کے خلاف رائے رکھتے ہیں، مشہور زمانہ تھے واقعات سے مجبور ہو کر آئینہ تاریخ نما کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ

> ''اردو اب ہماری مادری زبان بنتی جاتی ہے اور وہ ممالک مغربی وشمالی (صوبہ آگرہ واودھ) میں کم وبیش بڑی اچھی ہر شخص بولتا ہے اور فارسی الفاظ جیسے ''آتش، معروف، شتاب، زنبور، کوہ، سردار وغیرہ ہمارے سب سے پہلے ہندی مصنف چند نے جو پرتھی راج کا مشہور بھاٹ تھا استعمال کیے ہیں۔''

پس ظاہر ہے کہ شہاب الدین غوری کی فتوحات سے پہلے برج بھاشا نے عربی وفارسی وترکی لفظوں کو اپنی آغوش میں لینا شروع کر دیا تھا اور ولادت اردو کا زمانہ قریب آگیا تھا۔

شہاب الدین غوری کا عہد:

جب شہاب الدین غوری نے پرتھی راج کو شکست دے کر دہلی کو دارالسلطنت بنایا اور مسلمان شمالی ہند میں ہر طرف پھیل گئے اور رعایا کو حکام اور حکام کو رعایا کے خیالات وجذبات سے واقف ہونے کی ضرورتیں روز بہ روز بڑھنے لگیں تو برج بھاشا نے فاتح زبان کو کشادہ دلی سے اپنے حلقۂ اثر میں جگہ دے کر اس کے الفاظ کو جو پہلے سے کسی قدر زبانوں پر چڑھے ہوئے تھے، اپنے الفاظ وروابط کے ساتھ ترکیب دے کر ٹوٹے پھوٹے جملوں اور فقروں کے قالب میں ڈھالنا شروع کر دیا جس سے اردو کی ولادت ہوئی اور مسلمان ادبا وشعرا نے اس کو ہونہار بچہ سمجھ کر اس کی پرورش وغور و پرداخت پر خاص طور سے توجہ کی خسرو نے جو دور اول (میں) حکومت اسلامیہ کے بلند پایہ شاعر ہیں، سنسکرت و بھاشا میں کمال پیدا کیا اور کئی بڑی بڑی جلدوں میں خالق باری لکھ کر جس کا ایک مختصر ٹکڑا آج بھی مکاتب میں بچوں کو پڑھایا جاتا ہے، لکھ کر مرادف الفاظ بھاشا وعربی وفارسی وترکی کو عام فہم بنانے کی بنا ڈالی اور سیکڑوں ہزاروں دوہرے پہیلیاں، مکرنیاں، دوسخنے، ڈھکوسلے، گیت، انمل، رباعیاں، ٹھمریاں کہہ ڈالیں، جنھوں نے ملک میں فارسی کے ساتھ بھاشا کے مخلوط کرنے کا مذاق پیدا کر دیا۔ بہ طور نمونے کے ہم چندان میں سے اس جگہ پر لکھتے ہیں۔ شایقینِ تفصیل کو ''اعجاز خسروی'' پر نظر ڈالنا چاہیے۔

رباعی

من دوش گزر کردم در کوے سمنا کے — او جانب من دیدہ من جانبِ او ''تاکے''

خندید و بہن گفتہ اے خسرو بے باکے — من عہد وفا کردم ''چل مار گولر پاکے''

پہیلی۔ آئینہ

فارسی بولے آئینہ۔ ترکی سوچے پائے نا — ہندی بولتی آرسی آے منہ دیکھو جو اسے بتاے

پہیلی۔ ناخن

بیسوں کا سر کاٹ لیا — نا مارا نا خون کیا

آشوبِ چشم کا نسخہ دوہروں کی بحر میں

لودھ۔پھٹکری۔مردہ سنگ افیون چنا بھر مرچیں چار پوست کے پانی پوٹلی کرے
ہلدی۔زیرہ ایک ایک ٹنگ اُور د برابر تھوتھا ڈار پرت بھر نینوں کو بھرے

دو سخنے

گوشت کیوں نہ کھایا ڈوم کیوں نہ گایا۔ گلا نہ تھا
جوتا کیوں نہ پہنا سنبوسہ کیوں نہ کھایا، تلا نہ تھا
انار کیوں نہ چکھا وزیر کیوں نہ رکھا۔ دانا نہ تھا
داریم آرزو کہ حکایت کنیم بات ہر برہمن کہ دید رخ خوب آں صنم
لالہ غلام روئے تو صد برگ زیر پات زنار را گسست لکدرو بہ روے لات

رباعی

رفتم بہ تماشائے کنارِ جوے دیدم بلب آب زن ہندوے
گفتم صنمابائے مویت چہ شود فریاد بر آورد کہ دُر دُر موئے

رباعی

تیلی پسرے کہ می فرو شد تیلے از دست و زبان حرف او واویلے
خالے برخش دیدم و گفتم تل است گفتہ کہ برونیست دریں تل تیلے

رباعی

حجام پسر بہ خوبی و رعنائی چوں آئینہ رخ نمود در زیبائی
گفتم صنما کہ من بیایم بتو شام فریاد بر آورد کہ نائی نائی

تغلق،لودھی اور سوری عہد:

سلطان فیروز تغلق نے جوالامکھی کی سیر کے وقت تیرہ سو قدیم سنسکرت کی کتابیں ہاتھ آنے پر ان کا ترجمہ کرانا شروع کیا۔ان میں سے ایک کتاب حکمت طبیعہ کو مولانا عزیز الدین نے نظم میں ترجمہ کر کے فیروز شاہی نام رکھا جس پر سلطان نے گراں قدر صلہ عنایت کیا۔

سکندر لودی نے کایستوں کو فارسی کی تعلیم دلا کر دفتر کی ملازمت میں داخل کیا،

ان کی زبانوں پر عربی و فارسی کے الفاظ اس طرح بیساختہ آنے لگے جس طرح آج کل انگریزی دانوں کی زبان پر انگریزی الفاظ آجاتے ہیں اور وہ برج بھاشا کے ساتھ ان کو ملا کر بولنے لگے، جس سے اردو کے دایرے نے وسعت اختیار کی اور نئی نئی تراکیب و جملے پیدا ہونے لگے۔ اسی زمانے میں گرورامانند کے چیلے کبیر شاہ عربانی "کبیر پنتھ" نے اپنے دوہروں میں فارسی و عربی الفاظ کو بھاشا کے ساتھ باندھنا شروع کیا۔ (آئین اکبری: جلد دوم، صفحہ ۷۸) جس سے عربی و فارسی و ترکی کے الفاظ عوام تک پہنچ کر اردو کی اشاعت میں معاون ہوئے اور مسلمان صوفیہ کو بھی اسی رنگ میں اپنے خیالات موزوں کرنے کی ترغیب ہوئی۔ چناں چہ شاہ رزق اللہ دہلوی المتوفی ۸۹۷ھ نے جو ہندی کے زبردست شاعر اور راجن تخلص کرتے تھے دو رسالے پیم آسن وجوت نرنجن بھاشا میں لکھے۔ (تحفۃ الفضلا: صفحہ ۶۳) جن کی اشاعت نے مصطلحات تصوف کو اردو کے قبضے میں دے دیا۔

ملک محمد جائسی نے شیر شاہ (غوری) کے زمانے میں پدماوت کی داستان نظم کر کے اس میں اضافہ کیا۔ شیر شاہ و سلیم شاہ نے ہندی و فارسی کو بغل گیر کرادینے پر اس قدر توجہ کی کہ اپنے ناموں کے ساتھ "سری" کا لفظ لگا کر سری شیر شاہ و سری سلیم شاہ ہندی حروف میں سکوں پر ثبت کرایا۔

مغلیہ عہد:

اکبر نے سررشتہ ترجمہ اعلا پیانے پر قایم کر کے قابل علما اور مشہور پنڈتوں و ہندی زبانوں کو اس میں مقرر کیا۔ پنڈتوں اور علما میں قربت پیدا ہونے سے ایک کو دوسرے کے محاورات و مصطلحات سے واقفیت حاصل کر کے معلومات میں اضافہ کرنے کا موقع حاصل ہوا اور ادبی و تاریخی و علمی الفاظ مہیا ہو جانے سے بھاشا کی سطح پر اردو کی عمارت تعمیر ہونے کا زیادہ مصالحہ فراہم ہو گیا۔

اکبر کی توجہات نے مسلمانوں میں بھاشا سیکھنے کا شوق پیدا کیا جس نے طبقۂ امرا کو اپنے حلقۂ اثر میں داخل کر لیا۔

خان خانان عبدالرحیم ہندی کا نامور شاعر تھا (تزک جہانگیری)۔شاہ محمد بن شیخ معروف فرملی جس کی منظومات کا گراں قدر ذخیرہ موجود ہے، نظم ہندی کا مشہور استاد تھا آزاد بلگرامی کہتا ہے:

''شاہ محمد در نظم ہندی استادِ کامل بود و گوے نکتہ سنجی از اقران مے ربود جمیع ماہرانِ ایں فن امروز استادی اور تسلیم مے کنند و سخن اورا بجان خریداری می نمائید۔'' (سروآزاد: صفحہ ۳۵۲)

اکبر کے وزیر مال راجہ ٹوڈرمل نے اپنی قوم کو آگے بڑھانے کے لیے دفتر ہندی سے فارسی میں منتقل کرایا جس کی وجہ سے ہنود تحصیل زبان فارسی کے میدان میں سرگرمی سے تگ و دو کرنے لگے اور مسلمانوں کے محاورات ہنود کی زبان پر روز بہ روز تیزی سے چڑھنے لگے اس دور میں ہندو مسلم اختلاط کا رنگ شاعری میں عجیب انداز سے نمایاں ہونے لگا۔

جہانگیر کے زمانے میں عواص شاعر نے طوطی نامہ اس طرح نظم کیا کہ ایک مصرعہ فارسی اور دوسرا ہندی میں تھا۔ جب شمالی ہند نے اختلاط السنہ میں سرگرمیاں دکھائیں تو دکن بھی اس سے متاثر ہو کر دلچسپی لینے لگا۔ابراہیم عادل شاہ فرمانروائے بیجاپور نے اس قدر اظہار شغف اس معاملے میں کیا کہ سلطنت کا دفتر جو قدیم سے فارسی میں تھا، ہندی میں منتقل کر دیا۔قاسم فرشتہ نے ہندوؤں کے بیدک (علم طب) کو فارسی میں منتقل کرنے کے لیے ''اختیارات قاسمی'' تصنیف کی۔(تاریخ فرشتہ)

غرضے کہ اکبر کے زمانے میں ہنود کے فارسی اور مسلمانوں کے بھاشا سیکھنے سے فارسی و بھاشا کے خلط ملط ہونے کی رفتار نہایت تیز ہوگئی واور شجر اردو کا سایہ زیادہ رقبے پر پڑنے لگا اور اس کی اولاد کے عہد میں اس کے اثر میں اس قدر وسعت پیدا ہوئی کہ شاہ زادے اور مستند علما و مشائخ اس میں کمال حاصل کرنے پر متوجہ ہوئے۔ اورنگ زیب بھاشا میں درجۂ کمال رکھتا تھا۔(مآثر الامرا ذکر فضائل خان: جلد ۳، ص ۴۰)

ہندی میں بھی ان کی رفعت و شان مسلمہ ہے۔ان کے منظومات میں ''سکہ نکھ'' ان کے کمال کا ادنی نمونہ ہے اور ان کے ہم شیر زادہ سید غلام نبی بلگرامی جن سے مرزا

مظہر جان جاناںؒ کو تلمذ تھا تو اس بحر بے پایاں کی شناوری میں یکتائے زمانہ جانے جاتے ہیں۔ انک درپن رس، پر بودہ ان کی طباعی کی یادگار ہیں۔ صاحب البرکات سید برکت اللہ مورث خاندان مشایخ مارہرہ مقامی عرفان زبان ہندی میں جوش و خروش سے بیان فرماتے تھے اور پیمی تخلص کرتے تھے ''پیم پرکاش'' رسالہ ان کا جس میں دوہا، گیت، بشبند، دھرپد مشہور معروف ہیں۔ (سروآزاد: فصل ثانی)

مگر اس مخلوط زبان کو جس کی ولادت عہد شاہ جہان سے سیکڑوں برس پہلے ہوئی تھی، لقب اردو اسی عہد میں حاصل ہوا۔ وجہِ تلقیب یہ ہے کہ اس وقت تک گھروں میں جہاں سب ایک زبان کے جاننے والے ہوتے تھے اس زبان کے بولنے کی ضرورت نہ ہوئی تھی۔ اس کی ضرورت صرف اردوے معلیٰ میں پڑتی تھی جہاں مختلف دیار و امصار کے مختلف اللسان لوگ موجود تھے اور تبادلۂ خیالات کے لیے مخلوط و مشترک زبان کی حاجت تھی۔

اورنگ زیب کے پچپن سال متواتر دکن میں مقیم رہنے سے اردوے معلیٰ بھی اسی جگہ رہا۔ اس لیے اس زبان کا بھی نشو ونما زیادہ تر جاری رہا جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ نظم اردو کا دکن سے ظہور ہوا جس کی طرف میر تقی ایک شعر میں اشارہ کرتے ہیں:

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

اور قایم ان کا معاصر کہتا ہے:

قایم میں غزل طور کہا ریختہ ورنہ
ایک بات لچر سی بہ زبان دکھنی تھی

بہ ہر حال عالم گیر کے عہد میں ولی اللہ متخلص ولی پیدا ہوا جو احمد شاہ کے ساتھ دہلی آیا اور وہاں ٹھہر کر اس نے اردو شاعری کا چراغ روشن کیا جو محمد شاہ کے زمانے میں ماہ تاب اور شاہ عالم کے عہد میں آفتاب ہو کر آسمان سخن پر نمودار ہوا۔ اس نے اپنا دیوان اردو میں مرتب کیا جو ۳ سالِ جلوس محمد شاہی میں دہلی پہنچا۔ اس کا نمونہ کلام یہ ہے:

غزل

آیا توں کمر باندھ کے جب جورو جفا پر — میں جیو کوں تصدق کیا تجھ بانکی ادا پر
مجھ دیدۂ خوں بار میں یک بار قدم رکھ — اے شوخ تیرا جیو ہے اگر رنگ حنا پر
انکھیاں ہیں یو خوبان جہاں کی کہ لگی ہیں — بوٹی نہیں نرگس کی صنم تری قبا پر
تشبیہ جو تجھ خط کوں دیا مشک وختن سوں — عالم کو دو آگاہ کیا اپنی خطا پر
دشوار ہے حیرت سوں وؔلی اس کوں نکلنا — باندھا ہے جو دل اس رخ آئینہ نما پر

اردو نثر کے ابتدائی خدمت گذار:

مجلس شعرا میں باریاب ہونے کے بہت زمانے بعد اردو کو نثر نویسوں سے روشناس ہونے کا موقع حاصل ہوا اور علمی وادبی حلقوں میں تو اس کی رسائی اس کے بھی بہت بعد ہوئی مصنفین و مترجمین عربی و فارسی کو تصنیف و تالیف کے لیے موزوں سمجھتے تھے اور علوم وفنون کی کتابیں اور مذہبی مناظروں کے رسالے اپنی زبانوں میں تصنیف کرتے تھے اور عربی کے تراجم بھی فارسی میں کیے جاتے تھے۔ خط و کتابت فارسی میں ہوتی تھی اور سارے مکتبوں میں بچوں کو فارسی ہی پڑھائی جاتی تھی۔ مکتب میں اردو شاعروں کی تعداد روز بہ روز بڑھ رہی تھی مگر اردو نثر لکھنے کا کسی کو شوق نہ تھا۔ مدت بعد اردو بول چال کی ترقی نے فارسی انشا پردازوں کو اس طرف راغب کر کے نثر نویسی پر مایل کیا اور فضلی نے ''دہ مجلس'' لکھی، مرزا رفیع سوؔدا نے میؔر کی مثنوی ''نوحہ عشق'' کو نثر میں کیا اور اپنے ''کلیات'' کا دیباچہ نثر میں لکھا۔ میر عطا حسین خان تحسیؔن نے ''چار درویش'' کا قصہ ۱۷۹۸ء میں بہ عہد آصف الدولہ ختم کیا۔ ۱۷۹۹ء میں میر شیر علی افسوؔس نے باغ اردو اور ۱۸۰۵ء میں ''آرایش محفل'' لکھی۔

۱۸۰۲ء میں میر امؔن دہلوی نے ''باغ و بہار'' اور ۱۸۰۵ء میں ''قواعد اردو'' لکھی پھر رجب علی سرؔور لکھنوی نے ''فسانہ عجایب'' لکھا جو اپنے طرزِ خاص کی وجہ سے اس زمانے میں نہایت مقبول ہوا، مگر علمی حلقوں نے اردو نثر کی طرف ۱۸۰۷ء کے قریب توجہ مبذول کی۔

خاندانِ شاہ ولی اللہ:

شاہ عبدالقادر دہلویؒ فرزند شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے قرآن مجید کا ترجمہ اردو میں کیا۔ شاہ صاحب کا اردو پر نظر التفات ڈالنا معمولی بات نہ تھی۔ جو علمی حلقوں میں بغیر گہرا اثر ڈالے رہ جاتی۔ ان کی تقلید میں ان کے بھتیجے اور شاگرد رشید مولوی اسماعیل شہیدؒ نے کئی رسالے اردو میں لکھے اور مفتی عنایت احمدؒ نے تو اسی زبان کو اپنی تصانیف کے لیے عموماً پسند کیا۔

مولوی سلطان خان شاہ آبادی نے ''رشید المومنین''، ''زینت الایمان''، ''شجرۂ القانیہ'' و دیگر رسالے اردو میں لکھے۔ اس کے بعد مولوی قطب الدین خاں دہلوی نے تصانیف و تراجم کے ذریعے سے اردو کی تحویل میں دینیات کا معقول سرمایہ فراہم کر دیا تب گروہ علما میں اردو تصنیف و تالیف کے قابل سمجھی گئی۔

غالب و سر سید کا عہد:

آخر میں مرزا غالبؔ دہلوی نے نثر نویسی کا ایک نیا پیرایہ ایجاد کیا جو سادگی و روانی کی وجہ سے بہت پسند ہوا ''عود ہندی'' و ''اردوئے معلّٰی'' اس جدید طرز کا آئینہ ہیں اور سر سید احمد خان، خواجہ الطاف حسین حالیؔ، مولوی نذیر احمد دہلوی، محسن الملک سید مہدی علی خان، محمد حسین آزاد دہلوی، علامہ شبلی نعمانی وغیرہم ارباب قلم نے اس کی سادگی میں صفائی اور صفائی میں جلا پیدا کی ''تہذیب الاخلاق'' علی گڑھ، ''اودھ پنچ'' لکھنؤ، ''تیرھویں صدی'' آگرہ، ''فسانۂ آزاد''، ''سیر کہسار'' نے نثر نویسی کے نقود ڈھالنے کے لیے سانچے ملک کے سامنے پیش کیے، جس سے ادبی حلقوں میں نئی روح پیدا ہوگئی۔

۱۸۳۵ء میں برٹش گورنمنٹ نے فارسی کو دفتر سے خارج کر کے اردو کو اس کا جانشین کیا اور ۱۸۴۲ء میں اردو میں علوم و فنون جدیدہ کے ترجمہ کرانے کے لیے دہلی میں ''سوسایٹی'' قایم کی تب اردو نے گورنمنٹ کی حمایت سے فارسی کو پیچھے ہٹانا شروع کیا اور نظم و نثر کے تمام شعبوں پر قابض و متصرف ہوگئی۔

اب اگر ہندوستان کے گوشے گوشے میں کسی زبان کا بولنے اور سمجھنے والا مل سکتا ہے۔تو وہ اردو ہے اور اپنی عمومیت کے لحاظ سے وہ لینگوا فرینکا ہونے کا دعویٰ صحیح طور سے کرسکتی ہے۔اسی وجہ سے ملکہ معظمہ وکٹوریہ قیصرۂ ہند نے اس کو ہندوستانی زبان سمجھ کر ایک استاد ہندوستان سے بلوا کر اس میں لکھنا پڑھنا سیکھا اور ۱۳ر دسمبر ۱۹۱۱ء کو شاہی دربار دہلی میں شاہی اعلان کے اشتہار کے لیے اسی کو منتخب کیا گیا اور پروگرام دربار کا بھی اس میں شایع کیا گیا۔

اردو اخبارات:

صوبہ جات متحدہ آگرہ واودھ کی انتظامی رپورٹ ۹-۱۹۰۸ء میں موقتہ الشیوع اخباروں اور رسالوں پر ریویو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ۱۲۱ رسالوں و اخباروں میں سے، ۱۶۵ اردو، ۳۱ ہندی، ۱۳، انگریزی اور ۱۳ اردو من انگریزی۔ ہندی وغیرہ ملی جلی ہوئی زبانوں میں نکلتے ہیں جو کھلا ہوا ثبوت اس بات کا ہے کہ ملک کی تمام آبادی اردو لکھنے پڑھنے کی خوگر ہے اور ہندی کا نام برائے نام ہے قوم کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ۶۰ فی صدی اخبار ہنود، ۳۳ فی صدی مسلمانؑ، باقی عیسائیوں کی ایڈیٹری میں نکلتے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہنود جس طرح شمار میں مسلمانوں سے بڑھے ہوئے ہیں، اسی طرح اردو کے استعمال میں بھی زیادہ تعداد میں آگے ہیں۔

ناگری رسم خط کا رواج:

۱۹۰۰ء میں لارڈ مکڈانل صاحب نے جو اس وقت لفٹنٹ گورنر اس صوبے کے تھے ناگری رسم خط کو عدالتوں میں مروج کرنے کی نیت سے ایک ریزولیوشن جاری کیا مگر مسلمانوں کی چیخ پکار کی وجہ سے وہ عملی طور پر معطل وغیر موثر رہا۔ اور ایسا ہی ہونا چاہیے تھا، کیوں کہ اردو ہندو اور مسلمانوں کی یک ساں زبان ہے۔ دونوں اس پر یک ساں حق رکھتے ہیں۔اس کی پیدائش بھاشا کے بطن سے ہوکر پرورش اس کی فارسی و عربی وترکی و ہندوستان کی اور زبانوں کی گود میں ہوئی۔ وہ تمام ہندوستانی زبانوں

کے خواہ وہ اصلی باشندگان ہند کی ہو یا باہر سے آئی ہوئی دیگر قوموں کی ہو، الفاظ اپنی تحویل میں رکھتی ہے اور ہر شخص اپنے اس مخاطب سے جو اس کا ہم زبان نہ ہو تبادلۂ خیالات کرنے کے لیے اس کو کام میں لا سکتا ہے۔

دیہاتی اور شہری زبان:

یہ قدرت کا اقتضا ہے کہ وہ دیہاتی حلقوں میں جن کو بیرونی زبانوں کے سننے یا ان کے بعض الفاظ کا صحیح تلفظ مقدم کرنے یا شہریوں سے زیادہ ملنے جلنے کے مواقع حاصل نہ تھے۔ اپنے اصلی زبان کے بوجھ سے زیادہ دبی رہی اور اپنے الفاظ کی کثرت دیہاتیت سے مثل ستھری زبان کے صاف وستھری نہیں ہوئی جس کی وجہ سے فصیح و غیر فصیح کی حد فاصل قایم ہوگئی۔ یعنی دیہاتی زبان کثرتِ الفاظ اور روابط وافعال برج بھاشا کی وجہ سے غیر فصیح اور شہریوں کی زبان بہ وجہ کثرت تراکیب فارسی کے جو عرصے تک سرکاری دفتر و حکم ران قوم کی زبان رہنے سے ملک پر چھائی ہوئی تھی، فصیح قرار پائی۔ مگر ترکیب عنصری کے لحاظ سے دونوں اردو ہیں، اور فصیح اور غیر فصیح کا فرق صنفی اختلاف سے زیادہ رُتبہ نہیں رکھتا ہے۔

مقامی زبان اور اردو:

اب ہم مقامی زبان کی تاریخی حالت پر نظر ڈالتے ہیں، شہر کی آبادی سے پہلے یہاں گوجر آباد تھے اور وہی زبان بولتے تھے جو روہیل کھنڈ دوآبہ کے دیہات وقصبات میں مروج ہے۔ جب گوجروں کو ہٹا کر شہر کی بنیاد ڈالی گئی اور افاغنہ جو پہلے سے فوج شاہی میں ملازم تھے یا جو افغانستان سے آئے تھے، یہاں آباد ہوئے تو وہ پشتو اپنی مادری زبان اور ہنود جو فوج و دیگر قصبات و دیہات سے آکر اس نو آبادی میں آباد ہوئے، اپنی زبان اپنے ساتھ لائے اور ہم زبان مخاطب سے گھروں میں خطاب کرنے کے وقت ہر شخص اپنی زبان استعمال کرتا تھا۔ مگر غیر زبان بولنے والے مخاطب سے اظہار خیال کرنے کا وہی طریقہ مروج ہوا جو اردو کے ظہور کا علت تامہ تھا۔ لہٰذا

آبادی شہر ہونے پر اردو کا تخم اس سرزمین میں مقتضیاتِ زمانہ کے ہاتھوں سے بویا گیا اور معاشرتی ضرورتوں کی آب یاری سے وہ نشوونما پا کر تناور ہو گیا۔ تاہم افغانی خاندانوں میں پشتو کم وبیش کسی نہ کسی صورت سے دو تین پشت تک متروک نہیں ہوئی اور بعض الفاظ اب تک مستورات کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں، جن کی مختصر فہرست ہم اس جگہ درج کرتے ہیں:

۱	خسم	پشتو میں	شوہر	کو کہتے ہیں
۲	خیل		گروہ	
۳	روغ		تن درست	
۴	رنزول		بیمار	
۵	کور		گھر	
۶	کوچئ		گوندھے ہوئے بال	
۷	خورین		ہڈی و گوشت	
۸	اڑنگ بڑنگ		ایک ناہموار	
۹	خیلا		بے وقوف لڑکی	
۱۰	پیغلا		جوان شریر لڑکی	
۱۱	زیلی		جوان شریر لڑکا	
۱۲	بھولا		سیدھا و نادان	
۱۳	چکڑ ہڈہ		چھکڑا، گاڑی	
۱۴	ناؤخت		ناوقت و بے وقت	
۱۵	لبدڑ		گاڑھا و غلیظ	
۱۶	یازپشین		نماز ظہر	
۱۷	مازختن		نماز عشا	

۱۸	جَبہ		زبان، میٹھی	
۱۹	بلاغنڈ		بیل	
۲۰	زن قدن		جان کندن۔ نزع	
۲۱	پیرزو		پیار۔ محبت	
۲۲	تورہ		تلوار۔ افغانستان میں ایک قبیلے کا تورہ دوسرے قبیلے سے اس وقت قایم ہوتا ہے جب کہ جنگ میں شریک ہونے کا معاہدہ ہو۔	
۲۳	تمن	ء	گروہ، خاندان، برادری	
۲۴	ناط		رشتہ، قرابت	

دہلی سے سیاسی تعلقات وسلسلۂ ایاب وذہاب ڈیڑھ سو برس تک قایم رہنے سے یہاں کی زبان میں وہاں کے محاورات کی جھلک زیادہ نمایاں ہے ''تلک'' ''آئے ہے'' ''جائے ہے'' وغیرہ وغیرہ بولتے تھے۔ لکھنؤ سے اگرچہ ۲۸ سال تک سیاسی تعلق رہنے کی وجہ سے زبان پر زیادہ اثر نہیں پڑا مگر بعد میں شعرا نے جو اساتذہ لکھنؤ سے زیادہ تر مستفیض ہوئے محاورات لکھنؤ کو زیادہ پھیلایا اس لیے اب بہ مقابلہ دہلی کے لکھنؤ کا رنگ زیادہ گہرا نظر آرہا ہے۔

(۱۴)

شاہ جہان پور کے مدرسے اور اسکول

ابتدائی دور

ذیل کے صفحات میں شاہ جہان پور کی قدیم تاریخ تعلیم پیش نہیں کی جا رہی ہے۔ اس کے حدود و خصوصیات پیش نظر مقصد تالیف سے باہر ہیں۔ یہ شاہ جہان پور کے قیام کے زمانے سے تا طلوع صبح آزادی تعلیمی فضا کا ایک سرسری جائزہ ہے۔ ۱۹۵۰ء میں شاہ جہان پور کی زمین سے ہمارا دانہ پانی اٹھا تھا۔ اس وقت فضا کچھ ایسی ہی تھی۔

۱۹۴۷ء تک شاہ جہان پور میں کسی کالج کا وجود نہ تھا۔ وطن کی قسمت سوئی ہوئی تھی۔ اب شہر اور ضلع میں کئی کالج کھل گئے ہیں اور امیر و غریب کے لیے حصول تعلیم کی راہیں آسان اور کھلی ہوئی ہیں اور وہ وقت آ گیا ہے کہ وقت کا مؤرخ شاہ جہان پور کی نئی تاریخ لکھنے کی فکر کرے۔ معلوم نہیں یہ تاریخ لکھنے کا وقت کب آئے گا اور آزاد ہندوستان کے ایک بہادر اور مہذب شہر کی نئی تاریخ کے مطالعے کی آرزو پوری ہو گی یا نہیں؟ لیکن تاریخ جب بھی لکھی جائے گی مجھے خوشی ہو گی کہ قدیم تاریخ کا یہ مواد نئی تاریخ کی بنیاد کو مضبوط کر دے گا اور اس کے صفحات کے آئینے میں آنے والی نسل اپنے بزرگوں کی پاکیزہ سیرت، اپنی قدیم تعلیم، تہذیب، اخلاق اور قومی اور مقامی و زمینی خصوصیات کی تصویریں دیکھ سکے گی۔

''قدیم زمانے میں دستور تھا کہ علما اپنے گھروں پر یا مساجد میں بیٹھ کر درس دیا کرتے تھے اور مدرسے کے نام سے شہروں و قصبوں میں ضرورت کے لحاظ سے متعدد عمارتیں ہوتی تھیں یہاں بھی شہر کے آباد ہوتے ہی وہی دستور جاری ہوا۔

مدرسہ خواجہ خضر:

شروع ہی میں ایک مشہور عالم خواجہ خضر نامی جو شیخ عثمان صاحب متانی کے استاد تھے گاڑی پورہ میں آباد ہو کر درس دینے لگے۔ نواب بہادر خان نے ان کو وسیع قطعۂ آراضی بہ طور مدد معاش عطا کیا جو گاڑی پورہ سے ملا ہوا جانب شرق واقع ہے اور چک خواجہ خضر کے نام سے مشہور ہے۔

مدرسہ ملا عبدالحمید:

اسی زمانے میں دوسرے مستند عالم ملا عبدالحمید خان افغانستان سے آکر محلہ قاضی خیل میں آباد ہوئے اور مسجد کے متصل مدرسہ تعمیر کیا۔ شاہ عالم بہادر شاہ نے پانچ سو بیگہ آراضی بہ طور معاش ان کو عطا کی۔

مدرسہ بحر العلوم:

بارھویں صدی میں یہاں کئی درس گاہیں تھیں جن میں سب سے زیادہ مشہور محلہ باقر زئی کا مدرسہ تھا جو نواب عبداللہ خان نے ملک العلما مولانا بحر العلوم کے لیے تیار کرایا تھا۔ اس مدرسہ میں ملک العلما نے برسوں تک درس دیا اور بڑے بڑے نامور علما سند فراغ لے کر نکلے اور اطراف ہند میں انھوں نے علمی فیوض و برکات کے چشمے جاری کیے مولانا کے تشریف لے جانے کے بعد ۱۱۸۸ھ میں وہ ویران ہو گیا۔......

مدرسہ مولوی ظریف:

دوسرا مشہور مدرسہ محلہ ملا خیل میں مولوی ظریف خان کا بنا جو حافظ رحمت خان نے تیار کرایا تھا وہ آج تک مدرسہ کہلاتا ہے گو عرصہ سے مسکن ہے۔

مدرسۂ ضیا خیل:

"ایک اور نامی مدرسہ جو خاندان علمائے ضیا خیل سے متعلق تھا صحن جامع مسجد سے ملا ہوا شرق میں تھا جو اب مزروعہ کھیت کی شکل میں ہے۔

اب بھی شہر میں چندے سے کئی مدرسے جاری ہیں مگر ایک بھی ایسا نہیں ہے

جس سے بہ وجہ خرابی طرز تعلیم ونصاب تعلیم روشن ضمیر علما پیدا ہونے کی توقع معقول طور سے کی جاسکتی ہو۔" (تاریخ مطبع: صفحہ ۶۹-۱۶۸)

دوسرا دور-۱۸۵۷ء کے بعد

مدرسہ سعیدیہ جامع مسجد:

مولوی صبیح الدین نے جب وہ اپنی تاریخ شاہ جہان پور لکھ رہے تھے۔ یہ تاریخ انھوں نے ۱۹۲۹ء، ۱۹۳۰ء لکھنی شروع کی اور چند برسوں میں مکمل کر کے ۱۹۳۲ء میں شایع کی تھی اس میں لکھتے ہیں کہ

> "چھ سات سال کا عرصہ ہوا کہ حاجی محمد سعید خان صاحب سوداگر نے شہر کے بچوں کی تعلیم کے واسطے قایم کیا ہے۔"

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ مدرسہ ۲۵-۱۹۲۴ء میں قایم ہوا ہوگا۔ مولوی صبیح الدین کے بیان کے مطابق حاجی صاحب نے چھ ہزار رُپے سالانہ جائیداد وقف کی تھی جس سے مدرسے اور تبلیغ کے اخراجات پورے ہوتے تھے۔

خان بہادر مطیع اللہ خاں نے اپنی تاریخ شاہ جہان پور میں لکھا ہے کہ "ایک مدرسہ خستہ و بدحال موجود تھا۔"

اس زمانے کے بعد قایم ہونے والے مدرسے چوں کہ اپنی شان اور کارگزاری کے لحاظ سے خان بہادر کی نظر میں جچے نہیں اس لیے انھوں نے ان کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ مولوی صبیح الدین میاں نے اپنی تاریخ میں جدید دور کے قایم اور مصروف خدمت مدارس کا ذکر کیا ہے یہ مدرسۂ سعیدیہ بیسویں صدی کے ربع اول کے اختتام یا ربع ثانی کے آغاز پر قایم کیا تھا۔

حاجی محمد سعید خان نے جو وقف قایم کیا تھا اس کے دو مقاصد واضح تھے۔

۱۔ مدرسے کے قیام کے ذریعے بچوں کو دین کی تعلیم دینا اور

۲۔ مسلمانوں کی اصلاح اور تبلیغ دین کرنا۔

۴۶-۱۹۴۵ء میں اس وقت کے مہتمم مولانا عبدالہادی خاں کی کوشش سے بیرون شہر کے طلبہ کے لیے ایک بورڈنگ ہاؤس کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ اس سلسلے میں شاہ جہان پور کے دیہات وقصبات سے جو ۱۵، ۲۰ طلبہ اس پروگرام سے مستفید ہونے کے لیے پہنچے تھے، ان میں ایک یہ خاک سار بھی تھا۔ بعد میں چند بنگالی طلبہ بھی آ گئے تھے۔ طلبہ کی نگرانی کے لیے دہلی سے ایک عالم دین کو بلایا گیا تھا جو طلبہ کی نگرانی کرتے اور بورڈنگ ہاؤس کے کاموں اور نظم وضبط کے ذمے دار تھے۔

مدرسے میں صدر مدرس مولانا شیخ کفایت اللہؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ تھے۔ ابتدائی کتابیں پڑھانے کے ایک مدرس عربی اور ایک مدرس فارسی کے تھے۔ دو مدرس حفظ و ناظرہ قرآن کی تدریس کے لیے تھے۔ ایک مدرس اردو اور حساب کی تعلیم کے لیے تھے۔ محمد اشفاق نامی ایک منشی دفتری کاموں کی انجام دہی کے لیے تھے۔

محمد سعید وقف کا شعبۂ اصلاح وتبلیغ:

شعبۂ اصلاح وتبلیغ میں دو عالم دین تھے، ایک مولانا عبدالصبور خان تھے جو سرودی کے بنگلے سے مغرب کی جانب محلے میں رہتے تھے۔ دوسرے مبلغ و مصلح مولانا احسان علی خاں تھے جو شاہ جہان پور کے قریب بانڈی گاؤں نامی موضع کے ساکن تھے۔ ان دونوں سے میں واقف تھا۔ دونوں عالم دین سال بھر ضلع میں سیر وگردش رہتے اور وعظ وتبلیغ کے ذریعے اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ چوں کہ یہ میرے گاؤں میں بھی آتے رہتے تھے۔ مسجد کے ساتھ چوپال میں ٹھہرتے تھے۔ قیام کے دوران اطراف کے گاؤں میں بھی یہیں سے آتے جاتے رہتے تھے۔ یہاں ہوتے تو چوپال کے لمبے چوڑے چبوترے پر گاؤں کے ہندو مسلمان سبھی جمع ہوتے اور وہ وعظ کہتے تھے۔ مولانا احسان علی خاں کا وعظ بہت پسند کیا جاتا تھا۔ وہ حفیظ جالندھری کا شاہ نامہ اسلام اور کبھی آلہ اودھل کی منظوم کہانی اور کبھی ہندو مسلمانوں کی دوسری کتابوں سے بہادری، نیک چلنی کے قصے اور انسانیت اور بہترین اخلاق پر مبنی

حکایتیں سناتے تھے اور ہندو مسلمان بہت شوق سے سنتے تھے۔ میرے والد صاحب کے دونوں سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ والد صاحب کہیں آتے جاتے نہ تھے اور نہ ان پر گھر بار کی کوئی خاص ذمے داری تھی اس لیے دونوں دن بھر بیٹھے باتیں کرتے اور حقہ پیتے رہتے تھے۔ اور میں ان کی خدمت پر مامور اور حقے پانی کے انتظام کا ذمے دار ہوتا تھا۔ مولانا عبدالصبور خان ان اطراف میں بہت کم آتے تھے۔ وہ مزاج کے سخت تھے اور اپنے وعظ میں بھی ڈانٹ ڈپٹ سے کام لیتے تھے۔ اگرچہ ان دونوں بزرگوں کا مدرسۂ سعیدیہ سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن اکثر آتے رہتے تھے۔ انھوں نے مجھے مدرسے میں دیکھا تو بہت خوش ہوئے پھر کئی بار ہوسٹل میں تشریف لائے اور نگراں سے ملاقات کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نگراں صاحب بھی مجھ سے بہت محبت کرنے لگے۔

مولانا احسان علی خاں:

۱۹۵۰ء میں مولانا احسان علی خاں پاکستان آ گئے تھے اور نواب شاہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ایک مدرسے میں مدرسی اور ایک مسجد میں امامت اور وعظ و تبلیغ کا شغل یہاں بھی تھا۔ ۱۹۵۱ء میں میں نواب شاہ پہنچ گیا اور اسی مدرسے میں میرا تقرر عمل میں آ گیا۔ آں مرحوم نے ایک بزرگ کی طرح میری سرپرستی فرمائی۔ وہ جہاں وعظ کے لیے جاتے مجھے ساتھ لے جاتے اور چند منٹ مجھے تقریر کرنے کا موقع دلواتے۔ مجھے تقریر کرنا انھوں نے سکھایا تھا۔ ان کی ایک شادی شدہ بیٹی شاہ جہان پور میں رہ گئی تھی۔ وہ اسے بہت یاد کرتے تھے میری بیوی کو انھوں نے بیٹی بنالیا تھا۔ اس کے ساتھ ان کا معاملہ عید، تہوار اور خاندان کی تمام رسوم و تقریبات کے موقع پر ٹھیک وہی ہوتا تھا جو بیٹیوں کے ساتھ ہوتا۔ یہی معاملہ ان کی اولاد کا میری اولاد کے ساتھ ہے۔ میرے لیے یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ان کا بیٹا، بیٹیاں، بہو، داماد اور تمام رشتے دار اس روایت کو نبھا رہے ہیں۔ مولانا احسان علی کے بیٹے عزیزم محمد سعید، ان کے بچے اور رشتے دار مجھے بھی اسی طرح بہت عزیز ہیں۔ حال آں کہ میں خود نہ ان

رسوم اور اخلاقی وتہذیبی روایات کو نبھا سکا اور نہ ان کا حق ادا کرسکا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس خاندان کے دور ونزدیک کے تمام چھوٹوں اور بڑوں کو خوش وخرم، کامران اور اپنے حفظ وامان میں رکھے۔

مدرسہ فیض عام:

یہ مدرسہ محلّہ باڑوزئی میں وہاں کے قصابوں نے چندہ سے تعمیر کرایا ہے۔ یہ عمارت لب سڑک نہایت وسیع اور شاندار ہے۔ اس میں طلبہ کو قرآن شریف کی خاص طور پر تعلیم دی جاتی ہے اس کے مہتمم حکم عبدالحق صاحب ہیں اور اس کی گراں قدر امداد حکیم صاحب اپنی جیب خاص سے کرتے ہیں۔ میونسپلٹی سے بھی ۳۵ روپیہ ماہوار مقرر ہوئے ہیں۔

مدرسۂ اعزازیہ:

شاہ جہان پور میں ایک مدرسہ اعزازیہ بھی تھا۔ اس کی بڑائی کے لیے یہ کافی ہے کہ اس کے صدر مدرس مولانا عبید الحق تھے اور اس کے تلامذہ میں سے مولانا مفتی کفایت اللہ تھے، جنھیں ان کے استاذ نے اعلیٰ تعلیم کے لیے مدرسۂ شاہی مراد آباد بھیج دیا تھا۔ وہاں سے وہ دارالعلوم دیوبند چلے گئے اور مولانا محمود حسن محدث دیوبندیؒ کے حلقۂ تلامذہ میں نامور ہوئے۔ دیوبند سے فراغت کے بعد وطن لوٹے تو مولانا عبدالحق نے مدرسہ عین العلم قایم کرلیا تھا۔ انھوں نے مولانا کفایت اللہ کو بھی اپنے مدرسے میں رکھ لیا۔ مولانا عبید الحق کے انتقال کے بعد وہ دہلی چلے گئے اور علمی، دینی اور سیاسی دنیا میں نہایت شہرت پائی اور مفتی اعظم ہند کے لقب سے عالم اسلامی میں ملقب ہوئے اور اپنے وطن مالوف اور مولود منشائے طفولیت شاہ جہان پور کے نام کو روشن کیا۔ یہ وہی بزرگ مولانا ہیں جو مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلویؒ کے نام سے مشہور، مدرسۂ امینیہ۔ دہلی کے شیخ الحدیث اور بہت بڑے فقیہ تھے، سیاست میں بڑا درک رکھتے تھے۔ جمعیت علما ہند کے بیس سال تک صدر رہے تھے۔

مدرسہ عین العلم:

یہ مدرسہ محلہ جنگلہ میں استادی مولوی حکم عبید الحق خاں صاحب مرحوم نے ۱۳۲۳ھ میں قایم کیا تھا۔ (شاہ جہان پور کے) مدارس عربیہ میں یہ اب اول نمبر کا مدرسہ ہے۔ متعدد علما اس میں درس دیتے ہیں۔ مدرس اول مولوی عبدالغنی صاحب ہیں، جو ذی استعداد اور عالم فاضل ہیں۔ سالانہ جلسۂ دستار بندی میں طلبہ کو سند فراغ دی جاتی ہے۔ منتہی طلبہ زیادہ تر بیرونی ممالک کے ہوتے ہیں۔ باوجود ایک مستند درس گاہ ہونے کے یہاں کے شرفا کو اس طرف کچھ توجہ نہیں ہے۔ چندے سے مدرسے کے مصارف پورے کیے جاتے ہیں، جن میں زیادہ تر غربا کا حصہ ہوتا ہے۔ میونسپلٹی شاہ جہان پور سے بھی مبلغ پچھتر رُپے ماہوار ملتے ہیں۔ جس سے اس مدرسے کا قیام ہے۔ مادۂ تاریخ مولوی اعظم شاہ صاحب نے موزوں کیا ہے:

اعظم دل خستہ شد در فکرِ سال
گفت ہاتف ''چشمۂ فیض مدام''
۱۳۲۳ھ

چند دیگر مدرسے اور اسکول:

اس کے علاوہ شہر میں چونگی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کی طرف سے متعدد مدرسے قایم ہیں اور محلے کے مکتبوں کو امداد بھی دی جاتی ہے ان مکاتب اور مدارس میں شہر کے بچوں کو ابتدائی تعلیم اردو اور حساب کی دی جاتی ہے۔

ایک مدرسہ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے واسطے مکان محمد یار خاں صاحب واقعہ محلہ مہمند ملاخیل میں چند سال سے قایم ہے۔

چند اور اسکول:

مدرسہ روٹی گودام میں مڈل تک انگریزی بھی پڑھائی جاتی ہے یہ مدرسہ میونسپلٹی کی طرف سے ہے اور گورنمنٹ کی طرف سے ایک ہائی اسکول اور امریکن مشن کی

طرف سے انگریزی میں انٹرنیس تک تعلیم کا ایک اسکول ہے، مگران اسکولز اور مدارس میں مسلمان شرفا بچوں کی تعداد بمزلہ صفر کے ہے البتہ اہل ہنود میں بیداری کے آثار پائے جاتے ہیں۔ چند زنانہ اور مردانہ اسکول ان کے ذاتی مصارف سے بڑے پیانے پر چل رہے ہیں اور ان کی تنظیمی کمیٹیاں رات دن اپنے کاموں میں مشغول ہیں۔

مشن اسکول:

مشن اسکول پرانا محلہ محمد زئی میں ۱۸۵۸ء سے تھا جس کو امریکا کے مشنریوں نے قایم کیا تھا اس کو فروخت کر کے ۱۹۱۵ء سے محلہ گوہر پورہ میں سبزی منڈی کے قریب لب سڑک باغ میں تعمیر ہوا ہے۔ عمارت نہایت عالی شان اور خوب صورت ہے اور گورنمنٹ نے پرانے گورنمنٹ ہائی اسکول کی عمارت کو پولیس کو دے دیا ہے اور جدید اسکول کی عمارت متصل کوٹھی مسنو جوالا پرشاد نہایت عالی شان اور پرفضا موقعے پر تعمیر کر لی ہے۔

(۱۴)

شہر کی چند قدیم عمارتیں

شاہ جہان پور میں کوئی ایسی عمارت جو قدامت کے لحاظ سے یادگار زمانہ یا کمال فن عمارت کے خیال سے پچھلی صناعیوں کا اعلا نمونہ ہو، موجود نہیں ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ شہر ہی زیادہ پرانا نہیں ہے اور اس کے آباد ہونے سے پہلے یہاں سوائے جنگل و کچی پکی معمولی گڑھوں کے اور کچھ نہ تھا اور بانی شہر کے جلد وفات پانے سے سلسلۂ تعمیرات درہم و برہم ہوگیا اس لیے کوئی شان دار عمارت تعمیر نہ ہوسکی۔ ان کی حیات میں ایک خوش نما محل سرا تعمیر ہوا تھا جو قلعہ مشہور تھا مگر ہنگامہ ۱۸۵۷ء نے اس کو مٹا دیا اور ہم کو اس کا دیکھنا نصیب نہ ہوا، نہ اس کا فوٹو دنیا میں موجود ہے۔ نواب عبداللہ خان نے جو اس میں پلے بڑھے اور عنفوان جوانی تک رہے بسے تھے ایک نقشہ اس کا اس فوٹو کی مدد سے جو ان کے حافظہ کی پلیٹ پر ثبت تھا تیار کرا دیا تھا جس کو ہم ناظرین کی دل چسپی کے لیے پیش کرتے ہیں اور ذیل میں اس کے حالات درج کرتے ہیں۔

قلعہ بہادر خانی:

یہ قلعہ شہر کے منتہائے جنوبی گوشے کے بلند قطعے پر جس کے دو طرف گرا و کھنوت کی پر فضا ترائی زمین کا سبزہ زار اپنا دل ربا منظر پیش کرتا ہے، واقع تھا۔ اسی جگہ پر گوجروں کی گڑھی نونیر بنی ہوئی تھی۔ دوابہ گرا و کھنوت میں اس کو بہترین مقام سمجھ کر دلیر خان نے اپنے بھائی بہادر خان کے محل سرا کے لیے منتخب کیا انور معمار دہلوی نے اس کا نقشہ تجویز کیا اور خواجہ بلند کی نگرانی میں اس کی تعمیر ہوئی۔ ....

ہماری دانست میں بنیادِ قلعہ ۱۰۲۸ھ میں رکھی گئی اور یہ وہ وقت تھا جب کہ بہادر خان مہم قندھار پر شاہزادہ شجاع کے ساتھ جانے والے تھے۔

یہ قلعہ اگر چہ جنگی قلعہ نہ تھا مگر ایک عالیشان محل ضرور تھا جو کئی سال میں تیار ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ عمارت بہت وسیع تھی اور دیوان خانہ اس کا پتھر کا تھا شاہ جہان پور میں نہ سنگ تراش تھے نہ پتھر کی کان دہلی یا آگرہ سے پتھر لانے اور سنگ تراشوں کے بلانے کا انتظام کرنا تھا اس لیے دیر ہونا لازمی تھا۔

قلعہ شرقاً غرباً طول میں ۳۵۰ درعہ اور جنوباً شمالاً عرض میں ۲۵۰ درعہ شاہ جہانی تھا جس کے دو دروازے اور ایک کھڑکی تھی بڑا دروازہ شمال رویہ اس سڑک کے سامنے تھا جو آج کل کوتوالی و تحصیل کے بیچ میں سے چوک وکھترانہ سے گزرتی ہوئی اس سڑک سے جو راج گھاٹ سے پل پختہ کھنوت کو جاتی ہے مل جاتی ہے۔ چھوٹا دروازہ شرق رویہ کھنوت کی طرف تھا اور کھڑکی جنوب رویہ تھی جس کے نام سے کھڑکی گھاٹ آج تک مشہور ہے۔ احاطے کے اندر ایک دیوان خانہ سنگین دو محل سرائے مربع شکل میں تھیں جن کا طول وعرض سو سو گز تھا اور ہر ایک دروازے کے آگے صحن نہایت وسیع چھوٹا ہوا تھا جس کے گرد کوشک بنے ہوئے تھے اور کوشکوں کے آگے سائبان کھپریل بہ طور جلوخانہ کے پڑا ہوا تھا۔ نواب احمد خان جو اسی قلعے میں بیٹھے ہوئے انہار البحر تصنیف کرر ہے تھے (یہ) نقشہ قلعے کا (کھینچا ہے۔)......

اس قلعے کو بشپ ہیبر نے انیسویں صدی کے آغاز میں جب کہ وہ اپر انڈیا کی سیاحت میں مصروف تھا، دیکھا تھا۔ وہ اپنے سفرنامے میں اس کی عمدگی وخوب صورتی کا ذکر کرتے ہوئے اس کو شاہی محل کا لقب دیتا ہے۔

قلعہ کی عمر تقریباً سوا دو سو برس ہوئی ۱۰۴۸ھ (۳۹-۱۹۳۸ء) میں اس کا سنگ بنیاد نصب ہوا اور ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۸ء) میں وہ دنیا سے غائب ہو گیا۔ اپنی عمر میں اس نے بہت انقلاب دیکھے مگر قیامت خیز ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے آشوب کا وہ متحمل نہ ہو سکا اور گورنمنٹ کے حکم سے اس کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اس کا بلند ٹیلہ اپنا حسرت ناک نظارہ اور انقلاب لیل ونہار و بے ثباتی روزگار کا کرشمہ دیدۂ عبرت نگاہ کے روبہ روپیش کرتا ہے جس زمین پر شاہانہ محل سیاحوں کو نظر پڑتا تھا، اب وہاں کچھ کچے کچھ پکے معمولی مکانات اور خس پوش جھوپڑے اور ذبح خانہ و پونڈ و گودام آب کاری اور روہیل

کھنڈ کمایوں ریلوے کا چھوٹا سا اسٹیشن اور تمباکو کے کھیت دکھائی دیتے ہیں۔ شعر

پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

(تاریخ مطیع: صفحہ ۵۶-۱۵۴)

رنگ محل:

جس کے نام سے محلہ رنگ محل منسوب ہے، قلعہ سے شمال میں تھوڑے فاصلے پر جہاں اب کیرو گنج ہے، واقع تھا اور عمارت اس کی خوب صورت وشان دار تھی۔ مشہور ہے کہ قلعے کے ساتھ بنائی گئی تھی۔ نواب بہادر خان نے تیار کرائی تھی۔...... مگر غدر سے بہت پہلے سیلابِ حوادثِ روزگار کے اثر سے معدوم ہو گئی۔

قلعہ بگھابی بی:

یہ جمال خان و پہاڑ خان نوحانی کا...... خوش نما محل سرا تھا، جو امام باڑہ کلاں سے شرق میں ملی ہوئی واقع تھی۔ ہمارے سن شعور تک کچھ حصے اس کے باقی تھے، جن میں نواب عبدالرحیم خان رہا کرتے تھے جن کو ایک ہزار روپے سالانہ پولی ٹیکل پنشن سرکار سے ملتی تھی اور زمین داری بھی تھی اور ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے احمد حسن خان پانسو روپے سالانہ پاتے تھے۔ اب ان میں سے کوئی بھی باقی نہیں ہے، نہ عمارت کا پتا ہے۔ زمین بھی قبضۂ ہنود میں چلی گئی ہے۔

نواب عزیز خان ابن بہادر خان کی والدہ اسی خاندان سے تھیں، وراثتاً کسی اور ذریعے سے وہ محل سرا نواب عزیز خان کے قبضے میں آ گئی تھی، جو ان کے بیٹے نواب تہور خان المخاطب خان بہادر خان کو ملی اور ان کے لاولد فوت ہونے پر ان کی بہن کو اور بہن کے بعد اس کی بیٹی جو زینت بیگم عرف بگھابی بی کو پہنچی اور وہ اس میں رہنے لگیں اس وجہ سے قلعہ بگھابی بی مشہور ہو گیا۔ نواب وزیر کے عہد میں مالک مکان کی اجازت سے موسم بارش میں چکلہ دار اس میں رہا کرتا تھا۔ جب انگریزی عمل داری ہوئی تو ابتدا میں دفاتر اسی مکان میں قایم ہوئی اور بعد تعمیر کچہری وغیرہ کے وہاں منتقل

کر دیے گئے۔(ملخص بہ تاریخ مطبع: صفحہ ۵۸-۱۵۴)(ایضاً: صفحہ ۵۸-۱۵۷)

چند دیگر عمارتیں

جیل خانہ:

اسلامی دور حکومت میں کوئی جیل خانہ یہاں نہیں تھا۔ شاہ جہان پور ضلع نہ ہونے سے بریلی سے متعلق تھا اس لیے قیدی بریلی کے جیل خانے کو بھیجے جاتے تھے۔ ابتدائی عہد حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی میں بھی یہی طریقہ رہا۔ ۱۸۱۳ء میں شاہ جہان پور جب ضلع قرار پایا تو یہاں بھی جیل خانہ بنایا گیا جو کنٹونمنٹ میں پرانا جیل خانہ کر کے مشہور ہے۔ غدر ۱۸۵۷ء میں جب احمد اللہ نے چھاپہ مارا تھا تو انگریزوں نے اسی جیل خانہ میں پناہ لی تھی اور دہس بندی کر کے شاہ صاحب کا مقابلہ کیا تھا۔ غدر کے بعد پرانے گورنمنٹ اسکول کے پاس پختہ سڑک سے پچھم کو موجودہ جیل خانہ بنایا گیا۔ اس میں ساڑھے تین سو قیدی رکھے جاتے ہیں۔ سول سرجن شہر کو جیل کی سپرنٹنڈنٹی کی خدمت بھی سپرد ہے۔(تاریخ صبیح: صفحہ ۵۰)

جلی کوٹھی:

یہ لب سڑک محلہ خلیل میں خان بہادر قاسم حسن خان کی تعمیر کردہ ہے۔ غدر ۱۸۵۷ء میں اس میں احمد اللہ شاہ نے آگ دیدی تھی، جب سے جلی کوٹھی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کوٹھی اب سر اسرار حسن خان صاحب حافظ خیل کے قبضے میں ہے۔ حال میں اس کو ترمیم کر کے ساز و سامان سے خوب آراستہ کر لیا ہے۔ چوں کہ اس کو ایک تاریخی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ اس وجہ سے اس کے اندراج کی ضرورت ہوئی۔(تاریخ صبیح: صفحہ ۵۰)

کوٹھی روضہ:

اگرچہ یہ کوٹھی حدود میونسپلٹی کے اندر نہیں ہے، مگر قرب شہر ہونے کی وجہ سے یہ

شہر ہی میں شمار ہوتی ہے یہ انگریز سوداگروں کی ایک کمپنی ہے جو غدر سے پہلے موضع ''پرمالی'' میں قایم ہوئی تھی۔ یہ یوروپین صنعت وحرفت کا تجارتی ایک بڑا خار خانہ شکر سازی اور ولایتی شراب کا ہے۔اس کارخانہ کی شکر اور شراب تمام ہندوستان میں مشہور ہے اور ہر بڑے شہر میں اس کے ایجنٹ مقرر ہیں۔ یہ کوٹھی قابل دید ہے۔معزز سیاح دُور دُور سے اس کو دیکھنے آتے ہیں۔(تاریخ صبیح:صفحہ ۷۰)

میونسپلٹی/ ٹاؤن ہال:

بتاریخ ۶/۱ اکتوبر ۱۸۶۴ء کو شاہ جہان پور میں چونگی قایم ہوئی۔مسٹر ایچ سی ارون صاحب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ضلع نے ٹاؤن ہال کا سنگ بنیاد ۱۸۹۱ء میں نصب کیا موجود عمارت ٹاؤن ہال دو سال میں بن کر تیار ہوگئی۔ چونگی کی موجودہ آمدنی تقریباً دو لاکھ پندرہ ہزار رُپے ہے۔ بارہ ممبر انتخاب سے اور دو سرکاری ممبر گورنمنٹ کی طرف سے نامزد ہوتے ہیں۔مردم شماری کے اعتبار سے سات ممبر مسلمان اور پانچ ہندو منتخب ہوتے ہیں اور اب پندرہ سال سے چیرمین نان افیشل کے تین سال کے لیے ممبران بورڈ انتخاب کرتے ہیں۔ممبری اور چیرمینی نے پبلک کے پرانے شوق پھیکے کر دیے۔

(تاریخ صبیح:صفحہ ۶۹)

(۱۵)

مذہبی عبادت گاہیں

ا۔ مسجدیں:

مساجد و مدارس و منادر و مقابر کے شمار اور اس کے کتابوں کی فراہمی کے لیے ہم نے ایک معتمد ملازم کو ۱۹۱۱ء میں مقرر کیا اس نے ایک سال گشت کر کے ہر چیز کو اپنی آنکھ سے دیکھا اور ضروری تحقیقات کر کے رپورٹ تیار کی جو اقف کار ثقات کو سنا کر صحیح کی گئی اس کا خلاصہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

شہر میں چھوٹی بڑی، آباد و یران، کچی پکی ہر قسم کی مساجد ۱۹۱۱ء میں دو سو اٹھاون تھیں، ان میں سے عمارت کے لحاظ سے صرف جامع اعظم اور قدامت کے لحاظ سے چند اور مساجد اہمیت رکھتی ہیں جن کا ذکر ہم تفصیل سے کرتے ہیں باقی کی تعداد محلہ وار لکھنے پر قناعت کریں گے۔

یہ بات قابل بیان ہے کہ گیارھویں صدی میں بیشتر مساجد خام کھپریل پوش تھیں سقف یا لداؤ کی محدود چند تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ ایک دفعہ سے ہزاروں مسلمان غیر ملک سے لا کر جنگل میں آباد کر دیے گئے اس وقت نہ یہاں پزاوے تھے، نہ معمار، لہٰذا رہنے کے لیے جس شان کے مکان بنائے گئے ویسے ہی خدا کا نام لینے کے لیے تعمیر کیے گئے۔ کچھ زمانے بعد جیسے جیسے تدریجی ترقی مسکونہ عمارتوں میں ہوتی گئی ویسے ہی عبادت خانوں میں بھی ہوتی رہی۔ اب معدودے چند مساجد پرانے نمونے کی یادگار باقی ہیں باقی سب پختہ لداؤ کی ہیں ہے۔

یہاں کوئی باضابطہ انجمن حفاظت مساجد کے لیے نہیں ہے جس کی وجہ سے امامت مسجد جامع، خطابت، عیدگاہ کا کام بے قاعدہ وابتر ہو رہا ہے۔

مسجد کا نچ: خواجہ بلند، خواجہ سرا نواب بہادر خان نے بنائی اور ۱۰۵۷ھ میں اس

کی تعمیر ختم ہوئی اس کی محراب کی پیشانی پر یہ قطعہ کندہ ہے۔

شد مرتب بدور شاہ جہان
در وطن دل کشا بہادر خان
مسجد و چاہ ساخت خواجہ بلند
سال تاریخ نغز شد بہ جہان

۱۰۵۷ھ

بزرگان کہن سال کا بیان ہے کہ شاہ جہان پور میں پہلی مسجد لداؤ کی یہی ہے اور یہی پہلی جامع مسجد اس شہر کی ہے۔ مسجد کے سامنے اور اس کی دونوں بغلوں میں وسیع صحن اس غرض سے چھوٹا ہوا تھا کہ جمعہ کے دن زیادہ ہجوم ہونے پر نمازیوں کی صفیں صحن میں کھڑی ہوسکیں۔ آغازِ انگریزی عمل داری تک صحن اصلی حالت میں تھا جب شاہ جہان پور ضلع بنایا گیا تو مسجد کی جنوبی بغل میں کوتوالی اور شمال میں تحصیل کی عمارت بنائی گئی اور سڑک نکالنے پر صحن کا شرقی حصہ جو مسجد سے علاحدہ ہوگیا تھا اس پر بعد میں شفاخانہ جواب تحصیل ہوگیا ہے تعمیر کیا گیا۔

خواجہ بلند بانی مسجد نہایت بلند حوصلہ تھا۔ دین داری و خدا پرستی میں اس کو شغف تھا اس نے ۱۱۱۴ھ ۴۷ جلوس عالم گیر میں شاہ آباد میں بھی ایک مسجد و کنواں بنایا ہے جو محلہ سردار گنج میں لب سڑک واقع ہے جس پر یہ شعر کندہ ہے:

در چہل ہفت سنہ جلوس پسند
مسجد و چاہ ساخت خواجہ بلند

نوب بہادر خان کی وفات کے بعد وہ (خواجہ بلند) دلیر خان کے پاس شاہ آباد چلا گیا تھا۔ اس وقت اس نے وہاں مسجد تعمیر کی۔

مسجد کانچ کے میناروں پر چینی کا کام تھا جو افغانی عہد کی عمارتوں پر دہلی میں نظر پڑتا ہے جس کا ذکر سید احمد خان نے آثار الصنادید میں کیا ہے مگر یہاں والے اس کو کانچ کا کام کہتے ہیں۔ اس لیے یہ مسجد کانچ مشہور ہوئی۔ خواجہ بلند نے آموں کا بہت بڑا باغ موضع پہنا بزرگ میں لگایا تھا، جو خواجہ کا باغ مشہور تھا۔ مدت ہوئی درخت

معدوم ہوگئے مگر زمین اب تک اسی نام سے موسوم ہے۔

اس مسجد اور روضہ شیخ کبیر بالا پیر واقعہ قنوج کی تعمیر ایک سنہ میں بہ عہد حکومت نواب بہادر خاں ختم ہوئی۔ دونوں عمارتوں کی پیشانی پر بانیان نے ان کی فیاضیوں کے اثرات سے متاثر ہو کر ان کے نام کو ثبت کرایا دونوں قطعات تاریخی کا اسلوب بیان یکساں ہے اور مادۂ تاریخ بھی واحد ہے۔ کچھ بعید نہیں اگر دونوں قطعات ایک ہی قلم کا نقش اور ایک ہی دماغ کی تخئیل ہو۔

مسجد جامع: یہ وسیع وشان دار مسجد دوہرے دالان کی محلہ مسجد گنج میں جو اسی مسجد کے نام سے معروف ومنسوب ہے، واقع ہے۔ اس کی چھت چھ گنبدکی ہے۔ مشہور ہے کہ ایک سو ایک نمازی ایک صف میں کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اس کی تعمیر کا سال اور تعمیر کنندہ کا نام بوجہ نہ ہونے کتابے کے، عمارت کی زبان سے دریافت نہیں ہوتا۔ مگر مشہور یہ ہے اور غالباً صحیح بھی ہے کہ نواب عزیز خان خلف نواب بہادر خان اس کے بانی ہیں۔ اس بنا پر یہ مسجد عمر میں مسجد کا نچ سے تقریباً پچاس سال چھوٹی ہے۔ ظن غالب یہ ہے کہ عہد اورنگ زیب میں جو تعمیر مساجد و تاسیس معالم دین کے لیے مشہور و معروف ہے، عزیز خان نے اس مسجد کی بنیاد ڈالی مگر ان کی حیات میں اس کی تکمیل نہ ہوئی استر کاری، فرش، حوض، چاہ، دروازہ، غسل خانہ، حجرات، بیرونی تعمیر ہونے کی نوبت نہیں آئی اس لیے کتابہ لگانا بھی باقی رہ گیا۔ عزیز خان کے بعد تہور خان ان کے اکلوتے بیٹے نوجوان مارے گئے کوئی اولاد ان کی باقی نہ رہی اس لیے یہ مسجد و مقبرہ عزیز خان کا جو زیر تعمیر تھا نامکمل رہ گیا۔ کچھ دن تو صحن میں جنگلی درختوں اور خاردار جھاڑیوں کا بن کھڑا ہو گیا اور اندورن مسجد دن میں خفاش صلوۃ معکوس میں مصروف اور شب میں چغد یا ہو کے نعرے لگانے میں مشغول رہنے لگے۔

جمعہ و جماعت کے لیے کوئی نمازی تو اس طرف رخ نہیں کرتا تھا مگر دھوبی و کمہار اپنے گم شدہ گدھوں کی تلاش میں اکثر ادھر آنکلتے تھے۔ جب مسجد کی بے حرمتی و ابتری اس حد تک پہنچی تو غیرت کبریائی جوش میں آئی اور ۱۸۵۷ء سے پیشتر منشی سید نیاز علی صاحب کو اس کی مرمت و درستی کے لیے کوشش کرنے کی توفیق عطا ہوئی۔ اس

زمانے میں وہ ڈپٹی کلکٹر مراد آباد تھے انھوں نے اپنی فراست سے شہر کے مسلمانوں کو متوجہ کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مولوی محبوب علی مراد آبادی مشہور واعظ کو شاہ جہان پور لائے اور مسجد کی ضروری صفائی کرا کر نماز جمعہ ادا کی اور بعد نماز مولوی صاحب کا وعظ ہوا جو ایک غیبی صدا تھی جس کا ہر لفظ سامعین کے دل میں اتر گیا اور بہ حکم فلیبلغ الشاهد الغائب جس مسلمان نے سنا وہ اس کام میں حصہ لینے کے لیے تیار ہو گیا اور سرگرمی کے ساتھ چندہ جمع کرنا شروع ہوا تھوڑے دن میں ہزار ہا رُپے جمع ہو کر مسجد کی استرکاری وضروری مرمت ہو گئی نجو خان صوبہ دار نے حوض، مولوی محمد امین خان نے کنواں تعمیر کرایا اور حوض بھرنے کے مصارف کے لیے مولوی صاحب نے ایک مختصر چک واقع لودی پور بھی وقف کر دیا۔ مسجد اچھی طرح آباد ہو گئی اور جمعہ کو شاندار جماعت ہونے لگی پھر ۱۸۸۸ء کے قریب پہلی مرمت سے چالیس پچاس سال بعد ایک پردیسی بندۂ خدا جو مولوی بلغاری کے لقب سے مشہور تھا یہاں وارد ہوا اس نے چندہ کر کے گنبدوں کی استرکاری از سر نو کرائی، پشتہ مضبوط اور شرقی دیوار کو کس قدر بلند کرایا اس کے چند سال کے بعد مسجد کی دونوں بغلوں اور سامنے کی طرف شمال بہ رویہ وجنوب رویہ وغرب رویہ دالان وحجرات چندے سے تیار کیے گئے اور آمدنی جائیداد موقوفہ سے مدرسۂ عربیہ بھی جاری کیا گیا۔ اب مسجد فضل الٰہی سے رونق پر ہے گو مدرسہ خستہ وبدحال ہے۔ مسجد کی عمارت کے متعلق صرف ایک کسر باقی ہے، یعنی اس کے منارے پست ہیں اور دروازہ جیسا شاندار ہونا چاہیے تھا نہیں ہے۔ اس کمی کے پورا کرنے کی ضرورت ہے۔ ع

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

عیدگاہ ہدف: سب سے وسیع وقدیم مصلئے عید کا اس شہر میں وہی ہے جو قبرستان ہدف میں واقع ہے گاڑی پورہ کی عیدگاہ نہایت مختصر ہے چند سال ہوئے اس عیدگاہ کی محراب کے از سر نو تعمیر ہونے پر ایک پتھر کی سل جو بنیاد محراب میں مدفون تھی برآمد ہوئی اس پر یہ قطعہ تاریخ کندہ پایا گیا:

در زمان شہ با حشمت و جم

کہ ربود از کف افلاک عناں
مسند آرائے جہان عالم گیر
کہ زعدلش شدہ معمور جہان
کرد بنیاد محمد کاظم
منزل سجدہ گہے خلق جہان
بہر تاریخ خرو باامن گفت
شد بنا عید گہے رشک جنان

جس سے ۱۱۰۰ھ میں اس کا تعمیر ہونا ثابت ہوتا ہے مگر اب تک اس کے بانی محمد کاظم کے حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ نوابان قلعہ کے شجرہ منقولہ انہار البحر پر ہم نے غائر نظر ڈالی کوئی شخص اس نام کا نہ پایا۔ نواب بہادر خان کی اولاد میں عبداللہ خان سے دریافت کیا جواب ملا کہ ہمارے بزرگوں میں سے کسی نے مصلیٰ ہدف تعمیر نہیں کیا۔ نامور شرفائے شہر میں سے بھی کوئی بڑی قدرت اس نام کا معلوم نہیں ہوتا۔ اس لیے ہمارا خیال ہے کہ جب اورنگ زیب نے اس ضلع کو خالصہ شریفہ کر کے عامل و ناظم تعینات کیا تھا ان میں سے کسی نے اس کی تعمیر کی ہے۔ اس لیے شہر والے اس کے نام سے واقف نہیں!

پہلے اس عیدگاہ کا صحن بہت مختصر تھا ۱۸۵۷ء میں مولوی سرفراز علی صاحب گورکھ پوری یہاں وارد ہوئے ان کی تحریک سے زمین حاصل ہوئی اور چندہ ہو کر فصیل بڑھائی گئی مگر بہراؤ کے مضبوط ہونے کے انتظار میں فرش اس جدید صحن کا پختہ نہ ہوا تھا جو بعد میں چندہ سے بنایا گیا اور پشتہ و چاہ نجو خان صوبہ دار نے تعمیر کیا۔ اس مسجد کی کرسی بلند و صحن وسیع اور موقع نہایت عمدہ ہے مگر عمارت نہایت معمولی و پست ہے۔ اس کے دونوں گوشے منارے تعمیر ہونے کا بزبان حال مطالبہ کر رہے ہیں۔ خدا پورا کرے!

اس مسجد کی خطابت شیخ عبدالعلیم اور ان کی اولاد میں قدیم سے چلی آتی تھی اور اس خدمت کے صلے میں موضع پرا پرگنہ تگوہی و موضع جلال نگر پرگنہ شاہ جہان پور میں

معافیات عطا ہوئی تھیں اور عہد حافظ رحمت خان میں کچھ نقد بھی ملتا تھا مگر اب اس خاندان میں کوئی باقی نہیں رہا اور معافیاں بھی فروخت ہو گئیں لہٰذا ہر عید کو نیا خطیب ممبر پر نظر آتا ہے۔

اس مقام کے ہدف مشہور ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اسی میدان میں ہدف بنا ہوا تھا جس پر مشق تیراندازی کی جاتی تھی۔

مسجد مظفر خان: مظفر خان خلف نواب بہادر خان نے قلعہ کے قریب ۱۱۰۸ھ میں بہ عہد اورنگ زیب تعمیر کی جس کی اہمیت صرف اس کی قدامت میں مضمر ہے۔ عمارت بالکل معمولی ہے قطعہ تاریخ اس پر کندہ ہے جس کے تحت میں معمار نے اپنا نام سلطان معمار بھی لکھ دیا ہے۔

بہ عہد ہمایوں اورنگ شاہ ❶
بہ لطف محمد مظفر شفیق
چو شد مسجد اللہ از بہر سال
خرد گفت کا مد کہ بیت العتیق

۱۱۰۸ھ

مسجد گاڑی پورہ: اونچے برکی مسجد مشہور ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر شہر کی آبادی سے پہلے گڑھی تھی، فتح چنور کے بعد وہ مسمار کر دی گئی اور اس کے بلند ٹیلے پر یہ مسجد بنائی گئی اس لیے اس نام سے مشہور ہے۔

بوجہ وسعت و قدامت یہ مسجد گاڑی پورہ میں بہ طور جامع کے ہے، سال تعمیر معلوم نہیں۔

مسجد مہمان شاہ: دو سو برس سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ اس کے صحن میں جھولے والی قبر واقع ہے جس کی نسبت یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ فشار قبر کے خوف سے کسی خاتون نے مقبور ہونا پسند نہ کر کے ایک پختہ حجرہ تعمیر کرا کر اس میں جھولا کھڑا کرایا اور اس کی چھت پر تعویز قبر بنوایا اور مرنے کے وقت یہ وصیت کی کہ بعد تجہیز و

❶ اورنگ شاہ سے مراد شاہ اورنگ زیب ہے۔ (صاحب تاریخ مطبع)

تکفین لاش جھولے میں رکھ کر حجرہ کا دروازہ تیغا کر دیا جائے۔ وصیت کے مطابق وارثوں نے عمل کیا۔ چند سال ہوئے دیوار حجرہ میں شگاف ہو گیا تھا اس کی راہ سے لوگوں نے دیکھا تو جھولے میں لاش بحال موجود تھی جس کی وجہ سے ان بی بی کے تقدس کی شہرت ہو گئی۔ حال آں کہ اسلام کی نظر میں یہ کھلی ہوئی وہم پرستی ہے۔

مسجد بکیریان: نواب عزیز خان کی بنائی محلّہ بکیریان میں ہے۔ خوشنما و خوش قطع ہے۔

مسجد بگھابی بی: یہ مسجد اپنے محل سرا کے ساتھ نوحانیوں نے تعمیر کی تھی جب محل سرا قبضہ بگھابی بی میں آ کر قلعہ بگھابی بی مشہور ہوئی تو مسجد بھی ان کے نام سے مشہور ہو گئی حال آں کہ ان کی بنائی ہوئی نہیں ہے۔..... سال تعمیر معلوم نہیں..... وہ شہر کے بنیاد پڑنے سے تھوڑے دن بعد بنائی گئی۔

مسجد گرزی: نواب عبداللہ خان کی بنائی ہوئی بازار گرزی میں ہے۔ عمارت محض معمولی ہے قدامت اس کا طرۂ امتیاز ہے۔

مسجد الہ یار خان: محلّہ بہار دواجی میں ہے۔ الہ یار خان رئیس اعظم تھے۔ اپنا محل سرا تعمیر کیا جو عالی شان عمارت تھی تو ایک مسجد اس کے دروازۂ جنوبی پر اور دوسری دروازہ شمالی پر تعمیر کی۔ مدت ہوئی محل سرا فنا ہو گیا۔ مسجدیں باقی ہیں۔ البقاء للملک المعبود

مسجد گھورن خان: یہ مسجد دیوان گھورن خان کی بنائی ہوئی ہے جن کے نام سے محلّہ تلیا گھورن مشہور ہے۔ اسی جگہ پر ان کا محل سرا تھا جو قلعہ بگھابی بی سے جنوب اور امام باڑے سے شمال مسجد کی پشت پر واقع تھا۔ زمانہ ہوا منہدم ہو گیا اور اس کی آراضی کا بڑا حصہ ہنود کے قبضے میں چلا گیا۔ .... مختصر قطعہ اولاد امام خان کے قبضے میں ہے..... گھورن خان مشہور خاندان نوحانی کے ایک رکن تھے اور خاندان نواب بہادر خان میں سے کسی کے دیوان ہونے کی وجہ سے دیوان گھورن خان مشہور تھے۔

مسجد حسین خان: یہ مسجد محلّہ بکسریان میں واقع ہے۔ خوب صورت تین گنبد کی ہے۔ بانی اس کے نواب حسین خان خلف نواب بہادر خان بانی شہر ہیں۔ حوالی مسجد

میں کلال وکھتری آباد ہیں۔........

مسجد حسین پورہ: بانی اس کے نواب حسین خان ہیں جن کے نام سے یہ محلّہ منسوب ہے۔

مسجد بادل خان درویش: محلہ باقر زئی میں لب سڑک بسرات واقع ہے۔ بادل خان درویش کے مقیم رہنے سے ان کے نام سے مشہور ہوگئی۔ مگر بانی اس کے حافظ الملک حافظ رحمت خان ہیں ۱۱۵۵ھ میں تعمیر ہوئی جو قطعۂ تاریخ سے عیاں ہے۔ اس کے قریب مولوی بحرالعلوم صاحب کا مدرسہ تھا جو حافظ الملک نے تعمیر کرایا تھا۔

مسجد نواب سکندر خان: یہ مسجد محلہ ورک زئی میں ہے اور ایک گنبد کی ہے۔ بانی اس کے نواب بہادر خان کے پوتے نواب سکندر خان ہیں۔

مسجد محلّہ جھنڈا: بنائے نواب عزیز خان مشہور ہے اس کے صحن میں جھنڈا ہے اور اس کے حوالی میں میلہ گیارھویں کا ہوتا ہے۔

مسجد نواب یعقوب علی خان درانی: معتمد الدولہ محسن الملک نواب یعقوب علی خان بہادر ظفر جنگ نے اپنے محل سرا کی تعمیر کے وقت جو قلعہ یعقوب علی خان مشہور تھا، اس مسجد کی تعمیر کی جس کو تقریباً ڈیڑھ سو برس کا زمانہ ہوا۔ قلعہ قریب چالیس سال کے ہوئے کھود گیا، مگر مسجد باقی ہے۔

مسجد محمد غوث خان: محلہ بی بی زئی چوراہا میں ہے محمد غوث خان آفریدی نے جو نظام علی خان کوتوال کے مورث تھے اپنے مکان کے قریب بنائی تھی۔ اب نہ وہ خاندان باقی ہے نہ اس کی عمارت کا پتا ہے صرف مسجد بہ طور یادگار باقی ہے۔

قطعۂ تاریخ سے ۱۱۶۹ھ میں تعمیر ہونا معلوم ہوتا ہے۔........

مسجد دیوان یٰسین خان: یہ مسجد محلّہ مدراخیل میں ہے۔ یٰسین خان دیوان نواب عبداللہ خان نے بنائی تھی۔

سنہری مسجد: نواب احمد علی خان کی بیگم نے ۱۲۶۸ھ میں بنائی ہے۔ اس کے گنبدوں پر طلائی کلس چڑھے ہوئے ہیں اس لیے اس نام سے مشہور ہے۔ عمارت مختصر مگر شان دار وخوش نما ہے۔ گزیٹیر میں خوش نمائی کی وجہ سے اس کا خصوصیت کے

ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ (تاریخ مطیع: صفحہ ۶۷-۱۵۸)

مولوی حافظ مطیع اللہ خاں نے اپنی تاریخ مطیع میں اس مقام تک بیش مشہور اور تاریخی مساجد کے تذکرے کے بعد جن کا ملخص پچھلے صفحوں میں درج ہوا، ایک گوشوارہ پیش کیا ہے، جس میں مردم شماری کے کاغذات کے مطالعے کے بعد شاہ جہان پور کے ۷۵ محلوں کی ۲۳۶ مسجدوں کو محلے وار بیان کیا گیا ہے۔ (ایضاً: صفحہ ۶۸-۱۶۷)

۲۔ امام باڑے:

یہاں پہلے کبھی امام باڑہ نہ تھا۔ ۱۱۸۸ھ میں جب روہیلوں کی تباہی کے بعد شیعہ حکومت قایم ہوئی، اس وقت مرزا جعفر بیگ چکلے دار نے آصف الدولہ کی اجازت سے بگھابی بی کے قلعے کے پہلو میں امام باڑہ بنایا اور اس کے مصارف کے لیے کچھ آراضی معافی اور کچھ زر نقد آصف الدولہ سے مقرر کرایا۔...... متولی امام باڑہ سادات بلگرام تھے۔ ۱۸۸۱ء میں مسٹر ایچ پی میولاک قایم مقام کلکٹر ہو کر آئے انھوں نے...... امام باڑے کو از سر نو پختہ لداؤ کا بنوایا اور متولی سابق کو معزول کر کے علی بہائی بوہرہ کو جو شیعہ اسماعیلہ سے تھا متولی مقرر کیا اور...... ایک سو نواسی روپے بارہ آنے چار پائی خزانہ سرکار سے اور معافیات سے اسّی روپیہ سالانہ کی آمدنی ہے جس سے مصارف امام باڑہ پورے ہوتے ہیں۔ بانڈی گاؤں میں جو معافی، وہ امام باڑے و مسجد واقع موضع مذکور کی مشترکہ ہے۔ باقی معافیات خالص امام باڑے کی ہیں۔

دوسرا امام باڑہ جو کفر توڑ کے نام سے مشہور ہے محلہ بہادر داجی میں ہے عمارت اس کی پختہ ہے مگر شاندار نہیں ہے۔ اس مقام پر پہلے بت خانہ تھا بہ عہد آصف الدولہ میں محرم کے موقعے پر ہندو و مسلمانوں (اہل تشیع) میں فساد ہوا مسلمانوں نے بت خانہ توڑ کر حکومت کے پنجۂ غضب سے محفوظ رہنے کے لیے امام باڑہ بنالیا اور اس کا نام کفر توڑ رکھ دیا۔...... علاوہ اس کے دو امام باڑے سنی سادات کے محلہ خلیل میں اور ایک شیعہ سادات کا محلہ دلازاک میں ہے جو عمارات کے لحاظ سے محض معمولی ہیں۔ پانچواں امام باڑہ بدلے دلال نور باف کا محلہ باقر زئی میں کسی قدر شاندار ہے۔ اس

کے مصارف کے لیے اس نے کچھ آراضی موضع سرائے خاص کی وقف کی ہے جس کی آمدنی ایک سو اسّی روپے سالانہ ہے۔ اور اس کی اولاد متولی ہے۔ (ایضاً: صفحہ ۱۶۸)

۳۔ مندر:

غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے یہاں دو درجن سے زیادہ مندر و شوالے نہ تھے اور ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو شاندار و خوشنما ہو مگر بعد غدر تمول و مردم شماری ہنود میں بہت ترقی ہوئی اور ان محلوں میں جو افاغنہ کی بود و باش کے لیے مخصوص تھے اس کے..... خستہ خراب ہو جانے سے زمینیں ہنود کے ہاتھ آئیں اور تعداد منادر میں سرعت کے ساتھ اضافہ ہوا۔ ۱۹۱۱ء میں ہمارے شمار کنندہ نے ان کی مجموعی تعداد ۷۵ پائی جن میں سے بعض کی عمارت نہایت خوشنما و شاندار ہے اور ان کے مصارف کے لیے مستقبل و گراں قدر اوقاف قایم ہیں۔

محلہ وار تفصیل یہ ہے

احمد پور	۱	فتح پور	۴	سرائے کائیان	۷
چمکنی گاڑی پورہ	۱	دلیل گنج گاڑی پورہ	۳	عبداللہ گنج	۳
بسرات سے پورب	۱	بھولا گنج	۱	چوکسی	۷
رنگ محلہ	۳	تلیا گھورن	۲	مسجد گنج	۳
کوچہ لالہ	۲	مظفر گنج	۲	بکسریان	۲
آفریدی	۱	حسین پورہ	۵	خلیل شرقی	۱
محمد زئی	۳	جھاؤنی ٹولہ	۳	ہندال خیل	۳
دلاور گنج	۵	ترین بہادر گنج	۴	برزیا مکو	۴
برزیا لالہ تیلی	۱	صدر بازار	۳		

(ایضاً: صفحہ ۱۶۹)

۴۔ گرجے:

خان بہادر حافظ مطیع اللہ خاں نے اپنی تاریخ مطیع میں شاہ جہان پور میں عیسائیوں کی عبادت گاہوں کا ذکر نہیں کیا۔ تاریخ صبیح کے مؤلف مولوی صبیح الدین نے صرف دو گرجوں کا ذکر کیا ہے، لیکن نام ان کے بھی نہیں بتائے۔ ایک گرجے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''بڑا گرجا سول لائن میں ۱۸۴۸ء میں تعمیر ہوا تھا۔ اس کی بلندی ستر فٹ ہے، عمارت خوش نما اور مضبوط ہے۔''

دراصل یہ وہی گرجا ہے، جس کا ذکر مورخین نے ۱۸۵۷ء میں چند انگریز عورتوں اور مردوں اور بچوں کی پناہ گاہ کے طور پر کیا ہے جو ہفتے کی عبادت کے لیے جمع ہوئے تھے اور اچانک حالات کی خرابی کی وجہ سے گرجے میں ٹھہر گئے۔ انگریزوں نے جس کا ذکر قتل گاہ کے طور پر کیا ہے۔ اس گرجے کا نام ''سینٹ میری گرجا'' تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ گرجا کے اندر کسی کا قتل ہونا ثابت نہیں، کسی نے گرجا پر فائرنگ بھی نہیں کی! یہ سراغ بھی نہیں ملتا کہ گرجا میں محصوروں کو خوف زدہ کرنے کے لیے پکڑو، مارو، قتل کرو کے نعرے لگائے ہوں۔ عورتیں، بچے، مرد گرجے کی اوپر کی منزل پر چلے گئے تھے۔ ان کو بھی کسی نے نہیں چھیڑا۔ گرجا کی کسی نے نہ توہین کی اور نہ اسے نقصان پہنچایا۔ حال آں کہ جو حالات اور فضا پیدا ہو گئی تھی، اس میں یہ باتیں ممکنات میں سے نہیں تھیں۔ گرجا کے اندر نہیں گرجا کے باہر قریب و دور دو تین قتل ضرور ہوئے تھے۔ پھر جب اس روز سہ پہر کو محصورین کا قافلہ پوایاں کے لیے گاڑیوں میں روانہ ہوا تھا تو کسی مجاہد وطن، حریت پسند اور آزادی خواہ نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ حال آں کہ ان کے لیے یہ کوئی مشکل نہیں تھا کہ وہ اس قافلے کے جو دو تین محافظ تھے، ان کو بھگا دیتے یا قتل کر دیتے۔ اس کے بعد قافلے کے ستم رسیدہ مظلومین چند عورتیں، مرد اور بچے رہ جاتے۔ انھیں قتل کر دینے میں کیا دشواری پیش آسکتی تھی؟ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مظلومین کا وہ قافلہ بہ خیریت اپنی منزل مقصود پوایاں کو پہنچ گیا اور کوئی ایسا حادثہ پیش نہیں آیا اور تاریخ میں مجاہدین وطن کے نام کو کوئی بٹا نہیں لگا۔

ان باتوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جنگ آزادی کے جانبازوں کے سامنے آزادی کے نصب العین کے سوا کوئی دوسرا مقصود نہ تھا اور لوٹ مار و قتل وخوں ریزی وغیرہ سے انھیں کوئی غرض نہ تھی۔ اگر چہ انگریزوں نے یہ الزام انھیں پر ڈالا تھا، لیکن تاریخ نے اپنا ورق الٹ دیا اور یہ راز فاش ہوگیا کہ اس سے زیادہ ضخیم تاریخ تو خود انگریزوں کی لوٹ مار اور قتل وخوں ریزی کی تاریخ ہے۔ البتہ اس سے قطعاً انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کتنے ہی اہل وطن کے لیے ان کے اپنے اور خاندان کے دشمنوں سے انتقام لینے کے لیے حالات کے انتشار کو سازگار بنادیا تھا۔ اور موقعہ پرستوں اور پیشہ وروں کے لیے تو ایسی فضا گویا فصل کاٹنے کا موسم ہوتا ہی ہے۔ انھوں نے حالات کی نزاکت سے فایدہ اٹھایا۔ ہم ان کی حرکات ذمیمہ کا طعنہ سن سکتے ہیں، ان کی ذمے داری نہیں لے سکتے۔

شاہ جہان پور اور روہیل کھنڈ میں لڑی جانے والی تاریخ آزادی کی ایسی خصوصیات تھیں جن کا اعتراف مولوی صبیح الدین کے ذوق انگریز پرستی میں مانع نہ ہوسکتی تھی لیکن اس کے اس اظہار کے لیے جو جرأت اور عزیمت مطلوب تھیں، میاں صاحب اس سے قطعی محروم تھے۔

لیکن خان بہادر حافظ مطیع اللہ خاں کو خدا نے تاریخ کے جس اعلیٰ ذوق اور جس تہذیب و شرافت سے نوازا تھا، توقع تھی کہ وہ ان خصوصیات کی طرف ضرور توجہ فرمائیں گے، لیکن انھوں نے ان گرجا کا تاریخی آثار اور عبادت گاہوں میں شاہ جہان پور کے کسی گرجے کے ذکر ہی کو لایق اعتنا نہ سمجھا۔ بس جب تک تبصرہ نگار کو کسی بیان کے ترک واخذ کا پس منظر معلوم نہ ہو، وہ کسی مصنف کے عدم تحریر و سکوت کو زیر نقد و جرح کیوں کر لاسکتا ہے۔ اس لیے اس مقام پر میرے لیے گریز کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

صاحبِ تاریخ صبیح نے ایک اور گرجے کو لایق تذکرہ سمجھا ہے لیکن نام اس کا بھی نہیں لکھا..... فرماتے ہیں:

"البتہ جو گرجا ۱۹۱۲ء میں ایڈل کی کوٹھی کے قریب جانب شمال دیسی

عیسائیوں کا تعمیر ہوا ہے، اس کی عمارت شاندار اور خوش نما ہے۔"

گویا کہ اس کے ذکر کی وجہ عمارت کی شان اور اس کی خوش نمائی ہے۔ دوسرے گرجا کے بارے میں ان کا بیان یہ ہے:

"شہر میں اور بھی گرجے ہیں، مگر عمارات کے لحاظ سے ان میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہے۔" (تاریخ سمیع: صفحہ ۵۵)

(۱۶)

مقبرے اور قبرستان

مقابر جن پر حکومت نے قبضہ کرلیا:

پرانے مقبرے اس شہر مین حسب ذیل ہیں۔ جن میں سے بعض شان دار اور بعض معمولی ہیں:

۱۔ مقبرہ نواب بہادر خان بانی شہر بہادر گنج کے شمال میں واقع ہے عہدِ اورنگ زیب میں پہلے نواب عزیز خان نے تعمیر کرایا، کتابہ نہ ہونے سے سال تعمیر دریافت نہیں ہوسکتا ہے۔

۲۔ مقبرہ نواب عزیز خان مقبرہ نمبر (۱) سے شرق میں واقع ہے اس میں نواب عزیز خان بانی مقبرہ نمبر (۱) کا مزار ہے ان کے بیٹے نواب تہور خان نے اس کو بنانا شروع کیا تھا مگر وہ ایک خانہ جنگی میں مارے گئے۔ لہٰذا مکمل نہ ہوا اور اب تک اسی طرح ہے۔

بعد غدر املاک نوابان قلعہ کے ساتھ گورنمنٹ نے دونوں مقبرے بھی ضبط کر کے گیان سنگھ ٹھاکر ساکن موضع کھنڈر علاقہ تحصیل جلال آباد کو بہ صلۂ خیر خواہی ایام غدر بہ شمول آراضی مضبوطہ شہر شاہ جہان پور عطا کیے جس پر مؤلف گزیٹیر شاہ جہان پور اظہار تعجب کرتا ہے مگر اس زمانے میں حکام اکثر اضلاع میں مساجد و مقابر کے متعلق ایسی غلطیوں کے مرتکب ہوئے۔ اس لیے کوئی تعجب کی بات نہیں۔

گیان سنگھ نے خیر خواہ سرکار ہونے کے گھمنڈ میں مقبروں کے ساتھ نہایت بدسلوکی کی۔ تعویذ مزار نواب بہادر خان جو بیش قیمت سنگ مرمر کا تھا کھودلیا اور حوالی مقبرہ کی عمارت کھود کر اینٹیں بیچ لیں گیان سنگھ کی وفات کے بعد اس کی اولاد زیر بار قرضہ ہوئی اور وہ تمام املاک جو بہ صلۂ خیر خواہی سرکار سے اس کو عطا ہوئی تھی، ۱۸۸۷ء

میں بہ غرض ایفائے مطالبہ ڈگریات دیوانی کے نیلام ہوئی۔ اس وقت مسلمانوں نے چندہ کر کے دونوں مقبرے خرید کر لیے مگران کی مرمت کا کوئی انتظام اب تک نہ ہوا بدستور بے مرمت ہیں تاریخی عظمت کے لحاظ سے دونوں مقبرے اس قابل ہیں کہ محکمۂ آثارِ قدیمہ ان کو مثل مقبرہ نواب دلیر خاں شاہ آبادی کے اپنی سپردگی میں لے کران کی مرمت وحفاظت کا انتظام کرے ورنہ جلدان کے برباد ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

۳۔ مقبرہ نواب احمد علی خان محلّہ گوہر پورہ میں ۔ سڑک مشن اسکول جدید کے مقابل واقع ہے۔ عمر کے لحاظ سے یہ تمام مقابر شاہ جہان پور سے چھوٹا مگر خوبی عمارت کے لحاظ سے سب سے بڑا اور ابڑھا ہوا ہے۔ بیگم نواب مرحوم نے سنہری مسجد کی تعمیر ختم ہونے پراس کا بنوانا شروع کیا تھا مکمل ہونے نہیں پایا تھا کہ غدر ہو گیا اور انھیں دنوں بیگم صاحب کا بھی انتقال ہو گیا اس وجہ سے نامکمل رہا، بعد دفع آشوب غدر جب انگریزی حکومت واپس آئی تو مسٹر منی مجسٹریٹ وکلکٹر ضلع نے اس میں قیام کیا اور چوکھٹ کواڑ لگا کر رہنے اور کچہری کرنے کے قابل کرلیا اور راجہ روشن لال کا محل سرا و دیوان خانہ جو وہاں سے تھوڑے فاصلے پر محلّہ باقر زئی میں واقع تھا جیل خانہ بنایا گیا۔

اسی مقبرے کی چھت کے تلے اسیران بلا غدر کی قسمت کا فیصلہ ہوا اسی جگہ احمد اللہ شاہ کا سر منی صاحب کے سامنے راجہ پوایاں کے بھائی نے پیش کیا۔ اسی مقام سے اس حکم کا نفاذ ہوا جس نے بہادر خانی قلعے کو ہمیشہ کے لیے دنیا سے مٹادیا۔ اسی چار دیواری سے حکم ضبطی املاک اولاد بہادر خان ودیگر شرفا جاری ہوا۔ اسی عمارت کو قلعے کی مسماری کے بعد اولاد بہادر خان کے بعض خاندانوں کے گوشہ عافیت بننے کا موقع حاصل ہوا۔

بیگم صاحبہ کا علاقہ جو اچھا خاصہ تعلقہ تھا ضبطی سے محفوظ رہ کر بعد غدر وارثوں کے ہاتھ آیا مگر کسی نے ان کے چھیڑے ہوئے کام کو پورا نہ کیا جتنا بن چکا تھا اور اتنا ہی اب تک موجود ہے اور اب مقبرے اور اس کے حوالی میں اولاد بہادر خان آباد ہے۔

وَتِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاس.

دیگر مقابر:

۴۔ مقبرہ دیوان میر خلیل محلہ باڑوزئی میں واقع گیارھویں صدی کے آخر میں بہ عہد اورنگ زیب تعمیر ہوا مگر کتابہ نہ ہونے سے سال بنا معلوم نہیں ہو سکتا۔ صاحب مقبرہ کا نام میر خان اور قومیت افغان خلیل ہے پرانی دستاویزوں میں جو ہماری نظر سے گزریں اس کی صراحت موجود ہے، ان کے بیٹے کا نام سعادت خان اور پوتوں کے نام حیات خان، محمد خان تھے۔ جو ۱۱۸۳ھ تک زندہ تھے۔

۵۔ مقبرہ کرم علی خان محلہ حیات پورہ میں متصل مسجد واقع ہے۔

۶۔ مقبرہ عائشہ بی بی محلہ حیات پورہ میں ہے اور اس کے پہلو میں مسجد ہے جو اسی خاتون کی بنائی ہوئی ہے۔ موتی بی جس کی بنائی ہوئی ایک مسجد اسی محلے میں ہے ان کی حقیقی بہن تھیں۔

قبرستان:

اس شہر میں چھوٹے چھوٹے قبرستان ہر طرف کثرت سے نظر پڑتے ہیں ۱۸۹۱ء میں شمار ہونے پر کئی سو پائے گے۔ ابتدا میں صرف دو بڑے قبرستان تھے ایک شہر سے فاصلے پر چنور میں جہاں شہدائے جنگ چنور مدفون تھے دوسرا ہدف میں شہر سے پچھم تھا۔ اکبر نے یہ آئین قرار دیا تھا کہ قبرستان شہر سے پچھم ہونا چاہیے ابوالفضل کہتا ہے۔

گورستان را بیرون شہر مغرب رویہ قرار دہد (۱) جس کی تعمیل سختی سے اس کے اور اس لے جانشینان کے دور حکومت میں کی جاتی تھی اس لیے شہر آباد ہونے پر یہ دونوں قبرستان ان موقعوں پر قایم کیے گئے تھے مگر بعد میں حکومت تیموریہ کے ضعیف ہو جانے پر تمام ضوابط و آئین درہم و برہم ہو گئے لہٰذا سیکڑوں قبرستان قائم ہو گئے اب بڑے قبرستان حسب ذیل ہیں:

۱۔ گورستان ہدف		۲۔ گورستان گدیانہ
۳۔ گورستان مہمان شاہ		۴۔ گورستان گاڑی پورہ۔

قریب مزار شاہ اسحٰق صاحبؒ۔ ہر ایک کے قریب فقیروں کی آبادی ہے جو قبرستان کی حفاظت کرتے ہیں۔

ذرا دیکھ عبرت سے سوتے ہیں غافل
مزاروں میں پہنے کفن کیسے کیسے

(ماخوذ و ملخص بہ تاریخ مطیع)

(۱۷)

پل، سرائیں اور بسراتیں

پختہ پل حکیم مہدی:

اس شہر کی دونوں ندی پر پل پختہ بنے ہوئے ہیں۔ آغاز آبادی شہر میں ندی کھنوت پر کاٹھ کا مختصر پل بنایا گیا تھا جس کے آثار ہمارے سن شعور تک باقی تھے۔.....
حکیم مہدی علی خان لکھنؤ چھوڑ کر یہاں آئے اور ۱۲۴۱ھ (۱۸۴۵ء) میں بجائے چوبی پل کے پختہ پل تعمیر کرایا اور اس کے شرقی کنارے پر مسجد اور غربی کنارے کے قریب سرائے پختہ بنوائی۔

گرا کا پل ۱۹۱۴ء میں چندے سے زیر اہتمام دسٹرکٹ بورڈ تیار ہوا۔

سرائے باغ کھرنی:

پل پختہ کے علاوہ ایک پختہ سرائے باغ کھرنی میں کچہریوں کے پاس ہے، جو بعد غدر گورنمنٹ کے اہتمام سے تعمیر ہوئی تھی۔

سرائے منوگنج:

ایک سرائے خام محلہ بہار دواجی میں ہے جو سرائے منوگنج مشہور ہے۔ اس کے پھاٹک پر کتابہ لگا ہوا ہے جس سے بانی کا نام دیوان منولال ساکن حسین پورہ اور سال تعمیر ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) ظاہر ہوتی ہے۔

بسراتیں:

ندی کھنوت پر نہانے کے پختہ گھاٹ جن کو بسرات کہتے ہیں، دو جگہ بنے ہوئے

ہیں ایک ندی کے بائیں کنارے پر گاڑی پورہ کے جانب جو بسرات مصراین مشہور ہے۔ دوسرا ندی کے داہنے کنارے پر جو بسرات حسین پورہ مشہور ہے۔ پہلا نیا غدر کے بعد کا اور دوسرا پرانا غدر سے پہلے کا ہے۔ مگر چند سال ہوئے از سر نو بہت وسیع کر کے بنایا گیا ہے اور میونسپلٹی نے اس کی تعمیر میں گراں قدر مدد دی ہے۔

بسرات حسین پورہ دیوان منولال ساکن حسین پورہ نے ۱۸۳۷ء میں بنائی ہے۔ (ماخوذ از تاریخ مطیع: صفحہ ۱۸۱)

بسرات حسین پورہ کو ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں دیوان منولال ساکن حسین پورہ جنھوں نے سرائے منوگنج بنوائی ہوئی ہے تعمیر کرایا تھا۔ جو کتبہ سے ثابت ہے، دریا پر نہانے کے پختہ گھاٹ کو بسرات کہتے ہیں اسی دریائے کھنوت کے بائیں کنارے پر بسرات مصرائین بنی ہوئی ہے یہ قدیمی بسرات ہے۔ اس کو رائے بہادر شیونراین مصر کے خاندان سے ایک معزز اور باہمت خاتون تھی جنھوں نے اس کو بنایا تھا۔ اس کی مرمت اور توسیع جو حال میں ہوئی ہے، میونسپلٹی نے اس میں گراں قدر امداد دی ہے۔

(تاریخِ صبیح: صفحہ ۶۱)

(۱۸)

چند سماجی وتہذیبی تقریبات

چنور کا میلہ:

عیدین کی صبح کو چنور کا میلہ ہوتا ہے جو ۱۸۵۷ء سے پہلے قدیم قبرستان چنور کے قریب باغات میں لگا کرتا تھا بعد غدر حکام فوج نے وہاں میلہ ہونے کی ممانعت کردی۔ تب قبرستان گدیانہ کے قریب باغات میں قایم ہوا۔ اور امسال خلافت کمیٹی کی تحریک سے قبرستان عیدگاہ میں لگایا گیا۔

اس میلے کی بنیاد آبادی شاہ جہان پور کے ساتھ ساتھ اس وجہ سے پڑی کہ جنگ چنور میں جو لوگ شہید ہوئے تھے وہ میدان جنگ میں دفن کردیے گئے تھے۔ صبح عیدین کو لوگ ان کے مزاروں پر فاتحہ پڑھنے شاہ جہان پور سے جاتے تھے اور بعد دوپہر وہاں سے لوٹ کر مقبرہ نواب بہادر خان بانی شہر پر فاتحہ خوانی کرتے ہوئے قریب شام اپنے گھروں کو واپس آتے تھے۔ شہر سے فاصلہ ہونے کی وجہ سے آسایش کے لیے چنور میں چند گھنٹے ٹھرنا ضروری ہوتا تھا جس کی وجہ سے کھانے پینے کی چیزیں لے کر دکان دار وہاں جمع ہونے لگے سودا اچھی طرح فروخت ہوا اس لیے سال بہ سال ان کی تعداد میں ترقی ہوکر رفتہ رفتہ میلے کی شکل قایم ہوگئی۔ (تاریخ مطیع: صفحہ ۱۸۲)

مطیع اللہ خاں صاحب تاریخ مطیع لکھتے ہیں:

عیدین کے موقع پر قبرستان ہدف میں چند گھنٹے کے لیے بے ترتیب میلہ ہوتا ہے اور یوم عید الضحیٰ کی شب میں عیدگاہ و مزار حاجی قلندر صاحب پر جو اس سے ملا ہوا واقع ہے اراذل واجلاف اور ان کی عورات اپنی منتیں پوری ہونے کے شکریے میں چراغاں کرتے ہیں اور حاجی صاحب کے مزار پر شیرینی و مالیدہ لاکر فاتحہ دلاتی ہیں اس شب میں چراغاں کرنے کی وجہ معلوم نہیں۔ ممکن ہے کہ حاجی صاحب کے

وصال کا دن ہو اور عرس کے سلسلے میں یہ رسم جاری ہوئی ہو۔ بہر حال جو منت مانتا ہے وہ چراغاں میں سے ایک روشن چراغ لے کر ہوا سے اس کو بچاتا ہوا گھر کا رخ کرتا ہے اگر گھر تک چراغ جلتا ہوا پہنچ گیا تو مراد حاصل ہونا یقینی سمجھتا ہے اور اگر راستے میں گل ہو گیا تو اپنی بدقسمتی پر روتا ہے۔

محرم و چہلم:

باوجودے کہ یہاں شیعہ برائے نام آباد ہیں مگر محرم و چہلم بہت زور شور سے ہوتا ہے اور تعزیے نہایت عمدہ بنائے جاتے ہیں۔ بعض تعزیے سیکڑوں روپے کی لاگت میں تیار ہوتے ہیں اور کربلا لے جانے کا اہتمام بھی اعلا پیانے پر کیا جاتا ہے۔

۱۸۸۵ء میں جب محرم و دسہرا ایک وقت میں پڑا ہندو مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہوا مسلمان چاہتے تھے دسہرا بعد عشرہ ہو۔ ہنود اس پر راضی نہ ہوئے اس وقت مسٹر اوکشاٹ ایک نوجوان سویلین قایم مقام مجسٹریٹ ضلع و مسٹر سڈنی اسمتھ سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے وہ دفع اختلاف مناسب طور پر نہ کر سکے اس لیے مسلمانوں نے تعزیے بنانے سے انکار کر دیا اور عشرہ محرم نہ ہوا۔ مگر ہنود کی راج گدی ہوئی۔ جس سے تعلقات ہندو مسلمان میں کشیدگی پیدا ہو گئی جو اس شہر کے لیے نئی بات تھی۔

(تاریخ مطیع: صفحہ ۱۸۳)

جب کبھی ایسا ہوا کہ محرم اور دسہرا کی تقریبات ایک ہی تاریخوں میں پڑیں، حکام کی غفلت سے یا انتظامات کی خرابی سے دسہرا اور محرم منانے والوں کے درمیان حالات خراب ہوئے یا فسادات کی صورت پیدا ہو گئی، لیکن ان اختلافات نے عوام کو بے چینی کے سوا کبھی عام فسادات سے متاثر نہ کیا۔ چناں چہ اٹھارہ سو پچاسی چھیاسی ستاسی و نوے وغیرہا میں بعض ناخوش واقعات پیش آئے تھے اور ۱۸۹۱ء میں مسلمانوں نے احتجاجاً تعزیہ بند کر دینے کا اعلان کر دیا تھا، لیکن مسٹر برل ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کی کوشش سے مسلمانوں نے یہ پابندی اٹھا لی تھی۔ بعد کے برسوں کے حالات کے بارے میں خان بہادر مولوی مطیع اللہ خان لکھتے ہیں:

''۱۹۱۷ء میں پھر عشرۂ محرم و دسہرا ایک وقت میں پڑا مسٹر واکر مجسٹریٹ ضلع کے مناسب انتظام سے دونوں کام امن وامان سے ہوگئے۔ سال ہائے مابعد میں گو مسٹر واکر مجسٹریٹ ضلع نہ تھے مگر ان کے جانشین نے بھی وہی انتظام قایم رکھا اور کوئی فساد ۱۹۱۸ء و ۱۹۱۹ء کے محرم و دسہرے میں نہیں ہوا۔'' (ایضاً: صفحہ ۱۸۴)

بسی غازی میاں:

یہ میلہ صرف پل پختہ پر تھوڑی کے لیے ہوتا ہے۔ ہجوم زیادہ نہیں ہوتا ہے۔ دفالی بلند علم لیے ہوئے گاتے بجاتے گزر جاتے ہیں۔

دسہرہ اور رام نومی چرائین:

شہر میں ہنود کے میلے دسہرا، رام نومی و چرائین ہوتے ہیں شاہ جہان پور میں رام لیلا بنانے کی رسم انگریزی عمل داری میں ۱۸۵۰ء کے قریب شروع ہوئی۔ کالی پلٹن کے ہندو سپاہیوں نے جن کو تلنگے کہتے تھے اور بیشتر اودھ کے چھتری و برہمن تھے، اپنے دیس کے رواج کے مطابق کنٹونمنٹ میں رام لیلا بنایا۔ جب وہ پلٹن تبدیل ہوگئی تو شہر کے ہنود نے حاتم باغ میں اس رسم کو ادا کیا اور راج گدی مندر گھرنی باغ کو لے جانے لگے۔ پھر بجائے حاتم باغ کے رام لیلا قریب کربلا ایک بغیا میں بننے لگا مگر انتظامی دقتیں پیش آنے سے مسٹر ایچ سی اردن نے ہنود کو موقع بدلنے کی ہدایت کی اور انھوں نے ایک آراضی قریب گھاٹ لودی پور خرید کر کے وہاں لیلا بنانا و جلانا شروع کیا۔ چند سال بعد وہ آراضی ہائی اسکول کے لیے گورنمنٹ نے حاصل کر لی لہٰذا مقام رام لیلا جیل وسرائے گھرنی کے قریب ۱۹۱۳ء میں قرار پایا جو اب تک ہے۔

رام نومی و چرائین کے میلے تھوڑی دیر کے لیے پل پختہ پر ہوتے ہیں۔ ان میلوں سے شہر کی صنعت حرفت و تجارت کو کوئی نفع نہیں پہنچتا ہے۔ اگر ان میں سے کسی کے ساتھ نمایش قایم کی جائے تو مقامی صناعیوں کے جمود میں روانی آجانے کی امید ہوسکتی ہے۔

حصۂ دوم

روہیل کھنڈ اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء

تحریکِ آزادی کے بانی اور مجاہد اعظم

دارالحکومت بریلی

اور

اس کا نظام سیاسی

بہ شمول

محمدی میں قومی حکومت کا قیام

ترتیب و تدوین

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء تحریکِ آزادی

کے بانی اور مجاہدِ اعظم

حصہ دوم

باب اول:

بانی تحریک انقلاب ۱۸۵۷ء

تحریکِ آزادی کے بانی اور مجاہدِ اعظم

مولوی سرفراز علی گورکھ پوری

(۱)

مولوی صبیح الدین شاہ جہان پوری

نسباً سید، وطن گورکھ پور، آپ متبحر عالم خوش بیان واعظ اور قوی النسبت صوفی تھے۔ سلسلۂ چشتیہ نظامیہ میں شاہ ابواللیث خلیفہ شاہ سبحان علی صاحب خلیفہ مولانا فخر الدین صاحب شاہ جہان آبادی کے خلیفہ تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے قریب گورکھ پور چھاؤنی سنگولی کے رسالے میں شاہ جہان پور کے بہت لوگ ملازم تھے۔ اس رسالے میں غلام محمد خاں رسالدار ساکن محلہ تارین گاڑی پورہ اور شاہ غلام امام خان صاحب ساکن محلہ ہاتھی تھان پیر و مرشد حافظ میاں صاحب بھی ملازم تھے۔ یہ لوگ آپ کے وعظ کے جلسوں میں برابر شریک ہوتے، غلام امام خان صاحب آپ کے مرید ہوگئے تھے۔ اس تعلق سے ۱۸۵۷ء کے قریب آپ شاہ جہان پور تشریف لائے اور شہر میں جابجا آپ کے وعظ ہوئے۔ شاہ جہان پور کی چھاؤنی میں جو پلٹن تھی اس میں بھی مسلمان سپاہی تھے انھوں نے چھاؤنی میں مولانا کا وعظ کرایا۔ اتفاقِ وقت سے سرکاری فوجیں باغی ہوگئیں اور اسی آتش فتنہ وفساد کے شرارے شاہ جہان پور کی فوج میں بھی پہنچے۔ یہاں کی پلٹن نے بغاوت کردی اور مولانا کو زبردستی اپنے ہمراہ بریلی لے گئی اور پھر وہاں سے جب یہ پلٹن دہلی گئی تو مولانا کو اپنے ساتھ رکھا۔ اس وجہ سے حکام کو مولانا کی طرف سے بدگمانی ہوگئی جیسا کہ گزیٹیر شاہ جہان پور میں تحریر ہے کہ کچھ عرصے سے یہاں کی فوج مولانا کی زیر اثر آگئی تھی۔ مؤلف تاریخ مطبع لکھتے ہیں کہ ہم نے ثقات سے سنا ہے کہ مولانا کا کوئی تعلق سرکش فوج شاہ جہان پور سے نہیں

تھا۔ انھوں نے کبھی سرکار کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا۔ غدر کے بعد مولانا نیپال چلے گئے راجہ نے نہایت احترام و اکرام سے پناہ دے کر گزارہ مقرر کردیا۔ آپ کا نیپال ہی میں وصال ہوا اور وہیں سپرد خاک ہوئے مولانا ایک زبردست عالم سحر بیان، خوش اخلاق اور کامل درویش تھے سماع بھی سنتے تھے شاہ جہان پور میں غلام امام خان ان کے خلیفہ تھے۔ (تاریخ صبیح: حصہ دوم، صفحہ ۳۲-۳۳۱)

(۲)

محمد ایوب قادری

مولوی سرفراز علی گورکھ پور کے رہنے والے، عالم اور واعظ خوش بیان تھے، چشتیہ نظامیہ سلسلے میں شاہ ابواللیث خلیفہ شاہ سبحان علی، خلیفہ شاہ فخر الدین دہلوی کے مرید و خلیفہ تھے۔ انھوں نے فوج میں انگریزی اقتدار کے خلاف جذبۂ نفرت پیدا کیا۔ گورکھ پور کے قریب سنگولی کی چھاؤنی میں شاہ جہان پور کے بہت سے لوگ ملازم تھے، جن میں غلام محمد خاں رسالدار اور شاہ غلام امام خاں ساکنان شاہ جہان پور خاص سے قابلِ ذکر ہیں۔ شاہ جہان پور کے لوگ مولوی سرفراز علی کے وعظوں میں اکثر شریک ہوتے تھے۔ اس طرح مولوی سرفراز علی کے مرید ہوگئے، اور ۱۸۵۷ء کے موقع پر مولوی سرفراز علی شاہ جہان پور تشریف لائے، شہر میں جا بجا ان کے وعظ ہوئے، مسلمان سپاہیوں نے خاص چھاؤنی میں ان کا وعظ کرایا۔ اور اس طرح شاہ جہان پور کی سپاہ سے براہِ راست ان کا تعلق ہوگیا۔ اور جب شاہ جہان کی فوجوں نے انگریزوں کی غلامی کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکا تو اس موقع پر مولوی سرفراز علی شاہ جہان پور میں موجود تھے۔ وہاں سے فوج کے ہمراہ مولوی صاحب بریلی پہنچے اور بخت خان کے مشورے سے دہلی روانہ ہوئے۔ مولوی سرفراز علی کا تعلق دہلی کی انقلابی جماعت سے پہلے سے تھا، جیسا کہ مولوی صاحب کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ باقی باللہ کے عرس کے موقع پر فروری ۱۸۵۷ء میں وہ دہلی میں تھے، اور رسالدار سردار خاں سے ملے تھے۔

مولوی سرفراز علی دہلی پہنچے تو ان کی اور بخت خاں کی کوششوں سے دہلی کی

تحریک آزادی میں جان آگئی اور وہ آخر وقت تک بخت خاں کے شریک و سہیم رہے۔
دہلی کے مشہور فتویٰ جہاد پر مولوی سرفراز علی نے دستخط کیے سقوط دہلی کے بعد وہ بخت خاں کے ساتھ لکھنؤ آئے، اور آخر میں تحریک کے دوسرے قایدین کے ہمراہ نیپال چلے گئے اور وہیں انتقال ہوا۔ مؤلف تاریخ شاہ جہان پور لکھتے ہیں:

> ''غدر کے بعد وہ نیپال چلے گئے۔ راجہ (نیپال) نے نہایت احترام و اکرام سے پناہ دے کر گذارہ مقرر کر دیا آپ کا نیپال ہی میں وصال ہوا۔ اور وہیں خاک ہوئے مولانا ایک زبردست عالم، سحر بیان واعظ، خوش اخلاق اور کامل درویش تھے۔ سماع بھی سنتے تھے۔''

شاہ جہان پور میں غلام امام خاں مولوی سرفراز علی کے خلیفہ تھے، جن کا انتقال ۱۲۸۴ء میں ہوا۔ شاہ جہان پوری غلام امام خان کے بہت سے مرید تھے، جن میں حافظ احمد حسین عرف حافظ میاں (ف ۱۳۲۵ھ) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ حافظ میاں سے متعدد تصانیف یادگار ہیں۔ جن میں سے کلیات نظم اور میزان الانفاس طبع ہو چکی ہیں۔

(۳)

مکتوب مولوی سرفراز علی

جناب من بعد سلام نیاز آں کہ سردار خاں رسالدار ساکن ساگر کنول دہلی بیرون شہر در سرائے عیدگاہ کہنہ مقیم است واز معتقدان مولوی صاحب مرحوم و مغفور چوں کہ بندہ دیروز بعرس افضل المتاخرین قدوۃ العارفین خواجہ باقی باللہ قدس اللہ سرہ العزیز رفتہ بود ❶ مشارٌالیہ جستجوئی بر مکان گرامی، می نمود، اتفاقاً ازیں احقر ملاقات گردید، حال قبلہ گاہی صاحب آں مکرم شنیدہ بسیار افسوس نمودہ و مشتاق مواصلت

---

❶ خواجہ باقی باللہ کا انتقال ۲۵ جمادی الاخریٰ ۱۰۱۲ھ میں ہوا اس لیے عرس ۲۵/ جمادی الاخریٰ ۱۲۷۳ھ کو ہوا ہوگا جو فروری ۱۸۵۷ء کے مطابق ہوتا ہے۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی سرفراز علی تحریک کی تیاری کے سلسلے میں اس وقت دہلی میں موجود تھے۔ اور فوجی آدمیوں رسالدار سردار خاں وغیرہ سے ملاقات کر رہے تھے۔ (محمد ایوب قادری)

ہستند اگر دریں وقت فرصت باشد درفاتحہ خواجہ صاحب داخل ثواب شدہ ملاقات بفرمایند زیرا کہ اوہم در آنجا خواہد آمد بہ موجب مصرع　　ع

چہ خوش بود کہ براید بیک کرشمہ دو کار

فقط رقیمہ احقر العباد سرفراز علی

نوٹ: یہ مکتوب میرے جد امجد مولوی حکیم سعید اللہ مرحوم کے کاغذات میں تھا جو میری پھوپی محترمہ غفور النساء (ف ۱۴/ زی الحجہ ۱۳۸۱ھ م ۱۹۶۲ء) زوجہ حاجی چودھری شمس الدین رئیس و زمیندار قصبہ اوجھیانی ضلع بدایوں (ف ۸/ اکتوبر ۱۹۶۵ء) کے پاس محفوظ تھے۔ میری درخواست پر یہ مکتوب پھوپی مرحومہ نے مجھے عنایت فرمادیا۔ میں نے یہ مکتوب نیشنل میوزیم آف پاکستان کراچی میں داخل کردیاہ۔ (محمد ایوب قادری)

مجاہد اعظم اور حکمران محمدی

مولوی احمد اللہ شاہ

(۱)

سید خورشید مصطفیٰ رضوی

باڑی سے مولانا احمد اللہؒ نے قصبہ محمدی کا رخ کیا اور شاید موزوں جگہ دیکھ کر قیام کیا تاکہ شاہ جہان پور، ہردوئی اور فرخ آباد پر حملے کیے جاسکیں۔ یہ تمام کارروائیاں اس قدر خفیہ اور اچانک ہوتی تھیں کہ انگریز حیران و پریشان تھے کہ ''باوجود انتہائی کوشش کے مولوی کی روانگی کی سمت کا پتا نہیں چلتا۔'' جیسے ہی کولن کچھ فوج چھوڑ کر شاہ جہان پور سے گیا، مولاناؒ نے حملے کا ارادہ کرلیا لیکن انگریزوں کو جاسوسوں نے چوکنا کردیا تھا اور انھوں نے محفوظ پناہ گاہ بنالی۔ انقلابی فوج تیزی سے بڑھی، آدھی رات کے بعد چار میل دور قیام کیا، اگلے دن حملہ کرکے شہر پر قبضہ کرلیا۔ انگریز اس حملے کی تاب نہ لاکر جیل خانے کی عمارت میں بند ہوگئے۔ اس جنگ میں انگریزی فوج تین گنا زیادہ تھی جس میں سکھ اور گورکھے بھی تھے۔

(فتح محمد تائب، تواریخ احمدی (قلمی): صفحہ ۹۸ تا ۱۰۰)

شاہ جہان پور کے نواح میں کئی جنگیں ہوئیں۔ ۲۸ر اپریل ۱۸۵۸ء کو موضع بچھوریا گھاٹ پر جنگ ہوئی۔ نظام علی خاں کام آگئے اور بخشی رام کائستھ نے بھی جان دی۔ مولاناؒ عارضی طور پر ہٹ گئے لیکن دو تین دن بعد پھر حملہ کیا۔ اس موقعے پر ایک عمارت بھی جلادی گئی (جو ''جلی کوٹھی'' کے نام سے مشہور ہے)۔ ۱۱ر مئی کے بعد تین چار دن جنگ جاری رہی۔ ۱۱ر مئی کو کھنوت ندی کے کنارے جنگ ہوئی۔ انگریزی فوج پانچ گنا زیادہ تھی مگر اسے شکست ہوئی۔ اس کے بعد انگریزوں کی پناہ گاہ کا محاصرہ کرکے گولا باری کی گئی، کافی مال غنیمت ہاتھ آیا۔ بعض روایات سے پتا چلتا ہے کہ ۱۵ر مئی تک تمام انقلابی لیڈر یعنی بیگم حضرت محل، شاہ زادہ فیروز، مایاں صاحب

(محمدی کا راجہ) نانا صاحب، بخت خاں، ڈاکٹر وزیر خاں، مولوی فیض احمد، عظیم اللہ خاں، مولوی سرفراز علی، نواب تفضّل حسین، مولوی لیاقت علی بھی یہاں آ پہنچے تھے۔

ایک جنگ قصبہ کانٹ (شاہ جہان پور سے ۵ میل) میں ہوئی۔ جہاں انقلابیوں کو شکست ہوئی کیوں کہ جنرل جونس بھی آ گیا تھا۔ مولانا جنگ کرتے ہوئے مغرب کی طرف جا کر موضع سکندر آباد (تحصیل جلال آباد) میں مقیم ہوئے۔ کمانڈر انچیف کولن اب خود اِدھر متوجہ ہوا، ۱۸؍ مئی ۱۸۵۸ء یا اس کے کچھ بعد یہاں پہنچا، مختلف سمتوں سے فوجیں روانہ کر کے چاروں طرف سے گھیر لیا تاکہ مولانا بچ کر نہ جا سکیں مگر یہ تمام تدبیریں دھری کی دھری رہ گئیں اور مولانا اُسی طرف سے صاف بچ کر نکل گئے جدھر کمانڈر انچیف خود نگرانی کر رہا تھا۔ اس طرح سال بھر کی محنت کے بعد انگریزوں نے جس اودھ سے باغیوں کو دھکیلا، یہ جاں باز مولوی اب اسی اودھ میں داخل ہو رہا تھا۔ قصبہ محمدی (لکھیم پور، کھیری) میں باقاعدہ مولانا کی حکومت قایم ہوئی، نانا صاحب کو دیوان بنایا گیا، بخت خاں وزیر دفاع، مولوی سرفراز علی قاضی ہوئے۔ راجہ لونی سنگھ بھی ہمراہ تھا۔ سکہ جاری ہوا:

سکہ زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ
حامئ دینِ محمد احمد اللہ بادشاہ

ہردوئی اور فرخ آباد پر حملے:

مئی ۱۸۵۸ء کے آخری ہفتے میں (۲۴؍ مئی کو) مولانا نے فرخ آباد کی حدوں تک حملے کیے، بچھوریا گھاٹ پر بھی معرکہ ہوا، آس پاس کے علاقوں کے پٹھان انقلابیوں کے ہمراہ تھے۔ ایک انگریز افسر کی رپورٹ یہ تھی کہ ''وہ پٹھان نہایت احتیاط سے فوجی قافلے کی نوعیت اور روانگی کا وقت معلوم کر کے مولوی کو اطلاع دیتے ہیں۔ انھی کی اطلاع کی بنیاد پر اس کو ہمارے آخری قافلے کے کوچ کی خبر مل گئی تھی [1]۔

[1] بریڈفورڈ اسسٹنٹ کمشنر فتح گڑھ کی رپورٹ بہ حوالہ مآثر دلاوری۔ ۱۶۱ شاید اسی جاسوسی کی بنا پر فرخ آباد کے کوتوال غلام علی خان کو پھانسی دی گئی۔

چناں چہ سانڈی ضلع ہردوئی پر حملہ کر کے انھوں نے قبضہ کیا یہاں نرپت سنگھ بھی اُن کے ساتھ ہوگیا اور تمام سورج بنسی راجپوت بھی (ایک کے علاوہ) ان کے ساتھ تھے۔ انگریزوں کو یہ اطلاعات کسی طرح نہ پہنچ سکتی تھیں کہ مولوی کی نگاہیں اب کسی مقام کو نشانہ بنانے والی ہیں۔ ان افسروں کی حیرانی ان کی خط وکتابت سے پوری طرح عیاں ہوتی ہے۔ مئی کے آخر ہفتے میں پالی (ہردوئی) پر بھی حملہ ہوا، آس پاس کے زمیندار مثلاً کیوں سنگھ (راجپورت سردار) موضع بھوگنی کا نرائن سنگھ کے علاوہ گوکل سنگھ، منالال، دیوانی سنگھ اور جملہ ہندو مسلمان سردار مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پالی کا عنایت خاں بھی ان کے ساتھ تھا اور ٹھاکران کی فوج میں شامل ہوگئے تھے۔ نرپت سنگھ نے بلگرام کو لوٹا پھر سانڈی کی طرف بڑھا جہاں مولانا کے ساتھ مل کر دھرم پور کی طرف رخ کر دیا (فاروقی (ابرار حسین) مآثر دلاوری: صفحہ ۱۶۷-۱۶۵) پالی پر مولانا کے حملوں کا ذکر آر سی مجمدار نے بھی اپنی کتاب میں کیا ہے لیکن بعض سرکاری کاغذات سے واضح ہوتا ہے کہ پالی، سانڈی، اور بلگرام پر حملہ مولوی لیاقت علی نے کیا تھا، کاغذات میں صرف ''مولوی'' لکھا گیا ہے جس سے اُلجھن پیدا ہوتی ہے۔

(Freedom Struggle in UP. Vol.2, pp. 416-29)

بریلی میں خوں ریز جنگ:

ان حالات کو یہاں چھوڑ کر ہم بریلی کی طرف واپس ہو رہے ہیں جہاں فرید پور میں ۵ر مئی کو انگریزی فوجیں یکجا ہو کر آ گئی تھیں۔ نانا صاحب، بخت خاں، فیروز شاہ وغیرہ بریلی آ گئے۔ فیروز شاہ تو بریلی میں رہے، باقی لیڈر مولانا احمد اللہؒ کی مدد کو پہنچے۔ شاہ جہان پور سے کولن کی فوج بھی بریلی کی طرف بڑھی۔ بیگم حضرت محل، ولی داد خان، راجہ تیجا سنگھ اور بالا صاحب بھی بریلی میں تھے۔ اسکیم یہ تھی کہ گوریلا طریقۂ جنگ اختیار کیا جائے اور شہر خالی کر کے تمام روہیل کھنڈ میں پھیل جائیں۔ تمام تیاریاں مکمل ہوگئیں۔ مگر جب انگریزی فوجیں بریلی کی طرف بڑھیں تو بہادر روہیلے مقابلے پر تیار ہوگئے۔ دشمن کی زبردست فوجوں سے بغیر مقابلہ کیے ہٹ جانا انھیں

گوارا نہ تھا۔ خان بہادر خاں کے پاس بڑی توپیں بھی نہ تھیں پھر بھی شہر سے چار میل دور نکیٹا ندی کے کنارے صف آرا ہوئے اور روہیلوں کی اس سرفروشانہ تگ و تاز نے وہ تاریخی جنگ پیش کی جو تاریخ کے صفحات پر غازیوں کی جنگ، کے عنوان سے ثبت ہے اور دشمن بھی دل کھول کر داد و تحسین بلند کر رہا ہے۔

پہلے انگریزی توپ خانہ حرکت میں آیا لیکن غازیوں نے اس کی پروانہ کرتے ہوئے غضب ناک ہو کر حملہ کیا اور پنجاب رائفلس کے دستوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ جب سنگین بردار فوج آگے بڑھی تو غازیوں نے ڈھالیں اپنے سروں پر کر لیں۔ کمر کے بل جھک گئے اور تلواریں گھماتے ہوئے سنگینوں کے نیچے پہنچ کر انگریز فوجیوں کی ٹانگیں کاٹ دیں۔ آخر کار ایک بھی غازی زندہ نہ بچا۔ یہ تو ہونا ہی تھا مگر میلیسن، فوربس میچل، ولیم رسل اور دیگر متعدد مصنفوں نے انھیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ میچل اس جنگ کا عینی شاہد ہے، کہتا ہے:

> ''سبز رنگ کے صافے اور پٹکے باندھے ہوئے، بائیں ہاتھوں میں ڈھال اور دھاردار تلواریں لیے ہوئے تھے۔ غضب ناک ہو کر اندھادھند حملہ آور ہوئے۔ وہ اپنے جسموں کو جھکائے ہوئے تھے۔ کسی نے بھاگنے کی کوشش نہ کی، مرنے یا مارنے کو نکلے تھے۔''

فوربس میچل نے اندازاً اُن کی تعداد تین سو ساٹھ بتائی ہے۔ سر کولن اُن کا تیزی سے حملہ دیکھ کر حیرت میں رہ گیا، چلا چلا کر صرف اتنا کہہ سکا:

> ''نمبر ۴۲ قدم جمائے رہو، سنگینوں سے مقابلہ کرو، یہ غازی ہیں، یہ غازی ہیں!''

بعض کتابوں میں ہے کہ یہ غازی قرآن پاک کے الفاظ کی انگوٹھیاں پہنے تھے، داہنی طرف سے ''بسم اللہ، اللہ، دین دین'' کے نعرے لگا کر حملہ آور ہوئے۔

(MITCHELL: Reminicenses: pp 254-56, CHAUDHURI: (Shashi Bhusan) Civil Rebellion in the Indian Mutinies, 1857-59, Culcutta, 1957, p 113, EDWARDS (Mechael): Battles of the

(Indian Mutiny: London, 1963. p 147) رسل نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ وہ اگر چہ تعداد میں بہت کم تھے مگر اُن کے دلیرانہ حملہ نے گوروں کو بدحواس کر دیا اور وہ گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہائی لینڈرز نے ان کی پیش قدمی روکنا چاہی مگر وہ آگے بڑھتے چلے گئے اور کچھ تو انگریزی فوج کے پیچھے تک پہنچ گئے وہ وہیں لڑتے ہوئے ختم ہو گئے مگر گوروں کو بھی یوں کاٹ کر پھینک دیا جیسے گھاس کے پولے درانتی سے کٹتے ہیں۔ ان میں صرف ایک زندہ بچا تھا جو کسی تاک میں دم سادھے پڑا تھا۔ جیسے ہی کمانڈر انچیف ادھر آیا، وہ لاشوں کے درمیان سے اٹھ کر اس پر ٹوٹ پڑا۔ انگریزی فوج کے ایک سکھ نے اس آخری غازی کا خاتمہ کر دیا۔

۵ر مئی ۱۸۵۸ء کو شاہ زادہ فیروز نے بغیر مقابلہ کیے میر گنج (ضلع بریلی) چھوڑ دیا۔ البتہ نکٹیا ندی کے کنارے خان بہادر خاں کے ساتھ تھا۔ ایک چشم دید بیان ہے کہ عین جنگ کے وقت خان بہادر خان کا ہاتھی بگڑ کر بھاگ کھڑا ہوا اور فوج میں افراتفری پھیلنے لگی لیکن شاہ زادہ تیغ آزمائی کے جوہر دکھاتا رہا۔ جس سمت گھوڑے کی باگیں موڑ دیتا صفیں کی صفیں کاٹ کر رکھ دیتا۔ ''جس وقت مجاہدین اللہ اکبر اور یا علی کے نعرے بلند کرتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ عرش کے کنگرے ٹوٹ کر گر پڑیں گے [1]''

آخری جنگ شہر کے متصل چھاؤنی کے قریب ہوئی۔ روایت ہے کہ اس میں ولی داد خان، بندے میر خاں اور گل داد خاں وغیرہ شامل تھے۔ ایک انگریز افسر فوربس میچل، جو موقعے پر موجود تھا، اپنی یادداشت میں غازیوں کی جنگ کے بارے میں لکھتا ہے:

> ''خان بہادر خاں کی فوج میں غازیوں کی ایک جماعت تھی، یہ شہادت کے نشے میں چور تھے۔ دین دین کا نعرہ لگا کر ہمارے سامنے آئے، حملہ آور ہونے سے پہلے اُن کا سردار جو ایک بیس سالہ نوجوان تھا، جس کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا، صف سے آگے بڑھ کر ہم سے یوں مخاطب

---

[1] رسالہ ''العلم'' کراچی۔ اپریل جون ۱۹۵۷ء میں صفحہ ۳۷، تاریخ روہیل کھنڈ (قلمی) میں ہے کہ ''روز چہار شنبہ ۲۰ ر رمضان ۱۲۷۴ھ / ۵ر مئی ۱۸۵۸ء کے لڑائی ہوئی۔ فی الحقیقت اس لڑائی میں فیروز شاہ نے بڑی بہادری دکھائی۔

ہوا: ''کیا تم میں کوئی حوصلہ مند ہے جو میرا مقابلہ کر سکے؟ اگر ہے تو سامنے آئے!'' اس کی آواز پر ہماری صفوں میں سناٹا چھا گیا کوئی آگے نہ بڑھا، ایک منٹ کے بعد پھر چیلنج دیا اور کہا۔ میں پانچ آدمیوں سے تنہا مقابلہ کر سکتا ہوں، لیکن پھر بھی کوئی حرکت نہ ہوئی۔ آخر جھنجھلا کر اُس نے تلوار میان سے نکالی اور ہماری صفوں پر اس شدت سے حملہ کیا کہ چشم زدن میں اٹھارہ آدمیوں کو زخمی کر دیا۔ اس کی بے نظیر شجاعت سے کمانڈنگ آفیسر اس قدر متاثر ہوا کہ اس کو زندہ گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ زخمی ہو جانے کے باوجود جب کہ اس کے ہر عضو سے خون کے فوارے نکل رہے تھے، اس نے دوبارہ اسی شدت سے حملہ کیا، جب کمانڈنگ آفیسر نے دیکھا کہ اگر اس کو قتل نہ کیا گیا تو شاید ساری کمپنی (سو آدمی) کا صفایا کر دے گا۔ تو مجبوراً اس نے حکم دیا کہ ''سنگینوں سے خاتمہ کر دو۔'' یہ سن کر سپاہیوں نے اسے گھیر لیا، اور اپنی سنگینیں بہ یک وقت اس کے سینے میں پیوست کر دیں لیکن جب تک اس کی روح جسم میں باقی رہی، برابر اپنی تلوار کے جوہر دکھاتا رہا۔'' (MITCHELL (Forbes): Reminicences of the Great Indian Mutiny, 1897, 1904 P. 255)

غازیوں کی جواں مردی پر ساور کر کا خراج تحسین:

''دنیا کی تاریخ میں بے مثال بہادری اور شہادت کے مثالوں میں کوئی اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی۔'' (Sanacar, P. 451)

خان بہادر خان نے شہر خالی کر دیا مگر انگریزی فوج کو شہر میں داخل ہونے میں تامل تھا کہ کہیں پھر غازیوں سے پالا نہ پڑ جائے۔ شہر خالی ہو گیا تو یہ فوجیں ٹوٹ پڑیں۔ خان بہادر اور دوسرے انقلابی پیلی بھیت کی طرف نکل گئے۔

(العلم جنگ آزادی نمبر: صفحہ ۸۴،۸۵)

احمد اللہ شاہ

(۲)

۲۸ ر مئی ۱۸۵۸ء کو انگریزوں کی طرف سے مولانا احمد اللہ کو گرفتار کرنے والے کے لیے پچاس ہزار روپے انعام کا اعلان کر دیا گیا۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کے درمیان یہ اشارہ بھی کر دیا تھا کہ اب ہم نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گے۔

راجہ پوایاں جگن ناتھ سنگھ بغاوت کے شروع میں انگریزوں کو پناہ نہ دینے کی بنا پر ان کا دشمن سمجھا جاتا رہا اور مولانا اسے اپنا ہمدرد سمجھتے تھے۔ کچھ عرصے سے اُس کا بھائی بلدیو سنگھ مولانا کے ہمراہ تھا اور راجہ کی شکایت کرتا تھا کہ وہ انگریزوں کا حامی ہو گیا ہے۔ اس لیے اس کے بجائے بلدیو کو گدی پر بٹھایا جائے۔ بلدیو کے پیہم اصرار پر مولانا پانچ سو سواروں کو ہمراہ لے کر پوایاں گئے۔ سواروں کو قریب کے باغ میں ٹھہرایا اور خود دو سواروں کو لے کر گڑھی پر پہنچے تو دروازہ بند پایا۔ بعض کتابوں میں ہے کہ وہ امداد کے لیے راجہ سے ملنے گئے اور اس نے امداد کا وعدہ کیا تھا، لیکن تاریخ احمدی (مؤلفہ فتح محمد تایب) اس کی تصدیق نہیں کرتی۔ اس میں بیان کردہ واقعہ مختصر طور پر یہ ہے کہ گڑھی کے دربانوں نے راجہ کے پوجا کرنے کا عذر کیا۔ کچھ انتظار کے بعد مولانا نے ہاتھی طلب کیا اور دروازہ توڑنے کا حکم دیا۔ وہ خود گھوڑے پر سوار تھے کہ اتنے ہی گڑھی کے پھاٹک سے، جہاں راجہ موجود تھا، گولیاں چلیں جن سے مولانا اور ان کے دونوں ساتھیوں کی شہادت واقع ہو گئی۔ یہ واقعہ بہ روز منگل ۱۵ ر جون ۱۸۵۸ء (۲ ر ذی قعدہ ۱۲۷۴ھ) کا ہے۔........

گولی لگنے کے بعد راجہ اور اس کا بھائی گڑھی سے باہر آئے۔ مولانا کے خون آلود سر کو تن سے جدا کیا اور قریب ہی تیرہ میل دور انگریزی کیمپ میں (شاہ جہان پور) لے گئے۔ انگریز افسرات کا کھانا کھا رہے تھے جب راجہ نے اندر داخل ہو کر یہ تحفہ پیش کیا۔ اگلے دن جسم کو جلا کر راکھ دریا میں بہا دی گئی۔ اور سر کو کوتوالی پر لٹکایا گیا۔

(ماخوذ)

(۳)

مجسٹریٹ شاہ جہاں پور (جی پی منی) کا خط

یہ مجسٹریٹ شاہ جہان پور کے اس خط کا ترجمہ ہے جو اس نے مولانا احمد اللہ شاہ کی شہادت کی خبر سن کر روہیل کھنڈ کے کمشنر کو لکھا تھا۔ اس نے لکھا:

"۱۷ر جون ۱۸۵۸ء

میرے نیم سرکاری خط مورخہ ۱۵ اور ۱۶ جون سے آپ کو یہ اطلاع مل چکی ہوگی کہ مولوی احمد اللہ شاہ پوائیں میں قتل کر دیا گیا۔

(۲) اب میں آپ کو مزید رپورٹ دینے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں کہ گذشتہ رات راجا کا فرستادہ یہاں آیا اور اپنے ساتھ مولوی کا سر اور جسم لایا تھا اور جس کا کہ میں دن بھر انتظار کرتا رہا دو پہر کے بعد ان کے نہ آنے سے مجھے بے قراری شروع ہوئی اور میں نے جنرل سے ملتانی کیولری کا ایک دستہ پوائیں بھیجنے کی درخواست کی تا کہ اگر راجہ باغیوں کی طرف سے سر کو چھین لینے کی کوشش سے کسی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہو تو اس کی مدد کی جائے۔

(۳) سر کو پوائیں اور شاہ جہان پور کے کئی آدمیوں سے شناخت کرالیا گیا کہ یہ مولوی احمد اللہ شاہ کا ہے اور اب شک وشبہے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ سر کو پبلک کے سامنے کوتوالی پر رکھا گیا اور جسم کو برسر عام آج صبح جلا کر راکھ دریا میں بہادی گئی۔

(۴) میں نے کل نیم سرکاری خط میں راجہ کے خط کی جو نقل روانہ کی ہے اس سے آپ کو مولوی کی موت سے متعلق تفصیلات کا علم ہوا ہوگا تاہم میرے پاس چند دوسرے ذرائع سے جو خبریں آئی ہیں ان کے پیش نظر میں نہیں سمجھتا کہ واقعی کوئی سخت تصادم ہوا۔ ظاہر ہے کہ مولوی ایک خاص تعداد میں اپنے ہمراہیوں کے ساتھ "گڑھی" پر آیا تھا اور راجہ جگن ناتھ سنگھ سے بات چیت کی خواہش ظاہر کی، جس نے اپنے بھائی بلدیو سنگھ کو بات کرنے کے لیے بھیجا کہ معلوم کرے کہ مولوی کیا چاہتا ہے۔ مولوی نے مطالبہ کیا کہ نایب تحصیل دار اور تھانے دار کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔ اس کا یہ مطالبہ اسی وقت نامنظور کر دیا گیا۔ اس پر اُس نے اپنے ہم راہیوں کو حکم دیا کہ قلعے کا

دروازہ ہاتھی کے ذریعے توڑ دیا جائے۔

(۵) یہ سن کر راجہ کے ساتھیوں نے مولوی اور اس کے ساتھیوں پر فائرنگ شروع کر دی اور اس کے نتیجے میں مولوی اور اس کے دو ساتھی مارے گئے۔ جیسے ہی مولوی گرا بلدیو سنگھ نے اس کا سر تن سے جدا کرنے کا حکم دیا تین آدمی راجہ کی طرف کے بھی مارے گئے اور تقریباً بیس شدید زخمی ہوئے۔ یہ اچانک حادثہ میگزین اور بارود پھٹنے سے ہوا۔

(۶) حکومت کی طرف سے پچاس ہزار رُپیہ کا جو انعام باغی مولوی کی گرفتاری پر مقرر کیا گیا تھا اس میں خاص شرط یہ تھی کہ ''اس کو کسی انگریزی کیمپ یا فوجی پوسٹ پر زندہ گرفتار کیا جائے۔ اگرچہ واقعہ بالکل اسی طرح پیش نہیں آیا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ موجودہ صورت میں بھی پورا انعام راجہ کو دے دینا چاہیے جس کی بہ دولت انتہائی مستقل مزاج اور بے حد بااثر باغی سرداروں میں سے ایک سے چھٹکارا ملا ہے۔

(۷) جب سے میں نے ضلعے کا چارج لیا ہے میں برابر راجہ پر دباؤ ڈالتا رہا ہوں کہ اگر اُس نے حکومت برطانیہ سے ہمیشہ کی طرح پھر وفاداری کا ثبوت دیا تو یہ اس کے حق میں نہایت مفید ہوگا۔ جب مجھے یہ خبر ملی تھی کہ محمدی کے باغیوں کی طرف سے پوائیں پر حملے کا خطرہ ہے تو میں نے اُسے متنبہ کیا تھا کہ وہ مولوی کی گرفتاری کا یہ موقع ہاتھ سے ہرگز نہ جانے دے۔ مجھے خوشی ہے کہ آخر کار اس میں کامیابی ہوئی اور ایک ایسا باغی لیڈر جو اپنے پیروؤں پر حیرت انگیز اثر رکھتا تھا اور انتہائی خطرناک دشمن ثابت ہو رہا تھا، اس کا دور مٹ چکا ہے۔ (فریڈم اسٹرگل......: جلد ۵، صفحہ ۳۹-۵۳۷)

احمد اللہ شاہ

(۴)

خراج تحسین:

جب یہ خبر انگلینڈ پہنچی تو انگریزوں کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ ہومز خوشی سے بے تاب ہو کر کہتا ہے:

"شمالی ہند میں برطانیہ کا سب سے زیادہ خطرناک دشمن ختم ہو گیا۔"

(Holmes: p.530)

وہ یہ بھی اعتراف کرتا ہے کہ

"اس پیمانے سے مناسبت دیکھی جائے تو تمام باغیوں میں وہی بادشاہت کے لیے سب سے زیادہ مستحق تھا۔"

ساورکر بھی اس اقرار پر مجبور ہے کہ

"مولوی کی زندگی سے عیاں ہوتا ہے کہ اسلام کا سچا پرستار مادرِ وطن کے لیے زندگی قربان کرنا ہمیشہ فخر سمجھے گا۔"

میلی سن کی رائے یہ کہ

"مولوی بڑا عجیب انسان تھا۔......فوجی لیڈر کی حیثیت سے اس کی صلاحیت کے بہت سے ثبوت ملے ہیں۔کوئی اور شخص یہ ناز نہیں کر سکتا کہ اس نے سر کالن کیمپبل کو دو مرتبہ سر میدان شکست دی.......اگر ایک انسان کو جس کے وطن کی آزادی بے انصافی سے چھین لی گئی ہو اور جو اسے پھر آزاد کرانے کی کوشش کرے اور اس کے لیے جنگ کرے، محب وطن کہا جا سکتا ہے تو بے شک مولوی ایک سچا محب وطن تھا۔اس نے کسی بے کس کی موت سے اپنی تلوار کو کلنک نہیں لگایا، نہتے اور بے قصوروں پر ہاتھ نہیں اُٹھایا۔اس نے مردانہ وار آن بان کے ساتھ ڈٹ کر کھلے میدان میں ان غیر ملکیوں کا مقابلہ کیا جنھوں نے اس کا ملک چھین لیا تھا۔ہر ملک کے بہادر اور سچے لوگوں کو مولوی کو عزت سے یاد کرنا چاہیے۔" (MALLEON: Vol 4, p. 381)

اور مورخ ٹامس اسٹین نے لکھا:

"وہ بڑی قابلیت رکھتا تھا۔وہ ایسا شجاع تھا کہ خوف نہیں کرتا تھا، اپنے عزم کا پکا اور مستقل مزاج تھا۔باغیوں میں اُس سے بہتر کوئی سپاہی نہیں تھا، کہا جاتا ہے کہ اس نے ہی چپاتیاں تقسیم کرائیں۔" (تاریخ ہندوستان از ذکاءاللہ: جلد ۳، صفحہ ۹۲)

مولانا احمد اللہ کا حلیہ:

میلی سن نے مولانا کا حلیہ بھی بیان کیا ہے۔ جس کے مطابق وہ دبلے لمبے اور گٹھیلے جسم کے تھے۔ آنکھیں بڑی اور گہری تھیں۔ بھنویں گھنی اور آگے کی طرف نکلی ہوئی تھیں۔ عقابی ناک جو آگے سے مڑی ہوئی تھی۔ ایک اور شخص جس نے شہادت کے بعد شناخت کیا، یہ حلیہ بیان کرتا ہے کہ ''سانولا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں اور بال تمام سر پر تا دوش اور داہنے ہاتھ کی ایک انگلی کٹی ہے۔''

مولانا کے سر کا راز:

جیسا کہ ابھی بیان ہوا، جسم کو جلا کر راکھ دریا میں بہادی گئی۔ ایک روایت ہے کہ کربلا کے میدان میں جسم کو جلانے کے بعد گدھوں کا ہل چلوایا گیا، تاریخ احمدی کا بیان یہ ہے کہ

جلایا کیے جسم کو تین روز نہ لیکن جلا وہ تن جاں فروز

ان کے سر کو کوتوالی شاہ جہان پور پر لٹکایا گیا۔ بعض جگہ بیان ہے محلہ احمد پورہ میں شہر کے باہر موضع جہان آباد (یا گنج) میں ایک چھوٹی سی مسجد کے قریب سر کا مدفن ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ وہ کھیت ہو جہاں جسم کو جلایا گیا لیکن انگریزوں سے یہ توقع بعید از قیاس ہے کہ وہ کوئی مدفن بنا کر یادگار بنا دیں کیوں مولانا کی حیرت انگیز مقبولیت کا انھوں نے بہ چشم خود مشاہدہ کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ پھر آخر سر کہاں گیا؟ اس کا راز صرف ایک انگریز مورخ رچرڈ کولیر نے اپنی کتاب (Sound of Fury) میں کھولا ہے کہ دوسری جنگ عظیم تک لندن کے رائل کالج آف سرجنس کے میوزیم میں مولوی کا سر موجود تھا، دیکھنے والوں کے لیے یہ ایک انوکھی عجیب شے تھی۔

(Richard Collier: Sound of fury. p. 350)

راجہ پوایاں پر حملہ:

مولانا کی شہادت کی خبر جب محمدی میں پہنچی تو انقلابی سردار جوش انتقام سے دیوانے ہو گئے۔ اسماعیل خان نے پوایاں پر حملہ کیا۔ ۲۲ جون ۱۸۵۸ء کے اس حملے

میں محمدی کے تعلقہ دار بھی شامل تھے۔ انھوں نے راجہ کی گڑھی چھین لی، تاخت تاراج کیا مگر راجہ ایسا چھپا کہ ہاتھ نہ آیا۔ تمام اودھ میں یہ غم ناک خبر پہنچی، انقلابی عوام شکستیں کھانے کے باوجود آگ اور خون کے دریا میں کود پڑے۔ اودھ پھر دشمن کو للکار رہا تھا۔ نظام علی خان (یا خان علی خان) پیلی بھیت کی طرف بڑھا۔ خان بہادر خان کے ساتھ چار ہزار جاں باز میدان میں نکل آئے۔ نانا صاحب، بالا صاحب اور علی خان میواتی وغیرہ نے روہیل کھنڈ اور اودھ میں تین ہزار سپاہ کے ساتھ جدو جہد شروع کردی۔ نواب تفضّل حسین اور ولایت شاہ بھی اپنی فوجوں کے ساتھ بڑھ رہے تھے۔ پوائیں کا راجہ کانپ اٹھا، انگریزوں نے اس کی حفاظت کے لیے دستے روانہ کیے۔ گھاگراندی کے کنارے چوک گھاٹ پر بیگم حضرت محل کے ہیڈ کواٹر تھے ان کے پیچھے راجہ رام بخش، بھوناتھ سنگھ، کنڈا سنگھ، کلاب سنگھ، بھوپال سنگھ، ہنومنّت سنگھ وغیرہ اپنی فوجیں لیے ہوئے تھے۔ شاہ زادہ فیروز بھی یہیں آگیا تھا۔ راجہ بنی مادھو اپنے قلعے سے نکل کر کان پور کی راہ سے لکھنؤ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ گونڈا کے راجہ نے راجپوت فوج منظّم کر کے گھاگرا کے بائیں کنارے پر انگریزی دستوں کا مقابلہ کیا۔ بنی مادھو نے گوریلا طریقے سے جنگ شروع کردی۔ اس کے اسّی ہزار ساتھی اودھ کے چپے چپے پر پھیل گئے اور انگریزی دستوں پر اچانک حیران کن حملے کیے۔ محمد حسن نے فیض آباد کے قریب کئی بار جنگ کی۔ لال مادھو سنگھ نے امیٹھی پر دفاع کیا۔ ہری چند نے چھ ہزار فوج کے ساتھ سندیلے سے دس میل شمال میں گومتی کو پار کیا۔ ہر بار شکست ہوئی مگر انگریزی فوجوں کو بھی سخت نقصان پہنچایا اور ان کے وفاداروں مثلاً سراؤں کا رام پرشاد اور مان سنگھ (شاہ گنج) کو حملے کر کے مزا چکھا دیا۔ ان کے جذبات اور ہمتیں ہمیشہ کی طرح بلند تھیں۔ (مجمدار: صفحہ ۸۰، ۸۱)

(ماخوذ)

باب دوم:

آزاد روہیل کھنڈ اور اس کا سیاسی مطالعہ

صوبہ غرب وشمال اور روہیل کھنڈ

(۱)

مولانا غلام رسول مہر

جس صوبے کو انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد صوبہ جاتِ متحدہ آگرہ واودھ (یونائیٹڈ پراونسز یا یوپی) کا نام دیا، وہ الحاق اودھ سے پیشتر انگریزی حکومت کی اصطلاح میں ''صوبہ غرب وشمال'' (نارتھ ویسٹرن پراونس) کہلاتا تھا، لیکن یہ اس کا اصلی نام نہ تھا اور نہ یہ سمجھنا چاہیے کہ اس صوبے کو ہندوستان کی انگریزی حکومت میں سرحد غرب وشمال کی حیثیت حاصل تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ بنگال، بہار اور اڑیسہ انگریزوں کے قبضے میں آئے تو ان تینوں کو ملا کر احاطۂ بنگال (بنگال پریذیڈنسی) کا نام دے دیا گیا۔ پھر غربی حصے میں کچھ اضلاع آہستہ آہستہ شامل ہوتے رہے۔ وہ سب ابتدا میں احاطۂ بنگال ہی کا جزو بنتے گئے۔ ۱۸۳۳ء میں انتظامی سہولت کے پیش نظر احاطۂ بنگال کی تقسیم عمل میں آئی تو شامل شدہ اضلاع کو الگ کر کے ایک نیا صوبہ بنا دیا گیا۔ چوں کہ یہ صوبہ احاطۂ بنگال کے غرب وشمال میں واقع تھا لہٰذا اسے یہ نام دے دیا گیا اور آگرہ اس کا صدر مقام قرار پایا۔

ڈویژن:

۱۸۵۷ء میں ہنگامے کا آغاز ہوا تو صوبہ غرب وشمال کے چھ ڈویژن تھے، جن میں سے پانچ کی تفصیل مع متعلقہ اضلاع کے ذیل میں درج ہے:

نمبر	ڈویژن	اضلاع
۱	آگرہ	آگرہ، متھرا، مین پوری، اٹاوہ، ایٹہ، فرخ آباد
۲	میرٹھ	میرٹھ، مظفرنگر، سہارن پور، بلند شہر، ڈیرہ دون اور علی گڑھ

۳	بریلی	بریلی، شاہ جہان پور، مراد آباد، بجنور اور بدایوں
۴	الہ آباد	الہ آباد، فتح پور، کان پور، باندہ اور ہمیر پور
۵	بنارس	بنارس، مرزاپور، جون پور، غازی پور، گورکھ پور اور اعظم گڑھ

گورکھ پور کو بعد ازاں دو ضلعوں میں تقسیم کر دیا گیا، ایک گورکھ پور اور دوسرا بستی۔ اسی طرح پیلی بھیت بھی بعد ازاں بریلی سے الگ کر کے ایک مستقل ضلع بنا دیا گیا۔

تشویش واضطراب:

بریلی اسی علاقے کا مرکزی مقام ہے، جسے عام طور پر روہیل کھنڈ کہا جاتا ہے۔ اس علاقے نے روہیلوں کے زمانۂ اقتدار میں بڑی اونچی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ شجاع الدولہ والی اودھ نے وارن ہسٹینگز کو روپے کا لالچ دے کر ساتھ ملایا اور دونوں کی مشترکہ قوت نے روہیلوں کو تباہ کر دیا۔ ان میں سے حافظ الملک حافظ رحمت خاں بہت ممتاز و نام ور تھے۔

صرف بریلی نہیں بلکہ پورے روہیل کھنڈ میں اسی وقت سے تشویش واضطراب کی لہریں دوڑنے لگی تھی، جب دم دم اور بارک پور میں نئی بندوق اور اس کے لیے چربی والے کارتوسوں نے سراسیمگی پیدا کی تھی۔ روہیل کھنڈ کے لوگ مذہبی معاملات میں بہت ذکی الحس تھے۔ پھر ان میں دینی غیرت وحمیت بہت بڑھی ہوئی تھی۔ وہ کیوں کر گوارا کر سکتے تھے کہ ملازمت کے سلسلے میں کسی ایسی حرکت کے مرتکب ہوں، جو ان کے مذہب کے خلاف تھی۔ میلی سن لکھتا ہے:

> ''وہ بار بار کہتے تھے کہ ہم نے اور ہمارے آباواجداد نے انھیں پرانی بندوقوں سے ہندوستان کو مسخر کر لیا، پھر اب نئی بندوق کی کیا ضرورت ہے؟''

فوجی افسروں کو اس تشویش واضطراب کا احساس تھا۔ اگرچہ ان حالات کا کوئی اندازہ نہ تھا جو آگے چل کر پیش آنے والے تھے۔

احتیاطی تدابیر:

بریگیڈیر سبالڈ (Sibbald) بریلی چھاؤنی کا افسر اعلا تھا، وہ دورے پر گیا ہوا تھا۔ جب میرٹھ میں سرکشی کی اطلاع بریلی پہنچی اور اس کی جگہ کرنیل کالن ٹروپ (Troup) کمانداراعظم کے فرایض انجام دے رہا تھا۔ اس کے علاوہ فوجی افسروں میں سے کپتان ایلگزانڈر میکنزی (Mackenze) قابل ذکر ہے، جس نے ہنگامے کو روکنے کے لیے بڑی جانبازی سے کام لیا، اگرچہ کامیاب نہ ہوسکا۔

میرٹھ سے سرکشی کی خبر آتے ہی کرنیل ٹروپ نے انگریز عورتوں اور بچوں کو نینی تال بھیج دیا۔ جتنے دیسی جیش بریلی میں موجود تھے، ان میں سے نمبر آٹھ بے قاعدہ رسالہ نیک نامی میں بہت مشہور تھا۔ اور اس کی وفاداری پر انگریزوں کو خاص اعتماد تھا لہٰذا کرنیل ٹروپ نے فیصلہ کیا کہ اس کی تعداد دگنی کرلی جائے۔ ساتھ ہی تمام سول افسروں کو خط لکھ دیے کہ جہاں جہاں قابل اعتماد سوار ملیں، انھیں ملازمت کے لیے بھیج دیا جائے۔ کپتان میکنزی اسی رسالے کا کماندار تھا۔ ٹروپ نے سپاہیوں کے شکوک و شبہات دور کرنے کی بھی کوشش کی لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ اس اثنا میں بریلی، میرٹھ اور فیروز پور سے قاصد برابر پہنچ رہے تھے اور خان بہادر خاں (ابن ذوالفقار علی خاں، ابن حافظ رحمت خاں) کی انگیخت سے ضلع میں سازشوں کا جال بچھایا جارہا تھا۔

(میلی سن: جلد سوم، صفحہ ۲۰۵، ۲۰۶)

ہنگامے کی ابتدا:

۱۹ر مئی کو سبالڈ دورے سے واپس آیا اور دس دن بہ ظاہر اطمینان سے گزر گئے۔ ۲۹ر مئی کو کمشنر کی طرف سے ایک نوٹ کرنیل ٹروپ کے پاس پہنچا کہ جو اطلاعیں ملی ہیں ان کے مطابق ۶۸ پیادہ فوج آج ہی بغاوت کرنے والی ہے۔ عین اُسی وقت سارجنٹ میجر نے اطلاع پہنچائی، دریا میں نہاتے وقت نمبر ۸ اور نمبر ۶۸ کے آدمیوں نے حلف اٹھائے ہیں کہ رات کے دو بجے اٹھ کر تمام انگریز افسروں کو قتل کردیا جائے گا [1]۔

[1] بیان کیا جاتا ہے کہ کپتان میکنزی کو ایک ہندو رسالدار نے بھی یہی اطلاع دی تھی اور اس رسالدار نے اپنے ہندو سپاہیوں سے سب کچھ سنا تھا جو دریا پر نہانے کی غرض سے گئے تھے۔

ایک دن رات سخت تشویش میں گزرے۔ ۳۱ر کی صبح سے ہنگامے کے تمام آثار یکے بعد دیگرے رونما ہونے لگے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سے ۱۱ بجے کا وقت باہم طے ہو چکا تھا۔ چناں چہ ادھر گیارہ بجے، اُدھر نمبر ۶۸ کے سپاہی دوڑ کر توپوں پر جا پہنچے اور آس پاس کی عمارتوں پر گراب مارنے لگے۔ باقی سپاہوں نے بندوقیں سنبھالیں، چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنائیں اور انگریز افسروں کے بنگلوں کا رخ کیا۔

میکنزی کی کوششیں:

اب کپتان میکنزی نے کوششیں شروع کر دیں کہ اپنے سپاہیوں کو قابو میں لائے وہ ایک فریق کو راضی کر کے لاتا تو دوسرا بگڑ جاتا۔ بریگیڈیر سبالڈ مارا جا چکا تھا۔ کرنیل ٹروپ نے نینی تال جانے کا فیصلہ کر لیا اور لوگ بھی اس کے ساتھ تیار ہو گئے۔ میکنزی نے ہمت نہ ہاری۔ اگر چہ انجام کار اسے بھی ناکام ہو کر نکل جانا پڑا۔

یہاں یہ بتا دینا چاہیے کہ سپاہیوں کو اٹھانے اور مقصد آزادی کے لیے جانیں لڑا دینے کے لیے جن لوگوں نے مسلسل اور متواتر سرگرمی سے کام کیا وہ دو تھے: اول بخت خاں جو توپ خانے کا صوبیدار تھا، دوم محمد شفیع جو نمبر ۸ بے قاعدہ رسالے میں رسالداری کے منصب پر فائز تھا۔ میکنزی کی کوششوں کو ناکام بنانے کا سب سے بڑھ کر ذمہ دار محمد شفیع ہی تھا۔ میلی سن نے لکھا کہ صرف تئیس آدمی رہ گئے جنھوں نے انگریزوں کا ساتھ نہ چھوڑا اگر چہ انھیں بڑے لالچ دیے گئے۔ (میلی سن: جلد سوم، صفحہ ۲۱۱)

خان بہادر خاں:

انگریز رخصت ہو گئے تو خان بہادر خاں کی حکم رانی کا اعلان ہو گیا۔ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں وہ حافظ رحمت خاں کا پوتا تھا۔ انگریزوں کی مداخلت سے پیشتر روہیل کھنڈ کی حکومت اس کے جد امجد کے ہاتھ میں تھی اور مسند حکومت چھن جانے کے باوجود اس کے خاندان کو نہ صرف بریلی بلکہ پورے روہیل کھنڈ میں انتہائی عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

بڑے کارکنوں میں سے محمد شفیع رسالدار خان بہادر خاں ہی کے پاس رہا۔ بخت خاں فوج اور رُپیہ لے کر دہلی پہنچ گیا اور وہاں اس نے جو کارنامے انجام دیے وہ حالات دہلی میں بیان کیے جاسکتے ہیں۔ بعد میں جو کچھ کیا وہ اودھ کے حالات میں آئے گا۔ خاں بہادر خاں نے اپنے خاندان کے پرانے متوسلوں کو بھی جمع کرلیا بلکہ کہنا چاہیے وہ لوگ خود بہ خود خدمت گذاری کے لیے آگئے۔ مقصود یہ نہ تھا کہ عہدے اور منصب لیں، مقصود یہ تھا کہ جہادِ آزادی کے تعلق میں اپنا قومی اور مذہبی فرض ادا کریں۔

شاہ جہان پور:

جس روز بریلی میں ہنگامہ بپا ہوا تھا، اسی روز شاہ جہان پور میں آزادی کا پرچم لہرایا گیا۔ مجھے یقین ہے کہ نہ صرف بریلی اور شاہ جہان پور کے درمیان بلکہ روہیل کھنڈ کے دوسرے مراکز کے درمیان بھی مخابرات اور مشورے کے سلسلے جاری ہوں گے۔ انگریز ۳۱ رمئی کو گرجے میں جمع تھے، جب ان پر اچانک یورش ہوئی۔ بعض انگریز زخمی ہوئے۔ پھر انھوں نے دروازہ بند کرلیا اور عورتوں کو گرجے کے مینار میں پہنچادیا۔ اتفاق یہ کہ سپاہی حملے کے لیے آئے تو کسی کے پاس بندوق نہ تھی۔ سب کے ہاتھ میں یا تلواریں تھیں یا ڈنڈے تھے۔ پھر ایک انگریز بندوق لے کر آیا تو سپاہی بھی بندوقیں سنبھالنے کے لیے دوڑے۔ اس اثنا میں انگریزوں کے ملازم ان کے اسلحہ لے آئے۔ ہتھیار پاکر انگریزوں نے گرجے کا دروازہ کھولا تو گاڑیاں بھی موجود تھیں جن میں سوار ہوکر وہ گرجے پہنچے تھے اور کچھ سکھ سپاہی بھی ان کی حفاظت کے لیے آگئے تھے۔

اس اثنا میں چھاؤنی کے اندر ہنگامہ عام بپا ہوگیا اور انگریزوں کے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ شاہ جہان پور کو چھوڑ کر کوئی محفوظ مقام تلاش کریں۔ وہ پوائیں کے راجا کے پاس پہنچے، اس نے پناہ دینے سے انکار کردیا[1]۔ بعد میں وہ کہاں کہاں گئے؟ یہ تفصیل زیرِ نظر مجموعے کے بعض مضامین میں ہے۔ (ا۔س۔ش)

---

[1] یہی بدبخت راجا تھا، جس نے مولانا احمد اللہ شاہ کو دھوکے سے شہید کیا تھا اور انگریزوں نے اسے پچاس ہزار رُپے انعام میں دیے تھے۔

بدایوں:

بریلی اور شاہ جہان پور سے ملا ہوا بدایوں ہے۔ اس کے گرد و پیش ہنگامے بپا ہو چکے تھے۔ یہ کیوں کر ممکن تھا کہ بدایوں ان سے غیر متاثر رہتا؟ پھر وہاں زمینداروں کی بہت بڑی آبادی انگریزوں کے جاری کردہ نظام مال گذاری کے باعث تباہ ہو چکی تھی۔ میلی سن لکھتا ہے کہ وہ لوگ حکومت برطانیہ کو اپنی تمام مصیبتوں کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ پھر ان کے ساتھ ہزاروں لاکھوں کسان وابستہ تھے۔ جن کی ہمدردیاں بہ ہر حال انھیں کے لیے وقف تھیں۔

ایک نکتہ:

یہاں یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھ لینا چاہیے کہ انگریزوں نے جو نظام مال گذاری جاری کیا تھا، اس سے آخر کس کو فایدہ پہنچا؟ زمیندار تباہ ہوئے۔ کاشت کار جیسے محروم پہلے تھے، ویسے ہی محروم بعد میں بھی رہے اور ان کی ہمدردیاں زمینداروں کے ساتھ رہیں، جن کی زمینیں کاشت کر کے وہ زندگی گزارتے تھے۔

یہ اور اس قسم کی بیسیوں دوسری چیزیں تھیں، جن سے انگریزوں کی اجنبیت اور بے گانگی نہایت رنجدہ شکل میں نمایاں ہوتی تھی۔ اور عوام یہ یقین کر لینے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ جب تک ان اجنبیوں سے کامل نجات حاصل نہ ہو جائے گی، اطمینان کی ساعت نہ آئے گی۔ ایسے ہی معاملات ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کا ایک بڑا سبب تھے۔

ہنگامہ:

بدایوں کے مجسٹریٹ اور کلکٹر کا نام ولیم ایڈورڈز تھا۔ اسے آبادی کے رنج و غصہ سے پوری آگاہی تھی۔ جب میرٹھ میں ہنگامے کی خبر ملی تو اس نے اپنی بیوی اور بچے کو نینی تال بھیج دیا، خود تنہا بدایوں میں بیٹھا رہا۔ اگرچہ یقین تھا کہ موقع پاتے ہی عام لوگ اٹھیں گے اور اس وقت پولیس بھی کوئی کام نہ دے سکے گی۔ چناں چہ بریلی میں ہنگامے کی اطلاع ملتے ہی بدایوں میں بھی افراتفری پیدا ہو گئی۔

ایڈورڈز اور اس کے تین ساتھی ایک سکھ اردلی وزیر سنگھ کے ہمراہ بدایوں سے

نکلے اور چکر کھاتے ہوئے فتح گڑھ کی طرف گئے۔ ایک ساتھی راستے میں مارا گیا اور باقی منزل مقصود تک پہنچ گئے۔

فتح گڑھ میں بھی عین اسی وقت ہنگامہ بپا ہونے والا تھا لہٰذا ایڈورڈز بعض دوسرے ساتھیوں کو لے کر دھرم پور چلا گیا جہاں کا رئیس ہردیو بخش انگریزوں کا حامی تھا۔ کم وبیش تین مہینے وہیں گزارے اور ستمبر میں کان پور پہنچا جب ہنگامے کا پورا دور گزر چکا تھا اور انگریزی تسلط بحال ہو چکا تھا۔

بجنور:

بجنور کے ہنگامے میں ممتاز ترین کارکن نواب محمود خاں تھا جو نواب نجیب الدولہ مرحوم کے خاندان کا ایک معزز رکن تھا۔ بجنور کے کلکٹر شیکسپیئر نے خود ضلع کا انتظام نواب موصوف کے حوالے کر دیا تھا۔ پھر وہاں مختلف مقامات کے ہندو رئیسوں اور مسلمانوں کے درمیان کش مکش شروع ہوگئی۔ انجام کار سب نے نواب محمود خاں کی حکومت تسلیم کرلی۔

فرخ آباد:

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، فرخ آباد آگرہ ڈویژن میں شامل تھا، لیکن اس کے حالات ہم یہاں بیان کریں گے۔ ہومز کہتا ہے کہ اگرچہ وہاں مسلمانوں کی آبادی تھوڑی تھی، لیکن صوبہ غرب وشمال کے کسی بھی حصے میں اتنے جوشیلے اور نظم وامن کے اتنے مخالف لوگ موجود نہ تھے جتنے کہ فرخ آباد میں تھے۔ تاہم وہاں دیر تک امن رہا۔ ۱۶رجون تک یہ حالت تھی کہ سیتاپور (اودھ) کی سرکش فوج نے فرخ آباد کی فوج کے پاس سرکشی کا پیغام بھیجا اور کہا کہ انگریز افسروں کو قتل کردو تو فوجیوں نے یہ پیغام اپنے کرنیل کے پاس پہنچا دیا جس کا نام اسمتھ تھا، لیکن دو روز بعد وہ سرکشی کے لیے تیار ہوگئے اور تمام افسروں سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم کسی کا حکم نہ مانیں گے، بہتر یہی ہے کہ آپ لوگ چلے جائیں۔ اس وقت سے فرخ آباد کے نواب تفضل حسین خاں کو انھوں نے اپنا حاکم بنالیا۔

فتح گڑھ:

فرخ آباد سے صرف تین میل مشرق میں دریائے گنگا کے کنارے فتح گڑھ تھا جو بڑا اہم اور مستحکم مقام تھا اور یہاں ایک قلعہ بھی تھا۔ اسی جگہ فرخ آباد کی چھاؤنی تھی۔ سپاہ کی سرکشی کے بعد کرنیل اسمتھ قلعے میں جابیٹھا۔ اس کے ساتھ تقریباً ایک سو انگریز تھے، لیکن ان میں سے صرف سینتیس آدمی ایسے تھے جو جنگی خدمات انجام دے سکتے تھے۔ اسمتھ نے قلعے میں مناسب مقامات پر توپیں نصب کردیں، جتنا سامانِ جنگ مل سکا فراہم کرلیا اور مقابلے کے لیے تیار ہوگیا۔ ۲۵ر جون کو فتح گڑھ پر حملہ ہوا۔ دو مرتبہ سیڑھیاں لگا کر قلعے کے اندر داخل ہونے کی کوشش کی گئی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ پھر پاس کے ایک گاؤں حسین پور کے اونچے مکانوں پر سے قلعے کے اندر آتش باری کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس میں متعدد انگریز مارے گئے۔ ساتھ ہی سرنگیں لگا کر ان میں بارود بھردی گئی۔ اس سے قلعے کی عمارت میں شدید تزلزل پیدا ہوا، لیکن صرف بیرونی دیوار کا ایک حصہ اڑا، اندرونی دیوار بہ دستور سلامت رہی۔

کشتیوں میں روانگی:

ظاہر ہے کہ مٹھی بھر انگریز مقابلہ زیادہ دیر تک جاری نہ رکھ سکتے تھے لہٰذا بچ نکلنے کی تدبیر یہ سوچی گئی کہ کشتیاں قلعے کی دیوار سے لگالی جائیں۔ پہلے غیر مصافی لوگوں کو سوار کیا جائے، پھر مصافی سوار ہوں۔ انھوں نے سارا سامان جنگ تباہ کیا اور ۳ر جولائی کی رات کو دو بجے کشتیوں میں روانہ ہوئے۔ مطلع صاف تھا، اس لیے بہت جلد معلوم ہوگیا کہ انگریز جارہے ہیں۔ ان پر گولیاں چلائی گئیں لیکن کسی کو نقصان نہ پہنچا۔ کشتیاں تین تھیں، ان میں سے ایک ناکارہ ثابت ہوئی تو اس کے مسافروں کو باقی دو میں سوار کرالیا گیا۔ سنگھ رام پور پہنچنے کے بعد ایک کشتی مرمت طلب نظر آئی۔ مرمت کی جارہی تھی کہ گاؤں والوں نے ہلّہ بول دیا۔ ان سے لڑائی ہوئی۔ پھر ایک کشتی ریت میں اٹک گئی۔ اس کے بعض لوگ تیر کر بچ نکلے۔ بعض ڈوب گئے اور بعض گرفتار ہوگئے۔ دوسری کشتی کسی نہ کسی طرح محفوظ مقام پر پہنچ گئی۔

(۲)

روہیل کھنڈ

سید خورشید مصطفیٰ رضوی

روہیل کھنڈ ڈویژن میں بریلی، بدایوں، شاہ جہان پور، مراد آباد، بجنور، پیلی بھیت، رام پور اور نینی تال وغیرہ شامل تھے۔

سازشیں:

بغاوت کے لیے جو سازشیں پورے ملک میں ہو رہی تھیں، روہیل کھنڈ کی راج دھانی بریلی کو بھی ان کے لیے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ حکومت کے بڑے عہدے دار مثلاً خان بہادر خاں (صدر امین) صوبے دار بخت خاں ❶ (افسر توپ خانہ) محمد شفیع رسالدار وغیرہ ان سازشوں میں شریک بتائے جاتے ہیں۔ اگرچہ سازشیں پوری طرح ہمارے سامنے نہیں آسکیں، لیکن انگریزوں نے ان کے آثار کسی نہ کسی طرح بھانپ لیے تھے۔

بریلی میں بغاوت کی تیاریاں پوشیدہ طریقوں پر جاری تھیں۔ سرکاری ذرائع

---

❶ اصل نام محمد بخش ابن عبداللہ خاں، اودھ کے شاہی خاندان سے رشتہ داری تھی اور یہ خاندان سلطان پور میں آباد تھا۔ بخت خاں نے فوج میں ملازمت کی۔ جنگ افغانستان میں نمایاں رہا۔ بعد میں جلال آباد اور نیچ میں تقرر ہوا، صوبے دار بنایا گیا، بہ عہدہ افسر توپ خانہ تقرر ہوا۔ بہادر اور بے باک، سادہ لباس، مذہبی رجحان تھا اور مولوی سرفراز علی سے بیعت کی۔ شجرہ یہ ہے عبداللہ خاں بن سلطان خاں بن اصالت خاں عرف سمند خاں بن ملک عنایت خاں بن سید خاں بن جہان خاں بن نظر خاں (نظر خیل) بن جہانگیر خاں، نواب عبداللہ خاں نجیب الدولہ کے حقیقی بھتیجے تھے اس طرح بخت خاں غلام قادر کے چچازاد بھائی۔
(العلم، کراچی۔ اپریل، جون ۱۹۵۷ء)

سے یہ پتا صرف اس وقت چلا جب ۲۲؍مئی ۱۸۵۷ء جمعہ کو گورنمنٹ کالج کے استاذ مولوی محمد احسن نے محلہ نومحلہ سادات کی مسجد میں تقریر کی۔ سب کچھ کہنے کے باوجود انھوں نے اپنا دامن بچائے رکھنے کے لیے مبہم طور پر جہاد کی مخالفت بھی کی۔ شہر میں کافی جوش وخروش تھا، ۲۵؍مئی کو عید تھی۔ اگلے جمعہ (۲۹؍مئی) کو بریلی کا کوتوال بدر الدین بھی اس مسجد میں پہنچا، بخت خاں اور اس کے ساتھی بھی موجود تھے۔ مولوی رحیم اللہ کو وعظ کے لیے کھڑا کیا گیا مگر کوتوال کی موجودگی نے جذبات کو دبائے رکھا۔ نومحلہ بریلی کے سیدوں کی آبادی تھی جو اپنے اثر ورسوخ اور عظمتِ نسبی کی وجہ سے شہر کے عوام خصوصاً روہیلوں میں بااثر اور معزز تھے۔ یہ لوگ سازشوں میں بھی شریک تھے۔ ان کے علاوہ جن لوگوں کی شرکت ثابت ہے۔ اُن میں مبارک شاہ خاں، ٹھاکر جے مل سنگھ، شوبھارام، مدار علی خاں وغیرہ بھی تھے۔ محمد شفیع رسالدار کے بارے میں منشی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:

> ''آٹھویں سواروں کی رجمنٹ میں انگریز افسر جانتے تھے کہ دغاباز بھرے پڑے ہیں جن میں محمد شفیع جو سب سے بڑا افسر تھا وہ سب سے زیادہ دغاباز تھا[1]۔''

۲۹؍مئی کی رات کو فوجی سرداروں کا ایک وفد خاں بہادر خاں سے ملا اور اگلے دن خاں بہادر انگریز حکام سے ملے۔ بریلی کے کمشنر الیگزینڈر کا بیان ہے کہ ہاتھ ملاتے ہوئے انھوں نے کہا: ''اپنی جان بچاؤ۔'' (SEN-348)

اچانک بغاوت:

بریلی میں بغاوت ہونے سے پہلے دوسرے علاقوں سے لوگ یہاں آنا شروع ہوگئے تھے، بغاوت کی افواہیں بھی تھیں مگر سپاہیوں نے وفاداری کا یقین دلایا آخرکار ۳۱؍مئی ۱۸۵۷ء اتوار (۷؍شوال ۱۲۷۳ھ) دن کے دس بجے کے قریب بخت خاں

---

[1] ذکاء اللہ۔ تاریخ عروج انگلشیہ ۸۲۲۔ محمد شفیع کے ذریعے دیسی سپاہ کو بغاوت پر آمادہ کیا گیا۔

(فریڈم اسٹرگل ان یوپی: جلد ۵، صفحہ ۷۹-۱۷۸)

نے توپ چلا کر بغاوت کا اعلان کر دیا۔ جے ایف ڈی انگلس ان حالات کا بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

"بریلی کے سربرآوردہ مسلمان دیسی سپاہ کے باغیانہ ارادوں سے پوری طرح باخبر تھے اور انھوں نے شہر کے عوام کو بغاوت کے لیے آمادہ کیا تھا۔"

(Narrative of Outbreak Bareilly 30th Nov. Freedom Struggle in UP. Volium. 5, Page 193)

غرض یہ کہ توپ سر ہونے کے بعد تمام سپاہ نے اچانک گولیاں چلانا شروع کر دیں، انگریز افسر کچھ قتل اور کچھ نینی تال کو فرار ہوئے۔ "تاریخ روہیل کھنڈ" (قلمی) میں یہ حال اس طرح ہے:

"......ساتویں شوال روز یک شنبہ ۱۲۷۳ھ کو مطابق ۳۱ رمئی ۱۸۵۷ء کے دوپہر کے وقت مسمی محمد بخش عرف بخت خاں صوبے دار توپ خانہ معہ پلٹن نمبر ۱۸، ۶۸ پیادگان و آٹھویں رجمنٹ ہندوستانی متعینہ چھاؤنی بریلی کے اپنی سرکار سے نمک حرامی کر کے باغی ہوا......خان بہادر خان خلف نواب ذوالفقار علی خاں ابن حافظ رحمت خاں والی سابق ملک روہیل کھنڈ بہ امداد شوبھا رام و مدار علی خاں وغیرہ بدمعاشان شہر بریلی اور سادات نومحلہ کے کوتوالی میں آکر والی ملک بن بیٹھا۔"

(نیاز احمد خاں از تاریخ روہیل کھنڈ (قلمی): صفحہ ۹۴،۹۵)

شیخ بدرالدین کوتوال دن میں بارہ بجے کے قریب خان بہادر خاں کے مکان پر پہنچا اور کہا کہ فوج نے بغاوت کر دی، جیل خانہ توڑ دیا گیا[1]۔ اس کے بعد مدار علی خاں پہنچا اور کہا کہ کوتوالی چلیے ورنہ باغی فوج شہریوں اور مہاجنوں کو لوٹنے آرہی ہے۔ خان بہادر اور مبارک شاہ خاں اس کے ہمراہ گئے۔ فیض اللہ، میاں جان اور دیگر سادات نومحلہ بھی ہمراہ ہو گئے۔ بخت خاں نے مصر بیج ناتھ کو بلا کر سرکاری رُپے کا

---

[1] جیل خانے کے دروازے کو آگ لگا دی گئی۔ یہاں کے تمام سپاہی بھی انقلابیوں کے ساتھ تھے۔ انگریز ڈاکٹر کو کوتوالی کے سامنے قتل کیا گیا۔ (اخبار الصنادید: ص ۳۷)

حساب لیا۔ یکم جون ۱۸۵۷ء کو مدار علی خاں شوبھا رام، مبارک شاہ خاں، احمد شاہ خاں، میاں جان، سید فیض اللہ وغیرہم خان بہادر کے پاس گئے اور کہا کہ رات محمد شفیع رسالدار اور مولوی امداد علی رسالدار بخت خاں کی طرف سے آئے ہیں کہ آپ انتظام سنبھالیں۔ خان بہادر نے اس پر تامل کیا، شوبھا رام نے کہا:

"غم نہ کیجیے، ہم رُپیہ جمع کریں گے اور اگر دیر ہوئی تو میں ایک یا دو سال کے لیے ایک لاکھ آدمی اور رُپیہ دینے کو تیار ہوں۔"

بخت خاں نے کہا کہ

"آپ کیوں خدا کا شکر ادا نہیں کرتے کہ وہ آپ کو شوبھا رام جیسا وزیر دے رہا ہے جو آپ کی ہر طرح مدد کرنے کو تیار ہے۔ آپ نہیں مانیں گے تو میں بسنت رام، جے مل سنگھ، راجہ پوایاں، محمد شفیع، مولوی امداد علی وغیرہم کو حاکم مقرر کردوں گا۔"

شوبھا رام نے کہا:

"بخت خاں! اب اس بارے میں کچھ نہ کہیے۔ نواب صاحب نے مجھے پوری بات بتادی ہے۔ میں بعد دوپہر تمہارے پاس آکر تفصیل سے بتاؤں گا۔"

شوبھا رام نے شہر کے لوگوں کی فہرست تیار کی، ملک غلام محمد اور سرنام سنگھ نے ایک ایک رجمنٹ منظم کی۔ نیاز محمد خاں کی سرکردگی میں بہت سے پیادہ اور سوار فوجی رام پور سے آئے۔ امروہہ، سنبھل اور سہسوان وغیرہ میں جو لوگ سوار فوج میں ملازم تھے۔ آکر شامل ہوئے۔ بریلی میں خان بہادر خاں کو پرانی کوتوالی میں ایک سادہ مسند پر تخت نشین کیا گیا، جلوس کی شکل میں کوتوالی تک لایا گیا۔

خان بہادر خاں کا انتظام:

خان بہادر نے ہاتھی پر سوار ہو کر شہر میں گشت کیا۔ اکبر علی خاں، احمد شاہ خاں اور مبارک شاہ وغیرہ ہمراہ تھے۔ ہاتھیوں کے آگے آگے یہ اعلان ہو رہا تھا کہ

''انگریزی حکومت ختم ہوگئی'' اوراب بہادر شاہ بادشاہ ہے۔ فضل حق تحصیل دار نواب گنج جعفر علی تھانے دار اور دوسرے سرکاری افسروں نے خدمات پیش کیں۔ ایک دربار منعقد ہوا اور شہر کے تمام معززین کو بلایا گیا۔ پھر خان بہادر خاں نے چھاؤنی جاکر بخت خاں اور محمد شفیع سے بات کی اور انعام اور تحفے تقسیم کیے۔ ۲/ جون کو شوبھا رام کو دیوان بنایا گیا۔ وہ نہایت تجربے کار، دولت منداور ہوشیار تھا۔ اس کے علاوہ یہ عہدہ دار مقرر کیے گئے:

مدار علی خاں اور نیاز محمد خاں : فوج کے جنرل

مول چند : نایب دیوان

مولوی خاں : کمیدان و پرگنہ شاہی تحصیل میر گنج کے فارم کا انچارج

برج لال : مختار (اس نے مختلف عہدے دار مقرر کیے)

ہوری لال (ابن شوبھا رام) : پے ماسٹر

علی حسین خاں : جنرل سوار فوج

دین دیال : داروغہ توپ خانہ

سیف اللہ خاں : سپرنٹنڈنٹ جیل

رضاء الدولہ : اے ڈی سی (خان بہادر)

ان کے علاوہ غوث محمد خاں، غلام حیدر خاں اور حافظ کلن خاں بھی مختلف عہدوں پر مقرر ہوئے۔ (Freedom Struggle in UP. Vol. 5, Page 193,

CHAUDHURY: Civil Rebellion.......112)

شوبھارام کا انتظام:

شوبھا رام نے دیوان کا عہدہ سنبھال کر نہایت فراست سے انتظامات کیے، سول ایڈمنسٹریشن منظم کیا، ریونیو کلکٹر مقرر کیے، ٹیکس وصول کیے، مختلف عہدوں پر پھوندن لال، تلسی رام، چیت رام، احمد حسین، غلام یحییٰ، مصر بیج ناتھ، کنہیا لال وغیرہ کو مقرر کیا، فوجی دستے منظم کیے، ٹھاکروں کو بغاوت کے لیے آمادہ کیا، اس کے فہم وتدبر کی انگریزوں نے بھی بے حد تعریف کی ہے۔

امن قایم کرنے اور ملکی انتظامات کرنے کے لیے جو کونسل بنائی گئی اس میں شو بھارام بھی شامل تھا۔ ایک اور کمیٹی بنائی گئی جس میں یہ ممبر تھے:

کرامت خاں : حافظ رحمت خاں کی اولاد

اکبر علی خاں : سابق صدر امین متھرا، خان بہادر کا عزیز ریونیو انچارج

قاضی غلام حمزہ : قاضی شہر

پنڈت اوجھر ناتھ تیغ : پنڈتوں کا افسر انچارج

ٹھاکر جے مل سنگھ : ٹھاکر کیارا تحصیل بریلی

کلب علی شاہ و جعفر علی: زمین داران

مولوی سید قطب شاہ

(اس کمیٹی میں بارہ ممبر تھے، سات مسلمان اور پانچ ہندو)

خان بہادر خان کے عہد کا کچھ اندازہ سرکاری یاد داشتوں، رپورٹوں اور (مقدمۂ خان بہادر) کے گواہوں کے بیانات سے ہوتا ہے کہ شو بھارام نے بہ حیثیت دیوان تمام معاملات میں کلیدی رول ادا کیا ہے۔

برج لال نے جسے مختار مقرر کیا گیا، متعلقہ عہدے دار مقرر کیے۔ محمد یار خاں کو نایب پیش کار اور غلام قادر خان کو شاہ جہان پور، فضل حق کو پیلی بھیت اور عبدالرحمٰن خاں کو بدایوں کا ناظم مقرر کیا گیا، مول چند کائستھ نایب دیوان تھا۔ بدھولی کے راجہ رگھوناتھ سنگھ کو راجہ کا خطاب اور ٹیکہ دیا گیا۔ رگھوناتھ نے فوج کے لیے آدمی مہیا کیے۔ سیکڑوں راجپوت روزانہ آتے، خان بہادر سے وفاداری کی قسم کھاتے اور فوجی خدمات انجام دیتے۔ شیوگڑھ کے ٹھاکر جے مل سنگھ نے بھی فوج منظم کی۔

راجپوت سرداروں میں دیبی سنگھ، سرنام سنگھ، کنج بہاری سنگھ، نندا سنگھ وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں۔ اور یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ خان بہادر کو ٹھاکروں اور راج پوتوں کا مکمل اعتماد حاصل رہا۔ اس اعتماد کے حصول میں شو بھارام اور مول چند کا بڑا ہاتھ تھا۔ چناں چہ پنڈتوں سے دیا وستھا اور علما سے فتویٰ حاصل کیا گیا۔

مذہبی عالموں کی کونسل میں جس میں پنڈت اوجھر ناتھ تیغ اور مفتی عنایت احمد،

مولوی امانت علی وغیرہ تھے، طے کیا گیا کہ بہ وقت ضرورت حکومت کسی بھی شخص کی دولت کا دسواں حصہ طلب کر سکتی ہے۔اس مقصد کے لیے جو کمیٹی بنی اس کا سربراہ خوشی رام تھا اور ممبروں میں مکول مہاجن، رام پرشاد مہاجن، درگا پرشاد (راجہ رتن سنگھ کا کارندہ) وغیرہ تھے۔اس کمیٹی نے مہاجنوں کی دولت کا اندازہ لگا کر ٹیکس مقرر کیا اور چار ماہوار قسطوں میں وصول یابی شروع کی۔رام پرشاد کے گھر میں ٹکسال قایم ہوئی۔ فوجی سرداروں میں کندن سنگھ، عظمت اللہ، بہاری سنگھ، غلام حیدر خاں، رگھوناتھ سنگھ، احمد حسین خاں، رام پرشاد، معصوم علی وغیرہ تھے۔ (Narrative of Outbreak Bareilly Mutiny Records, State Archive, Allahabad. Freedom Struggle in UP. Vol. 5, Page 193, 279, 287) لیکن ٹیکس وصول کرنے میں جو زیادتی کی گئی اس سے کچھ لوگ بددل ہو گئے۔

انگریزوں کا قتل:

کچھ انگریزوں نے حامد حسن منصف اور امان علی (کنبوہ) وغیرہ کے مکانوں میں پناہ لی مگر انھیں قتل کر دیا گیا اور لاشیں کوتوالی کے سامنے ڈال دی گئیں۔ کچھ کوتوالی کے سامنے قتل ہوئے کچھ سنہری مسجد کے پاس مارے گئے۔

بہادر شاہ کا فرمان:

خان بہادر خاں کی عرض داشت پر بہادر شاہ کی طرف سے ایک شقہ مع خطاب "انتظام الدولہ محافظ الملک" اور خلعت آیا۔ خان بہادر نے شہر سے ڈیڑھ کوس دور جا کر دیپ چند کے باغ کے قریب استقبال کیا اور خلعت پہنا۔مہر میں "الملک للہ والحکم للہ" کندہ تھا[1]۔

---

[1] نیاز احمد خاں: تاریخ روہیل کھنڈ (قلمی) ۹۶-۹۹ بہادر شاہ کا فرمان ۹ر جولائی ۱۸۵۷ء مطابق ۱۷ر ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ جاری ہوا جو حبیب الاخبار، مورخہ ۱۶ر جولائی ۱۸۵۷ء میں شایع ہوا۔

پھوٹ ڈالنے کی کوششیں:

انگریزوں کا خیال تھا کہ راجپوت ٹھاکروں اور روہیلوں میں اختلاف پیدا کر کے کام نکالا جا سکے گا، مگر سب سے پہلے جس شخص نے خان بہادر کو حاکم تسلیم کیا وہ راجپوت ٹھاکر جے مل سنگھ تھا۔ (SEN-349) وفاداروں کی سرگرمیاں بھی برابر جاری تھیں۔ بیج ناتھ مصر نہ صرف نینی تال میں مقیم انگریزوں سے رابطہ رکھے ہوئے تھا بلکہ بدایوں کے کلکٹر ایڈورڈ کی مدد بھی کی۔ خان بہادر نے گائے ذبح کرنے کی ممانعت کرادی تھی اگرچہ اس سے کہیں بے چینی بھی پیدا ہوئی۔ خان بہادر کے ایک عزیز میر عالم خاں نے بلدیو گیر گوسائیں پر باہم اختلاف کی بنا پر حملہ کیا۔ گوسائیں نے میر عالم کو اپنے دفاع میں قتل کر دیا۔ گوسائیں پر مفتی کی عدالت میں مقدمہ چلا اور بری کر دیا گیا۔ اس کے باوجود میر عالم خاں کے بھائی نے گوسائیں کو مار ڈالا اور قاتل کو انصاف کے رُوبہ رُو نہ لایا جا سکا۔ (Inglis Report, SEN-349)

نئے نظام سے تاجر طبقے میں ناراضگی کے آثار تھے کیوں کہ انھیں بار بار طلب کر کے رُپیہ وصول کیا جاتا تھا۔ مصر بیج ناتھ اپنے آدمیوں کے ذریعے جو حرکتیں کر رہا تھا اس سے انقلابی حکومت پوری طرح باخبر نہ تھی اسی لیے وہ صرف مالی نقصان برداشت کر کے چھٹکارا پاتا رہا [1]۔ لچھمی نرائن نے بھی نینی تال کو رُپیہ بھیجا۔ ایک بار تو یہ رُپیہ راستے میں پکڑا بھی گیا۔ شیخ بدر الدین نینی تال کو فرار ہو گیا تھا۔ اکتوبر نومبر ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی طرف سے کیپٹن گوان کو اس کام پر مامور کیا گیا کہ وہ ہندوؤں کو خان بہادر کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرے اور اس کام کے لیے پچاس ہزار رُپیہ صرف کرے۔ لیکن یہ اسکیم ناکام ہوئی اور گوان نے ۱۴ر نومبر ۱۸۵۷ء کو لکھا کہ وہ اپنی کوشش میں ناکام ہوا (Foreign Secret Consultations no. 25, SEN-352) اور یہ رُپیہ واپس خزانے میں جمع ہوا۔ غالباً انھی وفاداروں کی بہ دولت نینی تال سے انگریزوں کو نکالنے کی کوشش ناکام ہوئی۔ حال آں کہ اس کے لیے فروری ۱۸۵۸ء تک متواتر اور متعدد بار جد و جہد کی گئی۔ نواب رام پور اور اس کے جاسوس

[1] اس کو انگریزی قبضے کے بعد راجہ کا خطاب اور جاگیر دی گئی۔

خصوصاً علی بخش خاں بھی برابر انقلابی کارروائیوں کو ناکام بنانے اور ہر طرح کی خبریں اور مدد انگریزوں کو پہنچانے میں مصروف تھے۔

خان بہادر کے اعلانات:

خان بہادر خاں کی طرف سے جو اعلانات جاری ہوئے وہ مولوی سید قطب شاہ کے اہتمام سے چھپوائے گئے جو بریلی کالج میں فارسی کے استاذ تھے۔ ایک اعلان میں جو بریلی کی شکست کے بعد برآمد ہوا، لکھا تھا:

"فرنگی ہندو مسلمانوں کے مذہب کے دشمن ہیں۔ اس لیے مذہب کو بچانا ہمارا فرض ہے۔ اگر ہندو مسلمان متحد ہو کر مقابلہ کریں تو فرنگیوں کو مٹا دینا مشکل نہ ہوگا۔ اگر ہندو پوری طاقت سے انگریزوں کو ملک سے نکالنے میں شریک ہوں تو میری سلطنت میں گائے ذبح کرنا بند کر دی جائے اور فی الحال اس پر اتنا عمل کیا جائے کہ عام پبلک مقامات پر یا ہندو محلوں میں کوئی گائے ذبح نہ ہو۔ پوری طرح ممانعت انگریزوں کے خاتمے کے بعد عمل میں آئے گی۔ (ترجمہ از انگریزی)

ایک اور اعلان میں مسلمانوں سے جہاد کی اپیل کی گئی۔ ایک اعلان میں ہندو مسلمانوں سے خطاب ہے، لکھا ہے:

"ہندوستان کے رہنے والو! بڑے انتظار کے بعد ہماری آزادی واپس آگئی ہے۔ اب بتاؤ تم اسے قبول کرتے ہو یا رَدّ کرنا چاہتے ہو؟ تم اس مبارک موقعے سے فایدہ اٹھانا چاہتے ہو یا اسے اپنے ہاتھوں سے کھو دینا چاہتے ہو اور فایدے کے خواہش مند نہیں ہو؟

ہندو مسلمان بھائیو! تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر تم نے انگریزوں کو یہاں رہنے دیا تو وہ تم سب کو ختم کر کے تمھارے دین اور دھرم کو تباہ کر دیں گے۔ ہندوستانیوں کو اتنے عرصے سے انگریزوں نے فریب دے رکھا ہے اور انھیں کی تلوار سے ان کا گلا کاٹ رہے ہیں۔ وہ پھر تفرقہ ڈالنے کا پرانا

حربہ استعمال کریں گے۔ لیکن ہندو بھائیو! اُن کے فریب میں نہ آنا ہمیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ انگریز کبھی اپنے وعدے پورے نہیں کرتے چال اور دغا بازی میں طاق ہیں۔ یہ ہمیشہ سے سوائے اپنے مذہب کے اور سب مذہبوں کو مٹانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ کیا انھوں نے گود لیے بچوں کے حق نہیں چھین لیے؟ کیا انھوں نے ہمارے راجاؤں کے ملک نہیں ہڑپ کیے؟ اس پاک جنگ میں شامل ہو جاؤ۔ لڑائی کے میدان میں ایک جھنڈے کے نیچے لڑو اور خون کی ندیوں سے انگریزوں کا نام ونشان ہندوستان سے دھوڈالو۔'' (سندر لال: سن ستاون: ص ۷۸۔ یہ اعلان لاہور سکریٹریٹ واقع انارکلی میوزیم میں محفوظ ہے)

بریلی کے قرب وجوار میں:

بریلی میں بغاوت ہوتے ہی آس پاس کے قصبوں میں بھی انقلابی سرگرمیاں رنگ لانے لگیں اور عوام نے بغاوت کر کے بریلی کا رخ کیا۔ آنولہ سے کثیر تعداد میں انقلابی عوام بریلی روانہ ہوئے۔ یہاں نواب کلن خاں (نبیرہ بخشی سردار خاں) نایب ہوا۔ حکیم سعید اللہ، مولوی اسمٰعیل، غالب علی خاں اور شیخ خیر اللہ وغیرہ باغی سردار تھے۔ غالب علی نے شہزادہ فیروز کی آمد کے موقع پر اس کی دعوت کی [1]۔ شیخ خیر اللہ نے ٹھاکروں کو بغاوت میں شریک کرنے کا کام انجام دیا۔ حکیم سعید اللہ نے شہزادے کے ساتھ فرخ آباد وغیرہ میں بھی جنگ میں حصہ لیا اور آخر میں امروہہ کے گلزار علی کے ساتھ جنگلوں میں پوشیدہ رہے۔

بریلی میں ہندوؤں کا ایک جلوس بھی خان بہادر کی حمایت میں نکالا گیا، جس میں گوپال نند، نیول نند، ایشور نند، گنیش رائے، ہرسکھ رائے بھیم سین وغیرہ شامل تھے۔

(Narrative of Events Quoted by Chaudhury: Page:112)

---

[1] شہزادہ دو دن آنولہ میں رہا۔ اس کی قیام گاہ ''شہزادے کا تکڑ'' کہلاتی ہے۔

انقلابی سرگرمیاں:

بریلی کے آس پاس تصادم برابر ہوتے رہے۔ ۲۵/اپریل ۱۸۵۸ء کو کرور پر تصادم ہوا۔ یہاں انقلابی دستوں کی کمان اسمٰعیل خاں کر رہا تھا جو پہلے گنور میں تھا اس کی مدد کے لیے فیروز شاہ رحیم خاں بھی پہنچے۔ نواب محمود کے بارے میں اطلاع تھی کہ بجنور کی شکست کے بعد امروہہ اور بچھراؤں میں پناہ لی اور پھر مراد آباد ہو کر بریلی گیا۔ نانا صاحب فروری ۱۸۵۸ء میں بڑا کے مقام پر تھے، پھر بریلی گئے۔ نواب فرخ آباد، شہزادہ فیروز اور اسمٰعیل خاں بھی بریلی گئے۔ نانا صاحب کے ساتھ اشرف علی (محمد اسحاق تھانہ کان پور کا بھائی) بھی تھا۔ وہ ۱۵/مارچ کے بعد بریلی جا کر خان بہادر سے جا ملے، گرم جوشی سے استقبال کیا گیا اور بریلی گورنمنٹ کالج میں ٹھہرایا گیا (۲۴/مارچ) خان بہادر نے اپنی فوجوں کا سپریم کمانڈر نانا صاحب کو بنایا۔ فوج از سر نو منظم کی گئی، کچھ سکھ بھی بھرتی ہوئے۔ نانا صاحب بدایوں، بسولی، فرخ آباد وغیرہ بھی گئے۔ بابو رام نرائن (چندوسی) سہوان آ گیا۔ خان بہادر نے کرنل کا خطاب دیا۔ ۲۶/اپریل ۱۸۵۸ء کی اطلاعات کے مطابق رحیم علی کی فوج سنبھل میں موجود تھی اور مئی میں سہوان ہو کر بریلی کی طرف آ رہی تھی۔ بریلی کی شکست کے بعد خان بہادر، نانا، شوبھا رام اور فیروز شاہ کے ترائی کی طرف جانے کی خبر تھی جب کہ کچھ باغی فوج ایک گھمسان جنگ کے بعد پیلی بھیت گئی لیکن ۱۱/مئی کی اطلاع تھی کہ خان بہادر چار ہزار فوج کے ساتھ گجرولہ میں ہے۔

ہلدوانی، نینی تال وغیرہ:

نینی تال میں مختلف جگہوں سے بھاگے ہوئے انگریز جمع تھے، جن کی امداد رام پور کا نواب کر رہا تھا۔ خان بہادر کی فوج نے ستمبر ۱۸۵۷ء سے فروری ۱۸۵۸ء تک بار بار ہلدوانی پر حملہ کیا، ستمبر، اکتوبر میں تو ہلدوانی پر قبضہ بھی کر لیا مگر فوج واپس چلی آئی۔ یہاں پر انقلابیوں نے استقلال سے جنگ نہیں کی، چناں چہ مٹھی بھر انگریزوں کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔

کماؤں کے علاقے میں بھی تحصیل خزانہ لٹا، مارشل لا نافذ کیا گیا۔ رام پور کا مستوخان پیادہ اور سوار فوج لے کر آیا۔ رُدر پور میں کوئی انگریز نہیں مارا گیا، لیکن بغاوت ہوئی۔ جوہری خاں میواتی (ساکن بہرائی)، سمند خاں، من سکھ کرمی، منگل خاں، کرم علی، علی شیخ برقنداز اور نسیم خاں نے پٹھانوں، میواتیوں اور باغی عوام کی رہنمائی کی۔ ان کے علاوہ زین خاں، عیوض خاں، امیر خاں، نور خاں، فتح علی (ساکن لاما کڑا) نھو، چھدو خاں وغیرہ تھے۔

نقشہ ہندوستان اور اس میں اتر پردیش کا مقام

بھارت میں اتر پردیش کا محل وقوع

ضلع شاہ جہان پور کا حدود اربعہ اور رقبہ

نقشہ ضلع شاہجہاں پور

اتر

ضلع پیلی بھیت

ضلع بریلی

ضلع بدایوں

ضلع کھیری

پورب

ضلع ہردوئی

ضلع فرخ آباد

دکھن

روہیل کھنڈ

ROHILKHAND REGION

شاہ جہاں پور کی تقسیم

(تحصیلیں اور مشہور مقامات)

بلاک

نقشہ ضلع شاہجہاں پور

ضلع پیلی بھیت

ضلع کھیری

ضلع بریلی

ضلع بدایوں

ضلع ہردوئی

ضلع فرخ آباد

اتر پردیش کا نقشہ اس کے اضلاع اور شاہ جہان پور کا محل وقوع

اتر پردیش کے ضلع

(۴)

روہیل کھنڈ

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

روہیل کھنڈ، شمالی ہند (یوپی) کا وہ پر فضا، سرسبز و شاداب اور زرخیز خطۂ زمین ہے جو کوہ ہمالیہ کے دامن میں واقع ہے مغلیہ سلطنت کی کمزوری کے زمانے میں سرحد کے علاقہ ''روہ'' کے قبایل کے چند جانباز اور دلیر ہمت سرداروں نے اپنے قوت بازو سے علاقہ کٹھیر میں اپنی بساط ریاست بچھائی، جن میں داؤ خاں، نواب علی محمد خاں، حافظ رحمت خاں اور نواب دوندے خاں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس زمانے میں روہیلوں کی حکومت از سنگ تا گنگ مشہور تھی مگر آج کل روہیل کھنڈ صوبہ یوپی کی ایک کمشنری ہے جس میں سات اضلاع بریلی، بدایوں، پیلی بھیت، شاہ جہان پور، رام پور، مراد آباد اور بجنور شامل ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اہلِ کھنڈ سب سے پیش پیش رہے اور انھوں نے بڑی جانبازی، شجاعت اور ضبط و نظم کا ثبوت دیا بلکہ بہ قول مولوی ذکاء اللہ:

> ''جن ضلعوں میں بغاوت ہوئی وہ روہیل کھنڈ کی بغاوت کے آگے خفیف تھی۔'' (تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ) از شمس العلماء ذکاء اللہ (شمس المطابع - دہلی، ۱۹۰۴ء، ص ۸۲۰)

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

بریلی و آنولہ:

بریلی حافظ رحمت خاں کی حکومت کا صدر مقام رہ چکا تھا۔ وہاں مسلمانوں کے سیکڑوں باعزت اور باحیثیت خاندانوں کے علاوہ خود حافظ رحمت خاں کا خاندان موجود تھا، تحریک ۱۸۵۷ء کے شروع ہوتے ہی انگریزوں کے خلاف وہاں بڑا جوش و

جذبہ تھا اور بڑے خاص انداز سے تیاریاں کی جارہی تھیں، قایدین تحریک حالات کا بالکل اندازہ نہیں ہونے دیتے تھے۔ انقلاب سے پہلے بریلی میں اس تحریک کے دو ممتاز رکن موجود تھے: امام المجاہدین مولوی سرفراز علی اور دوسرے مفتی عنایت احمد کاکوروی۔ امام المجاہدین مولوی سرفراز علی ربیع الاول ۱۲۷۳ھ میں بریلی میں موجود تھے، (قلمی بیاض مولوی محمد احسن نانوتوی مملوکہ محمد ایوب قادری) اور مفتی عنایت احمد کاکوروی اس وقت بریلی میں صدر امین تھے۔ مفتی صاحب نے اپنی صدارت میں بریلی میں دینی لٹریچر کی نشر و اشاعت کے لیے ایک انجمن کی بھی تشکیل کی تھی، جس میں بریلی، بدایوں، پیلی بھیت، مراد آباد، آنولہ، امروہہ وغیرہ کے عمایدو شرفا کی امداد رقوم سے لٹریچر تیار کر کے تقسیم کیا جاتا تھا ❶۔ اور زیادہ تر یہ کتابیں مفتی عنایت احمد کاکوروی کی تالیف ہوتی تھیں۔

یہ کتابیں اصلاحی اور تبلیغی تھیں اور حقیقت یہ ہے کہ جنگ آزادی سے پہلے ہندوستان کے مسلمانوں کی سب سے پہلی یہ اصلاحی انجمن تھی، اس سلسلے میں ایک فقیر ''جھنڈا شاہ'' کا ذکر بھی ضروری ہے، جھنڈا شاہ کو اسی جرم میں گرفتار کیا گیا تھا کہ وہ بریلی میں لوگوں کو جہاد کی ترغیب دیتے تھے۔ جھنڈا شاہ کی گرفتاری ۲۱ر دسمبر ۱۸۵۸ء کو عمل میں آئی تھی ❷۔ غرض بریلی میں تیاریاں خوب تھیں مگر انگریزی حکام مطمئن تھے البتہ جب ملحقہ اضلاع سے انگریزی حکومت کے ختم ہونے کی اطلاعیں آنے لگیں تو بریلی کے انگریزی حکام خاص طور سے خوف زدہ ہوئے، مگر جب ظاہری حالات پر

---

❶ ضمان الفردوس مطبوعہ نظامی پریس- کان پور، ۱۲۷۳ھ کے آخر میں ایک اشتہار شامل ہے۔ اس میں اس انجمن کی کیفیت، مقاصد وغیرہ درج ہیں۔ خوش قسمتی سے یہ مطبوعہ نادر رسالہ ہمارے کتب خانہ میں موجود ہے۔

❷ یہاں اچھے اور نیکوں کا بھی یہ حال ہے کہ کوئی ٹاپو مولوی، پنڈت، درویش اور بھائی جی وغیرہ سے خالی نہیں ہے۔ جھنڈا شاہ ساکن بریلی مثل قطب کے برسوں سے مونٹ ہریٹ پر بیٹھا ہے۔ گو دسمبر ۱۸۷۲ء میں اس کی رہائی بھی ہوگئی مگر اب تک اپنی جگہ سے نہیں ہلتا اور..... عوام کی عقیدت کا مرکز بنا ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو ''تاریخ عجیب پورٹ بلیر و انڈمان''، از مولوی محمد جعفر تھانیسری، لکھنو ۱۸۹۲ء: صفحہ ۷۸ و ۱۰۳۔

نظر ڈالتے تھے تو کوئی بے اطمینانی کی بات فوج یا پبلک میں معلوم نہ ہوتی تھی۔ تحریک کے خاص خاص آدمی، خان بہادر خاں، جنرل بخت خاں اور محمد شفیع خاں رسالدار وغیرہ اپنا کام بڑے ضبط و نظم سے کر رہے تھے۔ محمد شفیع آٹھویں سواروں کی رجمنٹ میں رسالدار تھے۔ انھوں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے لیے بے مثال جدوجہد کی، منشی ذکاء اللہ ان کے متعلق لکھتے ہیں:

''وہ (کرنل ٹروپ) آٹھویں سواروں کی رجمنٹ میں جانتے تھے کہ ''دغاباز'' بھرے ہوئے ہیں جن میں محمد شفیع جو سب سے بڑا افسر تھا وہ سب سے زیادہ دغاباز تھا۔'' (ذکاء اللہ: صفحہ۸۲۲)

سابق حکمراں روہیل کھنڈ حافظ رحمت خاں کے خاندان میں خاں بہادر خاں نمایاں حیثیت کے مالک تھے، وہ صدر اعلا رہ چکے تھے، اور حکومت کے پنشن یافتہ تھے۔ مسٹر الیگزینڈر کمشنر نے خاں بہادر خاں ❶ کو اپنا معتمد بنالیا اور اپنے زعم ناقص میں کمشنر یہ سمجھا کہ خان بہادر خاں میرے دل سے خیر خواہ ہیں۔ خان بہادر خاں نے کمشنر کے اعتماد کو آخر وقت تک برقرار رکھا۔

(Fifty Seven by Henery George Keen (London 1883), Page:182)

مئی کے دوسرے ہفتہ میں جب دیگر مقامات کی خبریں بریلی پہنچیں اور شہر میں

---

❶ نواب خان بہادر خان ابن ذوالفقار علی ابن حافظ رحمت خاں، کندن لال اشکی کی تحریر کے مطابق ۳۰ر اگست ۱۸۱۵ء کو صدر امین مقرر ہوئے۔ ایک مدت تک بریلی میں صدر امین رہے۔ اس وقت پنشن یاب تھے۔ اس کے علاوہ خاندانی وظیفہ علاحدہ پاتے تھے۔ منشی گلزاری لال مؤلف ''تواریخ ضلع بریلی'' نے نواب صاحب کو ۱۸۴۷ء میں ''برگزیدۂ خاندان'' لکھا ہے۔ نواب صاحب، صاحب سیف کے علاوہ صاحب قلم بھی تھے۔ ان کی ایک کتاب ''مقاصد الصالحین'' ہے جو اخلاق و تصوف کے مضامین پر مشتمل ہے۔ اب تک یہ کتاب بغیر مصنف کے نام کے شائع ہوتی رہی۔ نواب خان بہادر خاں کو شعر و سخن سے بھی ذوق تھا۔ معروف تخلص کرتے تھے۔ جرأت کے شاگرد تھے فن خوش نویسی کے بھی ماہر تھے۔ (ملاحظہ ہو منتخب تنقیح الاخبار از کندن لال اشکی (مطبع لکھنؤ): صفحہ ۱۰۹ و تواریخ ضلع بریلی از منشی گلزاری لال قلمی (نیشنل میوزیم آف پاکستان کراچی) حیات حافظ رحمت خاں از سید الطاف علی بریلوی، کراچی (۱۹۶۳ء): صفحہ ۳۲۳

مختلف قسم کی خبریں پھیلنی شروع ہوئیں تو انگریزی حکام کو وحشت ہوئی اگرچہ فوج سے کسی بات کا اظہار نہ ہوا بلکہ جب دوسرے مقامات سے لوگ بریلی پہنچے اور دہلی سے بھی پیغامبر آئے تو انگریزی حکام نے اپنے بیوی بچوں کو احتیاطاً ۲۰ رمئی ۱۸۵۷ء کو نینی تال پہنچادیا۔ (محاربہ عظیم کنھیالال (لکھنؤ ۱۹۱۶ء): صفحہ ۲۸۷)

۲۲ رمئی کو نماز جمعہ کے بعد مولانا محمد احسن نانوتوی ❶ نے بریلی کی مسجد نومحلہ میں مسلمانوں کے سامنے ایک تقریر کی اور اس میں بتایا کہ حکومت سے بغاوت کرنا خلاف قانون ہے ❷۔ نواب بہادر خاں کمشنر بریلی مسٹر الیگزینڈر کے بہ ظاہر مددگار تھے اور نواب صاحب پر کمشنر بریلی کا پورا اعتماد تھا، اس سلسلے میں ایک انگریز مورخ رقم طراز ہے:

> ''پچھلی صدی کے محافظ (حافظ رحمت خاں) کے پوتے خان بہادر خاں نے کمشنر بریلی کی کوششوں کی پوری پوری تائید کی اور (بریلی) کالج سے منسلک ایک مولوی (محمد احسن) نے مسجد میں تقریر کی اور اس میں بتایا کہ حکومت سے بغاوت کرنا خلاف قانون ہے۔''

(Fifty Seven by Henery George Keen, Page: 128)

---

❶ مولانا محمد احسن بن حافظ لطف علی نانوتہ میں پیدا ہوئے تعلیم دہلی میں شاہ عبدالغنی مجددی، مولانا مملوک علی، مولانا احمد علی سہارن پوری وغیرہم سے حاصل کی۔ دہلی کالج میں بھی پڑھے، بہت سی کتابوں کے مصنف و مترجم تھے۔ احیاء العلوم کا ترجمہ ''مذاق العارفین'' کنز الدقائق کا ترجمہ ''احسن المسائل''، قواعد اردو حصہ چہارم، رسالہ عروض وغیرہا مشہور ہیں، سرسید احمد خاں کی فرمایش پر فری گاڈ ہیگنس کی کتاب اپالوجی کا ترجمہ ''حمایت الاسلام'' کے نام سے کیا۔ بریلی میں صدیقی پریس قایم کیا جس سے علوم مشرقی کی بہت سی کتابیں شایع ہوئی۔ ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۴ء) میں دیوبند میں انتقال ہوا (ملاحظہ ہو'' مولانا محمد احسن نانوتوی'' از محمد ایوب قادری کراچی ۱۹۶۶ء)

❷ مولانا محمد احسن صاحب کی اس جامع مسجد کی تقریر اور آنولہ میں قیام کے متعلق حالات راقم نے حکیم معظم علی خاں عرف ملہ میاں مرحوم رئیس اعظم آنولہ ضلع بریلی سے سنے۔ بعد کو تحریری شہادتیں بھی مل گئیں حکیم معظم علی خاں (ابن حکیم واحد علی خاں) حکیم سعادت علی خاں مدار المہام ریاست رام پور کے پوتے تھے بڑے وضع دار رئیس تھے۔ ۱۱ رمارچ ۱۹۵۳ء کو ان کا انتقال ہوا۔

اس تقریر نے بریلی میں ایک آگ لگادی اور تمام مسلمان مولانا محمد احسن نانوتوی کے خلاف ہوگئے۔ اگر کوتوال شہر شیخ بدر الدین کی فہمایش پر مولانا بریلی نہ چھوڑتے تو ان کی جان کو بھی خطرہ ہوگیا تھا۔

(Freedom Struggle in U.P. Volum. V, Page: 170)

اس تقریر کا ردّعمل یہ ہوا کہ ۲۵؍مئی ۱۸۵۷ء کو بہ روز عید نو محلے کی مسجد میں مولوی رحیم اللہ خاں نے انگریزوں کے خلاف سخت تقریر کی، اس موقع پر بخت خاں بھی موجود تھے۔ مسلمانوں میں بہت جوش پیدا ہوگیا تھا۔ مگر کوتوال شہر نے اپنی حکمت عملی سے اس جوش کو ٹھنڈا کر دیا۔

(Freedom Struggle in U.P. Volum. V, Page: 173)

بریلی کالج کے شعبۂ فارسی کے استاد مولوی قطب شاہ نے مطبع بہادری کے نام سے ایک پریس قایم کیا جس میں انقلاب سے متعلق لٹریچر شایع وطبع ہوا۔
۲۲؍مئی ۱۸۵۷ء کو مولانا محمد احسن نے بریلی چھوڑ دی۔ مولانا نے بریلی چھوڑتے وقت مولوی فضل الرحمٰن دیوبندی کے لیے بعض ہدایات و اشارات قلمی بیاض میں لکھے ہیں جو درج ذیل ہیں:

"آنچہ عقب من ضرورت بخانۂ ام خود جناب ادا سازند بر پرچہ کاغذ بہ طور یادداشت ارقام می کردہ باشند و تنخواہ احقر نزد خزانچی جمع دارند یا از وگرفتہ نزدِ خود جمع می کردہ باشند کہ در جمعیت نزد خزانچی احتمال ست دفیہ مافیہ، وقرضہ شیخ محمد نسیم صاحب ہم بعد وصول تنخواہ ادا باید فرمود و اگر ڈاک سہارن پور جاری باشد از مولوی محمد حسین دریافتہ خطے بہ نام مولوی احمد علی صاحب نویسند کہ فلاں کس ہنڈوی بہ نام شیخ ظفر علی فرستادہ بود مگر بہ سبب شور وغوغا اہل بلوہ نرسید و چوں رسیدن سہارن پور ہم خالی از شائبہ وشک نیست و خودش جتلائے مصائب گردیدہ بریلی راگذاشت و سرگرداں شد، لاجرم فرستادن مبالغ موقوف بروقت دیگر ماند اگر ہرج جناب باشد از دمبلغ (۱۳۵) (ایک سو پینتیس) کہ نزد جناب جمع ہستند بکدام حیلہ شرعی بعد

تبدیل وغیرہ کارروائی کردہ گیرندو نشان مولوی احمد علی این ست کہ در
سہارن پور محلہ محسنیاں رسیدہ نزد مولوی احمد علی صاحب برسد۔''

میرٹھ، بجنور، مراد آباد اور بدایوں وغیرہ کے حالات دیکھ کر ۳۰؍مئی ۱۸۵۷ء کو الیگزینڈر کمشنر روہیل کھنڈ نے خان بہادر خاں کو بلا کر کہا کہ

''امروز و فردا میں یہاں بلوہ ہونے والا ہے چوں کہ یہ ملک آپ لوگوں کا موروثی ہے، آپ اس کا بندوبست کیجیے۔''

(تاریخ سلیمانی از سلیمان خاں اسدؔ بہ حوالہ حیات حافظ رحمت خاں (طبع اول، بدایوں ۱۹۳۲ء: صفحہ ۳۲۶)

نواب خان بہادر خاں نے کمشنر کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیا❶۔ آخر وہ وقت آ گیا جس کا سب کو انتظار تھا اور جو آغاز کار کے لیے طے ہوا تھا۔ بریلی میں ۳۱؍مئی ۱۸۵۷ء کو مندرجۂ ذیل فوجیں اور افسران موجود تھے۔

(۱) زیر پلٹن نمبر ۱۸	زیر کمان	میجر پیرسن
(۲) زیر پلٹن نمبر ۶۸	زیر کمان	کرنل سی ٹروپ
(۳) زیر پلٹن نمبر ۸ سوار	زیر کمان	کپتان میکنزی

مندرجہ ذیل افسران بریلی میں موجود تھے۔

(۱) رابرٹ الیگزینڈر	کمشنر
(۲) جے گتھری	مجسٹریٹ
(۳) ڈی رابرٹسن	جج
(۴) جی ڈی ریکس	سیشن جج

(گزیٹیر ضلع بریلی (انگریزی) الہ آباد، ۱۹۱۱ء: صفحہ ۱۷۱)

۳۱؍مئی ۱۸۵۷ء کو اتوار کے دن قریب ۱۱ بجے صبح جب کہ تمام انگریز اور عیسائی گرجا میں جمع تھے۔ چھاؤنی میں توپ کا فایر ہوا، جو اس بات کا اعلان تھا کہ فوج نے انگریزی حکومت کی اطاعت و انقیاد سے منہ موڑا اور علم آزادی بلند کر دیا۔ نمبر ۶۸ فوج

❶ ہنری کین اس ملاقات کے سلسلے میں لکھتا ہے کہ ''خان بہادر خاں نے جواب دیا کہ حالات نازک ہو گئے ہیں، لہٰذا آپ اپنی حفاظت کی فکر کیجیے۔'' اور یہ ملاقات ۳؍مئی کو ہوئی تھی۔

کے سپاہی تمام لائینوں میں دوڑ پڑے۔ صوبے دار بخت خاں مع تمام افواج انگریز حکومت کے خلاف ہوگئے، تمام لائینوں میں شور وغوغا مچ گیا۔ مسلح سپاہی دیوانہ وار چاروں طرف دوڑنے لگے اور جو افسر سامنے آتا اسے گولی کا نشانہ بناتے اتنی تیزی سے فساد برپا ہوا کہ اکثر افسروں کو تو اس کی خبر بھی نہیں ہوئی کہ ان کے بنگلوں پر فوج پہنچ چکی ہے اور گولیاں چلنی شروع ہوگئی ہیں۔

فوج کے افسران کے درمیان یہ بات طے ہو چکی تھی کہ فساد کے وقت سب یورپین آٹھویں رسالے کی لین کے متصل جمع ہو جائیں۔ (گزیٹر ضلع بریلی: صفحہ ۱۷۱) چناں چہ سب لوگ اس طرف دوڑے اور جو افسران اپنی پلٹن کی صرف تنبیہ وفہمائش کی غرض سے گئے وہ متاعِ حیات کھو بیٹھے۔ الیگزینڈر کمشنر اور گتھری مجسٹریٹ تقریباً تیس آدمیوں کے ہمراہ گھوڑوں پر سوار ہو کر نینی تال روانہ ہوگئے ❶۔

ہندوستانیوں میں انگریزوں کا وفادار شیخ بدر الدین کوتوال (بریلی) تھا۔ اس نے انگریزوں کی وفاداری اور امداد میں بڑی مستعدی دکھائی باہر کے سپاہیوں کو حتی الوسع شہر میں داخل نہیں ہونے دیا اور کمشنر کے ہمراہ نینی تال پہنچا اور آخر تک وہیں مقیم رہا۔ جب انگریزوں کی فتح ہوگئی تو دوسرے انگریز افسروں کے ساتھ یہ بھی بریلی آیا اور آنولہ کا تحصیل دار مقرر ہوا۔

(لائل محمڈنس آف انڈیا، میرٹھ ۱۸۶۱ء، حصہ سوم از سرسید احمد خاں وگزیٹر ضلع بریلی: صفحہ ۱۷۲)

انقلابیوں نے تھوڑی سی دیر میں میگزین اور سرکاری خزانہ اپنے قبضے میں لے لیا، کوٹھیوں اور بنگلوں کو انگریزوں کی نشانی سمجھ کر ختم کر دیا، سرکاری دفتر کو نذر آتش کیا (اخبار الصنادید: جلد دوم، صفحہ ۳۷) اور جیل خانہ توڑ ڈالا۔ میر سیف اللہ تلہری نے جیل کا دروازہ کھول دیا۔ دروازے کے اوپر جو مکان تھا لوگوں نے اسے ڈھا دیا۔ ۳۵۰۰ قیدی آزاد

❶ جب یہ لوگ بھیڑی پہنچے تو ان کو جلے ہوئے بنگلے ملے۔ بھیڑی کے پیش کار سے خزانہ طلب کیا۔ اس نے رُپیہ دینے سے صاف انکار کر دیا ناچار آگے بڑھ گئے۔ تھوڑی دیر کچھا میں ٹھہرے صبح کو ہلدوانی پہنچے۔ (یکم جون ۱۸۵۷ء) کل ۲۸ یورپین تھے۔ پلٹن نمبر ۸ کے چند وفادار سپاہی اور بدر الدین کوتوال ساتھ تھا۔
(گزیٹر ضلع بریلی: صفحہ ۱۷۲)

ہوئے۔(تاریخ روہیل کھنڈ از منشی عبدالعزیز خاں عاصی بریلوی (کراچی ۱۹۶۳ء): صفحہ ۲۱۰، ۲۱۱)
بہ قول شمس العلماء منشی ذکاء اللہ:

''فوج میں سب سے زیادہ جہاد کی تبلیغ کرنے والا محمد شفیع تھا جو عقاید کی رو سے لوگوں کو بھڑکاتا تھا۔ محمد شفیع کے پاس سبز جھنڈا تھا۔''

غرض چند گھنٹوں میں میدان صاف ہو گیا اور انقلابیوں کی تجاویز کے مطابق تمام کام عمل میں آیا۔ اسی دن نواب خان بہادر خاں مدار علی (ساکن کانکرٹولہ) اور بخت خاں کی درخواست اور مشورے سے ناظم روہیل کھنڈ مقرر ہوئے۔ (تاریخ روہیل کھنڈ: صفحہ ۲۱۰) مسند نشینی کی رسم کوتوالی کے سامنے عمل میں آئی۔ مؤلف تاریخ روہیل کھنڈ لکھتے ہیں:

ہوادار پر سوار ہو کر کوتوالی آئے، اجلاس کیا، شرفاے بریلی نے نذریں دیں۔'' (تاریخ روہیل کھنڈ: صفحہ ۲۱۰)

مسند نشین ہونے کے بعد انتظام حکومت درست کیا، فوج بھرتی ہونی شروع ہوئی، توپیں ڈھلوائی گئیں اور جا بجا تھانے اور تحصیلیں قایم ہوئی۔ (اخبار الصنادید: جلد دوم، صفحہ ۳۰ و گزیٹیر ضلع بریلی: صفحہ ۱۷۳) خان بہادر خاں کی حکومت میں درج ذیل عہدے دار مقرر ہوئے:

(۱) خان بہادر خاں	گورنر روہیل کھنڈ
(۲) مدار علی خاں	کمانڈر اِن چیف
(۳) ہوری لال ابن شوبھارام	بخشی فوج
(۴) شوبھارام	دیوان کل و عدالت اپیل اعلا
(۵) محمد یوسف خاں	رسالدار
(۶) حسین	کوتوال
(۷) محمد احسن خاں	منصف
(۸) محمد امین خاں	صدر امین
(۹) مظفر حسین	صدر الصدور

(۱۰) مولوی سید احمد بدایونی	مفتی
(۱۱) ملا منیر	ملائے قرآنی
(۱۲) حافظ کالے خاں	دُرّے لگانے والا
(۱۳) مولوی حیدر علی	روزنامچہ نگار (تاریخ غدر ہندی کا مؤلف)

(تاریخ روہیل کھنڈ: صفحہ ۲۱۴)

خان بہادر خاں نے فوجی انتظام کی طرف سب سے زیادہ توجہ دی اور وار کونسل قایم کی جس کے ممبران:

"(۱) کرامت خاں (۲) اکبر علی خاں (۳) غلام حمزہ (۴) پنڈت اوجھر تیغ ناتھ (۵) مظفر حسین خاں (صدر اعلا) (۶) جعفر علی خاں (۷) جے مل (۸) کلب علی شاہ۔ انتظامیہ کونسل میں خود (۱) خان بہادر خاں (۲) شوبھا رام (۳) مدار علی (۴) احمد شاہ خاں اور (۵) مبارک شاہ خاں تھے۔" (فریڈم اسٹرگل: جلد پنجم، صفحہ ۲۸۵)

مواضعات نگریا پٹی اور بھگوتا پور کے میواتیوں کی فوج تیار کی۔ (تاریخ روہیل کھنڈ: صفحہ۴) کیارہ کا جے مل سنگھ، خان بہادر خاں کا بہت مددگار تھا، اس کی کمان میں جنگھارہ ٹھاکروں کی ایک رجمنٹ تیار کرائی۔ (گزیٹیر ضلع بریلی: صفحہ ۱۷۴)

خان بہادر خاں کو سخت مالی مشکلات تھیں لہٰذا رعایا پر عشر قایم کیا۔ (فریڈم اسٹرگل...... جلد پنجم، صفحہ ۲۸۶) مفتی عنایت احمد کاکوروی اور مولوی امانت حسین نے فتویٰ دیا اور پنڈت اوجھر تیغ ناتھ نے بھی تائیدی تحریر لکھی۔

خان بہادر نے سپاہی کے چھ رُپے ماہ وار اور سوار کے بیس رُپے ماہ وار مقرر کیے تھے۔ (تاریخ روہیل کھنڈ: صفحہ ۲۱۴)

غرض کہ فوجی اعتبار سے بریلی کی حالت اچھی تھی ❶۔ جس کا ثبوت سرکاری

❶ ظہیر دہلوی آنکھوں دیکھا حال لکھتے ہیں: رام پور کے تیس ہزار آدمی بریلی میں ملازم ہیں اور مردمان رام پور کا یہ حال ہے کہ ایک ایک تھان کا دوپٹہ سر سے بندھا ہوا ہے اور اس پر گوٹا لگا ہوا ہے، آدھا دوپٹہ سر سے بندھا ہوا ہے اور آدھا گھوڑے کی رکاب سے نیچے لٹکتا ہوا ہے، اور چار چار طمنچے کمر میں لگے ہوئے ہیں دوہری تلواریں ڈاب میں لٹکی ہوئی گھوڑوں پر سوار ہیں اور شہر میں گھوڑے کداتے پھرتے ہیں۔ پچاس ہزار ➤

ریکارڈ سے بھی ملتا ہے۔ (فریڈم اسٹرگل ...... : جلد پنجم، صفحہ ۲۹۰ و ۳۱۱)

نواب خان بہادر خاں نے جنرل بخت خاں کو فوج کے ساتھ دہلی بھیجنا تجویز کیا، اور بادشاہ ابوظفر بہادر شاہ کے حضور میں ایک عرضی پروانہ نظامت کے متعلق بھیجی جو بادشاہ نے منظور کر لی ❶۔ بادشاہ نے بہادر خاں کو "نواب انتظام الدولہ خان بہادر تنویر جنگ رئیس اعظم روہیل کھنڈ" کا خطاب عطا فرمایا ❷۔ نواب خان بہادر خاں نے اپنی مہر پر "الحکم للہ والملک للہ" کندہ کرایا تھا۔ اور ایک مہر پر یہ سجع تھا "شدیم خان بہادر بہ ذوالفقار علی" (حیات حافظ رحمت خاں: صفحہ ۳۶۴) خان بہادر خان نے اپنا سکہ بھی جاری کیا تھا۔ (فریڈیم اسٹرگل ...... : جلد پنجم، صفحہ ۲۸۸)

چوں کہ خان بہادر خاں کے دادا حافظ رحمت خاں روہیل کھنڈ کے حکمراں رہ چکے تھے اور یہ پرانے رئیس تھے لہٰذا انھوں نے ملحقہ اضلاع میں اپنی حکومت قایم کرنے کا انتظام کیا ❸۔

۲- آنولہ:

آنولہ ضلع بریلی کا ایک قدیم اور مشہور قصبہ ہے چوں کہ روہیلوں کے زمانے میں یہ صدر مقام رہا تھا اس لیے اس کی اہمیت زیادہ تھی۔ روہیلہ سرداروں کی اولاد بھی

◄ سوار کا اجتماع بریلی میں موجود ہے۔ (داستانِ غدر- لاہور ۱۹۹۷ء: صفحہ ۱۸۷ و ۱۸۸) اور نجم الغنی خاں رام پوری لکھتے ہیں کہ اہل رام پور کے غول کے غول جاتے تھے اور نوکر ہوتے تھے۔

(اخبار الصنادید: جلد دوم، صفحہ ۵۴۵)

❶ ۲۱ رجون ۱۸۵۷ء کو بادشاہ کی طرف سے سند نظامت موصول ہوئی۔ (گزیٹر ......، صفحہ: ۱۷۵)

❷ حکیم نجم الغنی خاں نے نواب انتظام الدولہ خان بہادر ہزبر جنگ رئیس اعظم روہیل کھنڈ" لکھا ہے۔

(اخبار الصنادید: جلد دوم، صفحہ ۴)

❸ بریلی کے مرکز انقلاب کے ساتھ قومی حکومت کا نظام پیلی بھیت، بدایوں، شاہ جہان پور تک پھیلا ہوا تھا۔ ان اضلاع میں ۵۸-۱۸۵۷ء کے حوادث اور نظام حکومت کے احوال کی تفصیلات انھیں اضلاع کے زیرِ عنوان مطالعہ فرمائیے۔ (ا۔س۔ش)

وہاں رہتی تھی۔ مسلمانوں کی اس قصبے میں اکثریت تھی۔ سب نے خان بہادر خاں کی حکومت کو خوش آمدید کہا، آنولہ میں خان بہادر خاں نے نواب کلن خاں نبیرہ بخشی سردار خاں (۱) کو ناظم بنایا۔ نواب کلن خاں بڑے بہادر اور جری آدمی تھے۔ شکل وصورت اور موزونی جسم میں بھی اپنی مثال آپ تھے، انتظامی قابلیت بھی خوب تھی حکیم عبد الغفور (۲)۔ مرحوم مؤلف ''سوانحات المتاخرین آنولہ'' لکھتے ہیں:

> ''نہایت شکیل وجمیل اور سجیلے جوان تھے۔ اپنے دوست حکیم جان محمد (۳) کے مزار پر اکثر فاتحہ خوانی کرنے جاتے تھے بازار کے دن کھڑکی والی مسجد (۴) کی فصیل پر جب بیٹھا کرتے تو بازار آنے والی عورتیں ان کے حسن وجمال کا نظارہ کیا کرتی تھیں والد صاحب (۵) ان کی قوت کا حال بیان کرتے تھے کہ جوانی میں چٹکی سے رُپیہ ٹیڑھا کردیتے تھے اور سینہ پر بندوق رکھ کر دونوں ہاتھوں سے دبا کر لچادیا کرتے تھے۔ راقم الحروف نے ان کو بڑھاپے میں دیکھا۔ نمازی تھے کسی قدر نشہ کے عادی تھے۔''

(سوانحات المتاخرین آنولہ از حکیم عبدالغفور قلمی (مملوکہ محمد ایوب قادری): صفحہ ۴۸)

---

(۱) بخشی سردار خاں ولد موسم خاں کمال زئی، داؤد خاں کے ہم راہ روہ سے ہندوستان آئے بڑی بہادری کے کام کیے داؤد خاں کے بعد نواب علی محمد خاں نے اپنی رفاقت میں رکھا اور جب کٹھیر پر نواب کا قبضہ ہوگیا تو وہ بخشی مقرر ہوئے۔ بڑے متقی، عابد، زاہد، سخی اور شجاع تھے۔ نماز کے پابند تھے، آنولہ میں چار مسجدیں ان سے یادگار ہیں۔ جامع مسجد آنولہ (محلہ کٹرہ) میں دفن ہیں۔ ۲۴ ربیع الاول ۱۱۸۷ھ کو فوت ہوئے۔ (اخبار الصنادید: جلد اوّل از حکیم نجم الغنی خاں (لکھنؤ ۱۹۱۸ء): صفحہ ۴۲۶)

(۲) حکیم عبدالغفور ابن ملا قادر بخش نہایت ذی علم بزرگ تھے علم طب میں خوب دست گاہ حاصل تھی تصنیف وتالیف کا بھی شوق تھا، رسالہ تنبیہ التکبرین اور سوانحات المتاخرین آنولہ ان سے یادگار ہیں ۱۴ر اگست ۱۹۰۴ء کو انتقال ہوا اسی سال سے متجاوز عمر پائی۔

(۳) مؤلف سوانحات المتاخرین کے دادا کے بھائی تھے۔ اور نواب کلن کے دوست تھے۔

(۴) مسجد واقع کٹرہ (بازار دت رام)۔

(۵) مولوی قادر بخش (المتوفی ۱۳۲۰ھ)

انتظامی امور کے سلسلے میں حکیم عبدالغفور مرحوم لکھتے ہیں:

''غدر ۱۸۵۷ء میں جب نواب کلن خاں کو نواب بنایا گیا تو کچھ روز نہایت شان وشوکت سے حکومت کی، ملازمین برطانیہ پر بھی قابو تھا، مخالفین کو معقول سزائیں بھی دیتے تھے۔'' (سوانحات المتاخرین آنولہ از حکیم عبدالغفور قلمی (مملوکہ محمد ایوب قادری): صفحہ ۴۸)

نواب کلن خاں کے ساتھیوں میں مولوی محمد اسمٰعیل، غالب علی خاں، شیخ خیر اللہ اور حکیم سعید اللہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مولوی محمد اسمٰعیل صدر شریعت تھے، غالب علی خاں بڑے بااثر روہیلہ سردار تھے۔ جب فیروز شاہ شہزادہ قصبہ میں آیا تو غالب علی خاں نے شہزادہ فیروز شاہ کی فوج کی ضیافت کے تمام مصارف اپنے ذمے لیے شیخ خیر اللہ بڑا مرد مجاہد تھا۔ ارلا کے ٹھاکروں نے جب سرکشی کی تو شیخ خیر اللہ نے ناک چنے چبوا دیے۔

حکیم سعید اللہ نے اس تحریک میں بڑا کام کیا، مولوی سرفراز علی اور مولانا کفایت علی مراد آبادی سے ان کے تعلقات تھے حکیم صاحب کے پاس مولانا کافی آنولہ میں جہاد کے فتوے کی اشاعت کے لیے تشریف لائے۔ مولانا کفایت علی کافی کی مشہور کتاب بہار خلد، شرح شمائل ترمذی کا مسودہ اوّل اور مولانا سرفراز علی کا ایک مکتوب حکیم صاحب کے ذخیرۂ علمیہ میں محفوظ تھا جو ہمیں ملا۔ کنکرالہ اور کپنلا (ضلع فرخ آباد) میں بھی حکیم صاحب لڑے۔ حکیم سعید اللہ مرحوم کا تفصیلی حال باب نہم میں درج کیا گیا ہے۔

سید مصطفٰی علی بریلوی لکھتے ہیں:

''آنولہ کے مجاہدین میں حکیم سعید اللہ نے اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ نام پیدا کیا۔ وہ شہزادہ فیروز شاہ کی معیت میں فرخ آباد کی جنگ آزادی میں شریک جدال وقتال رہے، انھوں نے بریلی کے آخری مقابلے میں بھی داد شجاعت دی، جب جنگ آزادی ناکام ہوگئی تو روپوش رہے جب عام معافی کا اعلان ہوا تو ظاہر ہوئے اور کافی مدت تک حیات

دنیوی کی نیرنگیاں دیکھ کر ۱۹۰۷ء میں راہی عالم بقا ہوئے۔"

(نواب خاں بہادر خاں شہید از مصطفیٰ علی بریلوی (کراچی ۱۹۶۳ء): صفحہ ۲۵)

نواب کلن خاں کے متعلق حکیم عبدالغفور مرحوم لکھتے ہیں:

"(بعد غدر) حکیم سعادت علی خاں کی شان و شوکت دیکھ کر نواب کلن خاں حیران تھے۔ اور خوف و ہراس میں راہ نجات تلاش کرتے تھے۔ یہ تحقیق نہیں کہ نواب صاحب اور حکیم صاحب کی ملاقات ہوئی یا نہیں، لیکن یہ معتبر ذرائع سے سنا کہ نواب صاحب کی جان حکیم صاحب نے بچائی، یعنی جب غدر ختم ہو کر برطانیہ کا تسلط ہوا اور باغیوں کو سزائیں دی جانے لگیں تو آنولہ بھی بغاوت کا مجرم تھا، یہاں بھی گرفتاریاں اور سزائیں دی جانے لگیں، لیکن بلاقصور عوام الناس گرفتاریوں سے بری تھے، اکثر باغیوں نے فرار ہو کر اپنی جان بچائی نواب کلن خاں دو سبب سے گرفتار نہیں کیے گئے ایک حکیم سعادت علی خاں صاحب کی نظر عنایت سے دوسرے فرار ہو جانے کی وجہ سے، نواب صاحب شکل و صورت اور موزونی صورت میں اپنی مثال آپ تھے سو سال سے عمر تجاوز کر گئی تھی لیکن جسم پر کہیں نہ جھری، نہ چہرے پر شکن، دانت بجنسہٖ موجود تھے، سیاہ خضاب کر لینے کی وجہ سے اچھے خاصے جوان معلوم ہوتے تھے۔ بعد دوپہر اپنے دوست عنایت اللہ خاں کے ساتھ آنولہ کی گشت کرتے تھے، خوش پوشاک تھے، ادنا اور اعلا سے مساویانہ ملتے تھے۔ لوگوں میں ذکر ہوتا تھا کہ منشیات یعنی افیون وغیرہ بھی کھاتے ہیں۔ ذریعہ معاش معلوم نہ ہو سکا، افواہاً سنا گیا کہ حکیم سعادت علی خاں نے اپنی جیب خاص سے یا ریاست رام پور سے وظیفہ مقرر کرا دیا تھا۔ جس پر گزر اوقات ہوتی تھی۔ آنولہ میں ان کے نسب کا وجود نہیں اور ہو تو مجھے معلوم نہیں۔ سن اور تاریخ وفات صحیح یاد نہیں۔ اندازہ ہے کہ ان کے انتقال کو ابھی پچاس سال نہیں ہوئے ہیں۔" (مکتوب مولوی حکیم عبدالغفور بہ نام محمد ایوب قادری، مورخہ

۲۲ مئی ۱۹۵۳ء نیز دیکھیے سوانحات المتاخرین، آنولہ: صفحہ ۸۶)

قصبے کے حریت پسند گروہ کے لیے ایک سخت مشکل کا سامنا تھا۔ صورت یہ تھی کہ اسی قصبے کے ایک نام ور رئیس حکیم سعادت علی خاں (۱) ریاست رام پور کے مدار المہام تھے اور سرکار انگریزی کی بڑی خدمات انجام دے رہے تھے، لہٰذا ان کی طرف سے حریت پسند گروہ کے لیے ہمہ وقت مشکلات پیدا کی جاتی تھیں۔ قصبہ کا صرف ایک گروہ من حیث المجموع حکیم صاحب کی ہدایت کے مطابق کام کرتا تھا۔ یہ لوگ چوبرجی کے رہنے والے تھے (۲)۔ جولائی ۱۸۵۷ء میں حکیم سعادت علی خاں رام پور کے سپاہیوں کے ساتھ آنولہ آئے اور پھر واپس چلے گئے۔ (اخبار الصنادید: جلد دوم، صفحہ ۵۵۳) جب تحریک کا آغاز ہوا تو سعادت علی خاں کے دو چھوٹے بھائی ہدایت علی اور محبّ علی نے انقلابی تحریک سے متعلق خبریں کمشنر بریلی کو پہنچائیں (۳)۔

فیروز شاہ شہزادہ آنولہ میں دو دن میر والے باغ میں مقیم رہا۔ آج کل اس باغ میں رام لیلا کا میلہ لگتا ہے پھر بدائیوں ہوتا ہوا مراد آباد چلا گیا۔

ایک معمر بزرگ مولوی اسد علی خاں مرحوم اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

---

(۱) حکیم سعادت علی خاں ابن حکیم مردان علی، بڑے ہوش منداور لایق شخص تھے، پہلے بدایوں میں تحصیل دار رہے۔ جب نواب محمد سعید خاں نے رام پور کا انتظام سنبھالا تو ان کو اپنی ریاست میں لے گئے وہاں حکیم صاحب نے بڑی ترقی کی، ۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت کی خدمات انجام دیں، پانچ ہزار کا خلعت اور دس ہزار رُپیہ کی زمین داری عطا ہوئی۔ ۱۲۸۳ھ میں آنولہ میں انتقال ہوا۔ قصبہ سے جنوب و مشرق کی جانب مقبرہ بنا ہوا ہے۔ (اخبار الصنادید: جلد دوم، صفحہ ۱۰۹-۹۹، سوانحات المتاخرین آنولہ: صفحہ ۴۔ خطبہ صدارت جمعیۃ شبان المسلمین، آنولہ ۱۹۴۳ء از حکیم معظم علی خاں (بریلی ۱۹۴۵ء): صفحہ ۵

(۲) شجاع الدولہ نے روہیل کھنڈ پر قبضہ کیا قلعے کی اس عمارت میں اودھ کے کئی شیعہ خاندان بسا دیے گئے تھے۔

(۳) مولوی اسد علی خاں ولد غلام نبی خاں ۱۸۵۷ء میں ۱۸ سال کے تھے، رام پور وطن تھا تمام عمر آنولہ میں گزاری فارسی کے کلاسیکی ادب پر گہری نظر تھی پشتو سے بھی واقف تھے۔ ۱۹۵۶ء میں انتقال ہوا۔ راقم الحروف نے فارسی کی ابتدائی کتابیں مولوی اسد علی خاں سے پڑھیں۔

''شہزادہ فیروز شاہ آنوالہ میں ایک دن اور ایک رات مقیم رہا۔ اس کا قیام میر والے باغ میں ہوا۔ یہ وہ باغ ہے جس میں آج کل رام لیلا لگتا ہے بڑا وسیع اور گھنا باغ ہے شہزادہ کے ساتھ تقریباً پانچ ہزار آدمی جمع تھے۔ باشندگان آنولہ نے شہزادہ اور اس کے آدمیوں کی بڑی مدد اور خاطر و تواضع کی۔ آنولہ کے سربراہ کاروں میں غالب علی خاں، نواب کلن خاں، سید وارث علی، مولوی محمد اسمٰعیل، حکیم سعید اللہ، نواب حسن، نواب جان محمد اور شیخ خیر اللہ، سب پیش پیش تھے۔ آنولہ کے لوگوں نے کھانا تیار کرایا۔ عام کھانے کے ساتھ ساتھ شہزادہ اور اس کے خاص آدمیوں کے لیے پلاؤ اور زردے کی دو دیغیں تیار کرائیں، شہزادہ نے اپنے اہتمام سے ساتھیوں کو کھانا تقسیم کیا اور اس میں ہر سپاہی کو پلاؤ اور زردہ بھی بھجوایا، جب شہزادہ سے کہا گیا کہ چاول تو آپ کے خاص لوگوں کے لیے تھے، شہزادہ نے جواب دیا کہ میں بھی ایک سپاہی ہوں جو سب سپاہیوں کو کھانا ملے گا وہی میں کھاؤں گا۔ شہزادہ کا یہ لشکر دوسرے دن محلہ کٹڑے سے گزرا، کھڑکی والی مسجد کے پاس پانی کا ایک گہرا گڑھا تھا، شہزادہ کا گھوڑا چمک گیا اور اتفاق سے شہزادہ کی آنگوٹھی کا فیروزہ اس گڑھے میں گر گیا شہزادہ کو اس کا سخت افسوس ہوا۔ چار گھنٹے اس جگہ قیام رہا، اس گڑھے کی تلاشی ہوئی مگر وہ فیروزہ نہ ملا، سخت مایوسی ہوئی، عصر کی نماز کھڑکی والی مسجد میں ادا کی اور تمام مسلمانان آنولہ کو مخاطب کر کے ایک زوردار تقریر کی، جس میں سارا زور جہاد پر دیا گیا تھا، ایک مدت تک یہ جگہ ''شہزادہ کا نکڑ'' کہلائی۔'' (مکتوب اسد علی خاں بہ نام محمد ایوب قادری، ۱۵؍اپریل ۱۹۵۲ء)

(۴)

روہیل کھنڈ

ڈاکٹر مسز عابدہ سمیع الدین۔علی گڑھ

ابتدائی تاریخ:

اوپری گنگا کی وادی کا زرخیز علاقہ جس کے مشرق میں اودھ کے حصے اور مغرب میں جمنا کے علاقے تھے، روہیلہ سرداروں کا ایک ڈھیلا ڈھالہ وفاق تھا۔ جو پہلا روہیلہ سردار اودھ سے یہاں آکر مقیم ہوا اس کا نام داؤد خاں تھا[1] دھیرے دھیرے اس کے متبنی بیٹے اور وارث علی محمد خاں نے دوسرے زمینداروں کی جگہ لے لی اور خود علاقے کا بڑا جاگیر دار بن گیا۔ اس کا صدر مقام آنولہ تھا جو ضلع بریلی کا قدیمی قصبہ تھا۔ اس کی خدمات کے عوض شہنشاہ دہلی نے اسے نواب کے خطاب سے سرفراز کیا، نیز ۱۷۴۰ء میں روہیل کھنڈ کا گورنر مقرر کیا۔ جو دوسرے روہیلہ سردار بعد میں شریک ہوئے، ان میں حافظ رحمت خاں اور نواب دوندے خاں کے نام قابل ذکر ہیں۔ ۱۷۴۹ء میں علی محمد خاں کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا سعد اللہ خاں وارث ہوا۔ رحمت خاں سرپرست مقرر ہوئے۔ حافظ رحمت خاں کی انتظامی صلاحیتوں نے بہت جلد

---

[1] ۱۷۰۷ء (بہ اثنائے وفات عالم گیر) داؤد خان روہیلہ نامی پٹھان کھیڑ میں داخل ہوئے۔ کشمیر کے مغربی کنارے سے افغانستان کے مشرقی سرے تک، شمال سے جنوب میں کوہ کاشغر، قندھار، غور وغزنی سے بلوچستان تک کا علاقہ انیسویں صدی تک ''روہ'' کہلاتا تھا جہاں کے قدیم باشندے آج بھی روہ کی مناسبت سے اپنے کو روہیلہ کہتے ہیں۔ ۱۷۱۴ء میں داؤد خاں نے بریلی کے علاقے کو فتح کرلیا۔ اس جنگ میں انھیں ایک لڑکا ملا جو بعد کو سردار علی محمد خاں کے نام سے مشہور ہوا اور روہیل کھنڈ کا بانی کہلایا۔ ۱۷۲۸ء میں روہیلہ سلطنت کی بنیاد پڑی۔

(دور آفریدی ''تاریخ روہیل کھنڈ......۱۵قبل مسیح تا ۱۹۸۵ء'': صفحہ ۲۳-۳۳)

قرب و جوار میں اپنا لوہا منوالیا اور روہیل کھنڈ سلطنت مغلیہ کا سب سے بہتر منظم علاقہ بن گیا❶۔ جو انگریزی اقتدار کی راہ کا بڑا کانٹا تھا۔ جلد ہی ۱۷۷۴ء میں روہیل کھنڈ پر نواب اودھ اور انگریزی افواج نے مشترک حملہ کیا۔ ۱۷۹۴ء میں آصف الدولہ کے زمانے میں اہل روہیل کھنڈ نے انگریزوں سے ٹکر لی اور کوشش کی کہ نواب اودھ کے تسلط سے آزاد ہو جائیں۔ اہل روہیل کھنڈ کی حریت پسندی اور جذبۂ آزادی کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس لڑائی میں ہر طبقے و گروہ نے حصہ لیا۔ تاریخ روہیل کھنڈ میں حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی شہادت کا سال ۱۷۷۴ء ہمیشہ یادگار رہے گا۔ فتح کے بعد اودھ اور کمپنی کی فوجوں نے پورے علاقے کو لوٹ کھسوٹ کر تاخت و تاراج کر دیا۔ اور بغیر کسی جواز کے پارلیمنٹ نے وارن ہسٹینگز کے اس فعل کو معاف کر دیا۔ تاہم تاریخ نے بہ انداز دگر اسے اپنے اوراق میں محفوظ کر لیا۔ روہیلوں نے اسے کبھی معاف نہیں کیا۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں کئی سخت معرکے اسی علاقے میں ہوئے۔ سید احمد شہیدؒ کے تذکرے میں ہنٹر نے بجا طور پر اعتراف کیا ہے:

> "ان کا پہلا مرکز روہیلوں کی جن کو صفحۂ ہستی سے نابود کرنے کے لیے ہم نے محض دولت کے لالچ میں اپنی فوجیں عاریتاً دوسروں کے دے دی تھیں، اور جس کی افسوس ناک تاریخ وارن ہسٹینگز کی زندگی پر ایک نہ مٹنے والا داغ ہے۔ ان کی اولاد گذشتہ نصف صدی سے متواتر اس کا انتقام لیتی چلی آرہی ہے اور اس وقت بھی سرحد کے باغی کیمپ کو اس کے بہترین شمشیر زن مہیا کر رہی ہے۔ روہیلوں کے معاملے میں بھی اور جہاں کہیں بھی ہم نے ہندوستان میں مظالم کیے ہیں ہم نے جیسا بویا ہے ویسا ہی کاٹا ہے۔"
>
> (ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر "ہمارے ہندوستانی مسلمان" مترجمہ ڈاکٹر صادق حسین: صفحہ ۲۲)

---

❶ اس میں شک نہیں کہ اس علاقے کا نظم و نسق پورے ہندوستان میں سب سے بہتر تھا۔ عوام محفوظ تھے صنعتی ترقی ہو رہی تھی۔ علاقے کی خوش حالی بے مثال تھی۔

(Mill James: "The History of British India" London, Page 386, Quoted by S. Moinul Haq in "The Great Revolution" Page 497)

رام پور کی چھوٹی سی ریاست کو چھوڑ کر پورا علاقہ اودھ میں شامل کرلیا گیا۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں نواب رام پور نے اس عنایت کا پورا پورا حق ادا کر دیا اور دامے، درمے و قدمے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ ۱۸۰۱ء میں لارڈ ویلزلی (Wellesley) نے نواب اودھ سعادت علی خاں کو اودھ کا آدھا حصہ کمپنی کو دینے پر مجبور کر دیا۔ اور یوں انیسویں صدی کے آغاز میں روہیلے کمپنی کے زیر اقتدار آ گئے۔

بریلی کی بغاوت ۱۶-۱۸۱۴ء:

۱۸۱۴ء میں بریلی میں ہاؤس ٹیکس لگایا گیا۔ مشتعل عوام نے مفتی محمد عوض کی رہنمائی میں احتجاج کیا مگر کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ ۱۶/اپریل ۱۸۱۶ء کو شہر کوتوال نے دورہ کیا اور ایک احتجاجی بھیڑ پر گولی چلانے کا حکم دیا۔ کئی اشخاص کی جان گئی۔ مفتی صاحب نے اپنی رہنمائی میں حسینی باغ میں لوگوں کو لے جا کر اعلان جہاد کر دیا۔ مشتعل ہجوم نے کمپنی کی فوجوں پر ہلا بول دیا۔ ۲۱/اپریل کو مراد آباد سے کیپٹن کننگھم (Cunningham) کی سربراہی میں کمک پہنچنے کے سبب مغلوب ہوئے۔ بہت اشخاص شہید ہوئے۔ مفتی صاحب ٹونک فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ اور یوں مفتی صاحب نے علم جہاد بلند کر کے سب سے پہلے شمالی ہندوستان میں تحریک آزادی کی بنیاد رکھی۔ بریلی کے اہل ثروت نے جہادیوں کے اخراجات برداشت کیے۔ حکیم وحید اللہ بدایونی نے لکھا ہے:

"مسمی کماؤ ساہوکار ساکن بریلی کفیل مصارف اہلِ بلوہ کا ہوا۔"

(محمد ایوب قادری، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات)، پاک اکیڈمی۔ کراچی، ۱۹۷۶ء: صفحہ ۳۸)

(S. Moinul Haq: "The Great Revolution of 1857" Peges 496-99)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اہل روہیل کھنڈ بڑے فعال رہے اور بڑی جانبازی، شجاعت اور نظم و ضبط کا ثبوت دیا۔ بہ قول مولوی ذکاء اللہ:

"جن ضلعوں میں بغاوت ہوئی وہ روہیل کھنڈ کی بغاوت کے آگے خفیف تھی۔" (مولوی ذکاء اللہ "تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند" صفحہ: ۸۲۰)

بریلی:

بریلی روہیل کھنڈ کا مرکزی مقام ہے۔ اس علاقے نے روہیلوں کے زمانہ اقتدار میں بڑی اونچی حیثیت حاصل کرلی تھی۔ شجاع الدولہ والیِ اودھ نے وارن ہسٹینگز کو رُپے کا لالچ دے کر ساتھ ملایا اور دونوں کی مشترکہ قوت نے روہیلوں کو تباہ کردیا۔ ان میں حافظ الملک حافظ رحمت خاں بہت ممتاز و نام ور تھے۔ نواب خان بہادر خاں انھیں حافظ رحمت خاں کے پوتے تھے۔ انگریزی دور حکومت میں نواب خان بہادر صدر امین کے عہدے پر سرفراز تھے۔ سبک دوشی کے بعد دوہری پنشن پارہے تھے۔ ایک ملازمت کی اور دوسری حافظ رحمت خاں کے وارث ہونے کی حیثیت سے۔ کمشنر الیگزینڈر کو ان پر مکمل اعتماد تھا۔ اگرچہ وی ڈی ساورکر کے مطابق "وہ تمام خفیہ انقلابی تنظیموں کے روح رواں تھے۔"

(V.D. Savarkar: "The Great war of Independence" Page: 165)

مارچ ۱۸۵۷ء سے چربی والے کارتوسوں کا مسئلہ عوامی ذہن پر بوجھ بنا ہوا تھا۔ اور ایک عام بے چینی کی کیفیت تھی۔ تحریک حریت کی ابتدا ہی سے بریلی اس ہیجان کا ایک اہم مرکز تھا۔ اس کے اہم رہنماؤں میں مجاہد مولوی سرفراز علی اور مفتی عنایت احمد صدر امین کے نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ جو لٹریچر کے ذریعہ جہاد کی تبلیغ واشاعت میں مشغول تھے۔ جھنڈا شاہ نامی فقیر ❶ نے بھی جسے عوامی اعتماد حاصل تھا جہاد کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔

ان حضرات نے مفتی عنایت احمد کی صدارت میں بریلی میں دینی لٹریچر کی نشرو اشاعت کے لیے ایک انجمن بھی تشکیل کی تھی، جس میں بریلی، بدایوں، پیلی بھیت،

---

❶ جھنڈا شاہ کی گرفتاری ۲۱ ردسمبر کو عمل میں آئی اور پاداش میں انڈمان بھیجا گیا جہاں اس کی بہت عزت ہوتی تھی۔ یہاں اچھوں اور نیکوں کا بھی یہ حال ہے کہ کوئی مولوی، کوئی پنڈت، درویش اور بھائی جی سے خالی نہیں ہے۔ جھنڈا شاہ ساکن بریلی مثل قطب کے برسوں سے ماؤنٹ ہریٹ پر بیٹھا ہے گو دسمبر ۱۸۷۳ء میں اس کی رہائی بھی ہوگئی اور اس سیٹلمنٹ کے مشرکوں کو اولاد اور روزی تقسیم کرتا رہتا ہے۔ عوام کی عقیدت کا مرکز بنا ہوا ہے۔ (مولوی احمد جعفر تھانیسری "کالا پانی": صفحہ ۷۸-۱۰۳)

مراد آباد، آنولہ، امروہہ وغیرہ کے عمائد و شرفا کی امدادی رقوم سے لٹریچر تیار کر کے تقسیم کیا جاتا تھا۔ (محمد ایوب قادری "۱۸۵۷ء واقعات و شخصیات": صفحہ ۱۱۸)

بریلی چھاؤنی میں ایک اور انقلابی شخصیت جنرل بخت خاں روہیلہ کی موجودگی تھی جو انگریزی توپ خانہ کا ایک نہایت قابل اور محبّ وطن افسر تھا۔ جنرل بخت خاں نے بغاوت کی تنظیم اپنے دوست مدار علی خاں وغیرہ کے مشورے سے کی۔ روہیل کھنڈ میں بغاوت کی ابتدائی تنظیم جن کے ہاتھوں ہوئی ان میں جنرل بخت خاں کے علاوہ محمد شفیع رسالدار (سواروں کی رجمنٹ نمبر ۸) جنرل نیاز محمد خاں، ظفریاب خاں اور سادات نو محلہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

(العلم۔ جنگ آزادی نمبر کراچی بہ حوالہ شان دار ماضی: صفحہ ۳۲۵)

غرض بریلی میں انقلاب کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ مئی میں دہلی میں فوجی بغاوت کی خبر نے عوامی ہیجان کو اور بھی ہوا دی۔ مغل شہنشاہ کے اقتدار کی بحالی پٹھانوں کے خون میں نئی حرارت پیدا کر رہی تھی۔ اگرچہ بریلی کے حکام بہ ظاہر مطمئن تھے، تحریک کے خاص خاص آدمی خان بہادر خاں، جنرل بخت خان اور محمد شفیع خان رسالدار وغیرہ اپنا کام بڑے ضبط و نظم سے کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے تنظیم اس ہوشیاری سے کی کہ انگریز افسروں کو وقت کے وقت تک حقیقت حال کا پورا اندازہ نہ ہو سکا۔ محمد شفیع نے پہلی تحریک آزادی کے لیے بے مثال جدوجہد کی۔

۳۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو اتوار کے دن قریب صبح ۱۱ بجے جب کہ تمام عیسائی گرجا گھر میں جمع تھے چھاؤنی میں توپ کا فایر ہوا جو اس بات کا اعلان تھا کہ فوج نے علم بغاوت بلند کر دیا ہے۔ ۶۸ نمبر کی فوج کے سپاہی تمام لاینوں میں دوڑ پڑے۔ صوبے دار بخت خاں مع تمام افواج انگریزی حکومت کے خلاف ہو گئے۔ مسلح سپاہی دیوانہ وار چاروں طرف دوڑنے لگے۔ جو افسر سامنے آتا اسے گولی کا نشانہ بناتے۔ فایرنگ کی آواز سن کر بریگیڈیر سبالڈ (Sibbald) اپنے رسالے کے لاین کی جانب دوڑا۔ ان کے سینے پر سپاہیوں نے گولی ماری وہ وہیں مر گئے۔ (کنھیا لال "محاربہ عظیم": صفحہ ۳۸۹)

اور افسران بھی قتل ہوئے۔ جو افسر اپنی فوج کو تنبیہ کرنے جاتا وہی قتل ہوتا۔

چناں چہ جنرل سبالڈ کو ایک ہندوستانی سوار نے جوان کی اردلی میں تھا شتر خانے کے متصل بندوق سے ختم کیا۔ اور لیفٹیننٹ ٹکر (Tuckar) کو تلنگوں نے سکوت میں مار ڈالا۔ میگزین اور خزانہ شاہی بھی اپنے قبضے میں کر لیا۔ کوٹھیوں اور بنگلوں کا اسباب لوٹ کر آگ لگا دی۔ (ایضاً: صفحہ ۳۸۸) اس کے فوراً بعد میکنزی نے جو آٹھویں رسالے کا انچارج تھا اس نے اپنے آدمیوں کو وفادار رہنے کی تلقین کی۔ تبھی پیادہ پلٹن کے درمیان سے اپنے ''دین'' کے تحفظ کی آواز بلند ہوئی۔ سبز جھنڈا لہرایا گیا۔ کمشنر الیگزینڈر اور جے گتھری مجسٹریٹ تقریباً تیس آدمیوں کے ساتھ سوار ہو کر نینی تال روانہ ہو گئے ❶۔

خان بہادر خاں نے حکومت سنبھالتے ہی ایک جنگی کونسل قایم کی۔ شوبھا رام دیوان ریاست اور خصوصی اپیل افسر مقرر ہوئے۔ نیاز محمد خاں جنرل بنائے گئے۔ مدار علی خاں سپہ سالار مقرر کیے گئے۔ مولوی خاں افسر کمپو بنائے گئے۔ منشی فرحت اللہ بخشی فوج اور شہر کوتوال اکبر علی خاں مامور ہوئے۔ شاہ جہان پور کی نظامت نظام علی خاں کو اور بدایوں کی نظامت عبدالرحمٰن کو تفویض ہوئی۔ مراد آباد میں نواب مجو خاں، نواب محمود خاں بجنور، نواب کلن خاں آنولہ میں نظامت کے فرایض انجام دینے لگے۔

نواب نے تقریباً تیس ہزار فوج جمع کی۔ چالیس توپیں مہیا کیں۔ اسلحہ فیکٹری قایم کرنے کا فرمان جاری ہوا۔ نواب نے ٹکسال بھی قایم کیا۔ خان بہادر خاں کی مہر پر یہ الفاظ کندہ تھے ''الحکم للہ والملک للہ'' خان بہادر خاں نے انگریزوں کے خلاف متحدہ محاذ قایم کرنے کی غرض سے جنگ آزادی کے بیشتر رہنماؤں سے مثلاً نانا راؤ، سید احمد شاہ، دلاور جنگ، فیروز شاہ، نواب تفضل حسین خاں والی فرخ آباد وغیرہم

---

❶ جب یہ لوگ بہیڑی پہنچے تو ان کو جلے ہوئے بنگلے ملے۔ بہیڑی کے پیش کار سے خزانہ طلب کیا۔ اس نے روپیہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ ناچار آگے بڑھ گئے۔ پلٹن نمبر ۸ کے چند وفادار سپاہی اور بدر الدین کوتوال ساتھ تھا۔ (Gazelteer Barreilly, P. 173) بدر الدین کمشنر کے ہمراہ نینی تال پہنچا اور اخیر تک وہیں مقیم رہا۔ انگریزوں کی فتح کے بعد بریلی آیا اور آنولہ کا تحصیل دار مقرر ہوا۔ (سر سید احمد خاں ''لائل محمڈنس'' حصہ سوم، میرٹھ، ۱۸۶۱ء)

سے برابر خط و کتابت رکھی اور دامے درمے قدمے معاون رہے۔

(شان دار ماضی: جلد۴، صفحہ ۳۲۸)

نانا راؤ پیشوا نے بٹھور سے اپنے بھائی ملہار راؤ کو نواب سے تعلقات پیدا کرنے کے لیے بھیجا۔ جنرل بخت خاں کے ہمراہ نواب خان بہادر خاں نے ملہار راؤ کو اپنا سفیر بنا کر دہلی بہادر شاہ ظفر کے پاس روانہ کیا۔ ان کے ساتھ ایک ہاتھی، ایک کوتل گھوڑا جس پر چاندی کا ساز و سامان تھا اور ایک سو طلائی اشرفیاں بھیجیں۔ بادشاہ کے سامنے جب جنرل بخت خاں نے یہ تحفے پیش کیے اور بریلی کے حالات سنائے تو بادشاہ بہت مسرور ہوئے اور نواب خان بہادر خاں کو روہیل کھنڈ کا گورنر مقرر کیا اور خلعت سرفرازی و خطاب نواب انتظام الدولہ، محافظ الملک تنویر جنگ رئیس اعظم روہیل کھنڈ عطا کیا۔ (مقدمۂ بہادر شاہ ظفر: خواجہ حسن نظامی بہ حوالہ ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا از امداد صابری۔ دہلی، ۱۸۵۹ء: ص ۳۵۱)

۲۱ ر جون کے اس فرمان سے اپنے ہاتھ مضبوط ہونے کے بعد خان بہادر خان نے ایک جہاد نامہ روہیل کھنڈ کے اضلاع میں تقسیم کرایا۔ منشی ذکاء اللہ نے اس جہاد نامے کا ذکر مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے:

> ''خان بہادر خاں نے شیخی بھرا اشتہار دے دیا کہ انگریز بڑے جھوٹے، دغا باز اور ہندو مسلمانوں کے مذہب غارت کرنے والے جاگیروں کو ضبط کرنے والے ہیں۔''

روہیل کھنڈ کے اضلاع بریلی، بدایوں، شاہ جہان پور اور پیلی بھیت پر تو باقاعدہ خان بہادر کی حکومت قایم ہوگئی۔ مگر روہیل کھنڈ کے باقی اضلاع مراد آباد بجنور وغیرہ پر اگرچہ باقاعدہ خان بہادر خاں کی حکومت قایم نہ ہوئی مگر ان اضلاع کے مجاہدین انقلابیوں اور تحریک کے سربرآوردہ حضرات سے خان بہادر خاں کے تعلقات بہت اچھے رہے۔ اور ان علاقوں میں جن قدیم رؤسا نے حکومت قایم کی نواب خان بہادر نے اپنا استحقاق جتا کر ان کے لیے قطعاً کوئی دقت پیدا نہیں کی۔

(محمد ایوب قادری ''جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ واقعات و شخصیات'' مذکرہ: صفحہ ۱۴۶)

مالیہ وصول کرنے کے لیے خان بہادر خاں نے با قاعدہ تحصیل دار مقرر کیے۔
خان بہادر خاں کا عہد جو تقریباً سال بھر رہا اس میں عوام خوش وخرم تھے۔ مکمل امن وامان تھا۔ گلی کوچوں میں رونق تھی۔ مسجدیں، مسافر خانے اور سڑکیں تعمیر ہوتی تھیں۔ ہر چیز سستی تھی۔ مجاہدین کے غول کے غول زرہ بکتر سے لیس ہو کر شہر میں گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلتے تھے اور ''اسلام کا بول بالا فرنگی کا منہ کالا'' کے نعرے لگاتے تھے۔(العلم، کراچی، جنگ آزادی نمبر، اپریل تا جون ۱۹۸۵ء)

خان بہادر خاں کو اپنے ابتدائی ایام میں مسلمانوں و ہندوؤں کا کامل اعتماد ملا۔ ٹھاکر جیمل سنگھ، رگھوناتھ سنگھ آف بدھیلی اور ٹھاکران شیوگڑھ اور نگریا سادات نے کامل اتحادِ عمل سے کام لیا۔ رگھوناتھ سنگھ کو خان بہادر خاں نے راجا کا خطاب دیا اور پرگنہ فرید پور کا انچارج بنا دیا[1]۔ ٹھاکر جیمل سنگھ کو کلکٹر کا عہدہ دیا گیا اور ایک ہزار رُپے ان کی تنخواہ مقرر کی گئی۔(شان دار ماضی، متذکرہ: صفحہ ۳۲۷)

خان بہادر خاں نے سب سے زیادہ توجہ فوجی انتظامات پر دی اور وار کونسل قایم کی۔ مواضعات نگریا پٹی اور بھگوتا پور کے میواتیوں کی فوج تیار کی۔ کیارہ کا جے مل سنگھ خاں بہادر خاں کا بہت مددگار تھا۔ اس کی کمان میں جنگھارہ ٹھاکروں کی ایک رجمنٹ تیار کرائی۔

ان کی فوج کے متعلق ظہیر دہلوی نے مکمل تفصیلات مہیا کی ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق پچاس ہزار گھوڑ سوار بریلی میں موجود تھے۔ جس میں تقریباً تیس ہزار رام پور سے آئے تھے۔ بریلی میں مفرورین کا اجتماع ہے اور سب سردار نانا راؤ، فیروز شاہ وغیرہ جمع ہیں۔ رام پور کے تیس ہزار آدمی بریلی میں ملازم ہیں۔ اور مردان رام پور کا یہ حال ہے کہ ایک ایک تھان دوپٹہ کا سر سے بندھا اور آدھا گھوڑے کی رکاب سے لٹکا ہوا ہے۔ اور چار چار طمنچے کمر میں لگے ہوئے ہیں۔ دوہری تلواروں میں ڈاب لگی ہوئی ہے۔ گھوڑوں پر سوار ہیں اور شہر میں گھوڑے کداتے پھرتے ہیں۔ پچاس ہزار کا اجتماع بریلی میں ہے۔(ظہیر بریلوی ''داستان غدر'': صفحہ ۱۸۷-۱۸۸)

---

[1] رگھوناتھ سنگھ بعد میں انگریزوں سے مل گیا۔

اقتدار سنبھالتے ہی خان بہادر خاں کو بدحالی کے رگھو بیر سنگھ کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا جو دبا تو ضرور دی گئی لیکن راجپوتوں سے ان کی ٹھن گئی۔

دوسرا واقعہ بدقسمتی سے شوبھا رام اور سادات نومحلہ کے درمیان شدید اختلاف کا ہوا۔

خان بہادر خاں کو ہندو مسلم اتحاد کی قیمت کا بہ خوبی اندازہ تھا۔ شوبھا رام ان کے انتہائی با اثر عہدہ داروں میں سے تھے۔ شوبھا رام بڑی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ لیکن اس پر انگریزوں سے ساز باز کا شبہ تھا۔ سادات نومحلہ اور سید معصوم پیرزادہ (جو حافظ رحمت خاں والی روہیل کھنڈ کے پیر کی اولاد میں سے تھے) دیوان شوبھا رام سے ناراض ہو گئے اور اس کے گھر پر حملہ کر دیا۔ لیکن خاں بہادر نے تحمل سے کام لیا اور اپنے بزرگوں کے پیر کے گھرانے تک کی رائے کو رد کر کے دیوان کو بحال رکھا۔

ہندوؤں سے مصالحت کی پیش نظر خان بہادر خاں نے گائے کی قربانی بند کرنے کی پیش کش بھی کی۔ اگر ہندو انگریزوں کو قتل کرنے کے لیے آگے آئیں گے تو مسلمان اسی وقت سے ذبیحہ گاؤ کو بند کر دیں گے۔

(Foreign Secret Consultations Nos. 22,23,30, April, 1858)

اس اتحاد کو ناکام بنانے کی خاطر ہر ممکن کوشش کی گئی۔ مثلاً ۱۸۵۷ء کے آخری مہینوں میں انگریز حکام نے ایک ہندو بغاوت کی منصوبہ بندی کی جس کے لیے پچاس ہزار رُپے کی رقم مختص کی گئی۔ لیکن خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔ کیپٹن گووان نے اپنے خط مورخہ ۱۴ر نومبر ۱۸۵۷ء میں اس کا اعتراف کیا ہے۔

(Surendra Nath Sen: "Eighteen Fifty Seven" Page: 352)

خان بہادر خاں کو سخت مشکلات بھی درپیش تھیں۔ لہٰذا رعایا پر عشر قایم کیا گیا۔ مفتی عنایت احمد کاکوروی اور مولوی امانت حسین نے فتویٰ دیا اور پنڈت اوجھر تیغ ناتھ نے بھی تائیدی تحریر لکھی۔ بریلی کے بہت سے مہاجن انگریزوں سے مل ہوئے تھے اور ان کو رُپیہ اور خبریں نینی تال بھیجتے تھے۔ اس لیے انقلابی ان پر شدت کرتے تھے۔ چنانچہ خاص طور پر مہاجن ان سے ناراض تھے۔

خان بہادر خان ناظم روہیل کھنڈ

باب سوم:

دارالحکومت بریلی اور اس کا نظام سیاسی

حکمراں یا والی روہیل کھنڈ

خان بہادر خان

(۱)

غلام رسول مہر

خان بہادر خان ابن ذوالفقار علی (ابن حافظ الملک حافظ رحمت خان) کی تاریخ پیدائش ۱۲۰۵ھ بتائی جاتی ہے یعنی ۹۱-۱۷۹۰ء۔ اگرچہ خاندانی ریاست مٹ چکی تھی، تاہم امیری کے آثار باقی تھے، انھیں کی آغوش میں تربیت ہوئی، وقت کے رواج کے مطابق تعلیم پائی اور بریلی میں صدر الصدور کے عہدے پر مامور رہے، ملازمت مدت پوری کر کے پنشن لی۔ ۱۸۵۷ء میں ان کی عمر تقریباً ستر سال کی ہو چکی تھی۔

۱۸۵۷ء:

میرٹھ میں سپاہ کی سرکشی کا حال معلوم ہوتے ہی مختلف مقامات پر ہنگامے کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ چناں چہ ۳۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو بریلی سے سلسلہ شروع ہوا، پھر شاہ جہان پور، بدایوں اور مراد آباد میں بھی انگریزی اقتدار ختم ہو گیا۔ خان بہادر خاں اس خاندان میں سے تھے، جو پہلے روہیل کھنڈ کا مالک رہ چکا تھا۔ اپنی عمر اور نام وری کے لحاظ سے بہت معزز سمجھے جاتے تھے اور چوں کہ ساری زندگی سرکاری ملازمت میں گزاری تھی اس لیے نظم ونسق کا تجربہ بھی انھیں خاصا تھا۔ انھیں اوصاف کی بنا پر ان کی حکمرانی کا اعلان ہو گیا۔ انگریز سب کچھ چھوڑ کر نینی تال چلے گئے۔

دوسری روایت:

مفتی انتظام اللہ خاں (شہابی) فرماتے ہیں کہ بریلی کے کمشنر الیگزانڈر صاحب نے خود خان بہادر خاں کو بلا کر کہا تھا کہ آپ انتظام سنبھال لیں، ہم آپ کو مسند نشین کرتے ہیں۔ خان بہادر نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ میں ضعیف العمر ہوں اور اس بار کو سنبھال نہیں سکتا۔

جب کمشنر نینی تال چلا گیا اور ضلع بے سردار رہ گیا تو جنرل بخت خان نیز فوجی افسروں اور عمایدِ شہر نے متفق ہو کر خان بہادر خاں کو روہیل کھنڈ کا نواب منتخب کیا۔ بہادر شاہ نے انتظام الدولہ محافظ الملک خان بہادر خاں ہزبر جنگ کے خطابات عطا کیے [1]۔

نظم ونسق:

جنرل بخت خاں دہلی چلے گئے، اس لیے کہ مرکز کو تقویت پہنچانی لازم تھی اور نتیجتاً وہاں قابل وکاروان سپہ سالار کی اشد ضرورت تھی۔ خان بہادر خاں کے نظم ونسق کی کیفیت یہ بتائی گئی:

نام	عہدہ
سوبھارام	دیوان ریاست
نیاز محمد خاں	جنرل
مدار علی خاں	سپہ سالار
مولوی خاں	افسر کمپو
عبدالرحمٰن خاں رام پوری	ء
منشی فرحت اللہ	بخشی فوج
اکبر علی خاں	کوتوال شہر
نظام علی خاں	نظامت شاہ جہان پور

[1] غدر کے چند علما: صفحہ ۳۸-۱۳۶، سید الطاف علی صاحب نے ہزبر جنگ کی جگہ تنویر جنگ لکھا ہے۔

فتح علی شاہ	نظامت بدایوں

(غدر کے چند علما: صفحہ ۳۸-۱۳۶)

عام کیفیت:

خان بہادر خاں نے شہروں اور اضلاع کا انتظام درست کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی، لیکن انگریزوں کا بیان یہی ہے کہ علاقے کی تمام بستیوں نے خان بہادر خان کی حکومت تسلیم نہ کی اور فرقہ وار کش مکش بھی شروع ہوگئی، اس لیے کہ مسلمان ہندوؤں پر سختیاں کرتے تھے اور ہندوؤں کی آرزو یہ تھی کہ جلد سے جلد انگریز واپس آجائیں۔

خدا جانے یہ بیانات کن اطلاعات پر مبنی ہیں۔ جس شخص نے دیوانی کا عہدہ ایک ہندو کارکن کے حوالے کردیا تھا۔ اس پر فرقہ وار کش مکش پیدا کرنے کا الزام لگانا سراسر ناقابل فہم ہے، واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ انگریزوں سے متعلق تھے اور ان کے کارندوں کی حیثیت میں کام کررہے تھے، ان پر یقیناً سختیاں ہوتی تھی، خواہ وہ ہندو تھے یا مسلمان، لیکن مذہبی اختلاف کی بنا پر سختیوں کا بیان سراسر افسانہ بافی کا کرشمہ ہے۔

جنگ بریلی:

خان بہادر خاں نے تقریباً ایک سال حکومت کی۔ مئی ۱۸۵۸ء میں کالن کیمبل شاہ جہان پور کو فتح کرتا ہوا بریلی آیا۔ مراد آباد کی طرف سے بریگیڈیر جونز فوج لے کر آرہا تھا، میلی سن نے لکھا ہے کہ خان بہادر خاں نے بچ نکلنے کا فیصلہ کرلیا، لیکن حافظ رحمت خاں کے اخلاف کی رگوں میں جو گرم روہیلہ خون موجزن تھا، وہ کبھی گوارا نہ کرسکتا تھا کہ دشمن سے مقابلے کیے بغیر کنارہ کشی اختیار کرلی جائے۔ چناں چہ خان بہادر خان نے ۴ رمئی کو اپنی فوج جنگ کے لیے آراستہ کی۔ اس نے نکتیا ندی سے گزر کر ایک اونچے مقام پر توپیں نصب کیں اور پیادہ فوج کے دونوں بازوؤں پر رسالے کے پرے جمائے۔ ۵ رمئی کو بڑے گھمسان کا رن پڑا۔ کالن کیمبل کے پاس رسالہ زیادہ تھا، اس لیے وہ کامیاب ہوتا نظر آیا۔

غازیوں کی ترکتازی:

خان بہادر خاں کی فوج میں ایک جیش غازیوں کا بھی تھا جو حلف اُٹھا چکے تھے کہ خود مریں گے اور دشمن کو ماریں گے۔ جب تک زندگی کی رمق باقی ہے، تلوار چھوڑیں گے اور نہ پیچھے ہٹیں گے، عین اس موقع پر اس جیش نے حملہ کیا، عینی شاہد کا بیان ہے کہ وہ بڑے وجیہ تھے، جوانی ڈھل چکی تھی اور بڑھاپا شروع ہو چکا تھا، ڈاڑھیوں کے بال سفید ہو رہے تھے، سبز رنگ پگڑیاں اور سبز رنگ کے کمر بند باندھ رکھے تھے۔ ہاتھوں میں چاندی کی انگوٹھیاں تھیں، جن پر آیات نقوش تھیں۔ وہ گھوڑوں پر سوار بجلی کی تیزی سے حملہ کے لیے آئے، سر نیچے کر رکھے تھے اور انھیں ڈھالوں سے چھپا رکھا تھا۔ تلواریں بلند تھیں۔ ''دین، دین'' پکار رہے تھے [1] اور اس گاؤں پر حملہ آور ہوئے جہاں پنجابی سکھوں کا لشکر جما بیٹھا تھا۔ سکھ اس سیل میں سامنے خس و خاشاک کی طرح بہ نکلے۔ پھر غازی گھا گرا پلٹن پر جا گرے۔ میلی سن کہتا ہے کہ ان میں سے ایک بھی واپس نہ ہوا۔ سب نے میدان جنگ ہی میں جانیں دے دیں، تین غازی بریگیڈیر کیمرون (Cameron) پر جا گرے اور اُسے گھوڑے سے کھینچ کر نیچے گرایا۔ اس کی موت میں کوئی شبہ باقی نہ رہا تھا عین وقت پر دو غازی سنگین سے شہید ہو گئے اور ایک گولی سے۔ اسی طرح بریگیڈیر وال پول کی جان بڑی مشکل سے بچی۔ (میلی سن: جلد چہارم، صفحہ ۶۹-۳۶۸)

ایک اور چال:

اب بہ ظاہر انگریزوں کی کامیابی میں کوئی شبہ نہ رہا تھا لیکن یکا یک کالن کیمبل نے اپنی فوج کو ٹھہر جانے کا حکم دے دیا، کیوں؟ اس وجہ سے کہ غازیوں کی ترکتاز سے فایدہ اُٹھا کر خاں بہادر خاں کے رسالے نے انگریزی فوج کے میسرے کا چکر کاٹا اور

---

[1] انگریز مورخوں کے بار بار ''دین دین'' کے نعرے کا ذکر کیا ہے۔ مسلمانوں میں ایسا کوئی نعرہ مروج نہ تھا۔ وہ عموماً تکبیر کہتے تھے، بعض لوگ حضرت علی مرتضیٰؓ کی دلاوری کے جوشِ اتباع میں ''یا علی'' بھی پکارتے تھے۔

وہ فوج کے عقب میں پہنچ گیا تاکہ انگریزوں کا کیمپ اور ساز و سامان لوٹ لے۔ اس سے کیمپ میں شدید خوف و ہراس پیدا ہو گیا اور ہر شخص سراسیمہ وار اُدھر اِدھر بھاگنے دوڑنے لگا۔ اس اثنا میں غازیوں کے ایک اور مختصر جیش نے حملہ کر دیا اور وہ بھی شہادت سے سرفراز ہوئے۔

غرض اس جواں مردانہ مقابلے نے کالن کیمبل کو رک جانے پر مجبور کر دیا۔ ادھر تاریکی کا دور دورہ شروع ہوا ادھر خان بہادر خاں بریلی سے نکل کر پیلی بھیت چلا گیا جو تینتیس میل شمال مشرق میں تھا۔

پوائیں میں ظہور:

مولانا احمد اللہ کی شہادت کے بعد مجاہدوں اور آس پاس کے زمین داروں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ راجا پوائیں کو غداری اور بدعہدی کی عبرت ناک سزا دیں۔ اس موقع پر جہاں نظام علی خاں، نواب تفضّل حسین خان، ولایت شاہ، علی خاں میواتی اور بعض دوسرے مجاہد فوج لے کر جمع ہوئے، وہاں خان بہادر خاں بھی چار ہزار جانبازوں کے ساتھ ان کے ہمراہ تھا، نظام علی خاں اور علی خاں میواتی نے اس سلسلے میں پیلی بھیت پر بھی حملہ کیا۔ (میلی سن: جلد پنجم، صفحہ ۹۲-۱۹۱)

گرفتاری:

۱۸۵۹ء میں کوہستان نیپال کے دامن کی ایک لڑائی میں خان بہادر خاں گھوڑے سے اتفاقیہ گر پڑا اور گرفتار ہو گیا۔ انگریز اُسے لکھنؤ لائے چیف کمشنر کے روبہ روپیش ہوا تو زمین پر بیٹھ گیا کرسی پیش کی گئی تو فرمایا: مدتوں کرسی پر بیٹھے اب قیدیوں کی جگہ بیٹھنا چاہیے، چیف کمشنر نے اسے بہ زور کرسی پر بٹھایا۔

بیان:

جب پرسش شروع ہوئی تو بڑی مردانگی سے فرمایا:

"میں نے ازخود بغاوت پر کمر نہیں باندھی، سرکار انگریزی کی فوج باغی

ہوگئی اور جس ملک کا جو دعوے دار تھا، اس کا رئیس گردانا، بریلی، شاہ جہان پور، پیلی بھیت وغیرہ یعنی کل روہیل کھنڈ ہمارا موروثی ملک تھا۔ اس وجہ سے بخت خان اور جملہ رعایا نے مجتمع ہوکر مجھے مسند نشین ریاست کیا۔ میں نے بلوا نہ کرایا اور نہ کسی انگریز زن و بچہ کو قتل کیا۔ جس وقت آپ صاحبان نے فوج کے ظلم سے مجبور ہوکر ملک چھوڑ دیا، تب میں نے قبضہ کیا۔ باقی بلوائیوں کی روک تھام اس دم میرے اختیار میں نہ تھی، انھوں نے جو چاہا سو کیا۔

بعد ازاں لڑائیاں جا بجا سر میدان میری اور آپ کی فوج کی البتہ ہوئیں۔ ان میں طرفین کا کشت و خون ہوا، اس میں میری کیا خطا؟

عروس ملک کسے در کنار گیر و تنگ
کہ بوسہ برلب شمشیر آب دار بہ زند!

اب آپ کے بس میں ہوں، جو چاہے میری نسبت حکم دیجیے۔"

(تاریخ سلیمانی بہ حوالہ حیات حافظ رحمت خاں ۶۴-۳۶۳)

تبصرہ:

خان بہادر خاں پر بعض انگریزوں کے قتل کا بھی الزام تھا، اس کے جواب میں اس نے جو کلماتِ عذر فرمائے تھے اور جو کچھ کہا تھا وہ یقینی اور قطعی طور پر درست تھا یعنی نواب نے نہ کسی عورت یا بچے کو قتل کرایا نہ کسی انگریز افسر کو بہ طور خود سزائے موت دی۔ سپاہ تمام امور میں اپنے رئیسوں اور حاکموں کی بات مانتی تھی لیکن انگریزوں کے قتل کے متعلق کسی کا حکم شاذ ہی مانا گیا، کیوں؟ اس لیے کہ اول سپاہ کو انگریزوں کے غلط اور جابرانہ طرزِ عمل کے باعث سخت غصہ تھا، دوم انگریز جہاں جہاں کامیاب ہوتے رہے، اس ملک کے باشندوں پر نہایت خوف ناک اور ہول انگیز ظلم کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہی ہوسکتا تھا کہ اہلِ ملک کے سینے انتقام کے جذبات سے بے طرح بھر جاتے اور انھیں انگریزوں کے خلاف کسی بھی کارروائی سے روکنا ممکن نہ رہتا۔ یہی ہوا لیکن جیسا کہ میں بارہا کہہ چکا ہوں اسے افعال قتل کے لیے معذرت نہ سمجھا جائے۔ غلط فعل بہ

ہر حال غلط ہوتا ہے، خواہ اسباب کچھ ہوں۔ تاہم یہ ضرور مان لینا چاہیے کہ جن حالات میں واقعات قتل پیش آئے وہ سراسر غیر معمولی تھے اور اس ضمن میں غیر معمولی اشتعال خود انگریزوں نے پیدا کر دیا تھا۔

پھانسی:

خان بہادر خاں کے لیے پھانسی کی سزا غالباً پہلے سے تجویز ہو چکی تھی۔ پھر انگریزوں کی شقاوت اور سنگ دلی ملاحظہ ہو کہ یہ سزا لکھنؤ میں نہ دی بلکہ خان بہادر خاں کو بریلی لے گئے اور وہاں کوتوالی کے سامنے پھانسی پر لٹکایا۔

آخری وقت میں اُن سے کہا گیا کہ کچھ نصیحت و وصیت کرنی ہو تو کر دیجیے! فرمایا: مجھے کچھ نہیں کہنا، پھر آب دیدہ ہو کر یہ شعر پڑھا:

بہ جرم کلمۂ حق مے کشند غوغا نیست
زمرگ زندگیم مے شود تماشا نیست

چوں کہ اندیشہ تھا کہ مبادا شورش ہو جائے، اس لیے انگریزی فوج اور توپ خانے سے شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی۔

پھانسی کے بعد نعش اس وجہ سے متعلقین کے حوالے نہ کی گئی کہ وہ لوگ باہر دفن کریں گے تو قبر زیارت گاہ عام بن جائے گی۔ ڈسٹرکٹ جیل بریلی ہی میں دفن کرا دیا۔

سید الطاف علی بریلوی کے ایک بزرگ اس موقع پر موجود تھے۔ انھوں نے نعش کو بلا کفن قبر میں رکھتے ہوئے دیکھا تو اپنا رومال مرحوم کے چہرہ مبارک پر ڈال دیا۔ خان بہادر کی مہر پر "الحکم للہ والملک للہ" کے الفاظ کندہ تھے۔

(۱۸۵۷ء و ۱۸۵۷ء کے مجاہد)

خان بہادر خان
(۲)

محمد ایوب قادری

مولانا غلام رسول مہر کے قلم سے خان بہادر خاں کی جنگ آزادی کے سلسلے میں سرگرمیاں اوران کے سیاسی کردار کی ضروری تفصیلات مطالعہ فرمائیں۔لیکن ان کی زندگی کے دیگر پہلوؤں کا تذکرہ باقی رہ گیا۔مثلاً ۱۸۵۷ء سے پہلے کی مصروفیات ان کی تصنیف وتالیف اوران کی شاعرانہ حیثیت کا تذکرہ وغیرہ۔ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم نے اپنی تالیف ''جنگ آزادی ۱۸۵۷ء- واقعات وشخصیات'' کے ایک حاشیے میں یہ تذکرہ کیا ہے۔قارئین کرام کے ذوق کی تسکین کے لیے،ہم یہ حاشیہ یہاں نقل کرتے ہیں تاکہ مطالعے کی تشنگی باقی نہ رہے۔مرحوم قادری صاحب نے لکھا ہے:

> ''نواب خان بہادر خان ابن ذوالفقار خاں ابن حافظ رحمت خاں، کندن لال اشکی کی تحریر کے مطابق ۳۰ راگست ۱۸۱۵ءکوصدرامین مقرر ہوئے ایک مدت تک بریلی میں صدرامین رہے۔اس وقت پنشن یاب تھے۔اس کے علاوہ خاندانی وظیفہ علاحدہ پاتے تھے۔منشی گل زاری لال مؤلف ''تواریخ ضلع بریلی'' نے نواب صاحب کو ۱۸۴۷ء میں ''برگزیدہ خاندان'' لکھا ہے۔نواب صاحب، صاحبِ سیف کے علاوہ صاحبِ قلم بھی تھے۔ان کی ایک کتاب مقاصد الصالحین ہے جو اخلاق وتصوف کے مضامین پر مشتمل ہے۔اب تک یہ کتاب بغیر مصنف کے نام کے شایع ہوتی رہی،نواب خان بہادر خاں کوشعروسخن سے بھی ذوق تھا،مصروف تخلص کرتے تھے۔جرأت کے شاگرد تھےفن خوشنویسی کے بھی ماہر تھے۔''

(ملاحظہ ''منتخب تنقیح الاخبار'' از کندن لال اشکی (طبع لکھنؤ): صفحہ ۱۰۹ وتواریخ ضلع بریلی از منشی گل زاری لال (قلمی) (نیشنل میوزیم آف پاکستان، کراچی)
حیات حافظ رحمت خان از سید الطاف علی بریلوی، کراچی ۱۹۶۳ء: صفحہ ۴۴۳)

خان بہادر خان

(۳)

سید خورشید مصطفیٰ رضوی

دسمبر ۱۸۵۹ء میں جنگ بہادر نے بھٹول کے قریب جنگل سے خان بہادر خاں کو اچانک گرفتار کیا۔ ممو خاں، دیبی سنگھ اور گنگا سنگھ بھی ساتھ ہی گرفتار ہوئے، خان بہادر کو (یکم جنوری ۱۸۶۰ء) بریلی لایا گیا۔ فروری ۱۸۶۰ء میں مقدمہ چلا، گواہ تلاش کر کے لائے گئے اور ہر طرح کے الزامات ثابت کر دیے گئے۔ خان بہادر نے اپنے بیان میں کہا کہ جو گواہ لائے گئے ہیں وہ سب وہ ہیں جن کو کسی بدعنوانی کی بنا پر تنبیہ کی گئی یا ان کے خلاف کارروائی کی گئی یا کسی اور وجہ سے مخالف ہو گئے تھے، انگریزوں کے قتل کے الزامات کو غلط ثابت کیا، دلایل اور واقعات سے رد کیا اور کہا کہ وہ اپنا کیس کسی انگریز وکیل کے ذریعے پیش کریں گے تب تک کے لیے مقدمہ روک دیا جائے ورنہ خونِ ناحق ہوگا (Foreign pol. Cons. 16th March 1860, No. 39 (National Archive New Delhi) لیکن اس کا موقع نہیں دیا گیا دیگر الزامات کے علاوہ یہ بھی الزام تھا کہ ۲۱ر جنوری ۱۸۵۹ء کو بھی ایک اعلان جاری کیا جس میں فتح گڑھ کے عوام سے اپیل تھی کہ وہ متحد ہو کر انگریزوں کو شکست دیں۔ جو خطوط برآمد ہوئے۔ وہ بہادر شاہ، بیگم حضرت محل اور ایک رانی کے نام تھے جس کو بغاوت پر آمادہ کیا گیا تھا۔ وطن کی آزادی کے لیے جدوجہد میں ناکامی کا انجام موت ہے اور یہی انجام خان بہادر کے نصیب میں تھا۔ چناں چہ ۲۴ر مارچ ۱۸۶۰ء بہ روز ہفتہ صبح سات بجے پرانی کوتوالی (بریلی) کے سامنے پھانسی دی گئی۔ تاریخ روہیل کھنڈ (قلمی) مؤلفہ نیاز احمد خاں میں یہ تاریخ یکم رمضان ۱۲۷۶ھ (۲۳ر مارچ ۱۸۶۰ء) بیان کی گئی ہے۔ خان بہادر خاں کے آخری الفاظ یہ تھے:

"یہ سچ ہے کہ میں نے انگریزوں کو قتل کرایا، میں نے اسی مقصد کے لیے جنم لیا تھا میں نے سیکڑوں انگریز کتوں کو ہلاک کیا یہ نیک کام تھا اور مجھے

اس کے حصول میں کامیابی ہوئی۔"

(Freedom Struggle in UP. Vol 5, pp. 596-614, 183)

قیصر التواریخ میں ہے کہ کرنل بیرو نے پوچھا:

تم نے مدت تک سرکار کا نمک کھایا، اس سنِ پیری میں کیوں ایسی بغاوت کی؟"

خان بہادر نے بہادری کا بھرم رکھ کر جواب دیا:

"تم نے ہمارا آبائی ملک چھین لیا تھا۔ جب تم بھاگے تمہارے باغیوں نے ہمیں مستحق ریاست سمجھ کر حاکم کر دیا ہم اسے عنایتِ خدا سمجھے کہ اپنے حق کو پہنچے......"

غرض یہ کہ نواب اور کمشنر سے خوب تقریر ہوئی۔ جب کمشنر خاموش ہو گیا تو نواب خان بہادر نے کہا: "اب دیر لگانا کیا ضروری ہے ❶۔"

(قیصر التواریخ: جلد۲، صفحہ ۳۶۹)

سرکاری کاغذات کے بہ موجب خان بہادر کو پرانی کوتوالی میں دفن کیا گیا جب کہ ایک روایت کے بہ موجب ڈسٹرکٹ جیل میں کیا گیا، کہا جاتا ہے کہ جیل کے پہلے اور دوسرے پھاٹک کے درمیان حصے میں دفن ہے لیکن صحیح جگہ معلوم نہیں۔ خان بہادر کی رہائشی عمارتیں (بھوڑوں کا محلہ) مسمار کر دی گئیں یہ علاقہ "کھیڑہ خان بہادر" کے نام سے مشہور رہا۔ خان بہادر کی عمر بعض جگہ ساٹھ سال کے لگ بھگ اور بعض جگہ اسّی سال بیان کی گئی ہے لیکن چوں کہ وہ بریلی میں صدر امین تھے اس لیے ساٹھ سال زیادہ قرین قیاس ہے۔ بعض بیانات میں ضعیفی کے باوجود طاقتور اور شاندار شخصیت بتایا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ اور مصروف تخلص تھا "مقاصد الصالحین" تصنیف بتائی جاتی ہے۔ (ملخصاً) (رسالہ العلم کراچی جنگ آزادی نمبر: (اپریل تا جون ۱۹۵۷ء مصطفیٰ علی بریلوی، خان بہادر خان شہید)

---

❶ کہا جاتا ہے کہ پھانسی کے وقت یہ شعر پڑھا:

بہ جرم کلمہ حق می کشند غوغائیست ۔۔۔ نہ مرگ زندگیم می شود تماشائیست

خان بہادر خاں کے دو بیٹے جہان بہادر (لاولد) اور جان بہادر تھے۔ جان بہادر کے یار محمد اور احمد بہادر دو بیٹے ہوئے۔ یار محمد کے تین بیٹے یاور محمد (مقیم لاہور) دوست محمد اور دست گیر محمد مسعود ہوئے اور احمد بہادر کے سلیم بہادر (مقیم راول پنڈی) اور کلیم بہادر (مقیم بریلی) ہوئے۔ دوسرے عزیزوں میں ظفر یار خاں نے بغاوت میں حصہ لیا۔ خان بہادر کے عزیز وغیرہ انھی کی نگرانی میں رہے۔ ظفر یار کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ اپیل پر رہائی ہوگئی۔ ظفر یار کے بیٹے حشمت یار اور رفعت یار تھے۔ حشمت یار خاں کے بیٹے شوکت یار خاں ہیں جن کے بیٹے عثمان خاں ہیں۔ نواب خاں بہادر کے کم سن بیٹے جان بہادر اور بیوی ممتاز محل ضلع شاہ جہان پور کے مقام کھیڑی میں پوشیدہ رہے۔ جان بہادر نے نواب رام پور سے ملازمت چاہی مگر ناکامی ہوئی تو گوالیار پولیس میں ملازمت کی، مخبری پر برخاست ہوئے ۱۹۱۹ء میں انتقال ہوگیا۔

(العلم جنگِ آزادی نمبر ۱۹۵۷ء، تاریخ جنگ جنگ آزادی ہند، ۱۸۵۷ء: صفحہ ۴۹-۶۴۶)

باب چہارم:

بریلی میں انقلابی حکومت کا قیام

جے ایف ڈی انگلس کی کتاب "بریلی میں رونما ہونے والے واقعات" سے اقتباس

مورخہ ۳۰ر نومبر ۱۸۵۸ء

دہلی کے بادشاہ کی ہندوستان کے حکمران کے طور پر منادی:

۳۱ رمئی ۱۸۵۷ء: خان بہادر خان نے تقریباً چار بجے شام کو مبارک شاہ خان، احمد شاہ خان اور اپنے کئی ایک حمایتیوں کے ساتھ شہر (بریلی میں) ایک جلوس نکالا۔ ہاتھیوں کے آگے آگے لوگ چلتے ہوئے نعرے لگا رہے تھے کہ انگریز کا راج ختم ہو گیا ہے، اور دہلی کا بادشاہ اب ہندوستان کا آزاد حکمران ہے۔ لوگوں کو یہ ہدایت دی جارہی تھی کہ وہ اپنے گھروں کو واپس آئیں اور اپنی دکانیں کھولیں۔ (جو صبح سے بند پڑی تھیں) نواب گنج (1) کے تحصیل دار فضل حق، تھانے دار جعفر علی اور سرکاری عملے کے کئی دوسرے لوگ اسی روز آئے اور خان بہادر خان کی اطاعت قبول کی۔

خان بہادر خان کی طرف سے ضروری اقدامات:

پہلی جون کی صبح، خان بہادر نے احکام جاری کیے کہ سارا عملہ کوتوالی میں حاضر ہو اور اپنے غصب کیے ہوئے اختیار کی بحالی کے کاموں میں اپنا فرض ادا کرے۔ سب سرکاری ملازمین کو حکم جاری کیا گیا کہ وہ اپنے عہدے پھر سے سنبھال لیں اور اپنا کام جاری رکھیں، انکار کی صورت میں سزا کے لیے تیار رہیں۔

دربار کا وقت دوپہر دو بجے مقرر کیا گیا، اور شہر کی تمام اہم شخصیات کو دربار میں

(1) نواب گنج پرگنہ و تحصیل ضلع بریلی، مغرب میں ایک چھوٹا سا شہر ہے جو پہلے بجوریا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہ بریلی کے شمال مشرق میں کوئی ۱۸ میل کے فاصلے پر ٹھیک اس جگہ واقع ہے، جہاں سے پنکیلی کو پکی سڑک کاٹتی ہوئی گزرتی ہے۔ (ڈسٹرکٹ گزیٹیر بریلی: جلد ۱۳، ۱۹۱۱ء، صفحہ ۲۴۶)

حاضر ہونے کا حکم دیا گیا۔ یہ کام کوتوال کو سونپا گیا۔ شہر میں دربار لگانے کے بعد خان بہادر خان، مبارک شاہ خان، احمد شاہ خان، اکبر علی خان، شوبھا رام اور بہت سی دوسری اہم شخصیات بھی آئیں اور ہاتھیوں پر سوار ہوئے، جب کہ ہاتھیوں کے آگے پیدل اور گھوڑوں پر سوار ایک بڑے ہجوم کے ساتھ، چھاؤنی کی طرف روانہ ہوئے تا کہ بخت خان، محمد شفیع اور باغی گروپوں کے دیگر رہنماؤں سے ملاقات کر کے مبارک باد دے دیں۔

کلکٹر کی کچہری کے نزدیک چھاؤنی کے کنارے ان کی آمد پر، سپاہیوں نے ان پر گولی چلا دی، کیوں کہ ان کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کیوں آئے ہیں۔ تب خان بہادر خان ہودے میں کھڑے ہو گئے اور اپنا رومال ہلا کر انھیں محسوس کروایا کہ وہ ان کے دشمن نہیں ہیں۔ کچھ دیر کے بعد بخت خان کی طرف سے اسے ایک پیغام بھیجا گیا کہ اسے اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ شہر کے بپھرے ہوئے لوگوں کے ساتھ چھاؤنی میں داخل ہو جائیں۔ اگر وہ چاہیں تو اپنے کچھ اہم ساتھیوں کے ساتھ آسکتے ہیں۔ اس پر ہجوم کو واپس بھیج دیا گیا اور خان بہادر خان اپنے ساتھیوں مبارک شاہ خان، احمد شاہ خان، مدار علی خان، کرامت خان اور شوبھا رام کے ساتھ بخت خان سے ملاقات کے لیے آگے گئے، گیارہ توپوں کی سلامی سے ان کا استقبال کیا گیا۔ بخت خان پہلے تو بڑی سرد مہری سے ان سے ملے اور ایک ہزار رُپے نذرانہ بھی قبول کرنے سے انکار کیا، لیکن احمد شاہ خان کے اصرار پر لے لیا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر خان بہادر خان فوجی عہدیداروں کے لیے تحائف وہیں رکھ کر وہاں سے روانہ ہوئے۔

انتظامی اجلاس:

شہر میں اپنے گھر پہنچنے کے بعد، خان بہادر نے مدار علی خان، مبارک شاہ خان اور کرامت خان پر مشتمل ایک اجلاس منعقد کیا تا کہ شہر اور ضلع میں امن کی بحالی کے سلسلے میں غور و فکر کیا جاسکے۔ ضلع بھر سے آنے والی رپورٹوں کی وجہ سے وہ اس معاملے پر توجہ دینے پر مجبور ہوئے تھے۔ پورے ضلع میں ہر طرف لاقانونیت پھیل گئی ہے اور

تشدد کے واقعات رونما ہو رہے ہیں۔

فوجیوں کی بغاوت کی خبر پورے علاقے میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ جہاں کہیں یہ خبر پہنچی، تو لوگ اٹھ کھڑے ہوئے، انگریز سرکار کے خلاف اتنا نہیں، (جیسا کہ کسی بھی حکومت کے خلاف ہوتا ہے) جتنا کہ اپنی ذاتی دشمنی کا بدلہ لینے کے لیے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے اور ایک دوسرے کی زمین پر زبردستی قبضہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ جہاں وہ سمجھتے تھے کہ یہ زمین ان کا حق ہے۔

ہونے والے واقعات میں سے ایک واقعے کی مثال یہ ہے کہ اُکا (Akka) کے ٹھاکروں کا آپس میں کسی دیوار پر تنازع ہوا، اس مسئلے پر اُن کی آپس میں لڑائی ہو گئی تھی اور انھیں قید میں بھی جانا پڑا۔ انھیں اس بغاوت سے پہلے رہائی ملی تھی۔ بغاوت پھوٹ پڑنے والے دن ایک پارٹی نے جو خود کو زخم خوردہ سمجھتی تھی، مخالف پارٹی پر حملہ کر دیا اور ان کے رئیس کے چار بیٹوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، باپ کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ ڈالے اور باپ کی لاش کو بھی چاروں بیٹوں کی لاشوں کے ساتھ ایک گاڑی میں ڈالا اور ان سب کو رام گنگا میں بہا دیا۔

شوبھا رام کا بہ حیثیت دیوان تقرر:

کافی بحث مباحثے کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ خان بہادر کے ماتحت ایک دیوان مقرر کیا جائے، جس کا کام ضلع کی پولیس اور ریونیو کی نگرانی کرنا ہو، مدار علی خان کے اثر و رسوخ کے ذریعے سے شوبھا رام کو دیوان مقرر کرنے کا فیصلہ کیا گیا، اس نے انگریز سرکار کی فوجی ملازمت میں رہ کر جو معلومات اور تجربہ حاصل کیا تھا اس سے اس کے اثر رسوخ میں اضافہ ہوا اس نے اپنی ذمے داری کی ادائیگی میں فایدہ اٹھایا۔

خان بہادر کی طرف سے انتظامی تقرریاں:

۲ر جون کی صبح کو شوبھا رام دربار میں حاضر ہوئے۔ انھیں خان بہادر کی طرف سے دیوان مقرر کیا گیا، اس کی تنخواہ یہ مقرر ہوئی کہ جو کچھ سرکاری اخراجات میں سے

بچے گا اس میں سے اسے حصہ دیا جائے گا، اسی وقت اور تقرریاں بھی ہوئیں، مدار علی خان اور نیاز محمد خان کو ایک ایک ہزار ماہانہ تنخواہ کے ساتھ جنرل کے طور پر مقرر کیا گیا، مولوی خان کو کمیدان مقرر کیا گیا اور اسے شاہی پرگنہ ❶ کی زمین دے دی گئی، مول چند کو ۵۰۰ رُپے ماہوار پر شوبھارام کا نایب مقرر کیا گیا، شوبھارام کے بیٹے ہوری لعل کو ایک ہزار ماہوار پر پے ماسٹر مقرر کیا گیا، مدار علی خان کے بیٹے علی حسین خان کو ۵۰۰ رُپے ماہوار پر رسالے کا کمانڈنٹ مقرر کیا گیا۔ دین دیال کو جو سڑکوں کا سپرنٹنڈنٹ تھا دو سو رُپے ماہوار پر ہتھیاروں کی فاؤنڈری کا داروغہ بنایا گیا۔

سیف اللہ خان، جو جیلر تھے، انھیں ۵۰۰ رُپے ماہوار پر جیلوں کا سپرنٹنڈنٹ بنایا گیا، اس کے علاوہ کئی ایک نچلے درجے کی تقرریاں بھی کی گئیں، جس شخص نے بھی ۵۰ یا ۱۰۰ لوگوں کو لانے کا وعدہ کیا اسے کمیدان مقرر کیا گیا۔ اودھ کے بادشاہ کے سابق درباری گویے رضاء الدولہ کو جو بریلی میں مقیم تھا خان بہادر خان کا اے ڈی سی اور تقریبات کا منتظم مقرر کیا گیا، اودھ کی دربار میں اس نے جو تجربہ حاصل کیا تھا اس سے وہ ان کاموں میں ماہر ہوگیا تھا، اس نے سارے استقبالیے اور دربار کا انتظام رکھا، اس نے مشورہ دیا کہ دہلی کے بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو فوری طور پر خان بہادر کی طرف سے ایک عرضی لکھ کر انھیں بتایا جائے کہ انھوں نے اب تک کیا کام انجام دیے ہیں۔ اور ناظم کٹھیر کی تقرری کی ان سے درخواست کی جائے، چناں چہ رضاء الدولہ نے عرضی لکھی جو بادشاہ کو بھیجی گئی۔

بہ حیثیت دیوان شوبھارام کا کردار:

شوبھارام ایک مال دار اور صاحب حیثیت شخص تھا۔ اس نے بغاوت کے چوتھے یا پانچویں دن باغی خان بہادر کے گروہ میں شمولیت اختیار کی تھی۔ ایسا کوئی

---

❶ شاہی ضلع بریلی کی تحصیل میرگنج کا ایک پرگنہ تھا۔ یہ چھوٹا سا شہر مغربی بہگل کے بائیں کنارے پر اسی سڑک پر آباد تھا جو سانگھا پلی سے مراد آباد کے شیش گڑھ کو جاتی ہے۔

(ڈسٹرکٹ گزیٹیر بریلی: جلد ۱۳، ۱۹۱۱ء، ص ۲۴۶)

عدالتی ثبوت میسر نہیں ہوا ہے کہ اس نے ۳۱ رمئی سے پہلے خان بہادر سے کوئی تعلق پیدا کیا ہو، نہ کسی ایسی بات کا کوئی ثبوت موجود ہے کہ اس کی حاضری دربار میں لازمی تھی۔ چوں کہ اس نے بغاوت پھوٹ پڑنے کے چار یا پانچ دن بعد تک باغی گروپ میں شمولیت اختیار نہیں کی تھی، لہٰذا اس کا انگریزوں کے قتل میں ملوث ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہیں تھا۔

انقلابی حکومت میں شوبھارام کی اعلا حیثیت:

شوبھارام صاف طور پر اپنی دولت کے اثر اور اپنی انتظامی صلاحیت کے زور پر باغی گروہ میں شامل ہوگیا۔ اس نے نہایت سرگرمی کے ساتھ انتظامیہ کو چلانے میں حصہ لیا اور انقلابی حکومت میں اپنی جگہ پیدا کرلی۔ اس نے ریونیو کلکٹر مقرر کیے اور ریونیو وصولی کے انتظام کو درست کیا۔ ریونیو میں اضافے کی راہ نکالی۔ بیسل پور کا علاقہ فارم کے لیے ٹھیکے پر دے دیا، اور اپنے ایک رشتے دار کو شراب، دیگر منشیات وغیرہ آب کاری اکا ساٹھ رُپے یومیہ پر ٹھیکہ دے دیا۔ انتظامیہ کے دفتری نظام میں اتنی دل چسپی لی اور ایسا اعتماد پیدا کیا کہ کاموں کے اجرا کے لیے خان بہادر خان کی سرکاری مہر استعمال کرتا تھا اور بعض اوقات احکام پر خان بہادر خان کے دستخط کے ساتھ خود بھی دستخط کرتا تھا۔ اس نے اپنے کاموں کی انجام دہی کے لیے ایک دستہ تیار کیا، ان کی تنخواہیں وہ اپنے انتظام سے دیتا تھا اس میں باقاعدہ ایک نظام قایم تھا اور اس کا بیٹا اس کا ذمے دار تھا۔ اس نے ٹھاکروں کی دو پارٹیوں میں جو لڑ پڑی تھیں، ملاپ کرانے کی کوشش کی۔ اور تحریک آزادی میں شامل ہونے کی دعوت دی، اس نے ہندوؤں میں بھی بغاوت کی ایک تحریک پیدا کردی تھی۔ وہ یہ کام اس اعتماد سے کرتا تھا گویا وہ خود ان امور کا ذمے دار ہے۔ اس نے اپنے کاموں میں مدد کے لیے اپنے ساتھ چند اعتماد کے لوگوں کو نوکر رکھا تھا [1]۔ اس کے ایک نایب خزانچی نے اور

[1] شوبھارام نے اپنے ساتھ جن اعتماد اور قابلیت کے لوگوں کو صلاح و مشورے کے لیے اور کاموں کو صحیح اور تیزی سے انجام دینے کے لیے رکھا تھا۔ عدالت میں ایک بیان کے ضمن میں ان کے نام اور تعداد ◄

دوسرے اشخاص نے جنھیں اس نے اپنے ماتحت نوکر رکھا تھا کورٹ میں گواہی دی اور ایسے تحریری ثبوت پیش کیے اور فارسی کی بعض دستاویزات پیش کیں جن میں خان بہادر خان کے دستخط کے ساتھ اس کے تصدیقی دستخط تھے اور خان بہادر خان کی مہر ثبت تھی اور کچھ ایسے کاغذات بھی تھے جس پر صرف اسی کے دستخط تھے۔

دہلی کے بادشاہ کا فرمان خان بہادر خان کے نام

ان کے عریضے کا جواب میں (اردو ترجمہ):

بہ تاریخ ۱۷ ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ مطابق ۹ جولائی ۱۸۵۷ء

تمہاری استدعا مورخہ ۱۱ شوال ۱۲۷۳ھ (۴ جون ۱۸۵۷ء) جس میں حکومت کے ملنے اور عام گڑبڑ کی شروعات اور تمہاری طرف سے بانس بریلی اور اس کے قریبی علاقہ کٹھیر (روہیل کھنڈ) میں دو پلٹنوں اور ایک گھڑسواروں کی رجمنٹ کی مدد سے مؤثر انتظام ہاتھ میں لینے، اس التماس کے ساتھ کہ فرمان جاری کیا جائے حکومت چلانے کا اور اس حصے میں فوج کو رکھنے کی اجازت طلب کرنے، تاکہ وہاں کی رعایا کو امن کو خراب کرنے والے عناصر تباہ نہ کردیں، کا میری طرف سے ۱۷ ذی القعد ۱۲۷۳ھ (۱ جولائی ۱۸۵۷ء) مطالعہ کیا گیا ہے۔ جیسا کہ میری خواہش ہے کہ ملکی حالت امن کو واپس لایا جائے اور فساد کو ختم کیا جائے۔ میں تمہاری استدعا کو قبول کرتا ہوں اور وہاں تعین فوجی افسروں کو حکم نامہ جاری کرتا ہوں۔ یہ انھیں پہنچایا جائے اور ان کے تعاون سے تحصیل دار، تھانے دار اور دیگر عملہ مقرر کیا جائے۔ انتظام اس

◄ اور بعض کے کام بھی ظاہر ہو گئے ہیں۔ یہ تعداد میں ۲۷ ہیں۔ لیکن ان میں بیشی کا امکان ہے۔ ان میں دو ناموں کی تکرار ہے اور وہ بھی ممکن ہے کہ ان کی بڑی ذمے داری ہو۔ بقیہ ۲۵ میں ایک شوبھا کا بیٹا ہوری لال اور دو اس کے رشتے دار ہیں۔ دو اس کے ذاتی ملازم، دو مسلمان اور بقیہ پٹھان برادران میں سے ہیں۔ ان میں سے بعض کی جن ذمے داریوں کی وضاحت موجود ہے، ان کا تعلق حکومت کے لازمی شعبوں سے ہے۔ اگر وہ شعبے دیوان (وزیر اعظم) کی نگرانی میں نہ ہوتے تو ناظم (خان بہادر خان) کی نگرانی میں ہوتے۔ (ا۔س۔ش)

طرح کا ہو کہ اس دیہی علاقے کو قوی بنایا جائے اور وہاں کی کھیتی باڑی میں اصلاح لائی جائے اور زمین داروں اور مال گذاروں کو اس لائق بنایا جائے کہ وہ زراعت کی اصلاح کے لیے کوشش کریں اور حکومت کو ان کے واجبات ادا کرنے کے انتظامات کریں، اس سے آپ کی شہرت ہوگی اور ریاست کے لیے آپ کی خدمات سمجھی جائیں گی۔ فوجیوں کو باقاعدہ تنخواہیں ملنی چاہییں۔ دیگر ضروری باتوں کے ساتھ ساتھ تمھیں اس بات کا خیال رکھنا ہے کہ ہر معاملے میں کوئی بھی ایسی بات نہ ہونے پائے جو شریعت کے منافی ہو، اس مقصد کے حصول کے لیے رعایا کے ہر فرد اور ہر فوجی کو اپنی طرف سے کوشش کرنی چاہیے۔

(۲)

خان بہادر خان کی انتظامی کونسل

جے ایف ڈی انگلس کی کتاب "Harrative of Occurrences to Baraily" (بریلی میں رونما ہونے والے چشم دید واقعات) سے ماخوذ

۳۰ر نومبر ۱۸۵۸ء

کمیٹی برائے امن وانصاف کا قیام:

فوجی دستوں کی روانگی کے بعد، خان بہادر نے شہر اور ضلع میں پائی جانے والی لاقانونیت کو ختم کرنے کے لیے کوشش شروع کر دیں۔ انھوں نے کونسل جو شوبھا رام دیوان، مدار علی خان، احمد شاہ خان اور مبارک شاہ خان جو فتح گنج سے واپس آئے تھے، پر مشتمل تھی، اجلاس بلایا، کچھ بحث وتمحیص کے بعد ایک کمیٹی مقرر کی جو سب سے پہلے مقدمات کی سماعت کا نظام قایم کرے گی۔ حسب ذیل حضرات اس کمیٹی کے ارکان قرار پائے:

(۱) کرامت خان: حافظ رحمت خان کے خلف اور خان بہادر کا رشتے دار۔

(۲) اکبر علی خان: خان بہادر کے رشتے دار، ریاست متھرا کے سابق صدر امین، رشوت لینے کی وجہ سے برخواست ہوئے، یہ کمیٹی کے سربراہ تھے، ماہانہ ...اہ ایک

ہزار رُپے تمام مالی معاملات کے ذمے دار۔

(۳) قاضی غلام حمزہ: بریلی شہر کے قاضی۔

(۴) پنڈت اوجھار تیغ ناتھ (Ojhar Tegh Nath): شوبھا رام کے ایک دوست، جنھیں ہیڈ پنڈت مقرر کیا گیا۔

(۵) مظفر حسین خان: حافظ رحمت خان کے ایک رشتے دار، جو بعد میں صدرِ اعلا مقرر ہوئے۔

(۶) جعفر علی خان: ایک متمول زمیندار۔

(۷) جے مال سنگھ: کرور (تحصیل و ضلع بریلی) کے ٹھاکر یہ کمیٹی کے دو ماہ تک ممبر رہے۔

(۸) کلب علی شاہ: قدیم شہر کے ایک با اثر مسلمان۔

کمیٹی نے خان بہادر کے مشورے اور طے شدہ مقاصد کے مطابق اپنی ذمے داریوں کو پورا کیا۔ کمیٹی کی تشکیل کے علاوہ خان بہادر نے اضلاع میں تحصیل دار اور تھانے دار مقرر کیے اور فوج کے نظام کو درست کرنے پر توجہ دی اور اس کے لیے فوج کے آفیسر مقرر کیے۔

مالی حالت کی بہتری کے لیے اقدامات:

کونسل کا اجلاس اگلے دن پھر ہوا۔ تمام توجہ مالی معاملات پر مرکوز رہی۔ باغی خزانے کو لوٹ لے گئے تھے۔ مصر بج ناتھ اور کنہیا لال سے ان کی رقم چھین لی گئی تھی، خزانہ خالی تھا۔ ربیع کی فصل کا جو حصہ غدر سے پہلے موصول ہونا تھا اور وہ جو واجب الادا تھا اس کا کوئی حساب کتاب نہ تھا۔ اس لیے کونسل نے فیصلہ کیا کہ شہر پر ٹیکس عاید کیا جائے، اس کو قانونی شکل دینے کے لیے، خان بہادر نے پنڈتوں سے مشورہ کیا اور مفتیوں سے فتوے طلب کیے، ان سے پوچھا گیا کہ اگر راجہ یا نواب کو عوام کے فلاح و بہبود کے لیے رقم مطلوب ہو تو وہ مال منقولہ پر کس حد تک ٹیکس لگا سکتا ہے، پنڈت اوجھار تیغ ناتھ، مفتی عنایت احمد اور مولوی امانت حسین نے مسئلہ پر غور کیا اور جواب دیا

کہ ایسے حالات میں حکمران دولت کا دس واں حصہ طلب کر سکتا ہے۔

خوشی رام:

یہ جواب موصول ہو جانے کے بعد، خان بہادر نے ٹیکس کا جائزہ لینے کے لیے خوشی رام کے ماتحتی میں ایک کمیٹی قایم کر دی، کمیٹی میں یہ حضرات شامل تھے:

(۱) کمومل: بینکر

(۲) رام پرشاد: مہاجن

(۳) رام لال: مہاجن

(۴) درگا پرشاد: نمایندہ راجہ رتن سنگھ

(۵) درگا پرشاد: گماشتہ متھرا داس

کمیٹی کا اجلاس کنہیا لال کے گھر پر ہوا۔ اجلاس میں مہاجن اور دیگر حضرات کی ملکیّت میں موجود جائیداد کا جائزہ اور تخمینہ لگانے کے بعد ایک اسٹیٹمنٹ جاری کیا گیا، جس میں ٹیکس کی رقم مبلغ ایک لاکھ سات ہزار رُپے مقرر کی گئی اور اس کو چار قسطوں میں ادا کرنے کا فیصلہ ہوا جون، جولائی، اگست، ستمبر میں ادا کرنے کا حکم دیا گیا، خوشی رام کو پہلی قسط فوری طور پر وصول کرنے کے لیے تاکید کی گئی لیکن شاید وہ مضبوطی کے ساتھ حکم کو بجالانے سے قاصر تھے اس لیے انھیں برطرف کر دیا گیا اور امام علی اور سیف اللہ خان کو ان کی جگہ ٹیکس وصول کرنے کے لیے مقرر کیا گیا اور انھوں نے ٹیکس کی وصول کے لیے سختی کے ساتھ اقدامات کیے اور مبلغ بیاسی ہزار رُپے پہلی قسط کے وصول کر لیے۔ اس رقم سے بندوقیں اور بارود پر اٹھنے والے اخراجات پورے کیے گئے۔

نئے سکے کا اجرا:

اس طرح خان بہادر نے چاندی وغیرہ کے بڑی تعداد میں زیورات جمع کر لیے، لیکن موجودہ شکل میں، یہ اس کے لیے بیکار تھے، لہٰذا کونسل کے مشورے کے بعد طے کیا کہ زیورات کے سکے ڈھالے جائیں۔ بہت بحث و تمحیص کے بعد طے ہوا

کہ ایک رُپے کا سکہ شاہ عالم بادشاہ کے نام کا جاری کیا جائے اس کام کے لیے رام پرشاد کے گھر میں ٹکسال قایم کی گئی، لیکن بہ حیثیت خزانچی کام کرنے سے اس کے انکار کے بعد یہ ذمے داری اس سے اٹھالی گئی لیکن چاندی کے سکے جاری کیے گئے، جو بہت اعلا سلور کے تھے اور پورے وزن کے اور ایک سکہ ایک رُپے یا سولہ آنے کے برابر قرار دیا گیا۔

بریلی کی ٹیکسالی کا ڈھالا ہوا یہ سکہ حکومت (دہلی) کو بھجوایا گیا، اس کے سامنے کے رخ پر شاہ عالم کا چہرہ تھا اور کمپنی کے پرانے فرخ آباد رُپے کی طرح تھا۔ سکے کے دوسرے رخ پر یہ تحریر تھا۔ ''عہد بریلی ۱۲۷۴ھ کا ۷۳ واں ظفر مند سال''

اس جملے کے بعد واقعات کے بیان کنندہ نے یا روایت بیان کرنے والے نے لکھا ہے:

اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ اس سکے پر لکھی ہوئی تاریخ سے کس دور حکومت کی طرف اشارہ مقصود ہے؟ چوں کہ شاہ عالم ۱۷۵۹ عیسوی میں تخت نشین ہوئے ❶۔

نئے رُپے کی قدر کا تعین:

بریلی میں نواب صاحب نے حکم جاری کیا کہ رُپے میں چالیس ڈبل پیسے

---

❶ پیراگراف کے اس آخری جملے کی ساخت اور مضمون پر غور فرمائیے! یہ جملہ کس کا ہے؟ واقعات کے بیان کنندہ ''جے ایف ڈی انگلس'' کا؟ یا اس کی روایت کے بیان یا نقل کرنے والے کا یا ''فریڈم اسٹرگل ان اتر پردیش'' کے مواد کو مختلف مآخذ حاصل کرنے اور مرتب کرنے والے؟ جو کوئی بھی اس کو تحریر کرنے والا ہے، اسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی اس میں درحقیقت کوئی بات بھی ایسی نہیں جس میں کوئی پیچیدہ اور سمجھ سے بالا ہوا! اس جملے میں کسی بادشاہ کے سال جلوس کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ رواں صدی کا تہترواں سال یعنی ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۷ء وطن کی آزادی کا سال ہے اور اس تاریخی یادگار کے موقع پر یہ سکہ ۱۲۷۴ھ (مطابق ۱۸۵۸ء) میں جاری کیا گیا ہے۔ یہ نہایت عجیب تاریخ ہے کہ ہجری صدی اور اس کے سالوں کی مطابقت سے عیسوی صدی کی تاریخ نکالی ہے۔

(ا۔س۔ش)

ہونے چاہییں اور جو منی چینجرز اور بینکرز اس حکم نامے کو ماننے سے انکار کریں، انھیں سزادی جائے۔ حکم نامے پر فوری عمل درآمد لازم کیا گیا تھا اور اس میں کسی قسم کا تعطل یا عذر نا قابل سماعت تھا۔

فوجیوں کی تنخواہیں اوران کی ادائیگی:

فوجی دستوں کو تنخواہوں کی ادائیگی میں کوئی بے قاعدگی نہیں ہوئی، رام پور کے سپاہیوں کو چندہ کر لینے کی اجازت تھی اور ملک کے دیگر حصوں کے رہنے والوں میں مبلغ دو ہزار رُپے یا اس سے کچھ زیادہ روزانہ مشاہرے کی مد میں ادا کیے جاتے تھے کچھ رجمنٹوں میں، ایک سپاہی کو روزانہ ایک آنہ اور کہیں دو آنے ملتے تھے ایک کمودان کو ایک رُپیہ اولش دار کو آٹھ آنے تمن دار کو چار آنے اور کچھ سواروں کو آٹھ آنے اور چار آنے ملتے تھے۔

کچھ رجمنٹوں کو تحصیل داروں یا مختلف پرگنے کے ٹھیکے داروں کی طرف سے ان کی تنخواہوں کی بابت ہر مہینے یا ہر دوسرے مہینے حکم ملتے تھے، وہ عام طور پر جاتے اور اپنے آرڈر سے زیادہ کی رقم لٹوا جاتے۔

انفنٹری اور کیولری کے کچھ کمانڈنگ آفیسرز، ہر ماہ اپنے لوگوں کی فہرستیں مہیا کرتے اور رقم کی ادائیگی کے لیے حکم جاری کرا لیتے۔ یوں فہرست میں درج تعداد عام طور پر زیادہ ہوتی بہ نسبت ملازمت میں موجود لوگوں سے۔ چندے کی مد میں جولائی ۱۸۵۷ء سے کم و بیش دو ہزار رُپے روزانہ ادا کیے گئے، اپریل ۱۸۵۸ء کے اختتام تک یہ رقم بڑھ کر چھ لاکھ آٹھ ہزار رُپے ہو چکی تھی۔

(۳)
خان بہادر خان کے ماتحت کیولری رجمنٹیں

شمار	نام رسالدار	رسالے میں افراد کی تعداد	شمار	نام رسال دار	رسالے میں افراد کی تعداد
۱	تفضل حسین خان	۹۳	۲۱	محمد اکبر خان	۶۲
۲	جعفر علی خان	۶۱	۲۲	سرفراز خان	۸۱
۳	سید امداد حسین	۱۰	۲۳	کریم الدین	۴۱
۴	ولی محمد	۶۶	۲۴	محمد نسیم خان	۵۱
۵	کرامت حسین	۴۱	۲۵	رام پرشاد	۲۵
۶	معصوم علی	۳۷	۲۶	عماد الدین	۸۰
۷	وحید یار خان	۵۳	۲۷	معین الدین	۴۴
۸	مرزا امیر بیگ	۲۰۲	۲۸	ظفر یار خان	۶۸
۹	غلام محی الدین	۱۰۱	۲۹	علی احمد خان	۱۲
۱۰	صادق علی خان	۱۱	۳۰	سالار جنگ خان	۸۰
۱۱	امیر شاہ سید	۷۵	۳۱	شمس الدین خان	۶۲
۱۲	نیاز علی خان	۴۶	۳۲	محمد امیر خان	۶۲
۱۳	احمد حسین خان	۷۰	۳۳	حافظ محمد یعقوب علی	۴۵
۱۴	عمران ولی خان	۶۰	۳۴	نعیم الدین	۸۶
۱۵	محمد ولاب خان	۷۵	۳۵	محسن خان	۳۵
۱۶	مبارک شاہ خان	۵۱	۳۶	احمد علی خان	۷۰
۱۷	ملک غلام محمد	۹۴	۳۷	علی محمد خان	۸۱
۱۸	شفیق خان/شفیع خان	۹۶	۳۸	غلام صمدانی خان	۱
۱۹	نظام علی خان	۲۵	۳۹	خان شاہ خان	۴۷
۲۰	میر احمد حسین	۸۶	۴۰	عبداللہ خان	۴۴

شمار	نام رسال دار	رسالے میں افراد کی تعداد	شمار	نام رسال دار	رسالے میں افراد کی تعداد
۴۱	عبدالقدر خان	٦٦	٦۳	محمد اکبر خان	۵
۴۲	غلام مولیٰ خان	-	٦۴	کالا خان	٦۷
۴۳	عیس مولن خان	۱۰۱	٦۵	سید بندے علی	۵۹
۴۴	شاہ محمد خان	۹۳	٦٦	محمد علی خان	۴۷
۴۵	محمد خان	۹۲	٦۷	مرزا علی بیگ	۳۸
۴٦	نجف علی خان	۱۰۲	٦۸	ولایت علی	۱٦
۴۷	غلام حیدر خان	۵۵	٦۹	غلام علی	۱۹
۴۸	محمد شاہ خان	۵۱	۷۰	غلام حسین خان	۴۵
۴۹	خان بہادر خان	۵۱	۷۱	علی بہادر خان	۱٦
۵۰	امداد حسین	۸۴	۷۲	محمد روشن خان	۵۷
۵۱	اللہ نور خان	۳۱	۷۳	کفایت اللہ خان	۱٦
۵۲	صاحبزادہ عنایت رسول خان	۳۳	۷۴	میر امداد علی	۱۰۱
۵۳	شیخ خدا بخش	٦۰	۷۵	مبارک حسین	۷۳
۵۴	نصرت خان	۳۳	۷٦	احمد علی خان	۱۲
۵۵	محمد علی خان	۷۷	۷۷	غلام نبی خان	۲۴
۵٦	عبدالرحمن خان	۳۳	۷۸	امیر علی خان	۴۲
۵۷	حسین علی خان	۱۳	۷۹	ناصر خان	۱۴
۵۸	مظفر علی شاہ	۴۱	۸۰	ممدو خان	۴
۵۹	سید مظہر علی	۴	۸۱	معظم اللہ خان	۵
٦۰	علی شیر خان	۱۰۰	۸۲	حافظ محمد حسین خان	۱۱
٦۱	محمد عزیز خان	۲٦	۸۳	محمد نبی خان	۲٦
٦۲	علی حسین خان	۱۱۰	۸۴	محمد شفیع	۹۵

۸۵	سید علی خان؛	۲۰	۸۹	محمد یعقوب علی	۲۶
۸۶	حبیب اللہ خان	۴۵	۹۰	نیاز علی خان	۲۹
۸۷	شہزادہ سلطان	۶۰		کل افراد کی تعداد	۴,۵۷۴
۸۸	درگا سنگھ	۳۰			

(۴)

خان بہادر خان کے ماتحت انفنٹری رجمنٹیں

رجمنٹ کا نمبر	کمانڈر کا نام	پلٹن یا رجمنٹ میں افراد کی تعداد
۱	عنایت اللہ خان	۹۵۴
۲	بخشش علی خان	۷۹۰
۳	محمد علی شاہ	۵۷۲
۴	عنایت حسین خان	۱۶۸
۵	منصور علی خان	۶۵۴
۶	احمد حسین	۴۱۳
۷	تفضل حسین	۱۲۴۳
۸	عنایت اللہ خان-۲	۵۰۱
۹	سراج الدین خان	۷۵۶
۱۰	قطب حسین	۲۰۵
۱۱	امیر خان	۱۱۱
۱۲	مصاحب علی خان	۳۶۰
۱۳	امیر حیدر	۱۱۵
۱۴	محب اللہ خان	۶۰۰
۱۵	محسن خان	۳۱۳
۱۶	سرنام سنگھ	۸۴۴
۱۷	مرزا منو بیگ	۶۸

۱۸	غلامی خان	۲۸۶
۱۹	آصف اللہ خان	۶۱۸
۲۰	صمصام علی خان	۳۷۲
۲۱	امیر خان	۷۶۲
۲۲	فیض محمد خان	۴۵۳
۲۳	شمبھو سنگھ	۹۸
۲۴	سعادت اللہ خان	۳۸۳
۲۵	عبدالنبی خان	۴۰۵
۲۶	تفضل حسین خان	۳۹
۲۷	غلام حیدر خان	۴۷۷
۲۸	حسن رضا خان	۳۹۷
۲۹	اکبر علیؒ	۴۲۳
۳۰	غلام محمد خان	۹۱۴
۳۱	احمد بیگ	۳۵۵
۳۲	محمد حسن علی خان	۴۴۱
۳۳	محمد حسین	۵۴۰
۳۴	قاسم خان	۲۵۳
۳۵	غلام حیدر خان	۵۲۷
۳۶	الف بیگ	۸۸۹
۳۷	راحت علی خان	۱۱۰
۳۸	کندن سنگھ	۱۴۰۳
۳۹	امجد علی خان	۵۹۱
۴۰	رگوناتھ سنگھ	۳۶۱
۴۱	بہاری سہائے	۷۷۵

۴۲	احمد حسین خان	۴۳۲
۴۳	عظمت اللہ خان	۵۱۳
۴۴	نادر حسین	۳۸۲
۴۵	عنایت خان	۲۲۴
۴۶	نھو خان	۳۸۱
۴۷	باڈی گارڈ	۷۳
۴۸	وزیر خان	۴۳۵
۴۹	محمد نور خان	۳۲
۵۰	مرزا صاحب آف لکھنؤ	۲۳۷
۵۱	احمد یار خان	۲۰۷
۵۲	کرم حسین خان	۶۳
۵۳	رام بخش	۶۸
۵۴	غلام شاہ خان	۳۱
۵۵	ولی محمد خان	۵۷۴
۵۶	محمد علی خان	۱۱۹
۵۷	گنرز	۳۰۰
	کل	۲۴,۳۳۰,۰۰

(۵)
خان بہادر خان کی فوج کا حساب

انفنٹری رجمنٹ:

۱۰ سپاہیوں پر مشتمل ٹولی کو دستہ کہا جاتا تھا۔

۱۰۰ سپاہیوں پر مشتمل ٹولی کو تمن کہا جاتا تھا۔

۵۰۰ سپاہیوں پر مشتمل ٹولی کو اُولس کہا جاتا تھا۔

۱۰۰۰ سپاہیوں پر مشتمل ٹولی کو پلٹن یا رجمنٹ کہا جاتا تھا۔

☆ ہر دستے میں ایک جمع دار ہوتا تھا جس کو دس رُپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔

☆ تمن میں تمن دار کو پچیس رُپے ماہوار اور نایب تمن دار کو پندرہ رُپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔

☆ ایک مکمل رجمنٹ میں دو اولشدار، پچاس رُپے ماہوار ہر ایک کو ملتے تھے۔

☆ کمان دار (کرنل) یا کمانڈنگ آفیسر کو ۱۰۰ یا ۲۰۰ رُپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔

☆ ہر تمن کا ایک وکیل تھا جو آٹھ رُپے ماہوار پر تھا اور ہر رجمنٹ کا ایک بخشی (پے ماسٹر) تیس رُپے ماہوار پر تھا۔

سپاہی کی تنخواہ پانچ تا آٹھ رُپے ماہوار تھی۔

وکیل کی ذمہ داری، سپاہیوں اور آفیسرز کے لیے پٹیشنز لکھنے کی تھی۔ بخشی کو رجمنٹ کے ماسٹر رول (یعنی تنخواہوں کی تیاری) بنانا اور پھر تنخواہوں کی ادائیگی کرنا ہوتی تھی۔

☆ ۱۰۰ سواروں کی ٹولی کو رسالہ کہا جاتا تھا، رسالہ کا ایک رسالدار ہوتا تھا جس کو ۱۰۰ رُپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی لیکن اگر سواروں کی تعداد کم ہوتی تو فی سوار ایک رپیہ کم تنخواہ ملتی۔ کسی بھی رسالدار کو ۳۰ رُپے سے کم تنخواہ نہ ملتی تھی۔

☆ ایک نایب رسالدار کو ۵۰ رُپے کے حساب سے پوری تنخواہ ملتی تھی۔ کوئی کم نہ ہوتی تھی۔

☆ ایک دفعدار جس کی کمان میں ۱۰ سوار ہوتے تھے، اس کو ۲۸ رُپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔

☆ ہر رسالے کے ہمراہ ایک وکیل ۳۰ رُپے ماہوار پر ہوتا تھا لیکن ایسا رسالہ جس میں سواروں کی تعداد کم ہوتی تھی، ان کو ۱۵ رُپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔

☆ سواروں کی تنخواہ ۱۵، ۲۰ اور ۲۵ رُپے ماہوار تھی۔

بریلی کا نظام حکومت اور اس کے گرد و پیش:

شاہ جہان پور ۱۸۵۷ء کے عہد انقلاب میں بریلی کے مرکز سے وابستہ تھا۔ اس

علاقے میں جو آزاد قومی حکومت قایم ہوئی تھی، اس کا دارالحکومت بریلی تھا، اور شاہ جہان پور، پیلی بھیت اور بدایوں کی قومی حکومتیں، بریلی کے مرکزی نظام سے وابستہ تھیں۔ اگر ان کے آزاد قومی نظام کو ''آزاد روہیل کھند اسٹیٹ'' قرار جائے، تو روہیل کھنڈ کے وہ اضلاع جو اس نظام سے وابستہ تھے۔ اس کی وسطی آزاد ریاستیں یا وفاق کے اجزا تھے۔ جنھیں وفاق کے تحت خود مختار ریاستیں کہا جائے تو یہ بات دور از حقیقت نہ ہوتی۔ یوں بھی شاہ جہان پور، بریلی، پیلی بھیت اور بدایوں میں الگ الگ آزاد اور اپنے اپنے حدود میں اپنے وسایل کے مطابق نظام قایم ہوئے تھے اپنی ضرورتوں اور ہجوم و دفاع کے امور میں وقت کے تقاضوں کے مطابق خود فیصلے کرنے اور ان کے نفاذ کے ذمے دار تھے۔ وہ حصول آزادی کے عظیم مقصد میں ایک دوسرے کے حلیف اور معین و مددگار تھے اور ان اضلاع کے مابین نہ کوئی متحدہ نظام تھا، نہ حاکم و محکوم اور زیردست و بالادست کا تعلق تھا۔

اردگرد کے اضلاع مراد آباد جس کے ساتھ سنبھل، امروہہ وغیرہ میں مجو خان نامی ایک صاحبِ ہمت نے، جو ایک اعلا اور علاقے کے ایک نیک نام اور با اثر خاندان کے رکن تھے، آزاد قومی حکومت قایم کر لی تھی۔ فرخ آباد میں اس کے بانی اور حکمران خاندان کے جانشین کی آواز اور قدیم سے ایک حکومت قایم تھی، لیکن مراد آباد اور فرخ آباد دونوں کے قومی رہنما اپنے اپنے حالات میں گرفتار تھے اور ممکن نہ تھا کہ وہ دہلی یا روہیل کھنڈ کی قومی حکومتوں کی کوئی مدد کر سکتے۔ مراد آباد اور بریلی کے درمیان رام پور کی ریاست تھی۔ جس نے کھلے ہندوں تحریک آزادی کی مخالفت کی تھی اور ہندوستان پر انگریزوں کو مسلط رکھنے پر مصر تھے۔ سیتاپور، ہردوائی، کھیری، لکھیم پور کے علاقے اودھ کے آزاد نظام اور ان کے فوجوں کی جولان گاہ بنے ہوئے ان میں کوئی الگ زبردست اور مؤثر تحریک موجود نہ تھی۔ آخر الذکر ضلع کے قصبہ محمدی میں تھوڑے عرصے کے لیے ایک آزاد حکومت قایم ہوگئی تھی۔ اس کا اپنا الگ نظام تھا۔ افسوس کہ محمدی پر قبضے کو باقی نہ رکھا جا سکا۔

باب پنجم:

صوبائی نظام حکومت

بدایوں ۱۸۵۷ء میں

(۱)

فیروز خان لودھی بدایونی

۱۸۵۷ء کی آزادی کی لڑائی میں ضلع بدایوں کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ ۱۹/مئی ۱۸۵۷ء کو بغاوت کی سب سے پہلی لہر موضع بھٹہ گوشائیں میں اٹھی۔ دہلی اور میرٹھ کے بلوے کی خبریں ضلع کے کونہ کونہ میں گشت لگا رہی تھیں۔ ہر طرف لوگ متوحش ہو رہے تھے۔ مسٹر ایڈوارڈس اس زمانہ میں بدایوں کے کلکٹر تھے۔ انھوں نے پولیس کی تعداد میں اضافہ کر کے دو چند کر دیا اور ضلع کے بڑے زمین دار اور باثر اشخاص کو خطوط بھیجے کہ وہ ضلع میں امن وامان رکھنے میں سرکار کی مدد کریں۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ میں جس قدر بلوہ کم ہونے کی کوشش کرتا تھا اسی قدر اضافہ ہوتا تھا۔ چناں چہ جب ان کو معلوم ہوا کہ باغی فوجیں بریلی سے بدایوں پر قبضہ کرنے کو روانہ ہوگئی ہیں تو وہ یکم جون ۱۸۵۷ء کو گنگا پار پٹیالی بھاگ گئے جو اس زمانہ میں موجودہ ضلع ایٹہ کا صدر مقام تھا، باغی فوج نے سرکاری خزانہ کا روپیہ اپنے قبضے میں کر لیا اور تمام عدالتوں اور سول لائن کو جلا کر خاک کر ڈالا۔ جیل خانہ توڑ ڈالا اور ۱۷/جون ۱۸۵۷ء میں بدایوں خاں بہادر خاں والی بریلی کے زیر حکومت آیا۔

۱۷/اپریل ۱۸۵۸ء کو انگریزی فوجیں جنرل پنی کی ماتحتی میں ضلع بدایوں کی حدود میں داخل ہوئیں۔ انگریزوں کے مقابلے پر جو فوج تھی اس کی قیادت ڈاکٹر وزیر علی کر رہے تھے۔ ککرالہ کے مقام پر معرکہ کارزار گرم ہوا۔ جنرل پنی مارا گیا لیکن میدان انگریزوں کے ہاتھ رہا۔ مسٹر ونس اسپیشل کمشنر سول افسر کی حیثیت سے ان کے ہمراہ تھے۔ جو جون کو بریگیڈیر کاک ایک فوج لے کر شاہ جہان پور سے روانہ ہوا۔ راستہ میں تمام دیہات نذر آتش کر دیئے گئے، ۵/جون کو یہ دستہ ککرالہ پہنچا اور ۶/جون

۱۸۵۸ء کو بدایوں شہر میں داخل ہوا۔ رات ہی رات میں گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں۔ دوسرے دن الٰہی نودہ کے میدان میں مولوی تفضّل حسین اوران کے بھائی احمد حسین کو نیز دوسرے ذی اقتدار اشخاص کو جنھوں نے انگریزوں کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا تھا گولی ماردی گئی۔ شہر میں سناٹا ہوگیا۔ اسپشل کمشنر کے سامنے مقدمات پیش ہوئے۔ مجرمین کو پھانسی، دریائے شوراور بیتوں کی سزادی گئی۔ اس کے بعد قایم مقام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بریگیڈیر کاک کے ساتھ سہسوان پہنچا وہاں حیدر خاں کو گولی سے مارا۔ اس کے بعد اسلام نگر پہنچ کر گرفتاریاں کی گئیں اور باغیوں کو بن کنڈی مہادیو کے قریب ایک لائن میں کھڑے کر کے بارہ آدمیوں کے کان میں گولی ماری گئی۔ مسمی کہمان سنگھ گوجر یہ خونی داستان سنانے کو زندہ بچا۔ بدایوں ضلع میں کل ۲۱ آدمی گولی سے مارے گئے۔ ۱۱۷ کو پھانسی دی گئی۔ ۴ اشخاص حبس دوام بھیجے گئے۔ ۱۲۵ کو مختلف قید کی سزائیں ملیں اور ۲۷۰ آدمیوں کے بیت لگائے گئے۔ اکثر لوگ جنھوں نے غدر میں حصہ لیا تھا وہ فرار ہوگئے اور اس وقت تک اپنے وطن واپس نہ آئے جب تک لارڈ کنگ وائسرائے ہند نے باغیوں کی معافی کا اعلان نہیں کردیا۔

مسٹر کارمیکل صاحب نے بہ حیثیت حاکم سیاست تمام ضلع کا دورہ کر کے ایک مفصل رپورٹ مرتب کی تھی جس میں باغیوں کے علاوہ خیر خواہان سرکار کے نام بھی درج ہیں۔ (ذوالقرنین۔ بدایوں نمبر۔ اپریل ۱۹۵۶ء: صفحہ ۴۳، ۴۴)

نوٹ: چوں کہ روہیل کھنڈ ایک مستقل حکومت اور بریلی کو اس کا مستقر اور دارالحکومت قرار دیا ہے، اس لیے روہیل کھنڈ کے اضلاع کو اس کے صوبے قرار دیا ہے۔

بدایوں ۱۸۵۷ء میں
(۲)

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

بدایوں شمالی ہند کا مشہور قدیم تاریخی شہر اور سالار مسعود غازی کے مفتوحہ مقامات میں سے ہے۔ شمس الدین التمش یہاں کا گورنر رہا اور اس کے آثار اس وقت

بھی بدایوں میں موجود ہیں ❶۔ سلطان علاؤ الدین نے تخت دہلی چھوڑ کر بدایوں میں توطن اختیار کرلیا۔ علم و فضل کے اعتبار سے بڑے بڑے نام ور علما و فضلا و شعرا و صوفیہ اس سرزمین سے اٹھے ❷۔ غرض بدایوں اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز رہا ہے اور اس شہر میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔

بدایوں کے مفصلات میں ۱۹ر مئی ۱۸۵۷ء سے لوٹ مار شروع ہوگئی مگر شہر میں سکون تھا۔ ضلع مجسٹریٹ ولیم ایڈورڈس (William Edwards) گھبرا رہا تھا وہی ذمہ دار انگریز افسر تھا۔ ۲۵ر مئی ۱۸۵۷ء کو عید الفطر تھی مجسٹریٹ ضلع کو خبر ملی کہ اہل اسلام نماز عید پڑھ کر بلوہ کریں گے۔ اس نے اپنی حماقت سے اس کے دفعیہ کی یہ تدبیر کی کہ شہر کے سربرآوردہ حضرات کو بلا کر اپنے بنگلہ پر بٹھالیا، اس نے مختلف نوع کی گفتگو کی کہ نماز کا وقت گذر گیا ❸، مگر مجسٹریٹ کی حماقت سے سخت تنفر اور انتقام کا جذبہ پیدا ہوگیا ❹۔

۲ر جون ۱۸۵۷ء کو بریلی سے ایک دستہ فوج نمبر ۶۸ جو انگریزوں کے خلاف تھا، آیا اس نے انگریزی نام حکومت کو ختم کردیا، خزانہ پر قبضہ کرلیا جیل خانہ سے قیدیوں کو آزاد کردیا، پولیس والے وردیاں پھینک کر بھاگ گئے۔ (مصایب غدر:

---

❶ بدایوں میں جامع مسجد شمسی، عیدگاہ شمسی اور حوض شمسی، التمش کے عہد کی یادگار ہیں۔

❷ شہاب الدین مہمرہ، حضرت شیخ نظام الدین اولیا، اور ملا عبد القادر بدایونی کے اسما و تاریخ میں شہرت دوام کا درجہ رکھتے ہیں۔

❸ ولیم ایڈورڈس اپنے خود نوشت حالات میں لکھتا ہے:

"میں نے ان کو باتوں میں لگالیا اور ان کے ساتھ مباحثہ کرنے لگا، اور سب سے بڑھ کر تو یہ کیا کہ ان کو ایک دوسرے سے توڑ لیا، کیوں کہ یہ تو مجھ کو معلوم تھا ہی کہ ان میں سے بہتیروں میں باخود ہا بڑی عداوت ہے۔ الغرض میں نے ایسا بندوبست کیا کہ ان کا خیال بانٹ دیا۔ یہاں تک کہ جو وقت ہنگامہ بازی کے لیے مقرر تھا ٹل گیا۔"

(مصایب غدر ترجمہ مولوی نذیر احمد دہلوی (مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۸۹۶ء: صفحہ ۴، ۵)

❹ ایک شخص نجو خاں جب مراد آباد کے جیل خانہ سے چھوٹ کر آیا تو مجسٹریٹ بہت گھبرایا۔ یہ نجو خاں انقلابیوں کی جماعت میں پیش پیش رہا۔ (مصائب غدر: صفحہ ۲)

صفحہ ۱۴) مجسٹریٹ ضلع ایڈورڈس وغیرہ فرار ہو گئے اول شیخو پور پہنچے اور وہاں شیخ شرف الدین نے ان کو پناہ دی، اس کے بعد ضلع مجسٹریٹ شیخ صاحب کے گاؤں ککوڑہ رہے (بدایوں ۱۸۵۷ء میں از مولوی محمد سلیمان بدایونی (کراچی ۱۹۶۰ء): صفحہ ۴۲۔ مصایب غدر: صفحہ ۱۷، ۱۸) اور پھر ضلع ایٹہ کی طرف چلے گئے بریلی سے آنے والی فوج نے انگریزوں کو تلاش کیا اور شیخو پور تک گئی مگر شیخ شرف الدین کے یہاں سے یہ لوگ جا چکے تھے ❶۔

بدایوں میں انگریزی حکومت ختم ہو جانے کے بعد عجیب افراتفری رہی مگر مولوی فضل رسول بدایونی نے کچھ انتظام برقرار رکھا اور لوگوں کی جان و مال بچانے کی کوشش کی۔ حبیب الاخبار بدایوں مورخہ ۲۵؍ جون ۱۸۵۷ء مطابق ۳؍ ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ رقم طراز ہے:

چوں کہ مقدس عالم اور صوفی مولوی فضل رسول نے اعلا انتظامات کیے لہٰذا کوئی نا قابل مدافعت خاص واقعہ وقوع پذیر نہ ہوا انھوں نے اپنی جان پر کھیل کر لیٹروں اور غارت گروں کی غارت گری سے لوگوں کو بچانے میں اپنے اثر و رسوخ سے کام لیا اور سرکاری آدمیوں کی حفاظت اور امن کے لیے پوری کوشش کی۔'' (فریڈیم اسٹرگل: حصہ پنجم، صفحہ ۲۲۱)

سرکاری ملازم بہاری لال سب ڈپٹی انسپکٹر ساکن بدایوں جو اس زمانے میں وہیں تھا، لکھتا ہے:

''حقیقت میں موضع کھنک کے ٹھاکروں اور شیر علی نے موضع کھیڑا نوادہ کے مسلمان چودھریوں کی ہمراہی میں چاہا کہ شہر (بدایوں) کے شرفا کو

---

❶ شیخ شرف الدین بدایوں کے بڑے زمین دار تھے انھوں نے ایڈورڈس کلکٹر ضلع اور اس کے خاندان نیز اسٹیوارٹ انگریز کو اپنی جان پر کھیل کر مہینوں پناہ دی ان کو تین ہزار کا خلعت ۲۵۰۰ روپیہ سالانہ معافی کا گاؤں اور سی آئی ای کا خطاب ملا۔ ۱۸۸۶ء میں انتقال ہوا ان کے دو صاحب زادے خان بہادر شیخ انتظام الدین ڈپٹی کلکٹر اور شیخ امیر احمد ہوئے، آخر الذکر کے صاحب زادے ہمارے کرم فرما شیخ وحید احمد مسعود ہیں جو مختلف کتابوں کے مصنف ہیں، ان کی حالیہ تالیف سید احمد شہید کی صحیح تصویر (طبع لاہور ۱۹۶۶ء) ہے۔ ملاحظہ ہو لائل محمڈنس آف انڈیا حصہ اول از سر سید احمد خاں (میرٹھ ۱۸۶۰ء) نیز بدایوں ۱۸۵۷ء میں صفحہ ۴۵

لوٹ لیں اور اس کام کے سلسلے میں اپنے خبط کو اس طرح تسکین بخشیں لیکن مولوی فضل رسول کے اچھے انتظام نے بدایوں کو مصیبت سے بچالیا، مذکورہ مولوی ان نیک سیرت اور ولی صفت انسانوں میں سے ہیں جو آج کل نایاب ہیں۔'' (فریڈم اسٹرگل: حصہ پنجم، صفحہ ۳۱۸)

مولانا فضل رسول بدایونی کے سوانح نگار نے بھی اس واقعہ پر کشف و کرامات کا پردہ ڈالا ہے۔ (اکمل التاریخ جلد دوم از مولوی یعقوب حسین ضیا قادری (بدایوں ۱۹۱۵ء): صفحہ ۲۱۰، ۲۱۲) ورنہ حقیقت ظاہر ہے ❶۔

۱۷ر جون ۱۸۵۷ء کو خان بہادر خاں نے عبدالرحمٰن خاں کو بدایوں کا ناظم مقرر کیا اور شیخ فصاحت اللہ نایب ناظم مقرر ہوئے۔ (گزیٹیر ضلع بدایوں (الہ آباد ۱۹۰۷ء): صفحہ ۱۵۴) عبدالرحمٰن خاں ناظم نے سابقہ ملازمین کو ان کے عہدوں پر بہ حال رکھا۔ تفضّل حسین، اشرف علی، اور منشی محمود حسین پنشنر تحصیل داران کو بدایوں کا ڈپٹی کلکٹر مقرر کیا۔ منشی ذوالفقار الدین کو ڈپٹی مجسٹریٹ رضی اللہ کو تحصیل دار بسولی، واجد علی کو تحصیل دار گنور اور باداللہ خاں کو کوتوال شہر مقرر کیا۔ (ان عہدے داران کے حالات کے لیے دیکھیے ''بدایوں ۱۸۵۷ء میں'': صفحہ ۴۷-۵۰ نیز فریڈم اسٹرگل: جلد پنجم، صفحہ ۳۱۹) او چھپانی کا تحصیل دار لچھن سنگھ کو مقرر کیا، ولی داد خاں رسالدار اور چودھری تفضّل حسین و کرامت اللہ کمیدان مقرر ہوئے۔ جنرل نیاز محمد خاں سپہ سالار اور عظمت اللہ خاں بخشی فوج مقرر

---

❶ مولانا فضل رسول کے اس کارنامے کے بعد اس تحریک میں ان کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ ان کے حقیقی برادر نسبتی غلام حیدر (ف ۱۲۸۵ھ) بن قاضی امام بخش نے اس زمانے میں سہارن پور کے تحصیل دار کی حیثیت سے وفاداری اور خیر خواہی دکھائی۔ خان بہادری کا خطاب، موضع بھڈولی جاگیر میں ملا۔ ڈپٹی کلکٹر ہوئے (بدایوں ۱۸۵۷ء میں، صفحہ ۵۶) فضل رسول کے بھانجے اور داماد مولوی فیض احمد بدایونی اس تحریک میں شریک رہے۔ مولانا مولوی فیض احمد کو تلاش کرنے قسطنطنیہ تک پہنچے وہاں اعزاز و اکرام پایا، اس کے بعد حیدر آباد پہنچے وہاں سترہ رُپے یومیہ وظیفہ پایا، موروثی جائیداد کا معافی نامہ کمشنر مراد آباد سے مولانا نے حاصل کیا۔ مولانا فضل رسول کو ردِّ وہابیت میں خاص شہرت ہے، ۱۲۸۹ھ میں انتقال ہوا۔ (ملاحظہ ہو بدایوں ۱۸۵۷ء میں صفحہ ۵۲-۷۳، و اکمل التاریخ: جلد دوم، صفحہ ۵۲)

ہوئے، جولائی میں مال گذاری کی وصولیابی کا کام شروع ہوا۔ خان بہادر خان نے موضع بھٹولی کے ٹھاکر امراؤ سنگھ کو داتا گنج کا تحصیل دار مقرر کیا۔ مگر تحصیل کے ٹھاکروں نے خاندانی رقابت کی وجہ سے اس کی حکومت تسلیم نہیں کی اور متوازی حکومت قایم کر کے ہرلال سنگھ عرف ہلی سنگھ ٹھاکر ساکن موضع بکسینہ کو اپنا سردار بنالیا۔ اس نے اپنا لقب دھپودھام اختیار کیا۔ (مولوی رضی الدین، کنز التاریخ (بدایوں ۱۹۰۷ء): صفحہ ۳۳۳) اس اہیر نے مہر پر یہ سجع کندہ کرایا تھا❶۔

نیچے دھرتی اوپر رام
مہر کچہری "دھپو دھام"

ہلی سنگھ نے ٹھاکروں کے ایک بڑے گروہ کے ساتھ بدایوں پر حملہ کیا مگر شہر کی سرحد پر شکست کھا کر بھاگ گیا❷۔ دوبارہ اگست کے مہینے میں پھر ان ٹھاکروں نے بدایوں پر حملہ کا قصد کیا۔ مگر بدایوں میں نواب کی فوج کا بہت اچھا انتظام تھا اور بدایوں توپوں سے لیس تھا، یہ معلوم ہو کر ان کی ہمتیں پست ہوگئیں۔ گنور کے اہیر انگریزوں کے وفادار بنے رہے اور یہی حالت بسولی کے زمینداروں کی تھی۔ اگست ۱۸۵۷ء میں نواب خان بہادر خاں نے نبی خاں کو بسولی کا تحصیل دار مقرر کیا۔

(کنز التاریخ: صفحہ ۳۳۳)

زمین داران بسولی نے سرکشی کی، بدایوں سے مزید مدد گئی، مگر راستہ کے

---

❶ جنگھارے ٹھاکروں میں یہ روایت مشہور ہے کہ کسی زمانے میں یہ لوگ اپنے سردار کے ساتھ بدایوں لڑنے کے لیے آئے تھے۔ ان کے سردار کا نام دھپودھام تھا، وہ بڑا جواں مرد اور شجاع تھا، اس کی بہادری کے سلسلے میں جو گیت گایا جاتا تھا اس میں ایک بیت یہ بھی تھا۔ اسی کو یہاں نقل کیا گیا ہے۔ گزیٹیر بدایوں صفحہ ۱۵۵ و بدایوں ۱۸۵۷ء میں صفحہ ۶۸

❷ مولوی محمد سلیمان بدایونی (ف ۱۹۶۳ء) لکھتے ہیں: "انگریز جب واپس آیا تو ہلی سنگھ نے اپنے کو انگریز کا خیر خواہ بن کر پیش کیا، ہلی سنگھ سے سوال کیا گیا کہ تم نے تو بادشاہی کا دعویٰ کیا تھا بیساختہ جواب دیا، میں اپنی قوم کا بادشاہ تھا، آپ کے ملک کا نہیں، انعام پایا، داتا گنج کا تحصیل دار بنایا۔ (بدایوں ۱۸۵۷ء میں) صفحہ: ۶۸، ۶۹

ٹھاکروں نے فوج کا مقابلہ کیا، جنرل نیاز محمد خاں تازہ دم فوج اور توپ خانہ آمدہ بریلی لے کر فوراً موقع پر پہنچا، اور ٹھاکروں کو شکست فاش دے کر عبرت ناک سزائیں دیں اگست ۱۸۵۷ء میں عزیز احمد خاں ساکن رام پور نے پرگنہ سہسوان کا ٹھیکہ نواب خان بہادر خاں سے لے لیا تھا اس نے فوج اور توپ خانہ رکھ کر رعب واقتدار قایم کیا۔

(کنز التاریخ: صفحہ ۳۳۴)

جنرل نیاز محمد خاں کے سپاہیوں نے موضع کھولی کے ٹھاکروں کی شورش اور سرکشی کو بڑی بہادری سے دبایا۔ اوسہت اور سہسوان کی سزادہی کے لیے جنرل صاحب خود گئے اور ان کے سرغنوں کی تادیب کر کے بقیہ پر تعزیری ٹیکس لگایا❶۔

(کنز التاریخ: صفحہ ۳۳۵)

اس طرح ضلع بدایوں میں مکمل طور سے نواب بہادر خاں کی حکومت قایم ہوگئی۔

بدایوں ۱۸۵۷ء میں
(۳)

سید خورشید مصطفیٰ رضوی

بریلی کی انقلابی سپاہ یکم جون کو یہاں پہنچی۔ اس کے پیغام بر پہلے ہی آچکے تھے۔ سپاہ نے فایرنگ کی اور انگریزوں کے مکانات جلا دیے۔ عوام کے علاوہ ٹھاکر اور زمین دار بغاوت میں شریک تھے۔ جھلنداری کے زمین داروں سیف اللہ خاں اور سعید خاں نے نمایاں حصہ لیا۔ سلیم پور اور داتا گنج وغیرہ کے ٹھاکروں نے رہنمائی کی، منصفی اور تحصیل پر حملے کیے، ہری سنگھ نے انتظام سنبھالا۔ کیرت سنگھ (ساکن سلیم پور)، پرم سنگھ اور سانول داس وزیر بنائے گئے۔ بسولی کے تحصیل دار مولوی رضی اللہ

---

❶ نیاز محمد خاں رام پور کے باشندے تھے آخر وقت تک خان بہادر خاں کے ساتھ رہے۔ نیپال سے آکر وہ مکہ معظمہ چلے گئے، پھر بمبئی آگئے ۱۸۷۳ء میں گرفتار ہوئے، بدایوں میں مقدمہ چلا، پھانسی کی سزا ہوئی اپیل کی حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ہوئی، وہیں انتقال ہوا۔

(فریڈیم اسٹرگل: جلد پنجم، صفحہ ۶۱۷، ۶۲۰)

بھی انقلابی صفوں میں تھے۔عزیز خاں نے خزانے پر قبضہ کر کے بریلی میں خان بہادر خاں کے حوالے کر دیا۔ سہسوان میں ٹھاکر لچھمن سنگھ، مولانا نیاز احمد، حیدر خاں وغیرہ انقلابی سردار تھے۔گنور کا تحصیل دار ماجد علی بھی سرغنہ تھا، بدایوں گیا اور عوام میں مقبول ہوا۔حیدر خاں نواب فرخ آباد کی فوج میں بھی سالار رہا۔

بدایوں کی عوامی بغاوت کا اندازہ یہاں کے انگریز کلکٹر ایڈورڈس کے اس مشاہدے سے لگایا جا سکتا ہے:

"بدایوں میں عوام نے متحدہ طور پر بغاوت کی اور پورا ضلع انارکی اور انتشار کا نظارہ پیش کرنے لگا۔"

(Edwards (W): Personal Adventure, Pages 16-17,

Freedom Struggle, Vol. V, Pages 209-213)

جیل خانے اور خزانے کے ملازمین بھی باغی ہو گئے۔مولوی فضل رسول نے حفاظت کے انتظامات کیے۔

(حبیب الاخبار بدایوں بدایوں ۲ ذی قعد ۱۲۷۳ھ/ ۲۵ جون ۱۸۵۷)

قایم مقام کلکٹر سی پی کارمیچل اپنے بیان میں کہتا ہے:

"جب بریلی کے باغی یہاں آئے تو سرائے جالن دھاری، سرائے میرن، نئی سرائے، سرائے ناہر خاں، محلہ ابراہیم پور کے تمام باشندے اور آس پاس کے دیہات مثلاً نگلہ شرقی، رسول پور وغیرہ کے تمام عوام متحد ہو کر بغاوت میں شریک ہوئے۔مرزا منصور بیگ نے سرکاری ہسپتال کو لوٹا۔ گنور کے اہیر زمیندار، نگلہ اجمیری کے شرف الدین بلسی کے سیتارام، آنند سنگھ، لیکھ راج، فتح سنگھ، بھاؤ سنگھ (زمینداران ادجھانی) لچھمن سنگھ، بھوپ سنگھ، مادھو سنگھ، داتا گنج کے سردار خاں، مہراب خاں (ساکن گکرالہ) بختاور سنگھ، بسولی کی فتح سنگھ، نبی خاں، عزیز خاں، ناہل سنگھ، لیکری کے ٹھاکر، سہسوان کے حیدر خاں، فتح علی خاں، رامانند، نرائن سنگھ، گلاب سنگھ، اسلام نگر کے شہامت علی، میر خاں، ناصر علی، دھن سنگھ، بدن

سنگھ، وغیرہ باغی سردار تھے۔"

(Freedom Struggle, Vol. V, Pages:221-226)

اسلام نگر کے علاقوں میں تو مئی ۱۸۵۸ء تک بغاوت کی آگ بھڑکتی رہی۔ اخبار الصنادید کے الفاظ میں "بابو رام نرائن نے اسلام نگر میں ایک ہنگامۂ عظیم برپا کیا" جس کے مقابلے کے لیے نواب رام پور کی فوج ۲۹ر مئی ۱۸۵۸ء کو پہنچی اور رام نرائن اس جنگ میں کام آیا۔ (نجم الغنی: اخبار الصنادید ۹۴-۹۳، جلد ۲)

سہسوان کے انقلابی اور عہدے دار:

اس زمانے میں سہسوان پھر انقلابیوں کے قبضے میں آگیا تھا۔ ۱۷ر جون ۱۸۵۷ء (۲۲ر شوال ۱۲۷۲ھ) کو خان بہادر کی طرف سے عبدالرحمٰن خاں ناظم اور فصاحت اللہ نائب ناظم مقرر ہوئے۔ سابق سررشتہ دار ذوالفقار الدین ڈپٹی مجسٹریٹ اور بسولی کا سابق تحصیل دار رضی اللہ بدایوں کا تحصیل دار ہوئے۔ لچھمن سنگھ اوجھانی کا تحصیل دار اور رام اوٗ سنگھ (تعلقہ دار ہتھولی زمیندار ردولی) کو داتا گنج کا تحصیل دار بنایا گیا۔ کچھ ٹھاکروں نے اس کی مخالفت کی اور ہرلال سنگھ کی سرکردگی میں بدایوں پر حملہ کیا جس میں انھیں پسپا ہونا پڑا۔ اسی طرح بسولی وغیرہ میں بھی زمینداروں اور تحصیل دار ننھے خاں کے درمیان کشیدگی رہی۔ عزیز احمد نے سہسوان کے چکلے دار کا لقب اختیار کیا۔ عبدالرحمٰن خاں (ناظم) سے بھی ٹھاکروں کا اختلاف ہوا تو خاں بہادر خاں نے ٹھاکر جے مل سنگھ کو بھیجا جس نے صلح صفائی کرادی۔ عبدالرحمٰن خاں نے ٹھاکروں کو رُپیہ دیا۔ تحصیل تھانے اور فوج کی تنظیم کی۔ نیاز محمد خاں نے ٹھاکروں کو ہدایات دیں۔ داتا گنج کے ٹھاکر کبیرت سنگھ نے انقلابیوں کا ساتھ دیا۔ کچھ عرصے بعد ۱۰ر نومبر ۱۸۵۷ء کو عبدالرحمٰن کی بجائے مبارک شاہ خاں ناظم اور احمد شاہ خاں نایب ناظم بنائے گئے۔ اس دوران کچلا گھاٹ پر انگریزوں سے ایک تصادم بھی ہوا۔ (اکتوبر نومبر) فتح گڑھ پر جنوری ۱۸۵۸ء میں انقلابیوں نے حملہ کیا مگر شمس آباد پر ہوپ گرانٹ نے شکست دی اس جنگ میں گاؤں کے ہندو مسلم عوام اور ٹھاکر شامل تھے، دو ہزار مجاہدین

(جہادی) بھی تھے۔ منصور علی بیگ اور بیدار شاہ کے فوجی دستے بھی تھے۔ قادر گنج کے قریب بھی معرکہ آرائی ہوتی رہی۔ اس دوران بالا راؤ یہاں ہو کر شاہ جہان پور اور دلی داد خاں اور اسماعیل خاں بریلی سے آتے ہوئے سہسوان ہو کر فتح گڑھ گئے۔ دہلی کی شکست کے بعد بخت خاں نے آکر جہاد کا فتویٰ تقسیم کرایا جس سے جوش و خروش میں اضافہ ہوا۔ اپریل ۱۸۵۸ء میں ڈاکٹر وزیر خاں، مولوی فیض احمد اور شہزادہ فیروز وغیرہ پہنچے۔ نکرالہ پر تصادم ہوا (۲۷ر اپریل) جہاں جنرل پینی کی فوجیں حملہ آور ہوئی تھیں۔ جنرل پینی جان گنوا بیٹھا اور انقلابیوں کو فتح کے آثار نظر آئے مگر جنرل جونس کی تازہ دم فوجیں آجانے پر انھیں پسپا ہونا پڑا اور اس کے رہنما بریلی چلے گئے۔ جہاں خان بہادر خاں کا اقتدار تھا۔

وفاداروں کی حرکتیں:

انگریزوں کے وفادار برابر اپنی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ پنولال خط و کتابت کر رہا تھا اس کے نام انگریز حکام کا ایک خط انقلابیوں کے ہاتھ لگا جس میں لکھا تھا کہ تم ٹھاکروں کے ذریعے پھوٹ ڈالنے اور بدنظمی پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ (Freedom Struggle, Vol. V, Page 325) انقلابی جنرل نے اس خط کو راز میں رکھا، مشتبہ ٹھاکروں کو بات چیت کے لیے بلایا اور گرفتار کر لیا۔ بختاور سنگھ اور پنولال کو سزا دی گئی۔ ایک سردار کو گدھے پر بٹھا کر نکالا اور پھر توپ سے اڑا دیا گیا۔ بھائی سنگھ، دھرم سنگھ کو بھی اسی جرم میں قید کیا گیا۔ بہاری لال سابق سب انسپکٹر بھی انگریزوں سے نامہ و پیام کر رہا تھا اور روزنامچہ بھی لکھتا رہا۔ مارچ ۱۸۵۸ء میں مراد آباد کو فرار ہو گیا۔ مہدی علی رئیس پہاسو بھی وفاداروں میں تھا، شیخو پور کا زمیندار فیاض الدین [1] بھی انگریزوں کی مدد کرتا رہا۔

---

[1] اس کے بیٹے شیخ عبدالغفار نے ایک پمفلٹ "تریاق شورش" ۱۹۰۷ء میں شائع کیا جس میں لکھا کہ بدایوں میں ۱۹ر مئی سے بغاوت کی افواہیں تھی۔ ۲۵ر مئی (عید) کو بغاوت شروع ہونے کی افواہ تھی۔ کلکٹر نے معزز مسلمانوں کو طلب کیا اور مشورے کے بہانے اندازہ لگایا۔ بغاوت ۲ر جون کو شروع ہوئی۔

بدایوں کے انقلابی:

انقلابی سرداروں میں فصاحت اللہ خاں (وکیل ججی بریلی) نے انتظامات میں کلیدی رول ادا کیا، وہ نایب ناظم مقرر ہوا، بے حد بااثر تھا۔ بعد میں استعفیٰ دینے پر جج بنایا گیا اور محمد یار خاں نایب ناظم ہوا۔ فضل احمد ہیڈ سر رشتہ دار بنایا گیا جو فصاحت اللہ کا عزیز تھا، تمام اہم کارروائیوں میں شریک رہا۔ بعد میں ان تینوں کے پاس سے جو کاغذات ملے ان سے پتا چلا کہ لکھنؤ کے انقلابیوں سے برابر رابطہ رکھے ہوئے تھے۔ (Freedom Struggle, Vol. V, Pages:621-622) یہ اگست ۱۸۵۸ء میں فرنگی محل لکھنؤ سے گرفتار ہوئے۔ محمد یار کو پانچ سال جلاوطنی اور ضبطی جائیداد کی سزا ملی۔ احمد شاہ خاں نایب ناظم ۵/اگست ۱۸۵۸ء کو توپ سے اڑایا گیا۔ سہسوان کا مولوی نیاز احمد بھی شہید ہوا۔ حیدر خاں کو گولی ماری گئی (محلّہ شہباز پور میں دفن ہے) محمد حسن خاں کو بیدردی سے مارا گیا۔

مولوی فضل حق (ساکن شاہ جہان پور) پہلے بدایوں کے ضلعے میں تحصیل دار پھر بغاوت کی ابتدا میں پیلی بھیت کا ناظم بنا۔ نومبر ۱۸۵۸ء تک بغاوت میں سرگرم، آخر تک بڑی فوج ہمراہ تھی۔

(۱) اسلام نگر کے سید محب علی کے بارے میں مخبری کی گئی کہ فتویٰ جہاد امام باڑے میں دفن کر دیا ہے۔ چناں چہ امام باڑہ کھود کر مسمار کر دیا گیا اور محب علی کو گولی ماری گئی۔ مولوی علی رضا، ماجد علی اور تفضّل حسین کو بھی گولی ماری گئی۔

(۲) محسن علی خاں اپریل ۱۸۵۸ء میں زخمی ہو کر فوت ہوا۔ مولوی فیض احمد نے جنگوں میں حصہ لیا، ککرالہ کی جنگ میں بھی شرکت کی۔ دیگر سرداروں میں منیر خاں، رحیم علی، منصور بیگ، سیف اللہ وغیرہ تھے۔

بدایوں کی انقلابی حکومت کے چند اہل کار

(ماخوذ)

میں نے اپنی ہفتہ وار گذشتہ رپورٹوں میں جان بوجھ کر تین مشہور باغیوں فصاحت اللہ، محمد یار خان اور فضل احمد کی گرفتاری کا ذکر نہیں کیا۔

(۱) ان افراد میں پہلا شخص یعنی فصاحت اللہ، غدر سے پہلے، بریلی کے جج کی عدالت میں ایک قابل وکیل کی حیثیت سے تعینات تھا۔ مقامی افراد میں اس کا بہت زیادہ اثر ورسوخ تھا، باغی حکومت کے قیام میں فوری طور پر یہی وجہ کارفرما نظر آتی ہے اور بدایوں میں اسے ناظم عبدالرحمٰن خان بریلی سے لائے اور نایب ناظم تعینات کیا، یوں اس نے باغی حکومت کے قیام میں قایدانہ کردار ادا کیا، کچھ عرصے کے بعد اس نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور محمد یار خان کے حق میں دست بردار ہو گیا اور خود کو ایک اصلی جج کے طور پر مستحکم رکھا، لیکن حقیقتاً تمام اعلا اختیارات اس کے پاس رہے اور اختیارات حاصل کرنے کے بعد اُس نے بڑے مؤثر انداز میں کامیابی کے ساتھ اختیارات کا استعمال کیا۔

(۲) محمد یار خان بدایوں کے نایب ناظم تھے اور یہ پہلے قیدی تھے جنھیں عام معافی کی کلاس سے خارج کر دیا گیا تھا۔

(۳) تیسرا قیدی پہلے کا رشتہ دار تھا اور یہ باغی عدالت میں ہیڈ سر رشتہ دار تھا۔ یہ اپنی حیثیت اور اسے پہلے قیدی سے رشتے داری کی بنا پر بغاوت کے تمام اقدامات اور عمل میں چیف باغی یعنی باغیوں کے سرغنہ کے ساتھ منسلک کیا گیا۔

یہ وہ تمام تین آدمی تھے، جن کے بارے میں نیم سرکاری طور پر میں نے فوراً آپ کو آگاہ کیا کہ جیسے ہی مجھے لکھنؤ کے کمشنر مسٹر کارین جی نے بتلایا۔ ان کے قبضے سے ایسے کاغذات ملے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ ان کا لکھنؤ کے قابل ذکر باغیوں

سے جنھیں عام معافی دی گئی ہے، رابطہ تھا اور ان میں سے ایک دستاویز تو واقعی ان کے باغیانہ کردار کے لیے فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ میں اس تمام کارروائی کے خلاصے کی نقل جو کہ لکھنؤ سے ملی ہے، ساتھ روانہ کر رہا ہوں۔

آخر میں یہ بتانا ضروری ہے کہ اِن تینوں آدمیوں کا میرے پاس مقدمہ زیر سماعت ہے اور میرے پاس ان پر فرد جرم عاید کرنے کے لیے کافی دستاویزی ثبوت ہیں اور مجھے توقع ہے کہ میں ان کے خلاف ذاتی طور پر بھی صحیح شہادتیں حاصل کرلوں گا۔ یہ مقدمہ جج اور اسپیشل کمشنر کو بھجوانے سے قبل، میں ان میں سے ہر ایک کے خلاف زمینی حقایق اور ثبوتوں کا خلاصہ پیش کروں گا۔

پیلی بھیت میں انقلابی حکومت

(۱)

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

پیلی بھیت میں اس وقت مسٹر کارمیکل مجسٹریٹ متعین تھا اور پیلی بھیت کی حیثیت ایک پرگنہ کی تھی اتفاق سے کارمیکل اس زمانے میں پیلی بھیت میں موجود نہ تھا بلکہ نینی تال میں تھا، جیسے ہی اسے میرٹھ وغیرہ کے حالات معلوم ہوئے تو وہ فوراً پیلی بھیت پہنچا۔ اور پولیس اور سوار بھرتی کیے اس وقت مسلمانوں میں سخت جوش تھا۔ گزیٹر پیلی بھیت میں ہے:

> "مسلمانان پیلی بھیت بہت جوش کی حالت میں تھے جس کا اندازہ ان اشتہارات سے ہوتا ہے جو عید کے دن جامع مسجد اور عیدگاہ میں چسپاں ہوئے تھے۔"

پیلی بھیت کے مشہور بزرگ محمد شیر میاںؒ کے ماموں نعمت شاہ نقش بندی ایک فقیر اور مجذوب شخص تھے، وہ انقلاب سے کئی سال پہلے اپنے گلے پر انگلی پھیر پھیر کر فرماتے تھے کہ مخلوق پر قتل ہے، مخلوق پر تباہی ہے۔

(مقامات الاولیاء مرتبہ شرافت علی گکرالوی (بریلی ۱۳۵۷ھ): صفحہ ۱۲)

کارمیکل نے حفاظتی انتظامات کیے ہتھیاروں پر پابندی عاید کر دی۔ یکم جون کو جب اسے بریلی کے واقعات کا علم ہوا کہ وہاں خان بہادر خاں کی حکومت قایم ہوگئی، اور یوروپین آفسر بھاگ گئے تو اس نے اپنے بچوں کو پولیس کی حفاظت میں نینی تال بھیج دیا اور اسی دن خود بھی نینی تال بھاگ گیا۔ دوسرے افسر بھی فرار ہو گئے۔

پیلی بھیت سے بھی انگریزی حکومت کلیتاً ختم ہوگئی۔ اور خان بہادر خاں کی حکومت قایم ہوگئی۔ مگر راجپوتوں نے مکمل طور سے تعاون نہیں کیا۔ مجسٹریٹ کارمیکل کے جانے کے بعد پیلی بھیت کا ناظم فضل حق کو بنایا گیا۔ پھر ابوالحسن ناظم مقرر ہوئے

اور منصور خاں نایب ناظم مقرر ہوئے۔

خان بہادر خاں نے محاصل کی تحصیل کے لیے اپنا عملہ مقرر کیا۔ بیسل پور میں پور نانند کو مقرر کیا، جولائی میں اس کی بجائے علی محمد خاں کا تقرر کیا گیا، وہ بھی زیادہ کامیاب نہ ہوئے تو ان کی بجائے بریلی سے ایک فوجی جمعیت کے ساتھ مدار علی خاں بھیجے گئے جنھوں نے راجپوتوں کو سیدھا کر دیا۔ جہاں آباد کی تحصیل احمد یار خاں کے سپرد ہوئی بعد کو اس جگہ فخر الدین مقرر ہوئے جو پہلے پیش کار رہ چکے تھے، اس کے بعد ظفر یار خاں مقرر ہوئے۔

دو مہینے کے بعد ایوب خاں کا تقرر ہوا جو تحریک کے اخیر تک رہے۔ پہلے جہاں آباد کا تحصیل دار کاشی رام تھا جو بریلی آ گیا۔ (فریڈم اسٹرگل: جلد پنجم، صفحہ ۳۲۷) پیلی بھیت کے عبدالرحمٰن خاں اور بشیر خاں اور شیر پور کے الہ نور خاں، محمد یار خاں اور حضرت نور خاں پسران محمد نور خاں سرکار انگریزی کے انتہائی وفادار رہے، اور ان کو انعام و اعزاز بھی ملا۔ (کاپیز آف سرٹیفکیٹس، اسد اللہ اینڈ ہز فیملی۔ مطبوعہ بریلی) حضرت نور خاں کے صاحب زادگان منگل خاں اور بالا خاں تھے [1]۔

(جنگ آزادی ۱۸۵۷ء—واقعات و شخصیات)

(۲)
ناظم پیلی بھیت

فضل حق شاہ جہان پور کے باشندے تھے۔ انقلاب کے وقت وہ ضلع بدایوں میں تحصیل دار تھے۔ انقلابی قومی حکومت قایم ہوئی تو نواب خان بہادر خان نے پیلی بھیت کا ناظم بنا دیا تھا۔ اور پیلی بھیت میں ان کے پاس اپنی مدد کے لیے پانچ سو سواروں کا ایک دستہ موجود رہتا تھا۔ (فریڈم اسٹریگل......ج ۵، ص ۳۲۷)

یہ وہی انقلابی ہیں جن کا حوالہ مولانا فضل حق خیر آبادی نے مقدمے میں اپنی بریت کے بیان میں دیا تھا کہ بغاوت میں حصہ لینے والا فضل حق میں نہیں، وہ ہے جو پیلی بھیت کا ناظم رہا ہے۔ (ا۔س۔ش)

---

[1] واقعات زیادہ تر گزیٹیر پیلی بھیت (انگریزی) سے ماخوذ ہیں۔

(۴)

سید خورشید مصطفیٰ رضوی

عید کے دن (۲۵/ مئی ۱۸۵۷ء) باغیانہ اشتہار چسپاں کیے گئے جو حکام نے ہٹوا دیے، یکم جون کو بریلی کی بغاوت کی خبر سن کر انگریزوں نے متعلقین کو نینی تال بھیج دیا اور خزانہ اپنے وفاداروں کے حوالے کیا۔ ۶/ جون کو بغاوت پوری طرح پھیل چکی تھی۔ انقلابی سرداروں میں عبدالرشید خاں، غلام ربانی، کریم اللہ خاں اور مولوی فخر الدین تھے۔ سید فضل حق تحصیل دار بہیڑی، اس سے پہلے رام پور میں نایب سررشتہ دار تھے، پھر بریلی کمشنری کے سررشتہ دار ہو گئے۔ فیروز شاہ کے ساتھ بھی شرکت کی ●۔

فوجی سرگرمیاں:

نواب ولی داد خاں دہلی اور بلند شہر کی شکست کے بعد مرزا کوچک سلطان (بن بہادر شاہ) کے ساتھ بریلی آئے۔ اکتوبر ۱۸۵۷ء میں خان بہادر خاں نے فوجی امداد دی کہ مالا گڑھ پر دوبارہ قبضہ کیا جائے۔ ۱۶/ اکتوبر کو روانگی طے پائی مگر ملتوی کی گئی۔ بخت خاں اور بالا صاحب فرخ آباد روانہ ہوئے۔ خان بہادر کے ساتھ فوجی سرگرمیوں میں ولی داد خاں کے علاوہ نواب فرخ آباد، راجہ تیج سنگھ اور شوبھا رام کا نمایاں حصہ رہا۔ مولوی سید قطب شاہ (سابق استاد بریلی کالج) نے غازیوں کی فوج منظم کی۔ ہندوؤں میں مہابیر کی جھنڈی کے نام سے پرچم بلند کیا گیا (Freedom Struggle, Vol. V, Pages: 364-375) ۲۴/ فروری کو باغی سردار رام بہادر نے مع فوج کچلا گھاٹ (ضلع بدایوں) کے قریب گنگا پار کی۔ ولی داد خاں کے لیے بھی مارچ میں گنگا پار کرنے کی رپورٹ تھی۔ بجنور میں سیف اللہ خاں کی فوج تھی۔ پتھر گڑھ

● سید فضل حق شاہ جہان پوری: مصطفیٰ علی بریلوی نے کتاب خان بہادر خاں شہید میں لکھا ہے کہ نواب رام پور نے ہر چند بلایا مگر جواب دیا کہ "اب تو تمنائے شہادت ہے۔" رانی جھانسی کی طرف سے جنگ کرتے ہوئے کام آئے سرکاری رپورٹ کے بہ موجب ۸/ ستمبر ۱۸۵۸ء کو بہ مقام کونچ کے قریب جنگ میں مارے گئے۔ (بہ حوالہ فریڈم اسٹرگل یوپی: جلد ۳، ص ۶۵۸-۶۳۹)

کا قلعہ انقلابیوں کے قبضے میں تھا۔ احمد اللہ خاں، مارے خاں، قاضی عنایت کی سرکردگی میں فوجیں دارانگر پر تھیں۔ کاس گنج کے قریب مارچ ۱۸۵۸ء میں انقلابی فوجیں بڑی تعداد میں جمع تھیں۔ ولی داد خاں کے علاوہ ان کے بیٹے صمد خاں (نواب جھجر کا مشیر) محسن علی خاں اور احمد یار خاں کمان کر رہے تھے۔ شہزادہ فیروز اور کوچک سلطان بھی ہمراہ تھے۔ یہ فوجیں کچلا گھاٹ، بچپوریا (ضلع فرخ آباد) اور سورج پور گھاٹ سے پار اُترنے والی تھیں۔ نانا صاحب کے آنے کی بھی خبر تھی۔ شوبھا رام فوجی پریڈ کرانے اور میگزین تیار کرنے میں مصروف تھا۔ شاہ جہاں پور میں اسماعیل خاں مع فوج (دس ہزار) کے موجود تھا۔ ہلدوانی پر فضل حق کی فوجیں تھیں اور راجہ کاشی پور بھی شریک ہو گیا تھا۔ نیاز محمد خاں سہسوان ہو کر گنور آ رہا تھا۔ نانا صاحب کے بریلی پہنچنے کی اطلاع تھی۔ (۲۴/مارچ ۱۸۵۸ء)

ان کارروائیوں پر جے سی ولسن اور اخبار فرینڈ آف انڈیا کی رپورٹ یہ تھی کہ باغی روہیل کھنڈ کو مرکز بنا کر چاروں طرف بہ یک وقت حملے اور گوریلا جنگ شروع کرنے والے ہیں۔ رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ

> ''ہم نہ صرف مال گذاری کا رُپیہ بلکہ عزت، وقار اور انتظام سب کچھ کھو رہے ہیں۔ کہیں باغیوں میں کوئی حیدر علی پیدا نہ ہو جائے اس لیے دیر کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ یہ کہنا کہ ہم خان بہادر کو شکست دیں گے، خیالی پلاؤ ہے۔''

(تاریخ جنگ آزادی ہند ۱۸۵۷ء)

باب ششم:

محمدی میں انقلابی حکومت
۱۸۵۷ء کا قیام

محمدی ضلع کھیری کا ایک تاریخی شہر ہے۔ ۱۸۵۷ء کے واقعے نے اسے تاریخ ہند میں ایک نہ مٹنے والا نقش بنا دیا۔ تحریک آزادی ہند پاکستان کا قاری جب اپنے مطالعے کے اس مقام پر پہنچتا ہے تو اس کے قدم آگے بڑھنے سے رک جاتے ہیں اور دل چاہتا ہے کہ اس کی تاریخی عظمت کا اعتراف کیا جائے کہ کبھی اس مقام سے ہمارا گزر ہوا تھا۔

محمدی ہمارے سفر کی منزل تھا اور مقصد سفر بھی! ۱۸۵۷ء کا سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا کہ برٹش انڈیا کے طلسمت کدے میں جب کہ آزادی کا ایک ایک نشان مٹا دیا گیا تھا اور اس سرزمین کو غلام آباد ہند کہا جانے لگا تھا، محمدی کے مطلع پر آزادی و خود مختاری کا سورج طلوع ہوا تھا۔ سیتاپور کے اس قطعۂ زمین اور محمدی کی خوش نصیب بستی پر آزاد وطن کا جھنڈا لہرایا گیا۔ محمدی کی اس بستی کو یہ مقام مولوی احمد اللہ شاہ کی ہمتِ بلند نے دیا تھا اور اس کی قسمت کو چار چاند لگا دیے تھے۔

یہاں احمد اللہ شاہ۔ وطن دوست اور بہی خواہِ قوم و وطن کی حکومت قایم تھی۔ صبح و شام آزادی اور خود مختاری کی نوبت بجتی تھی۔ وقت کے بلند پایہ اور اہل ہمت رجال کار پر حکومت کی کابینہ اور قوم کے منتخب، جہاں دیدہ اور اہلِ نظر کی مشاورت کے لیے کونسل قایم تھی۔ آزاد قومی حکومت میں جنرل بخت خان، مولوی سرفراز علی گورکھ پوری، نانا راؤ پیشوا وغیرہم پر قایم تھی اور قومی نمایندوں پر مشتمل مشاورتی کونسل یا مجلسِ شوریٰ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ جس میں قوم و وطن کی ترقی اور بھلائی کے امور انجام پاتے تھے اور

ملک کے لیے قانون بنائے جاتے تھے۔ اس کے ارکان میں مولوی لیاقت علی الہ آبادی، ڈاکٹر وزیر خان، مولانا فیض احمد بدایونی اور ان جیسے اور ارکان شامل تھے۔ فیروز شاہ نے بھی شرکت قبول کرلی تھی۔

آزاد قومی ریاست کا محمدی کا اپنا جھنڈا بلند تھا اور اس کا اپنا سکہ بازاروں میں رواں تھا، جس پر ریاست کے بانی کا نام، اس کے دین کے اعلان، اس کے مرشد کے نام کی صراحت اور ریاست کی خصوصیات، اور مقصد -- کہ خدمت خدا کی تمام مخلوق کی بلاتفریق قوم ومذہب سب کی فلاح و بہبود کے لیے قایم کی گئی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بانی کا نام احمد اللہ شاہ ہے، جس کا مذہب، دین محمدی (یعنی اسلام ہے)۔ جس کا پیر ومرشد محراب شاہ کے نام سے معروف ہے۔

قطعہ یہ ہے:

سکہ زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ
حامی دین محمدؐ احمد اللہ باد شاہ

اگر اس نئی آزاد ریاست کی عمر دراز نہ ہوئی، لیکن اس کم وقت میں بھی ہندوستان کی تاریخ وتحریک آزادی میں آزاد قومی ریاست محمدی کا نام ہمیشہ کے لیے ثبت ہوگیا۔

چوں کہ محمدی کا روہیل کھنڈ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ البتہ پورب میں شاہ جہان پور سے کھیری کی سرحد ملتی ہے اور شاہ جہان پور کی تحصیل پوایاں کے بالمقابل کھیری کے حدود میں محمدی واقع ہے۔

محمدی میں چوں کہ شاہ جہان پور سے بالکل الگ اور مستقل انقلابی حکومت قایم ہوئی تھی۔ اس لیے اس کا تذکرہ شاہ جہان پور کی انقلابی حکومت اور اس کے ماتحت جلال آباد اور تلہر کے انقلابی نظامات کے برعکس شاہ جہان پور کی حکومت کے مساوی اور حلیف حکومت کی حیثیت سے "محمدی کی انقلابی حکومت ۱۸۵۷ء" کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر مسز عابدہ سمیع الدین اور ڈاکٹر محمد ایوب قادری محرم کے فاضلانہ ومحققانہ مقالات چوں کہ اسی آزاد قومی ریاست کی تاریخ کے بارے میں ہیں۔اس لیے انھیں دوسرے مقامات کی حکومتوں اور ان کے تزکار سے الگ نمایاں اور ممتاز کیا ہے۔

اب میں قارئین کرام اور شایقین محترم کو ان مقالات کے مطالعے سے لطف اندازہونے اور استفادہ کرنے کی دعوت دوں گا۔(ا۔س۔ش)

محمدی کا محاذ جنگ آزادی

ڈاکٹر مسز عابدہ سمیع الدین

اودھ کی شکست کے بعد احمد اللہ شاہ نے محمدی کو اپنا صدر مقام بنایا تھا جو ضلع کھیری (اودھ) شاہ جہان پور کی مشرقی حد پر واقع ہے۔ وہاں انھوں نے باقاعدہ اپنے عہدہ داران کا تقرر کیا۔ جنرل بخت خاں، مولوی سرفراز علی اور نانا راؤ پیشوا کابینہ میں اور مولوی لیاقت علی الہ آبادی، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا فیض احمد بدایونی کونسل میں تھے۔ فیروز شاہ نے اول اختلاف کیا۔ پھر شرکت کر لی۔ شاہ صاحب کا خطبہ سکہ جاری ہوا۔ اس پر یہ شعر کندہ ہوتا تھا

سکہ زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ
حامیِ دینِ محمدؐ احمد اللہ بادشاہ

(شاندار ماضی: محولہ بالا، صفحہ ۴۰۸)

غلام رسول مہر کو بادشاہت کے اعلان میں تامل ہے تاہم ایوب قادری کا استدلال ہے کہ بہادر شاہ قید ہو ہی چکے تھے حضرت محل اور برجیس قدر نے نیپال کا رخ کیا تھا لہٰذا مرکزیت کی خاطر کسی بادشاہ کا ہونا ضروری تھا۔

ادھر برٹش کمانڈر انچیف نے بریگیڈیر کوک (Coke) کو مزید کمک کے لیے لکھا جو ۲۲ رمئی کو پہنچ گئی۔ اور دو دن بعد بریگیڈیر جونس نے محمدی پر دھاوا بول دیا۔ جونس برنائی گاؤں کے قریب پہنچا تھا کہ انقلابیوں نے حملہ کر دیا۔ مگر فوج کی بھاری گولہ باری کے سامنے جم نہ سکے مگر بیس غازیوں کا ایک مختصر سا دستہ شہادت کے سو فیصدی امکان کے باوجود سینہ سپر رہا۔ کارن ہل (Corn Hill) میگزین میں شایع ایک مضمون کے مطابق غازیوں کے اس مختصر سے دستے نے دشمن کی صفوں میں گھس کر انتہائی بے جگری سے وار پر وار کیے اور کئی ملتانیوں کو موت کی نیند سلا دیا۔

• (Forrest, III pp. 386-387. Quoted by S. Mounul Haq in "The Great Revolution". p.547)

۲۵ رمئی کو محمدی پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ اسے اڑا دیا گیا جسے احمد اللہ شاہ نے پہلی ہی خالی کر دیا تھا۔ وہ اودھ چلے گئے جس سے ایک سال کی زبردست خون ریزی کے بعد فاتح انگریز مطمئن ہو چکے تھے۔ لیکن اب احمد اللہ شاہ کے لیے امید کی ہر کرن معدوم ہو چکی تھی۔ اپنے سپاہیوں وافسروں میں تال میل نہ ہونے کے سبب وہ انتہائی بددل ہو چکے تھے۔ اور انھیں تنبیہ بھی کر چکے تھے کہ ایسی غیر منظم فوج سے کسی کامیابی کی امید فضول ہے۔ وہ خود اب اپنی زندگی سے بھی مایوس ہو چکے تھے۔ ایک روایت کے مطابق درویش الف شاہ سے انقلاب کی زبوں حالی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اب ان کی واحد آرزو اپنے دین وملکی آزادی کی خاطر شہید ہونے کی ہے:

تمنا ہے یہ ایزدِ پاک سے
کہ چھٹ جاؤں آلائش خاک سے
رہ یار میں سرفدا ہو کہیں
یہ بار امانت ادا ہو کہیں

سقوط محمدی کے بعد ان کے کچھ ساتھی نیپال کی طرف نکل گئے اور جیسا کہ تحریر کیا جا چکا ہے وہ خود اودھ کی جانب گئے تاکہ منتشر انقلابیوں کو دوبارہ مجتمع کر سکیں۔ ۵ر جون ۱۸۵۸ء کو وہ پھر نمودار ہوئے۔ منصوبے کے مطابق انھوں نے پوایاں کے راجہ کو حضرت محل کی مہر کے ساتھ تحریک انقلاب میں شرکت کی غرض سے مدعو کیا۔ راجہ نے جو نہ صرف بزدل بلکہ عیار بھی تھا۔ جواباً تحریر کیا کہ وہ ذاتی طور پر مولوی صاحب سے ملاقات کرنا چاہے گا۔ احمد اللہ شاہ اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ راجہ کی گڑھی پر بات چیت کے لیے گئے۔ لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ گڑھی کا پھاٹک نہ صرف بند تھا بلکہ مسلح سنتری بھی پہرہ دے رہے تھے۔ جن میں راجہ جگن ناتھ کا بھائی بلدیو سنگھ بھی شامل تھا۔

(V.D. Savarkar: "War of Independence 1857" P. 455)

مولوی صاحب کے مہاوت کے حکم پر ہاتھی نے پھاٹک پر دو تین ٹکریں ماریں۔ راجہ کے ملازمین نے اوپر سے باڑھ ماری ایک گولی شاہ صاحب کے لگی وہ فوراً جاں بحق ہو گئے۔ ساتھ ہی ان کے دونوں ساتھی بھی شہید ہو گئے۔ یہ واقعہ ۱۵ر جون ۱۸۵۸ء بہ روز سہ شنبہ بہ وقت دوپہر وقوع پذیر ہوا۔ (''تواریخ احمدی'' متذکرہ، فتح محمد تائب: صفحہ ۹۱) راجہ وغیرہ باہر آئے۔ مولوی صاحب کا سر قلم کر کے قریب کے تھانے میں لے گئے۔ جہاں انگریز پہلے سے موجود تھے۔ سردیکھ کر ان کی دلی تمنا پوری ہو گئی۔ پوایاں کے تحصیل دار مولا بخش نے کلکٹر شاہ جہان پور کے پاس مندرجہ ذیل عرضی کے ساتھ شاہ صاحب کا سر روانہ کیا۔

''غریب پرور سلامت!

بہ جواب حکم حضور پرنور، مورخہ ۱۵ر جون سر مولوی و کرچ و کلاہ مولوی معرفت راجہ جگن ناتھ ارسال حضور کیا۔ ملاحظہ میں حضور والا کے گزرے گا اور اصل پروانہ مشعر خوش نودی مزاج بندگان حضور بہ طور سند کے کمترین نے اپنے پاس رکھا، اطلاعاً عرض کیا۔

مورخہ ۱۶ر جون ۱۸۵۸ء

عرضی محمد مولا بخش

تحصیل دار پوایاں''

(جنگ آزادی ۱۸۵۷ء متذکرہ، ایوب قادری: صفحہ ۳۰۱)

سر کو نمایش عام اور عوام کو مرعوب کرنے کی غرض سے کوتوالی پر لٹکایا گیا۔ احمد بیگ اور تلارام نے مولوی احمد اللہ کی نعش کی شناخت کی۔ تشہیر عام کے بعد لاش کو جلا کر راکھ کر دیا گیا اور اس جگہ پر گدھوں کا ہل چلوا دیا۔ تمام تھانوں میں سرکاری طور پر اعلان کرایا گیا۔ چناں چہ مجسٹریٹ شاہ جہان پور کی طرف سے ۱۸ر جون ۱۸۵۸ء کو حکم مشتہر ہوا:

''جو کہ احمد اللہ شاہ ''سرغنہ باغیان'' بہ مقام پوایاں بہ مقابلہ جمعیت راجہ جگن ناتھ رئیس پوایاں کے مارا گیا اور سر اس کا بہ مقام کوتوالی لٹکایا گیا۔''

حکم ہوا کہ اور جملہ تھانے داروں کو اطلاع دے کر لکھا جائے کہ وہ اپنے علاقے میں اس بات کو مشہور کردیں، نیز افسران چوکیاں کو بھی اطلاع دے دیں۔ مورخہ ۱۸؍جون دستخط بہ خط انگریزی۔"

(فریڈم اسٹرگل: جلد پنجم، صفحہ ۳۹-۵۳۷)

راجہ جگن ناگھ پچاس ہزار رُپے کے انعام کا مستحق ٹھہرا کیوں کہ مولوی احمد اللہ کے سر کے لیے پچاس ہزار کا انعام مقرر تھا۔ لندن میں اس خبر سے چراغاں ہوا۔ جیسا کہ ہومز نے لکھا:

"شمالی ہندوستان میں ہمارا سب سے بڑا دشمن سب سے خطرناک انقلابی ختم ہوگیا۔"

تاہم ان کی بہادری وحب الوطنی کا اعتراف انھیں دشمنوں نے کیا۔ میلسن نے لکھا:

"یہ مولوی ایک بڑا تجربہ کار شخص تھا۔ کوئی شخص فخر کے ساتھ نہ کہہ سکتا تھا کہ میں نے دوبار سر کالن کیمبل (کمانڈر انچیف ہند) کو میدان میں زک دی۔ مولوی احمد شاہ سچا محب وطن تھا۔ اس نے کسی نہتے کا خون بہا کر اپنی تلوار کو خراب نہ کیا تھا۔ اس نے بہادری کے ساتھ ڈٹ کر کھلے میدان میں ان بدیشیوں کے ساتھ جنگ کی، جنھوں نے اس کا وطن چھین لیا تھا۔ ہر ملک کے سچے بہادر لوگوں کو مولوی احمد اللہ شاہ کو عزت کے ساتھ یاد رکھنا چاہیے۔" (مسلمانوں کا روشن مستقبل، منقول مولوی طفیل منگلوری: صفحہ ۹۲)

وی ڈی ساورکر نے انھیں مندرجہ ذیل الفاظ میں خراج عقیدت ادا کیا:

"اس بہادر محمڈن کی زندگی اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ اپنے عقیدۂ اسلام میں سنجیدہ یقین کامل اور وطن کی مٹی سے گہری جذباتی وابستگی میں کہیں کوئی تصادم نہیں۔ اسلام کا سچا پیروکار اپنے دین سے محبت میں فخر اور مادر وطن کی خاطر شہادت کو اپنا استحقاق سمجھتا ہے۔

(V.D. Savarkar: "War of Independence" op. cit. P. 456)

مولوی احمد اللہ شاہ کی شہادت کا منظر مولانا فتح محمد کی زبانی سنیے:

فقط ساتھ اس شیر کے دور ہے
وہ صادق تھے اللہ کے ہو رہے
زہے ان کی قسمت زہے ان کے بخت
فدا اس غریبی پر سو تاج و تخت
پڑے تھے شہ ملک و عرفان کے گرد
مصاحب ہوں جس طرح سلطاں کے گرد
عیاں ان میں یوں لاشہ شاہ تھا
دو پیکر کے آغوش میں شاہ تھا

(تواریخ احمدی: صفحہ ۹۱)

احمد اللہ شاہ کی شہادت پر روہیل کھنڈ کی جنگ آزادی ہی نہیں، درحقیقت ہندوستان کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ختم ہوگئی۔ یہ وہ بہادر و جانباز مجاہد تھا جس نے جنگ آزادی کی تحریک کا آغاز کیا، اس کی تبلیغ کی، اس کو پروان چڑھایا اور آخر میں اپنی جان دے کر اپنے عزائم و مقاصد کی بلندی پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ روہیل کھنڈ پر قبضے کے بعد انگریزوں نے جذبہ انتقام میں ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ قتل، پھانسی، حبس دوام بہ عبور دریائے شور عام بات تھی۔ بیدوں کی سزا، قید و حوالات تو گویا سزا ہی نہیں تھی۔ جائیدادیں ضبط ہوئیں۔ مجاہدین کے گاؤں اور زمینداریاں خیر خواہوں کو ملیں۔ پھانسی کے لیے کسی مسلمان کا جوان و خوب صورت ہونا اس بات کا کافی ثبوت تھا کہ اس نے ضرور بالضرور انقلاب میں حصہ لیا ہوگا۔"

(قومی محاذ آزادی اور یوپی کے مسلمان: ص ۵۷-۳۵۳)

محمدی میں قومی حکومت کا قیام

(۱)

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

قومی حکومت کا قیام:

مفتی انتظام اللہ شہابی نے لکھا ہے کہ محمدی پر قبضے کے بعد انھوں نے قومی حکومت قایم کرلی تھی اور پورا نظام حکومت درج کردیا ہے۔ حکومت کے سربراہ وہ خود تھے۔ بہ طور قومی مجلس یا شوریٰ کے اعلا اقتدار کے ایک ادارہ قایم تھا۔ عدلیہ، انتظامیہ کے باقاعدہ شعبے قایم تھے۔ اور آزاد قومی حکومت کا اپنا سکہ رواں تھا۔ یہ حکومت تقریباً چھ ماہ قایم رہی۔ یقین ہے کہ حکومت کی کارگزاریوں سے ہندو مسلمان سب مطمئن اور خوش تھے۔ ان کی شہادت پر محمدی او گرد ونواح میں دور دور تک انگریزی حکومت کے خلاف جو ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ وہ احمد اللہ شاہ اور ان کی حکومت کی مقبولیت کا بڑا ثبوت تھا، جس کا بیان پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے۔ حکومت کے قیام و نظام کے بارے میں شہابی صاحب لکھتے ہیں:

> محمدی پر شاہ صاحب نے قبضہ کیا، چاروں طرف دمس بندی کی اور اپنی حکومت پورے طور سے قایم کردی۔ وزیر جنگ جنرل بخت خاں کیے گئے۔ قاضی القضاۃ سرفراز علی جون پوری، نانا راؤ پیشوا دیوان تھے۔ کونسل کے اراکین میں مولوی لیاقت علی الہ آبادی، ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی، مولوی فیض احمد بدایونی، شاہزادہ فیروز شاہ باجبر شریک ہوئے۔ یہ خود تخت نشینی کے متمنی تھے اور اپنا حق سمجھتے تھے۔ مضروب ہو کے سکہ جاری ہوا۔

سکہ

سکہ زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ
حامیٔ دینِ محمدؐ احمد اللہ بادشاہ

(قیصر التواریخ سید کمال الدین حیدر حسنی الحسینی: جلد دوم، صفحہ ۴۶۷)

چھ ماہ ابھی شاہ صاحب کو برسر اقتدار ہوئے، نہ ہوئے تھے سر کالن کیمبل نے قصبہ محمدی پر حملہ کر دیا خوب خوب مقابلہ رہا مگر شاہزادہ فیروز کی باطنی اختلاف سے شاہ صاحب کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور محمدی کو چھوڑنا پڑا۔ شاہ صاحب کے ہٹتے ہی ممو خاں معہ حضرت محل اور نانا راؤ عظیم اللہ اور بخت خاں وغیرہ نیپال کی طرف چلتے ہوئے۔ (تاریخ شاہ جہان پور: صفحہ ۱۳۹) ۱۵/جون کو شاہ صاحب پرگنہ پوایاں میں راجہ بلد یو سنگھ کے کہنے سے نمودار ہوئے۔ تنہا ہتھنی پر سوار تھے۔ راجہ پوایاں کی گڑھی پر تشریف لے گئے مگر بلد یو سنگھ کے بھائی نے پھاٹک بند کر دیا اور گڑھی پر سے گولیوں کی بوچھاڑ ایک ساتھ کر دی۔ سینہ چھلنی ہو گیا راجہ بلد یو سنگھ نے سر مبارک جسم اطہر سے اتارا اور صاحب کلکٹر بہادر شاہ جہان پور کے سامنے پیش کیا جو عرصہ تک کوتوالی پر لٹکا رہا۔ نعش کو آگ میں پھونک دیا۔ (تاریخ شاہ جہان پور: صفحہ ۱۳۹) اس پر سرکار برطانیہ نے پچاس ہزار رُپے نقد راجہ پوایاں کو عطا کیا۔ اور خلعت فاخرہ مرحمت ہوا۔ (صحیفہ زرین مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ) یہ واقعہ شہادت ۱۵/جون ۱۸۵۸ء مطابق ۲/ذی قعدہ ۱۲۷۴ھ کو پیش آیا۔ دریا پار محلہ جہاں آباد متصل احمد پور مسجد کے پہلو میں سر دفن کیا گیا۔ مولوی سید طفیل احمد (علیگ) منگلوری نے کتبہ تاریخ نصب کرا دیا ہے جرنیل ٹامس جو ایک بہادر انگریز تھا اور ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں شریک تھا شاہ صاحب کی بابت لکھتا ہے کہ

> ''مولوی احمد اللہ بڑی لیاقت اور قابلیت رکھتا تھا۔ وہ ایسا شجاع تھا کہ خوف اس کے نزدیک نہیں آتا تھا۔ یہ عزم کا پکا اور ارادے کا مستقل تھا باغیوں میں اس سے بہتر کوئی سپاہی نہیں تھا۔ یہ فخر اسی کو حاصل ہے کہ اس نے دو مرتبہ سر کالن کیمبل کو میدان جنگ میں ناکامیاب رکھا وہ بہ نسبت اور باغیوں کے خطاب شاہ کا زیادہ مستحق تھا۔ اگر محب وطن ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اپنے ملک کی آزادی کے لیے جو غلطی سے برباد ہو گئی ہو، سازشیں کی جائیں اور لڑائیاں لڑی جائیں تو مولوی یقیناً اپنے ملک کا محب صادق تھا۔ اس نے کبھی تلوار کو مخفی اور سازشی قتل سے خون آلود نہیں کیا

وہ بہادرانہ اور معززانہ طور پر ان سے معرکہ آرا ہوا جنھوں نے اس کا ملک چھین لیا تھا۔ دنیا کی ساری قومیں اس کو تعظیم اور ادب کے ساتھ، جو شجاعت وصداقت کے لیے لازمی تھیں اور جن کا مولوی مستحق تھا، اس کو یاد کریں گی۔"

شاہ صاحب کے متعلق ایک شریف جرنیل کے مندرجہ بالا قیمتی الفاظ ہیں۔

رفقا:

امیر احمد شاہ آفاق، قطب شہید، رستم علی، اسماعیل خاں، غلام محمد خاں، کفایت اللہ تلہری، فرقان علی، محمد شاہ خاں شہید، سعد اللہ خاں شہید، نور احمد، احمد یار خاں تحصیل دار، نواب غلام قادر خاں (بٹول)، عبدالرؤف خاں۔ اکثر انڈمان بھیج دیے گئے کچھ کو دار نصیب ہوئی کچھ گوشہ گیر ہو گئے۔

نہ شیشہ نہ مینا نہ ساقی رہا
فقط شکوۂ بخت باقی رہا

(تاریخ احمدی منظوم از مولانا فتح محمد تائب لکھنوی)

(ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما۔ دہلی: صفحہ ۴۳ تا ۴۵)

مولانا سید محمد میاں نے اپنی تالیف شاندار ماضی جلد چہارم صفحہ ۴۰۸ میں سکے کے ساتھ خطبے کے اجرا کا ذکر کیا ہے۔ اگرچہ ہمارے پاس کی کوئی سند موجود نہیں لیکن سکے کے اجرا کے بعد خطبے کا قیام ہرگز بعید از قیاس نہیں۔ البتہ مولانا غلام رسول مہر کو حکومت احمد اللہ شاہ کے قیام کے اعتراف میں تکلف ہے۔ لیکن ایسی صورت میں کہ بہادر شاہ ظفر کی مرکزی حکومت سے احکام کے اجرا اور پیام رسانی کا کوئی نظام نہ تھا۔ مختلف دایروں میں ذمے داروں اور کارگزاروں کو اپنی ہی صواب دید پر فیصلے کرنا پڑتے تھے اور ایسی صورت میں کہ دہلی کی حکومت کو ایک سال پہلے ہی شکست ہو گئی تھی اگر احمد اللہ شاہ اور ان کے قریبی رفقا نے اپنے مفتوحہ علاقے میں کوئی نظام قایم کر لیا تھا تو تعجب نہ کرنا چاہیے۔

(۲/الف)

قصبہ محمدی پر شاہ احمد اللہ صاحب نے قبضہ کرلیا۔ چاروں طرف دس بندی کی ان کی حکومت قایم ہوگئی۔ کابینہ مرتب ہوئی۔ وزیر دفاع جنرل بخت خان، قاضی سرفراز علی، قاضی القضاۃ اور نانا راؤ پیشوا دیوان مقرر ہوئے اور اراکین کونسل میں مولوی لیاقت علی آلہ آبادی، ڈاکٹر وزیر خان اور مولوی فیض احمد بدایونی تھے۔ فیروز شاہ نے پہلے اختلاف کیا۔ پھر انھوں نے بھی شرکت کرلی، شاہ صاحب کا خطبہ وسکہ جاری ہوا۔

سکہ زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ
حامی دین محمدؐ احمد اللہ باد شاہ

احکام شرع کا نفاذ ہوا۔ مگر فلک کج رفتار کو یہ ادا کب پسند تھی۔ ایک مہینہ بھی نہ گزرا کہ سر کالن کمبل نے قصبہ محمدی پر حملہ کردیا۔ سخت مقابلہ ہوا۔ انگریزی فوج کی طاقت اور فیروز شاہ کے اختلاف سے شاہ صاحب کو ناکامی ہوئی۔ محمدی کو چھوڑنا پڑا۔ کچھ لوگ نیپال کی طرف نکل گئے۔ ۵/جون ۱۸۵۸ء کو شاہ صاحب پھر نمودار ہوئے۔ جگن ناتھ سنگھ راجہ پوایاں کے بھائی بلدیو سنگھ کے کہنے میں آگئے۔ اکیلے ہاتھی پر سوار تھے راجہ کی گڑھی پر پہنچے۔ راجہ نے پھاٹک بند کرلیا۔ ہاتھی نے دو تین ٹکریں ماریں، راجہ کے ملازمین نے اوپر سے باڑھ ماری ایک گولی شاہ صاحب کے لگی فوراً جاں بحق ہوگئے۔ سرکاٹ کر لاش پھونک دی گئی●۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!

سر کشتہ بر نیزہ می زد نفس
کہ معراج مرداں ہمیں است بس

(مولانا فیض احمد بدایونی از محمد ایوب قادری: صفحہ ۲۹، ۳۰)

● آپ کا سر شاہ جہان پور میں دفن ہے۔ مولانا طفیل احمد منگلوری مصنف "مسلمانوں کا روشن مستقبل" نے کتبہ لکھوادیا ہے۔

حصہ سوم

شاہ جہان پور اور ۱۸۵۷ء

(مطالعات)

عمومی سیاسی، تاریخی، تحقیقی
اور
''غدر کی کہانی'' کی روشنی میں

ترتیب وتدوین

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

شاہ جہان پور اور ۱۸۵۷ء

(مطالعات)

حصہ سوم

شاہ جہان پور-ایک عمومی سیاسی مطالعہ

شاہ جہان پور

(۱)

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

(الف)

شاہ جہان پور میں میرٹھ کی فوج کے آزاد ہونے کی خبر ۱۵ر مئی کو پہنچی انتظام پر پلٹن نمبر ۲۸ مقرر ہوئی شاہ جہان پور کا مجسٹریٹ رکیٹس (M. Ricketts) چھٹی پر گیا ہوا تھا۔ اور ۱۷ر مئی کو آنے والا تھا۔ مسٹر برام لے (Bramley) اس کا قایم مقام تھا۔ (شاہ جہان پور گزیٹیر (انگریزی) طبع الہ آباد: صفحہ ۱۴۰) امام المجاہدین مولوی سرفراز علی شاہ جہان پور میں اس وقت مقیم تھے۔ انھوں نے جہاد کے لیے وعظ کہنے شروع کیے۔ (تاریخ شاہ جہان پور از صبیح الدین میاں (لکھنؤ ۱۹۳۲ء): صفحہ ۱۹) پلٹن کے سپاہی خاص طور سے مولوی صاحب کے وعظ سے متاثر ہوئے۔ ۲۵ر مئی ۱۸۵۷ء کو عید الفطر کے دن افسران نے خزانہ لٹنے کی خبر سن کر اسپیشل گارڈ اور سنتری مضاعف کرنے کا حکم دیا۔ (گزیٹیر شاہ جہان پور: صفحہ ۱۴۱) اس حکم کو سپاہیوں نے بے عزتی اور بے اعتمادی پر محمول کیا۔ اور اس کے بعد وہ اور بھی بددل اور ناراض ہو گئے۔ فوج نے ۳۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو گرجا گھر میں انگریزوں کو گھیر لیا۔ مجسٹریٹ ضلع رکیٹس (M. Ricketts) کو ختم کر کے اپنی آتش انتقام کو بجھایا کپتان اسنیڈ (Sneyd) موقع پر پہنچا۔ اس کے بعد سکھوں کا ایک وفادار دستہ انگریزوں کی مدد کو پہنچ گیا۔ (گزیٹیر شاہ جہان پور: صفحہ ۱۴۱) روضہ اور چھاؤنی کے بنگلے لٹ گئے انقلابیوں نے خوب داد شجاعت دی۔ تمام انگریز افسر یا تو فرار ہو گئے یا پھر انھوں نے اپنی متاع حیات کو انقلابیوں کے سپرد کر دیا۔ جیکنس (Jekins) جوائنٹ مجسٹریٹ نے راجہ پوایاں کے یہاں پناہ

لی۔ (گزیٹیر شاہ جہان پور: صفحہ ۱۴۲) اور صرف امجد علی ایک ایسے سرکاری افسر تھے جو انگریز کے وفادار رہے۔ انقلابیوں نے خزانہ پر قبضہ کرلیا۔ جیل خانہ کے قیدیوں کو رہا کردیا۔ انگریزوں کی حکومت ختم کردی سارے وفاتر انقلابیوں کے قبضے میں تھے اور پورا شہران کا ہم آواز تھا۔

جب بریلی کی خبریں شاہ جہاں پور پہنچیں کہ بریلی میں خان بہادر خاں کی حکومت قایم ہوچکی ہے تو خوانین شاہ جہان پور اور انقلابیوں نے نواب قادر علی خاں کو ناظم شہر بنالیا۔ (گزیٹیر شاہ جہان پور: صفحہ ۱۴۳) نواب قادر علی نے ایک اعلان جاری کیا کہ انگریزی حکومت ختم ہوچکی ہے اور نئی حکومت نواب خاں بہادر خاں ناظم روہیل کھنڈ کی قایم ہوئی ہے۔ (گزیٹیر شاہ جہان پور: صفحہ ۱۴۳) ۱۶/جون ۱۸۵۷ء کو نواب غلام قادر خاں بانسہ (ضلع بستی) سے شاہ جہان پور پہنچے۔ (گزیٹیر شاہ جہان پور: صفحہ ۱۴۴) نواب غلام قادر خاں، نواب بہادر خاں بانی شہر شاہ جہان پور کے خاندان سے تھے اور یہی سربراہ خاندان تھے وہ اس زمانے میں اپنے پیر سعادت علی خاں نبیرہ غلام علی بانسویؒ کے یہاں گئے ہوئے تھے، جب واپس ہوئے تو شاہ جہان پور کے حالات اور قادر علی خاں کی نظامت کا حال معلوم ہوا چوں کہ نواب غلام قادر خاں شہر کے سربرآوردہ رئیس اور بڑی باوقار شخصیت تھے لہٰذا اہل خاندان، باشندگان شہر اور مجاہدین نے قیادت ان کے سپرد کی۔ ان کے پیرزادگان، رؤف میاں، ظہور میاں پسر میاں سعادت علی نے بھی بڑی ہمت بڑھائی۔ (گزیٹیر شاہ جہان پور: صفحہ ۱۲۹) نواب خان بہادر خاں نے ان کو نظامت شاہ جہان پور کی سند دی۔ (گزیٹیر شاہ جہان پور: صفحہ ۱۴۴) نواب قادر علی خاں ان کے حق میں دست بردار ہوگئے اور شریک و مددگار کی حیثیت سے تحریک میں شامل رہے۔ مجاہدین نے خوب زور پکڑا، نواب غلام قادر خاں نے انتظام بہت اچھی طرح کیا، نظام علی خاں، حامد حسن خاں اور خان علی خاں نائب ناظمان مقرر ہوئے فوج کا کمانڈر عبدالرؤف کو مقرر کیا۔ اور توپ خانہ کا انچارج نواب حشمت خاں کو کیا (گزیٹیر شاہ جہان پور: صفحہ ۱۴۴ و تاریخ شاہ جہان پور: صفحہ ۱۲۹) دو ماہ کے بعد عبدالرؤف خاں مستعفی ہوگئے اور ان کی جگہ واجد علی مقرر کیے گئے۔ آخر میں فوج کی کمان نظام علی خاں کے

سپرد ہوئی جو نہایت جری اور بہادر مجاہد اور شہباز نگر کے بانی شہباز خاں کی اولاد سے تھے۔ (تاریخ شاہ جہان پور: صفحہ ۱۳ و مرقع شہباز نگر از سید ایوب احمد صبر (قلمی مملوکہ محمد ایوب قادری): صفحہ ۱۱-۵ و ۱۷) حامد حسن خاں کی بجائے نجیب خاں مقرر ہوئے جو کہ جلال آباد کے رہنے والے تھے، حامد حسن خاں کو کانٹ کا تحصیل دار مقرر کر دیا۔ (گزیٹیر شاہ جہان پور: صفحہ ۱۴۴) جہاں راجپوتوں نے سخت بغاوت کی تھی راجپوتوں کو بڑی سختی سے دبا دیا گیا۔ (گزیٹیر شاہ جہان پور: صفحہ ۱۴۴) مولوی مظہر کریم سر شتہ دار عدالت مفتی مقرر ہوئے۔

(فریڈم اسٹرگل..... جلد پنجم، صفحہ ۳۰۲)

شاہ جہان پور کے قصبہ تلہر میں غلام محمد خاں نے علم آزادی بلند کیا، تحصیل سے تمام انگریزی نظم و نسق ختم کر دیا گیا، نواب خان بہادر خاں نے ان کو وہاں کا تحصیل دار مقرر کر دیا اور فوجی استحکام کی ہدایت کی چھ ماہ کے بعد یہ پرگنہ کفایت اللہ خاں اور ہدایت اللہ خاں کے سپرد ہوا اور آخر وقت تک انھیں سے متعلق رہا۔ (گزیٹیر شاہ جہان پور: صفحہ ۱۴۵) میران پور کٹرہ میں فیض محمد خاں اور غلامی خاں نے غلامی کی زنجیریں توڑیں اور ہر ایک نے پیادگان کی ایک رجمنٹ بھرتی کی جلال آباد میں احمد یار تحصیل دار مقرر ہوئے۔ (گزیٹیر شاہ جہان پور: صفحہ ۱۴۵) غرض ضلع شاہ جہان پور میں بھی خان بہادر خاں کی حکومت قایم ہوگئی۔

روہیل کھنڈ کے اضلاع، بریلی، بدایوں، شاہ جہان پور اور پیلی بھیت پر تو باقاعدہ نواب بہادر خاں کی حکومت قایم ہوگئی۔ خاص خاص مقامات پر تحصیل اور تھانے قایم ہوئے۔ حسب معمول تحصیل داروں اور تھانے داروں نے کام شروع کر دیا۔ انتظام خوب ہونے لگا مگر روہیل کھنڈ کے باقی اضلاع مراد آباد، بجنور وغیرہ پر اگرچہ باقاعدہ خان بہادر خاں کی حکومت قایم نہ ہوئی مگر ان اضلاع کے مجاہدوں انقلابیوں اور تحریک کے سر برآوردہ حضرات سے خان بہادر خاں کے تعلقات بہت اچھے رہے اور ان علاقوں میں جن قدیم رؤسا نے حکومت قایم کی نواب خان بہادر خاں نے اپنا استحقاق جتا کر ان کے لیے قطعاً کوئی دقت پیدا نہیں کی۔ مراد آباد میں جب نواب مجو خاں اور اولاد نواب دوندے خاں میں نزاع ہوا تو نواب خان بہادر

خاں نے مصالحت کی پوری پوری کوشش کی اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

(جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ واقعات و شخصیات: صفحہ ۴۷-۱۴۴)

انگریزی حکومت کا انتظام

شاہ جہان پور پر قبضے کے بعد انگریزی حکومت نے مجاہدین آزادی اور عوام سے سختی کے ساتھ انتقام لیا۔ اس کے تذکرے اور اس پر تبصرے کے لیے کوئی کہاں سے جگر لائے۔ مولانا سید محمد میاں کا مختصر بیان نقل کرتا ہوں۔

مولانا کہتے ہیں:

"اکتوبر ۱۸۵۸ء میں پورے ضلع شاہ جہان پور پر مکمل طور پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ انگریزی حکومت نے تمام سردار اور رؤسا اور علما کو عبرت ناک سزائیں دیں۔ نواب غلام قادر خان اودھ چلے گئے۔ وہیں بٹول کی پہاڑیوں میں ان کا انتقال ہوگیا۔ نواب قادر علی خاں، عبدالروف خاں، قاضی سرفراز علی کو حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ غلام محمد خاں و کفایت اللہ خان تلہری بھی کالے پانی بھیجے گئے۔ جائیدادیں ضبط ہوئیں۔ احمد یار خاں جلال آبادی گرفتار ہوئے اور پھانسی پائی۔ وسیع مکانات، حویلیاں، محلات، قلعے ڈھادیے گئے۔ غرض کہ کوئی ایسا ظلم نہ تھا، جو روا نہ رکھا گیا ہو۔"

(علمائے ہند کا شاندار ماضی۔ کراچی، ۱۹۸۶ء: جلد چہارم، صفحہ ۴۰۹)

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

(ب)

شاہ جہان پور میں نواب خان بہادر خان کی جانب سے نواب غلام قادر خان ناظم مقرر ہوئے تھے ایک سال انتظام کیا۔ ملحقہ اضلاع مراد آباد، بدایوں وغیرہ سے

انگریز کامیاب ہو کر شاہ جہان پور پہنچے۔ ڈاکٹر وزیر خان اکبر آبادی، مولوی فیض احمد بدایونی جنرل بخت خان نیز دوسرے سردار پھر شاہ صاحب کے پاس پہلے پہنچ چکے تھے۔ ۲۸/اپریل ۱۸۷۸ء کو پچپوریہ کے مقام پر انگریزوں سے مقابلہ ہوا۔ کمانڈر فوج نواب نظام علی خان ❶ ساکن شہباز نگر تھے نظام علی خان نے انگریزی فوج کے چھکے چھڑا دیے اور آخر میں جام شہادت نوش کیا۔ انگریز کامیاب ہوئے۔ شہر کی حفاظتی فوج احمد اللہ شاہ کے سپرد تھی۔ جب انگریز شاہ جہان پور کی طرف بڑھے تو شاہ صاحب نے شہر خالی کر دیا۔ انگریز فوج پرانی جیل میں دمدمہ بندی کر کے مورچہ زن ہو گئی۔ شاہ صاحب نے تین روز کے بعد پلٹ کر حملہ کر دیا اور یہ حملہ ۳/مئی سے ۵/مئی ۱۸۵۸ء تک جاری رہا محصورین کی حالت نہایت نازک ہو رہی تھی۔ جنرل جونس ایک فوج لے کر آ موجود ہوا۔ انگریزی فوج شاہ صاحب کے مضبوط مورچہ پر حملہ نہ کر سکی اور بے ترتیب لڑائیاں ہوتی رہیں کہ اس عرصے میں شاہ صاحب کی مدد کو فیروز شاہ اور حضرت محل کی فوجیں آ گئیں۔ ۱۵/مئی ۱۸۵۸ء کو شاہ صاحب نے دمدمہ بندی پر سخت حملہ کیا مگر جنرل جونس ثابت قدم رہا۔ ۱۸/مئی ۱۸۵۸ء کو سر کالن کمبل بریلی سے فوج لے کر پہنچ گیا۔ شاہ صاحب موقعہ کی نزاکت دیکھ کر مع ہمراہیوں کے قصبہ محمدی چلے گئے۔

---

❶ نظام علی خاں شہباز خان روہیلہ بانی قصبہ شہباز نگر (شاہ جہان پور) کی اولاد سے تھے۔ بڑے بہادر اور جری تھے۔ ان کے محلات کا بقیہ آج بھی شہباز نگر میں موجود ہے۔ آپ کی اولاد میں منشی مظفر علی خان مرحوم سکریٹری میونسپل بورڈ بدایوں تھے۔

(۲)

ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین (علی گڑھ)

خان بہادر خان کے زیر اقتدار ایک اور اہم ضلع شاہ جہان پور بھی تھا۔ یہ ان چند مقامات میں سے ایک تھا، جہاں مولوی سرفراز علی گورکھ پوری انقلاب سے پہلے ہی جہاد کی تبلیغ کر رہے تھے۔ (ڈسٹرکٹ گزٹیئر شاہ جہان پور: صفحہ ۱۴۴) وہ اکثر شاہ جہان پور آتے رہتے تھے جہاں ان کے بہت سے معتقدین تھے۔ ان میں قدرت علی نایب فوج داری سررشتہ دار اور ان کے بھائی نیاز علی بھی تھے، جو انقلابیوں کے ہمدرد تھے۔ شاہ جہان پور میں میرٹھ کی بغاوت کی خبر ۱۵رمئی ۱۸۵۷ء کو پہنچی۔ دفاعی انتظام کے تحت پلٹن نمبر ۲۸ مقرر ہوئی۔ پلٹن کے سپاہی مولوی سرفراز علی کے وعظ سے متاثر تھے۔ ۲۵رمئی عید الفطر کے دن افسروں نے خزانہ لٹنے کی افواہ سن کر خصوصی گارڈ اور سنتری دوگنا کرنے کا حکم دیا جس سے سپاہیوں میں مزید بے اعتمادی اور بے عزتی کا احساس پیدا ہوا۔

۳۱رمئی کو جب انگریز گرجا گھر میں جمع تھے، انقلابی فوجوں نے ان پر یورش کردی۔ اور اندر گھس کے پادری صاحب پر اوّل حربہ کیا۔ لیکن وہ جان سے اس وقت بچ گئے، صرف ایک ہاتھ ان کا جاتا رہا۔ مسٹر ریکٹس صاحب کلکٹر و مجسٹریٹ شاہ جہان پور یہ دیکھ کر اپنے گھر کی طرف بھاگے۔ لیکن سپاہیوں نے تعاقب کیا اور ان کے برآمدے میں پہنچ کر ان کو قتل کیا۔ (مکندلال ''تاریخ بغاوت ہند'': حصہ چہارم، صفحہ ۱۹۵) اس کے علاوہ کچھ اور انگریز افسر بھی مارے گئے۔ کچھ انگریزوں نے گرجا گھر کے اندر کمرے میں اور اوپر برج پر اپنے تئیں بند کر کے کواڑ بند کر لیے تھے اور چوں کہ اس وقت سپاہیان باغی کے پاس بندوقیں نہ تھیں اور صرف لاٹھیاں تھیں اس سبب سے کواڑ نہ توڑ سکے۔ اور جلد چھاؤنی کو ہتھیار لینے گئے۔ یہ موقع پاکر جو صاحب لوگ اور میمیں وہاں تھیں باہر نکلیں اور جو گاڑیاں اور گھوڑے باہر کھڑے ہوئے تھے ان میں سوار ہو

کے پوائیں کی طرف بھاگے۔ پوایاں سرحد اودھ میں واقع ہے، لیکن شاہ جہان پور سے متعلق ہے۔ (ایضاً: صفحہ ۱۹۷) اب یہ ہنگامہ کارزار پوری چھاؤنی میں پھیل گیا تھا۔ انقلابیوں نے وہاں پہنچ کر کمانڈنگ افسر کیپٹن جیمس اور دیگر یورپین افسروں کو مغلوب کرلیا۔ جوائنٹ مجسٹریٹ جنکشن فرار ہوگیا اور راجہ پوایاں کے یہاں پناہ لی۔ (ڈسٹرکٹ گزٹیئر شاہ جہان پور: صفحہ ۱۴۲) اب انقلابیوں نے جیل سے قیدیوں کو آزاد کرایا اور خزانہ پر قبضہ کرلیا۔ انگریزی حکومت ختم ہوگئی۔ سارے دفاتر انقلابیوں کے قبضے میں تھے۔ اور پورا شہر ہم آواز۔ بریلی میں خان بہادر خان کی حکومت قایم ہوجانے کی خبر سن کر خوانین شاہ جہان پور اور انقلابیوں نے نواب قادر علی خاں کو ناظم شہر مقرر کیا۔ (ڈسٹرکٹ گزٹیئر شاہ جہان پور: صفحہ ۱۴۲) شہر کی سڑکوں پر جلوس نکالا گیا جس میں خان بہادر خاں کے اقتدار کا اعلان ہوا۔ بعد ازاں انقلابی دستے مولوی سرفراز علی کی قیادت میں بریلی کی جانب روانہ ہوگئے۔ اپنی ۹ رستمبر ۱۸۵۸ء کی رپورٹ میں کلکٹر شاہ جہان پور نے قلم بند کیا تھا:

> ''بغاوت کے پھوٹ پڑنے پر باغی دستے کی شکل میں بریلی گئے۔ ان کے ساتھ گورکھ پور کا مولوی سرفراز علی بھی تھا۔ غالباً یہ لوگ بیس دن قبل ہی اکٹھا ہوگئے تھے۔ سپاہیوں کو بھڑکانے میں بلاشبہ مولوی کا ہاتھ تھا۔''

(S. A. A. Rizvi: Freedom Stuggle in U.P., Vol.V, p. 297)

نظامت کی منتقلی:

جب شاہ جہان پور میں یہ ہنگامہ ہوا تو نواب غلام قادر خان ابن ابن نواب احمد خاں ابن نواب مصطفیٰ خاں عرف حاجی میاں ابن نواب فیض اللہ خاں ❶ جو بانی شہر شاہ جہان پور کے خاندان سے تھے، اپنے پیر سعادت علی شاہ نبیرہ غلام علی بانسوی کے یہاں تشریف لے گئے تھے۔ جب واپس ہوئے تو اہل خاندان، باشندگان شہر اور

❶ یہاں غلام قادر خاں کو ابن حاجی میاں لکھا گیا تھا حال آں کہ وہ نواب احمد خان کے بیٹے اور حاجی میاں کے پوتے تھے، لیکن یہ علماے ہند کی شاندار ماضی کی غلطی تھی جو نقل ہوگئی تھی۔

مجاہدین نے قیادت آپ کے سپرد کی۔ آپ کے پیرزادگان رؤف میاں وظہور میاں پسران شاہ سعادت علی نے ہمت بڑھائی۔ نواب خان بہادر خاں نے سند نظامت دی، نواب قادر علی ان کے حق میں دست بردار ہوگئے، لیکن شریک ومددگار کی حیثیت سے تحریک میں شامل رہے۔ (محمد میاں ''شاندار ماضی'': صفحہ ۸-۴۰۷) نواب غلام قادر خاں نے نظم ونسق سنبھالنے کے بعد نظام علی خان، حامد حسن خاں اور خان علی خان نایب مقرر ہوئے۔ فوجی دستوں کی کمان عبدالرؤف کو دی گئی۔ نواب حشمت خان کو توپ خانے کی ذمے داری سپرد کی گئی۔ عبدالرؤف کے استعفیٰ کے بعد ان کی جگہ واجد علی آئے۔ حامد حسن کے کانٹ کے تبادلے کے بعد ان کی جگہ نجیب خاں کو دی گئی۔ کانٹ میں راجپوتوں کا خطرہ بڑھ رہا تھا۔ مردان خان کی سربراہی میں ایک دستہ بریلی سے ان کی سرزنش کے لیے بھیجا گیا۔ مردان خان نے انھیں نہ صرف شکست دی بلکہ سخت سزائیں بھی دی۔ (Freedom Struggle in U.P., op. cit., Vol. V, pp. 298-311) ''نواب غلام قادر خان کا دور قریب ایک سال رہا۔ جنرل بخت خاں، نواب تفضل حسین، شاہ زادہ فیروز شاہ، نواب اسماعیل، ڈاکٹر وزیر خاں، مولوی فیض احمد بریلوی، شاہ احمد اللہ اور نانا راؤ وغیرہ شاہ جہان پور میں جمع ہوگئے۔

(شاندار ماضی: متذکرہ، صفحہ ۴۰۸)

تلہر، میراں پور اور جلال آباد:

مواضعاتی علاقوں میں بھی خان بہادر خاں کا اقتدار مستحکم کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ تلہر میں انقلابیوں کی رہنمائی غلام محمد خاں کر رہے تھے۔ انھوں نے پولیس اسٹیشن اور تحصیل پر قبضہ کرلیا۔ اور تحصیل سے انگریزی اقتدار کا قطعی طور پر خاتمہ ہوگیا۔ خان بہادر خاں نے انھیں وہاں کا تحصیل دار مقرر کردیا۔ چھ ماہ بعد یہ پرگنہ کفایت اللہ خاں اور ہدایت اللہ خاں کے سپرد ہوا۔ لیکن غلام محمد خاں کا فعال کردار بدستور جاری رہا۔ (ڈسٹرکٹ گزیٹیر شاہ جہان پور: صفحہ ۱۴۴) میراں پور کٹرہ میں فیض محمد خاں اور غلام خاں نے غلامی کی زنجیریں توڑیں۔ ہر دو نے پیادگان کی ایک ایک رجمنٹ بھرتی کی۔ جلال آباد میں پرانے تحصیل دار احمد یار کو نئی حکومت نے قایم رکھا انھوں نے بچھو ریا گی

لڑائی میں حصہ لیا۔ ۲۸/اپریل ۱۸۵۸ء کو جب انگریز جلال آباد پر قابض ہو گئے تو ان کو علاحدگی اختیار کرنی پڑی۔

معرکہ کارزار:

۲۸/اپریل ۱۸۵۸ء کو نظام علی خاں ● نے بچپوریا کے گھاٹ پر انگریزی فوج کے چھکے چھڑا دیے اور انھیں بھاری نقصان پہنچایا۔ (شاندار ماضی: متذکرہ، صفحہ ۴۰۸) شہر کے مورچے کی کمان شاہ احمد اللہ صاحب کے سپرد تھی۔ باڑی کو چھوڑنے کے بعد وہ خیر آباد چلے گئے جیسا کہ ان کے نام سید کاظم علی داروغہ کے خط مورخہ ۲۸/اپریل ۱۸۵۸ء سے اندازہ ہوتا ہے۔ (خط کے حوالے کے لیے ملاحظہ ہو (Freedom Struggle in U.P., Vol. II, p. 378) جلد ہی انھوں نے روہیل کھنڈ کے لیے خیر آباد بھی چھوڑ دیا اور شاہ جہاں پور کے قرب وجوار میں پہنچ گئے۔ ادھر ۲۸/مئی ۱۸۵۸ء کو سر کالن کیمبل بڑی کثیر فوج کے ساتھ شاہ جہاں پور آیا۔ اور ۳۰/کو اس پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت انقلابیوں کی رائے ہوئی کہ اب یہاں سے ہٹ کر محمدی پور کی گڑھی پر قبضہ کیا جائے۔ کیمبل دو دن بعد بریلی کے لیے روانہ ہوا اور کرنل ہیل کو اس جگہ حفاظت کے لیے چھوڑ گیا۔ احمد اللہ شاہ کو جن کا صدر مقام اب محمدی تھا جونہی اس کا علم ہوا انھوں نے فوراً ہی شاہ جہان پور پر حملہ کا ارادہ کر لیا۔ (Kaye & Malleson, Vol. IV, p.372) یہ فیصلہ صرف پندرہ سو مسلح آدمی ساتھ ہونے نیز خود احمد اللہ شاہ کی اپنی طبیعت کی خرابی کے باوجود اس لیے کیا گیا کہ دشمن رات کی تاریکی میں اچانک حملے کی تاب نہ لا سکے گا۔ بدقسمتی سے ان کے سپاہی چار میل کے فاصلے پر آرام کے لیے رک گئے۔ جاسوسوں نے فوراً کرنل ہیل کو ہوشیار کر دیا۔ اور یوں اسے اتنا موقع مل گیا کہ اس نے اپنے آپ کو جیل کے احاطے میں محفوظ کر لیا۔ احمد اللہ شاہ نے شہر اور قلعہ دونوں پر قبضہ

● نواب غلام قادر خاں شاہ جہان پور کے ناظم تھے، وہ شہر چھوڑ کر بچپوریا گئے ہی نہیں تھے۔ یہ بات فوج کے کمانڈر نظام علی خاں کے بارے میں درست ہے۔ یہ غلطی بھی ڈاکٹر عابدہ مقالہ نگار کی نہیں ماخذ سے نقل کی غلطی ہے۔)

کرلیا۔ اور وقتاً فوقتاً محصورین پر گولہ باری بھی جاری رہی۔ یہ صورت حال ایک ہفتے سے زیادہ چلی۔ ۱۱ / مئی ۱۸۵۸ء صبح بریگیڈیر جونس کی سربراہی میں کالن کیمبل کی جانب سے بھیجی ہوئی تازہ کمک پہنچ گئی۔ پہنچتے ہی اس کی مڈبھیڑ مختصر سے انقلابی دستے سے ہوئی جو بعد میں شہر کی جانب لوٹ گیا۔ جونس اور ہیل اگرچہ ایک دوسرے سے مل تو گئے تاہم جلد ہی انھوں نے محسوس کیا کہ مزید کمک کے بغیر کامیابی ممکن نہیں۔ جونس نے بریلی مدد کے لیے درخواست بھیجی۔ انقلابیوں کی جانب سے ان کے کئی اہم ترین رہنما مثلاً حضرت محل، خان بہادر خان، فیروز شاہ، اور اسماعیل خان بھی شاہ جہاں پور میں پہنچ کر مولوی احمد اللہ شاہ کے ساتھ شریک ہو گئے تھے۔

(S. Moinul Haq: "The Great Revolution." p.545)

۱۵ / مئی کو انقلابیوں نے زبردست حملہ کیا۔ جونس نے بہادری سے مقابلہ کیا لیکن دفاعی حیثیت میں رہا۔ اس نے کمانڈر انچیف کو پیغام بھیجا جو اسے فتح گنج میں ۱۶ / مئی کو موصول ہوا۔ ۱۸ / مئی ۱۸۵۸ء کو سر کالن کیمبل بریلی سے فوج لے کر پہنچ گیا۔ شاہ صاحب موقعے کی نزاکت دیکھ کر ہمراہیوں کے ساتھ قصبہ محمدی چلے گئے۔ اور قصبہ محمدی اور صدری سڑک پر شاہ صاحب کا قبضہ ہو گیا۔

(ایوب قادری ''جنگ آزادی ۱۸۵۷ء'': صفحہ ۲۹۹)

نینی کی لڑائی:

کمانڈر انچیف کو شاہ صاحب کی فوج کی واپسی سے بڑا سکون حاصل ہوا۔ شاہ جہان پور میں افواہ پھیل گئی کہ حضرت احمد اللہ شاہ کسی اور جگہ چلے گئے ہیں۔ سبھی عیسائی خوش تھے کہ ان کی دلی خواہش بھی یہی تھی۔ (فتح محمد تائب ''تواریخ احمدی'' نیا ایڈیشن: صفحہ ۱۱۱)
لیکن کالن کیمبل کسی حملے کی موافقت نہیں تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ موجودہ فوج مقابلے کے لیے ناکافی ہوگی۔ لیکن دشمن نے انھیں زیادہ آرام کا موقع نہیں دیا۔ ایک بار پھر حملہ ہوا۔ اگرچہ آخر میں انقلابیوں کو پسپائی کا منہ دیکھنا پڑا تاہم وہ جس بے جگری سے لڑے وہ بے مثال تھی۔ ان کا تعاقب بھی نہیں کیا گیا۔

(Kaye & Malleson, op. cit., Vol. IV, p.378)

یہ انگریزوں کی کامل فتح نہیں تھی۔ احمد اللہ شاہ فتح گڑھ جانے والی سڑک کی جانب لوٹ گئے۔

شاہ جہان پور پر مکمل قبضے کے بعد حسب روایت انگریزی حکومت نے تمام سردار ورؤسا کو عبرت ناک سزائیں دیں۔ نواب غلام قادر خاں اودھ چلے گئے۔ وہیں بٹول کی پہاڑیوں میں انتقال کیا۔ نواب قادر علی خاں، عبدالرؤف خاں، قاضی سرفراز علی کو حبس دوام بہ عبور دریاے شور کی سزا ہوئی۔ غلام محمد خاں اور کفایت اللہ خاں تلہری بھی کالے پانی بھیجے گئے۔ جائیدادیں ضبط ہوئی۔ احمد یار خاں جلال آبادی کو پھانسی دی گئی۔ وسیع مکانات، حویلیاں، محلات، قلعے ڈھائے گئے۔ غرضے کہ کوئی ظلم ایسا نہ تھا جو روا نہ رکھا گیا ہو۔ (شاندار ماضی: صفحہ ۴۰۹) (قومی محاذ آزادی.....: صفحہ ۵۲-۳۴۷)

(۳)

ماخوذ

۳۱ رمئی ۱۸۵۷ء (اتوار) کو جب انگریز گرجا گھروں میں تھے، انقلابیوں نے گرجا کو گھیر لیا۔ انگریزوں میں چند مارے گئے۔ تقریباً ۲۲ مرد عورتیں موقع پا کر گرجا سے نکل بھاگے اور چند مسلح وفادار ہندوستانی سپاہیوں کی حفاظت میں پوائیں کے لیے روانہ ہوگئے۔ گرجا کا پادری ان سے بچھڑ گیا تھا، جو بھاگنے اور بچنے چھپنے کی کوشش میں کسانوں کی نظر میں آگیا اور قتل ہوگیا۔ دیگر مضرورین کا قافلہ پوائیں پہنچ گیا۔ جنھیں پوائیں کے راجا نے اپنے یہاں عدم حفاظت کا خوف دلا کر اگلے روز ہی محمدی بھجوادیا۔ اور چند دن ہی گزرے تھے کہ انھیں قتل کر دیا گیا۔

گرجا پر حملہ کرنے والوں میں جواہر رائے، گنگا دوبے، نرائن پانڈے، شیو چرن، رام نرائن دوبے وغیرہ تھے۔ انگریزی اقتدار ختم ہونے کے بعد نظام علی سابق کوتوال کو تھانے کا انچارج بنایا گیا۔ قادر علی خاں نے ناظم اور غلام حسین خاں نے نایب ناظم کی حیثیت سے انتظامیہ کی باگ ڈور ہاتھ میں لی۔ باغی سپاہ میں گھنشام سنگھ صوبے دار سب سے نمایاں تھا۔

شاہ جہان پور کی بغاوت کو منظم کرنے میں مولوی سرفراز علی گورکھ پوری کا نمایاں رول ہے۔ انھوں نے تقریریں اور جہاد کی تلقین کی، دیسی سپاہ کو تیار کیا، انھیں اپنے بعض مریدین کے ذریعے فوج میں رسوخ حاصل ہو گیا تھا۔ اور ۳۱ مئی سے بیس دن پہلے یہاں آکر بغاوت کی سازش مکمل کردی۔ اس موقعے پر انھوں نے مولوی مظہر کریم کے گھر ہندو مسلمان حاضرین کے سامنے انگریزوں کے خلاف پرجوش تقریر کی۔ جس میں قدرت علی نایب سررشتہ، فوج داری، نظام علی زمین دار شہباز نگر، قدرت علی، عبدالرؤف خاں انسپکٹر مدارس اردو، سیتل سنگھ، دولت رائے، کالکا پرشاد چھوٹے زمین دار، گھنشام سنگھ صوبے دار میجر، منگل خاں وغیرہ موجود تھے۔

انہی سرگرمیوں کا نتیجہ تھا کہ آس پاس کے تمام گاؤں دلاور پور، رس رتھ پور، زین الدین نگر، نبی پور، مصری پور، سرورا، عزیز گنج، الذر پور، سہرامئو (پوایاں میں)، دھنیا پور، دھانی پور، شاہ باز پور، نجلا پور نواخا، اندا پور، اولوا پور، کاری، مکرند پور، چوندیرہ وغیرہ کے عوام بغاوت میں شریک تھے۔ (فریڈم اسٹرگل: جلد ۵، صفحہ ۹۷-۲۹۶)

انقلابی رہنماؤں میں قدرت علی (نایب فوج داری سررشتہ دار)، نیاز علی، حامد حسن ڈپٹی کلکٹر، نظام علی (سابق تحصیل دار) چودھری عبدالعلی وغیرہ انتظامات میں شریک رہے۔ نواب قادر علی نے حاکم بن کر انتظام سنبھالا۔ بعد میں کچھ لوگ جن میں عبدالرؤف (ڈپٹی انسپکٹر تعلیم)، نقش بند خاں، فیض خاں، غلام علی، ناصر خاں (محلہ خلیل) نظام علی (ساکن شہباز نگر)، نظام علی، خاں کوتوال، سیتل سنگھ، دولت رائے واجد علی وغیرہ تھے۔ ۱۵ رجون ۱۸۵۷ء کو بریلی گئے اور خان بہادر خاں سے غلام قادر خاں کو ناظم بنانے کی درخواست کی چناں چہ غلام قادر ناظم اور یہ عہدے دار مقرر ہوئے۔

نظام علی خاں (شہباز نگر): نایب ناظم
خان علی خاں (سابق تحصیل دار، بیسل پور-بریلی): نایب ناظم
حامد حسن خاں (سابق ڈپٹی کلکٹر): نایب ناظم
عبدالرؤف خاں: کمانڈر فوج

سیتل سنگھ: دیوان اور
مولوی مظہر کریم سر رشتہ دار کو مفتی شہر مقرر کیا گیا۔

فوجی انتظام سنبھالنے والوں میں کالکا پرشاد، ظہور خاں، اسرار خاں، قدرت اللہ، مہدی علی، نواب حشمت، امیر علی، حیدر خاں، رجب علی، ولایت علی، ناصر علی (الہ گنج کی جنگ میں شہید) علی حسن، منگل خاں (عبدالرؤف خاں کے سالے) وغیرہ تھے۔ ظہور احمد پیش کار اور رؤف احمد (محرر فوج داری) نے نمایاں حصہ لیا۔ یہ دونوں بھائی تھے اور کافی با اثر تھے (بعد میں اودھ چلے گئے)۔ عبدالرؤف خاں کے بعد واجد علی (سابق ناظر منصفی) کو کمانڈر اور حامد حسن کے استعفیٰ کے بعد نجیب خاں نایب ناظم ہوا۔ مفتی مظہر کریم سر رشتہ دار فوج داری کو مفتی شہر (شاہ جہان پور) اور ایک ہزار رُپے ان کی خدمات کا (ریواڈ) مقرر کیا گیا۔ (فریڈم اسٹریگل: جلد ۵، صفحہ ۲۹۸)

دوسرے علاقوں مثلاً تلہر، کٹرہ، میراں پور، جلال آباد، محمدی وغیرہ میں بھی انگریزی اقتدار ختم کر دیا گیا۔ تلہر میں بغاوت کی خبر پہنچتے ہی یہاں سے چلے جائیں۔ سرکاری عمارتوں پر قبضہ کیا، قیدی رہا کر دیے۔ جلال آباد کے ناظم تحریک انقلاب کے شروع ہی میں سرگرم رکن تھے، پھانسی کی سزا پائی۔ فیض اللہ خاں (سابق محافظ دفتر) نے جاسوسی کا محکمہ سنبھالا تھا تمام سابق عہدہ داروں نے اپنی خدمات نئی حکومت کو پیش کر دی تھیں دیوانی کے ایک سو چار اور فوج داری کے اکھتر ملازمین محمدی حکومت میں عہدے سنبھالے ہوئے تھے۔ ہدایت علی ساکن تلہر اور فیض محمد وغیرہ نے ۱۰ ر فروری ۱۸۵۸ء کو ہلدوانی پر فوجی مہم میں شریک تھے۔ دہلی کی شکست کے بعد بھی یہاں مولوی سرفراز علی نے پر جوش کارروائیوں سے عوام کے حوصلے بلند رکھنے پوری کوشش کی۔ مفتی مظہر کریم کی سربراہی میں عیدگاہِ شاہ جہان پور میں انگریزوں کے خلاف ایک زبردست جلسہ ہوا جس میں انگریزی راج کے خاتمے کی دعا کی گئی۔ کٹرہ میراں پور میں فیض محمد اور غلامی خاں نے فوج منظم کی تھی۔

لکھنؤ کی شکست کے بعد (اپریل، مئی ۱۸۵۸ء) شاہ جہان پور میں مولانا احمد اللہ شاہؒ کی سرگرمیاں، جنھوں نے انگریز تاریخ نویسوں کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ شاہ

جہان پور ستمبر ۱۸۵۸ء تک میدان میں ڈٹا رہا تھا۔ اس نے شکست کیا کھائی روہیل کھنڈ اور اودھ میں سناٹا چھا گیا۔ بچھوریا کا معرکہ ہندوستان میں انقلابی جدوجہد کا آخری معرکہ تھا۔ کاتب تقدیر نے شکست کا فیصلہ لکھ دیا اور قوم کی آزاد آرزوؤں پر کفن کی چادر بڑ گئی۔

اہم انقلابی سرداروں میں نظام علی خاں جو بچھوریا کے معرکے میں کام آئے تھے، قاسم علی کمانڈر، اعتقاد علی (سابق روزنامچہ نویس) جو جہاد کے لیے دہلی چلے گئے تھے۔ رعایت علی ناظم تلہر، کفایت علی، خادم حسین تحصیل دار تلہر، سلطان حسین خاں منصف تلہر (خان بہادر خان کا بھتیجا)، سید محمود حسین (مفتی پیلی بھیت)، مون چند، جانکی پرشاد، میر باز خاں، رام سہائے (تلہر)، برکت اللہ خاں، گردھاری لال (تلہر)، امراؤ سنگھ (تلہر)، صوبے دار میجر گھنشام سنگھ، سید نیاز علی، تراب علی وغیرہ تھے۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں ہے کہ جنوری ۱۸۵۸ء میں نواب غلام قادر نے حامد حسن خان سابق ڈپٹی کلکٹر کو انگریزوں سے خط و کتابت کے جرم میں قتل کرایا تھا۔ فتح گڑھ اور لکھنؤ کی شکست کے بعد نواب تفضل حسین خان فرخ آباد، فیروز شاہ اور نانا صاحب یہاں سے گزر کر بریلی گئے۔

شاہ جہان پور-ایک تاریخی مطالعہ

شاہ جہان پور جاگ اُٹھا!

اچ آر نیول

میرٹھ میں فوجی بغاوت ہوجانے کی خبر ۱۵رمئی ۱۸۵۷ء کو شاہ جہان پور پہنچی۔ اس وقت یہاں ۲۸ نمبر ہندوستان پلٹن تعینات تھی۔ اس کا سول چارج مسٹر براملے (Mr. Bramly) کے پاس تھا جو بہ طور قایم مقام کے تھا۔ کیوں کہ پلٹن کے کمانڈنگ آفیسر مسٹر ایم رکیٹس (Mr. M. Ricketts) موجود نہ تھے۔ وہ ۱۷رمئی کو واپس آگئے۔ یہاں کے فوجی افسران کو ہندوستانی سپاہیوں پر تھوڑا بہت اعتماد تھا۔ حال آں کہ نئے کارتوسوں میں ہڈی کا برادہ ملانے کی خبریں یہاں بھی پھیل چکی تھیں۔ اس طرح یہاں بھی سپاہیوں میں نفرت اور بغاوت کے آثار پیدا ہوچکے تھے۔ اور گورکھ پور کے مولوی سرفراز علی کی گورنمنٹ برطانیہ کی مخالفت کی خبریں یہاں پہنچ چکی تھیں، اور جب مولوی صاحب دہلی کی باغی فوج جس کو غازیوں کی فوج کہا جاتا تھا، چیف مقرر ہوئے تو یہاں کی فوج بھی بغاوت پر آمادہ ہوگئی اور ۲۵رمئی ۱۸۵۷ء عید الفطر کے روز بعض سپاہیوں نے افسران کو آگاہ کردیا کہ شہر کے عوام چنور کے روز سرکاری خزانہ لوٹنے والے ہیں۔ فوجی حکام نے جو سپاہیوں کا تھوڑا بہت اعتبار بھی کرتے تھے، مگر کچھ مشکوک ہوگئے اور ڈبل ڈیوٹیاں لگا کر حفاظتی انتظام کو مضبوط کیا، مگر ان باتوں کو کوئی زیادہ اہمیت نہ دی گئی۔ بغاوت کے تذکرے تو ہوتے رہے، مگر یہاں بغاوت کو زیادہ متوقع نہ سمجھا گیا، کیوں کہ یہاں پلٹن میں ۱۵۰ سکھ اور زیادہ تر وفادار سپاہی تھے۔ ان کو بہت ہی وفادار سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا کمانڈر سے حفاظتی احکام کو منسوخ بھی کردیا مگر ڈیوٹیاں ڈبل لگی رہیں اور چنور کے میلے تک کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا یعنی اتوار ۳۱رمئی تک۔

بغاوت کی ابتدا:

۳۱ رمئی بہ روز اتوار جب کہ تمام انگریز چرچ میں جمع تھے۔ سپاہیوں کی ایک جماعت نے چرچ پر حملہ کر دیا۔ تلواروں اور لاٹھیوں سے مسلح چھ سات سپاہی چرچ کے اندر گھس گئے۔ مسٹر ریکیٹس کو دروازے کے پاس ہی ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ مگر دیگر افسران نے ان باغیوں کو باہر نکال کر کواڑ بند کر لیے اور عورتوں کو چرچ کے برج میں پہنچا دیا۔ اتنے میں کپتان اسنیڈ (Sneyd) تنہا بندوق لے کر آ گئے۔ اب باغی شہر کی طرف متوجہ ہو گئے اور فی الحال چرچ والوں کو مہلت مل گئی۔ اس کے بعد ہی سکھ اور وفادار سپاہی آ گئے اور فوری طور سے یہ مصیبت ٹل گئی۔ لیکن اس عرصے میں کئی آفیسر وغیرہ مارے گئے۔ مثلاً کیپٹن جیمس (James) کمانڈنگ آفیسر سپاہیوں کو کچھ سمجھا بجھا رہے کہ ان کو قتل کر دیا گیا، اسی طرح مسٹر جے میکیولم (Mr. J. Maccullum) جو چرچ سے نکل بھاگے تھے اور ایک میل دور پہنچ گئے تھے کہ ان کو دیہاتیوں نے ٹھکانے لگا دیا۔ کلکٹری کے ایک کلرک لیمیسٹر (Mr. Lomaistre) چرچ کے اندر ہی قتل کر دیے گئے اور ان کی لڑکی کا آج تک پتا نہیں۔ کلکٹر کے ایک اور کلرک اسمتھ (Mr. Smith) کو کلکٹری کے پاس ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ اسسٹنٹ مجسٹریٹ مسٹر اے سی اسمتھ (A.C. Smith) اپنے بنگلے میں بخار میں مبتلا پڑے تھے۔ حالات خراب دیکھے تو شہر میں پناہ لینے بھاگے جا رہے تھے کہ سپاہیوں نے ان کو پہچان لیا، وہ ایک کچی جھوپڑی میں گھس پڑے۔ ان کو وہیں کوٹھری کے قریب ہی قتل کر دیا۔ ۲۸ ویں ہندوستانی پلٹن کے ڈاکٹر سرجن مسٹر ایچ ایچ باولنگ (Surgen H.H. Bowling) چرچ جاتے ہوئے قتل کر دیے گئے، جب کہ ان کی بیوی اور بچہ چرچ کے اندر پہنچ گئے۔ جہاں رجمنٹ کے دوسرے افسران بھی جمع تھے۔ باغی اس وقت چھاؤنی کے علاقے میں لوٹ مار اور گھروں کو جلانے میں مصروف تھے۔

اس کے بعد جوائنٹ مجسٹریٹ مسٹر جین کنس (Jenkins) نے اس بات پر بہت زور دیا کہ پوایاں کی طرف پسپا ہو کر پناہ حاصل کی جائے۔ لہٰذا اس وقت کے وفادار اور اعتماد کے سرکاری آفیسر تحصیل دار محمد امجد علی کو ہدایت کی کہ وفادار سپاہیوں کو

مطلع کر دیا جائے کہ فوراً شاہ جہان پور چھوڑ دیں اس وقت فرار ضروری ہے کیوں کہ باغی سپاہی دور ہی سے ہم پر فائرنگ کر رہے ہیں اور اس وقت ان کی ساری توجہ خزانے اور خزانچی کے گھر کی لوٹ مار میں لگی ہوئی تھی۔ بلوائیوں نے جیل توڑ کر قیدیوں کی بھی ایک بڑی تعداد کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور ان کے ساتھ شہر کی طرف بڑھ رہے تھے۔

فرار:

اس فیصلے کے بعد ایک بگھی میں گیارہ عورتیں بچے سوار ہوئے اور ایک سارجنٹ (حوال دار) اور دس آفیسر کل بائیس افراد کی ایک پارٹی پوایاں کی طرف روانہ ہوئی۔ دو میل سفر کرنے کے بعد ان کو وفادار سوار بھی مل گئے، مگر بعد میں ایک سوار باغیوں میں مل گیا۔ مسٹر جین کنس پوایاں کے راجہ جگن ناتھ سنگھ کے پاس پہلے ہی پہنچ گئے تاکہ فوجیوں کی حفاظت کا مناسب انتظام کریں، راجہ اپنی بزدلی کی بنا پر انھیں پناہ دینے کے انجام سے خوفزدہ تھا۔ حال آں کہ وہ دل سے وفادار تھا۔ راجہ نے دوسرے ہی دن اس قافلے کے محمدی جانے پر اصرار کیا، اس کا کہنا تھا کہ وہ باغیوں کے مقابلے میں ان کی حفاظت نہیں کر سکے گا۔ اس کے اپنے لوگوں کی بھی یہی رائے تھی، وہ نہ تو باغیوں سے کوئی سمجھوتا کرنے کے لیے تیار تھے اور نہ ان کا مقابلہ ہی کر سکتے تھے۔ یہاں انھیں ڈپٹی کمشنر تھامسن (Mr. Thomson) کا ایک خط ملا جس میں، اس نے بھی یہی خیال ظاہر کیے تھے کہ راجہ بلوائیوں کے معاملے میں تمہاری مدد نہیں کر سکے گا۔ چناں چہ راجہ نے روانگی کا انتظام تو کر دیا اور سیتا پور سے آئی ہوئی گاڑی کے ذریعہ ایک حفاظتی دستے کے ساتھ انھیں روانہ کر دیا اور یکم جون ۱۸۵۸ء کو یہ قافلہ بہ حفاظت محمدی (ضلع سیتا پور) پہنچ گیا۔ وہاں لکڑی کے تاجر مسٹر شیلڈس جو شاہ جہان پور میں کاروبار کرتے تھے، ان سے مل گئے۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر وہاں پہنچے تھے کیوں کہ باغی ان کی تاک میں تھے کہ ان کے پاس بہت روپے ہیں۔ محمدی کے پناہ گزینوں کا حال یہ ہوا کہ وہ محمدی سے سیتا پور جاتے ہوئے راستے میں اورنگ آباد کے قریب اودھ کے باغی فوجیوں کے ہاتھوں قتل کر دیے گئے۔ (ان کا

تفصیلی حال (کھیری ضلع سیتاپور) کے حالات میں کیا گیا ہے۔)

شاہ جہان پور میں "روضہ" میں دو انگریز اور تھے، ایک جی پی کریو (Mr. G.P. Carew) اور دوسرے مسٹر برانڈ (Mr. Brand) جس روز بلوہ ہوا تھا، فیکٹری اسی روز لوٹ کر پھونک دی گئی تھی مگر یہ دونوں جان بچا کر بھاگے اور موضع گواری میں چیت رام چوبے کے گھر پناہ لی، بعدہٗ کچھ راجپوتوں کے ساتھ موضع کنیگ ہو کر پوایاں کا راستہ پکڑا اور ملن پور (سیتاپور) پہنچے۔ یہاں سے راجہ دھورہرا (Dhaurahar) کے ذریعے لکھنؤ روانہ کیے گئے۔ مگر پتا لگا کہ یہ لوگ ایک سازش کے ماتحت یہاں لائے گئے ہیں تو وہ ان کی گرفت سے نکل کر بھاگے، مگر مسٹر کریو پکڑے گئے، انھیں لکھنؤ پہنچا دیا، جہاں وہ قتل کر دیے گئے اور مسٹر برانڈ کافی عرصے ترائی کے علاقے میں مارے مارے پھرتے رہے اور پھر بخار میں مبتلا ہو کر نیپال کے بٹوال کے مقام پر فوت ہو گئے۔

شاہ جہان پور شہر میں:

جب باغی شہر میں داخل ہوئے تو انھوں نے اپنی طرف سے انتظامیہ قایم کیا، چناں چہ کوتوال نظام علی خاں کو کوتوال بحال رکھا، قادر علی خاں (کو گورنر) اور غلام حسین خاں کو جوائنٹ گورنر بنا دیا۔ شہباز نگر کے نظام علی خاں کو جو پہلے بھی تحصیل دار تھے، تحصیل دار مقرر کیا، حامد حسین کو ڈپٹی کلکٹر بنایا لیکن لوٹ کھسوٹ بدستور جاری رہی۔ باغی شام کو کنٹونمنٹ کو واپس ہو گئے اور صبح کو مولوی سرفراز علی کو ساتھ لے کر بریلی روانہ ہو گئے، اس کے بعد جب بریلی میں بغاوت ہو جانے کی خبر یہاں پہنچی تو قادر علی خاں نے شہر میں ایک جلوس نکالا اور اعلان کرا دیا کہ انگریزی حکومت ختم اور خان بہادر کی سرکردگی میں روہیلہ حکومت قایم ہو گئی ہے۔ لیکن شہریوں کو یہ حکومت پسند نہ ہوئی کیوں کہ قادر علی خاں مال دار شہریوں سے مختلف طریقوں سے رُپیہ وصول کرتے تھے۔ ۸/ جون کو سیتاپور سے باغیوں نے آ کر عزیز گنج میں پڑاؤ ڈال دیا۔ ان میں کی ایک جماعت شہر میں داخل ہوئی۔ اور لوی (Levy) یعنی سامان جنگ کے لیے رُپیہ پیسہ وصول کرنا چاہا، مگر جب دیکھا کہ حامد حسین خاں ڈپٹی کلکٹر نے اچھی طاقت شاہ

جہان پور میں حاصل کر لی ہے اور سارا شہر ان کے ساتھ ہے تو یہ سیتا پور والے باغی فتح پور کو روانہ ہو گئے۔

۱۶ر جون کو نواب غلام قادر خاں جو اس عرصے میں مقام بانسی ضلع بستی گئے ہوئے تھے شاہ جہان پور واپس آئے اور فوراً بڑے خدم چشم کے ساتھ بریلی کو روانہ ہو گئے، اور تھوڑے ہی عرصے میں قادر علی خاں کی معزولی اور اپنے لیے ''ناظم اعلا شاہ جہان پور'' کا پروانہ لے کر واپس آ گئے۔ اب ان کے تین ڈپٹی مقرر ہوئے۔ نظام علی خاں، حامد حسن خاں اور خاں قلی خاں جنھوں نے تحصیل شاہی ضلع بریلی کا خزانہ لوٹا تھا اور عبدالرؤف خاں کو چیف کمانڈر مقرر کیا، انھوں نے ایک فوج مرتب کی جس میں چار فوجی پلٹنیں نو اسکواڈرن (سوار) اور بارہ براس گن کا توپ خانہ تھا۔ یہ سب فوج ایک پنشنر نواب حشمت خاں کی کمانڈ میں دے دیا، ایک سال بعد جب جنرل ہیولاک (Havelock) کے ذریعے کان پور میں باغیوں کی پسپائی کی خبریں یہاں پہنچیں تو چیف کمانڈر عبدالرؤف کے ساتھ بہت باغیوں نے بھی استعفیٰ دے دیا، اب ان کی کمانڈ کی جگہ منصفی کے ناظر واجد علی کو مقرر کیا گیا۔ ڈیڑھ ماہ بعد جلال آباد کے نجیب خاں کو حامد حسین خاں کے بجائے مقرر کیا گیا، نجیب خاں اودھ میں کچھ روز ملازمت بھی کر چکے تھے۔ ان کو کانٹ میں مال گذاری وصول کرنے پر تعینات کیا گیا لیکن کانٹ کے قریب موضع لاڑ پور کے ٹھاکروں نے مخالفت کی، اس کو بہ آسانی کچل دیا گیا۔ مگر بہر حال ہندو زمین داروں سے انتظام وصولیابی مشکل معاملہ تھا۔ اور ایسا ہی کچھ مشکل معاملہ بدایوں اور دیگر ملحقہ اضلاع کا بھی تھا۔

جون کے آخر میں چند ہندو زمین داروں نے شہر شاہ جہان پور پر حملے کی دھمکی دی۔ اس وجہ سے نظام علی خاں کو موضع بھٹیلا بھیجا گیا اور اس طرح بڑے بڑے سرکش زمین دار اور دیگر لوگ مارے گئے۔ مگر اتبارا (Atbara)، سہرامئو، بلتھرا، شاہ گنج، شر تاولی (Sirtaull) اور اَمورا کے ہندو لوگ شہر خاص اور نواحی مواضعات کے لیے خطرہ بنے رہے۔ اور تقریباً انتظامیہ کے قابو سے باہر رہے۔ نظام علی خاں نے ایک بار سہرامئو کو مغلوب کرنے کی کوشش کی تو ان کو بریلی سے امداد لینی پڑی اور وہاں سے

خان بہادر خاں کے کمانڈنگ آفیسر مردان علی خان ایک بڑی فوج لے کر آئے راجپوتوں کو مغلوب و منتشر کیا اور بہتیرے قتل ہو گئے۔ بہت سے مقتولوں کے کٹے ہوئے سر قلعے کے پھاٹک پر لوگوں کو دکھائے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روضہ وغیرہ کی لوٹی ہوئی بہت دولت واپس مل گئی اور شاہ جہان پور لائی گئی۔

اس ضلع کے اس وقت کے بیشتر حالات ہم کو مسٹر مونی (Mr. Money) کے بیانات کے مجموعے سے ملتے ہیں۔ جب ۳۱ رمئی کی شاہ جہان پور کی بغاوت کی خبر تلہر پہنچی تو یہاں کے ایک مشہور پٹھان غلام محمد خاں نے تلہر کے تحصیل دار کو برخاست کر دیا۔ تھانے پر قبضہ کر لیا اور جملہ کاغذات برباد کر دیے۔ دوسرے روز انھوں نے باغیوں کی دعوت کی اور ان کی مدد سے مفرور تحصیل دار کو تلاش کیا، مگر وہ کسی اور پٹھان کے گھر میں پوشیدہ رہے اور ہاتھ نہ آئے۔ اب خان بہادر خاں نے غلام محمد خان کو تلہر کا ناظم اعلا مقرر کر دیا اور ان کو فوج بھرتی کرنے کا بھی حکم دیا۔ لیکن چھ ماہ بعد ان کو دو تحصیل داروں کفایت اللہ اور ہدایت اللہ نے برطرف کر دیا اور پورے پرگنے کو کاشت کارانہ پٹے پر لے لیا۔ اس کے باوجود غلام محمد خاں اپنی فوج کے ساتھ ہلدوانی وغیرہ کے معرکوں میں کئی بار بڑے جرأت مندانہ طور سے شریک رہے۔ وہ دو تحصیل دار عرصہ تک قایم رہے، مگر پھر اس کے بعد فرار ہو گئے۔ مگر بعد میں گرفتار ہو گئے اور ان کو کسی نامعلوم جگہ روانہ کر دیا۔ ان کی جملہ جائیداد ضبط کر لی گئی۔

کٹرا میں باغیوں کے سب سے زیادہ مشہور سرغنہ فیض محمد خاں اور غلامی خاں تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی پلٹن (پیدل فوج) تیار رکھی تھی۔ لیکن کھیڑا بجھیڑا کے راجپوت مسلمان حکومت کے خلاف تھے اور بیشتر انگریزوں سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ اور بریلی کے پناہ گیر کپتان گووان (Captain Gowan) اور دیگر انگریزوں کی کئی ماہ حفاظت کر کے اپنی وفاداری کا ثبوت دیتے رہے۔ حتیٰ کہ اکتوبر میں ایک نجات دہندہ امدادی پارٹی مسٹر جے کراکرافٹ ولسن (Mr. J. Cracroft Wilson) کی سرکردگی میں تھوڑی سی فوج کے ساتھ گنگا پار کر کے علی گڑھ سے آ گئی تھی۔

جلال آباد میں اس وقت احمد یار خان تحصیل دار تھے۔ جو یہیں کے باشندے تھے، پہلے انھوں نے باغیوں کی ہم دردی میں بہت سے ملزمان قیدیوں کو چھوڑ دیا تھا۔ اس کے بعد غلام قادر خاں کے شاہ جہان پور آنے تک کچھ نہیں ہوا۔ احمد یار خاں بدستور انگریز تحصیل دار قایم رہے۔ بعد ازاں ناظم کے عہدے پر ترقی بھی ہوگئی۔ اس عہدے پر بڑی کوشش اور مستعدی سے کام کیا۔ اس سختی کا انجام یہ ہوا کہ کھنڈر اور گرد و نواح کے راجپوت برگشتہ ہوگئے۔ مجبوراً احمد یار خان نے بریلی سے رجوع کیا۔ وہاں سے اسماعیل خاں کی سرکردگی میں امدادی فوج آگئی۔ جس نے کھنڈر کے علاقے کو برباد کر دیا۔ صد ہا ٹھاکر موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ اس کے بعد احمد یار خان نے بجیوریا کے معرکے میں باغیوں کے ساتھ شرکت کی اور اس کے بعد ۲۸/اپریل ۱۸۵۷ء میں جب انگریزی فوج جلال آباد میں داخل ہوئی تو احمد یار خاں نے خود کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ اُن پر مقدمہ چلا اور راجپوتوں کی خوش نودی کے لیے شارع عام پر ان کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ اس کے بعد جلال آباد اور پرگنہ بن گاؤں نے مستقل طور سے انگریزوں کی مدد اور مسلمانوں کی مخالفت کی! اور باغیوں کی پسپائی کے وقت ان کو خوب لوٹا مارا۔

علاقہ پوایاں:

پوایاں کا راجہ جگن ناتھ سنگھ تھا۔ مگر سارا انتظام اس کے بھائی بلدیو سنگھ کے ہاتھ میں تھا۔ یہ اس فکر میں تھے کہ پوری تحصیل پوایاں کو اپنے قبضے میں کر لیں۔ اس کے لیے پہلے اپنی حویلیوں کی قلعہ بندی کی، بندوقیں خریدیں اور ایک پیدل اور گھوڑ سوار فوج بھرتی کی۔ لگان وصول کرنا بھی شروع کر دیا۔ لیکن خان بہادر خان نے بڑا فوجی دستہ روانہ کیا اور اس سے مال گذاری طلب کی۔ اس نے مرعوب ہو کر سمجھوتا کر لیا اور سالانہ تیس ہزار رُپے بہ طور نذرانہ اور ایک لاکھ رُپے مال گذاری دینا منظور کر لیا۔ اس طرح کھوٹار کا راجہ لاکھن ساہ بھی بریلی جا کر اپنے لیے کھوٹا اور پورن پور کی تحصیل وصول کی منظوری کا پروانہ لے آیا۔ درحقیقت وہ عملاً باغیوں کا طرف دار ہی تھا۔ اس پر

کچھ الزامات اور شبہات بھی کیے گئے مگر اس سے کچھ زیادہ تعرض نہ کیا گیا۔

کچھ دیگر واقعات:

دہلی میں باغیوں کی شکست تک یہاں باغیوں کی حکومت خوب چلتی رہی۔ جب دہلی میں دوبارہ انگریزی حکومت قایم ہوگئی تو یہاں کے باغیوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ منصف قاضی سرفراز علی خان نے اس بات کی کوشش کی کہ اسلامی جھنڈا لہرا کر دہلی کے باغیوں کی شکست کی خبر کے خوف ناک اثرات کو کم کیا جائے۔ مگر یہ کچھ سود مند نہ ہوا۔ ٹائیں ٹائیں فش ہوگئی! حال آں کہ ایک رسمی جلوس خاموشی کے ساتھ عیدگاہ تک لے گئے اور عیدگاہ شاہ جہان پور میں تین دن تک دعائیں مانگی گئیں کہ دوبارہ انگریزوں کی حکومت قایم نہ ہو۔

کچھ روز کے بعد بخت خان دہلی سے آیا۔ اس کے ساتھ ۳۰ ہاتھی، ۴۰۰ گھوڑے، ۱۵۰۰ پیدل سپاہی۔ چار توپیں نیز ۱۲۰۰ عورتیں بھی تھیں۔ بخت خاں چند روز تک ناظم کی خاطر ومدارات میں رہے اس کے بعد فرخ آباد کے نواب آئے۔ ان کے ساتھ فیروز شاہ اور اسماعیل خاں بھی فتح گڑھ سے پسپا ہو کر آ گئے۔ ایک اور آنے والا بہت مشہور نانا صاحب مرہٹہ تھا۔ اس نے چرچ کے پاس آم کے باغ میں ڈیرا ڈالا اور دس روز بعد بریلی جا کر خان بہادر خاں سے مل گئے۔

اس عرصے میں سرکار انگریزی کے وفادار ملازمین جو اس نواح میں تھے، نیز اطراف وجوانب کے وفادار افسران وغیرہ نینی تال میں مسٹر الیگزنڈر کمشنر اور آگرہ کے دیگر بڑے افسران سے رابطہ رکھے رہے۔ جن باغی ملازمین نے پہلے کار نظامت سنبھالا تھا، ان میں حامد حسن خاں بھی تھا۔ اور اس کا بھائی احمد حسن خاں جو آگرہ میں صدر امین بھی رہا تھا وہ بھی آخر تک انگریزوں کا وفادار رہا تھا۔ یہ دونوں بھائی غلام قادر خاں کی نظر میں مشکوک ہوگئے ان دونوں کو شاہ جہان پور میں دھوکے سے قتل کر دیا گیا۔

فوجی کارروائی:

جب لکھنؤ اور فتح گڑھ پر دوبارہ انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ تو سر کولن کیمبل (Sir

(Colin Campbell کو روہیل کھنڈ پر متوجہ ہونے کا موقع ملا۔ لہٰذا یہ طے پایا کہ ایک فوج جنرل پینی (Penny) کی کمانڈ میں ندولی (Nadauli) کے مقام پر گنگا ندی کو پار کر کے کٹرہ کی طرف بڑھے۔ جہاں اس کو وال پول (Wal Pole) کے ڈویژن سے ملنا تھا، جو لکھنؤ سے آرہا تھا۔ اسی عرصے میں بریگیڈیر جان جونس (John Jones) کورڑکی سے مراد آباد پہنچنا تھا۔ تاکہ وہ وہاں سے شمال ومغرب کو مڑ جائیں۔ اس عرصے میں بریگیڈیر سیٹن (Seaton) نے فتح گڑھ میں جنوب کی طرف سے آنے والے باغیوں کا راستہ روک رکھا تھا۔ بعد میں اس کو معلوم ہوا کہ بریلی روڈ پر کافی تعداد میں باغی جمع ہیں۔ اور اللہ گنج، کانکر اور دومیل شمال میں بن گاؤں میں باغیوں کی پوزیشن بہت مضبوط ہے۔ لہٰذا جب سٹین کو معلوم ہوا کہ اللہ گنج کی پوزیشن بہت مضبوط ہے اور اس پر حملہ خطرے سے خالی نہیں ہے، تو اس نے کانکر کی طرف سے ارادہ کیا، لہٰذا ۶ا راپریل ۱۸۵۸ء کی رات کو فتح گڑھ سے روانہ ہوا۔ اس کے ساتھ یک ہزار پلٹن کی نفری تین سو سوار اور پانچ توپیں تھیں۔ صبح ہو جانے پر کانکر پہنچا اور دشمن کی سوار فوج کو بھگا دیا۔ اس معرکے میں لیفٹننٹ ڈی کنزو (De Kantzow) نے نمایاں کام کیا، اور جس گاؤں پر باغی قابض تھے اس پر قاہرانہ حملہ کر دیا۔ تقریباً ڈھائی سو باغی مارے گئے اور تین توپیں بھی ہاتھ آئیں۔ انگریزی فوج میں صرف پانچ مارے گئے اور سترہ زخمی ہوئے اس کارنامے کا بڑا اچھا اثر پڑا۔ باغیوں نے اللہ گنج کو خالی کر دیا اور رام گنگا کا پل توڑ دیا۔ اور روہیل کھنڈ میں چلے گئے تاکہ دوآبہ کے علاقے پر ان کے حملے کی منصوبے میں خلل نہ پڑے اور خطرہ دور ہو جائے۔ ۲۸راپریل ۱۸۵۸ء کو پھر بھی جنرل وال پول فوج کی مزاحمت اللہ گنج میں کی گئی۔ اس معرکے میں بچپوریا کے محاذ پر نظام علی خاں کو شکست ہوئی، وہ شہید ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلال آباد پر انگلش فوج کا قبضہ ہو گیا۔ اگلے روز ۳۰راپریل کو وال پول اور سر کولن کیمپبل دونوں معہ فوج کے شاہ جہان پور پہنچ گئے۔ اس وقت شاہ جہان پور باغیوں سے خالی تھا۔ کیوں کہ باغیوں نے مولوی احمد اللہ شاہ فیض آبادی کی سرکردگی قبول کر لی تھی۔ جو باغیوں کا بڑا مشہور لیڈر تھا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ مرہٹہ سردار نانا صاحب بھی

وہاں موجود تھا اور اس نے مشورہ دیا تھا کہ شہر کے خاص خاص مکانات اور عمارات تباہ کردی جائیں تا کہ انگریزوں کو کہیں بھی پناہ نہ مل سکے۔ انگریزی فوج نے عزیز گنج میں پڑاؤ ڈالا اور ۷۹ ویں ہائی لینڈرس بٹالین کی دو کمپنیوں کا قلعہ پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا، جو سامنے ہی تھا اور اس کے کچھ حصے میں گورنمنٹ کی شراب کی بھٹی بھی تھی۔ ۲رمئی ۱۸۵۸ء کو سرکولن کیمپبل کٹرا کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں ندولی کی فوج بھی اس سے مل گئی۔ یہ قرابینوں والی فوج (Carabineers) تھی جو کہ جنرل پنی کی کمانڈ میں تھی۔ جنرل پنی بدایوں ضلع کے معرکے میں کام آچکا تھا۔

جیل کی حفاظت:

کمانڈر انچیف نے اپنے بریلی روانہ ہونے سے پیشتر کرنل ہیل (Hale) کو شاہ جہان پور کا انچارج بنادیا تھا۔ ان کی حفاظتی فوج میں ایک دستہ ۸۲ پیدل بٹالین اور ڈی کینزو (De Kantzow) کی بے ترتیب (Irregular) سوار فوج اور چار توپیں شامل تھیں۔ اس کے جانے کے دوسرے روز باغیوں کے سرغنہ مولوی احمد اللہ شاہ محمدی کی طرف آگئے۔ اور باغیوں نے مولوی صاحب کی سرکردگی میں جیل پر حملہ کردیا۔ اس کے نتیجے میں حفاظتی فوج جیل کے اندر جانے پر مجبور ہوگئی۔ کیوں کہ جیل کرنل ہیل کے کیمپ کے قریب ہی تھا اور اس کو ایک روز قبل ہی مضبوط اور محفوظ کیا گیا تھا۔ یہاں یہ فوج ۹ دن تک مولوی احمد اللہ شاہ کے محاصرے میں رہی کیوں کہ انھوں نے قلعہ پر قبضہ جما رکھا تھا۔ اور شہر کے باشندوں سے فوجی بیگار کے طور پر رقم وصول کی جارہی تھی۔ اور انگریزی فوج کے مقابلے کے لیے جیل کے بالکل سامنے ۸ توپیں نصب کر رکھی تھیں۔ کنٹونمنٹ میں جہاں فوجی اسلحہ گودام تھا اس پر ۳رسے ۱۱رمئی تک لگاتار گولا باری ہوتی رہی۔ جب ان حالات کی اس طرح تبدیلی کا علم کولن کیمپبل کو ہوا تو اس نے فوراً ایک بریگیڈیر جان جونس کی قیادت میں روانہ کردیا جس میں ۶۰ ویں رائفلز، ۷۹ ویں ہائی لینڈرس، ۸۲ ویں پیدل بٹالین کے بچے کھچے نوجوان، ۲۲ ویں پنجابی بٹالین، دو اسکوارڈن قرابینوں (Carabineers) والے، ملتان ہاؤس اور رایل ہارس

آرٹیلری شامل تھیں۔ جان جونس ۱۱ رمئی کو نبیا (Nibia) گھاٹ پہنچا، وہاں مڈ بھیڑ ہوئی اور معمولی مقابلے کے بعد دائیں بائیں سے گھیر گھار کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ باغی گھبراہٹ میں نبیا گھاٹ کے پل کو بھی صحیح چھوڑ گئے اور وہ پل انگریزی فوج کے کام آیا، بعد ازاں جان جونس نے گرّا ندی کے بائیں کنارے کنارے ایڈوانس کیا اور باغیوں کو قلعے، کھنّوت کے پختہ پل اور دوسرے مقامات۔ سے بھی بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ مگر خوف کی وجہ سے شہر میں داخل ہونے کی ہمت نہ پڑی، بلکہ مشرق سے گھوم کر لودھی پورے سے ہو کر کرنل ہیل سے جا کر مل گیا۔

مولوی احمد اللہ شاہ کی پشت یعنی شہر کی طرف سے پوزیشن مضبوط تھی۔ ایسا ناممکن نظر آیا کہ ہلّہ کر کے قبضہ کر لیا جائے۔ دوسرے یہ کہ باغیوں کی طاقت و تعداد بڑی تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔ اور دیگر اتفاقی امداد فیروز شاہ اور بیگم اودھ کے آجانے سے حاصل ہو گئی تھی۔ لہٰذا غیر مسلسل جھڑپیں وغیرہ ہوئی ہیں۔ تا آں کہ ۱۵ ر مئی ۱۸۵۸ء کو مولوی احمد اللہ شاہ نے انگریزی محاصرے پر ایک بہت بڑا حملہ کر دیا۔ بڑا سخت جنگی معرکہ ہوا۔ مگر جونس اپنے مورچہ پر مضبوطی سے ڈٹا رہا حال آں کہ اس کے پاس جوابی حملے کے لیے کافی فوج نہیں تھی۔ مگر خوش قسمتی سے سر کولن کیمپبل ۱۸ ر مئی کو بریلی سے واپس آ گیا۔ یہاں پھر جونس کو مایوسی ہوئی۔ اب وہ باغیوں کو فیصلہ کن جنگ کے لیے مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ کیوں کہ واپسی میں ایک سوار فوجی گشتی دستے نے فائرنگ کر کے باغیوں کو چوکنا کر دیا تھا کہ بریلی سے مدد آگئی ہے لہٰذا باغی مستعدی سے تیار ہو گئے۔ لہٰذا بے سوچے سمجھے اندھا دھند سواروں کی ایک جھڑپ ہو گئی اور باغی ایک طرف ہو گئے۔ اور اپنی فوج کی کمی کی وجہ سے باغیوں کا تعاقب کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس کے بعد سر کولن نے کرنل کوک (Colonel Coke) کو امداد کے لیے طلب کر لیا۔ جو پیلی بھیت کی طرف خان بہادر خان کے تعاقب میں ایک بریگیڈ کے ساتھ الگ کر دیے گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باغی شہر چھوڑ کر چلے گئے اور شہر باغیوں سے خالی ہو گیا۔ جیل کا محاصرہ بالکل ختم ہو گیا۔ انگریزی فوج نے محمدی تک باغیوں کا تعاقب کیا۔ مگر یہاں بھی باغیوں نے مقابلہ نہ کیا اور محمدی پر بہت

معمولی مزاحمت کے بعد انگریزی فوج کا قبضہ ہو گیا۔

شاہ جہان پور پر قبضہ:

مذکورہ بالا ناکامی کے بعد مایوسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ باغیوں سے شاہ جہان پور کا پورا شہر خالی ہو گیا اور عام لوٹ مار شروع ہو گئی۔ شہر کے تمام باشندے باہر بھاگ گئے، لیکن جانی نقصان بہت کم ہوا۔ ۲۵ رمئی ۱۸۵۸ء کو سر تھامس سیٹن (Sir. Thomas Seatan) شاہ جہان پور فوج کا کمانڈر مقرر ہوا۔ موسم گرما میں اس کی خاص ذمہ داری اودھ کی سرحد پر توجہ رکھنی تھی۔ یہ سرحد متواتر حملوں کا نشانہ تھی۔ اس مہم میں سر تھامس کو بہادر ڈی کینز و سے مدد دی گئی۔ ڈی کینز و نے روہیل کھنڈ کے نام پر ایک فوج (Rohil Kand the Auxiliary Levy) یعنی ''جبراً فوجی امداد'' کے نام سے قایم کی اور اس کے ساتھ کچھ عرصہ تک ضلع شاہ جہان پور کے شمالی حصے میں شاردا ندی کی طرف مشغول رہا۔ کیوں کہ بلوائیوں کو قلعہ اور پلیا (Palia) قصبے سے اُسی طرف کو کھدیڑ دیا گیا تھا۔

احمد اللہ شاہ کا قتل:

۵ رجون ۱۸۵۸ء کو ایک ایسا واقعہ رونما ہوا۔ جس نے ضلع کے امن و امان کے قیام پر بہت بُرا اثر ڈالا۔ مولانا احمد اللہ شاہ پوایاں پہنچے تا کہ راجہ پوایان کو انگریزوں کے خلاف اُکسا کر ایک نیا اتحاد قایم کریں، اس روز ڈی کینز و راجہ کا مہمان تھا۔ مولوی احمد اللہ شاہ گڑھی پہنچے تو ڈی کینز و نے راجہ کو بڑھاوا دیا اور ان کو قلعے کے اندر آنے سے روک دیا گیا۔ تو مولانا نے جبراً گھسنا چاہا تو راجہ بلدیو سنگھ نے مولانا کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ راجہ فوراً مولوی کا سر لے کر اپنے بھائی کے ساتھ شاہ جہان پور روانہ ہو گیا اور عین اس وقت جب کہ مسٹر مونی (Mr. Money) مجسٹریٹ شاہ جہان پور اپنے چند احباب کے ساتھ شام کا کھانا کھا رہے تھے، مکان میں داخل ہوئے اور مولانا کا قلم کیا ہوا سر ان کے سامنے فرش پر لڑھکا دیا جسے دیکھ کر مسٹر مونی اور ان کے دوست حیرت زدہ رہ گئے۔

آخری معرکہ:

یہ معرکہ ۵/ اکتوبر ۱۸۵۸ء کو پیش آیا۔ اس روز راجہ پوایاں نے باغیوں کا ایک حملہ معمولی نقصان کے بعد پسپا کر دیا۔ نیز بہت اہم معرکہ مشرقی سرحد کے چند میل قریب سرتھامس سیٹن کو پیش آیا جہاں انھوں نے باغیوں کی بڑی تعداد کو راستہ ہی میں روک دیا۔ ایک معمولی سی جھڑپ میں باغیوں کو شکست ہوگئی۔ ۳۰۰ باغی مارے گئے اور تین توپیں ہاتھ آئیں۔

انتقام:

اقتدار کی بحالی کے بعد حساب کتاب چکانے کا وقت آیا۔ باغیوں کے جو رہنما میدانِ جنگ میں قتل ہونے اور مارے جانے سے بچ گئے تھے، ان پر بغاوت کے الزام میں مقدمات چلائے گئے اور سولی پر لٹکا دیا گیا یا جیل بھیج دیا گیا۔ زمین داریاں اور جائیدادیں تو سبھی کی ضبط کر لی گئیں۔ قبضے کے کچھ عرصے کے بعد غلام قادر خان کا انتقال ہو گیا۔

ان کے لڑکے محمد خان کا انتقال ۱۸۷۸ء میں ہوا۔ ان کے لڑکے منظور احمد خان شاہ آباد ضلع ہردوئی میں رہتے ہیں۔ پٹھانوں میں خاص کر شاہ جہان پور کے پٹھانوں کو زیادہ اور تلہر کے پٹھانوں کو بھی بہت زیادہ نقصانات پہنچے۔

ہندو بغاوت میں بہت کم شریک تھے۔ بلکہ بیشتر مواقع پر روہیلوں کی سخت مخالفت اور مزاحمت کرتے رہے۔ کھنڈر اور بن گاؤں کے ٹھاکروں نے کھل کر انگریزوں کی حمایت کی اور اپنی وفاداری کا ثبوت دیا۔ جس پر ان کو انگریزی حکومت کی طرف سے بڑے انعامات و اکرام سے نوازا گیا۔ ان کو مسلمانوں کی ضبط کی ہوئی زمین داریاں دی گئیں۔ پرگنہ کھیڑا بجھیڑا کے راجپوتوں نے بریلی کے انگریزوں کو پناہ دی اور ان کی بڑی حفاظت اور مدارات کی تھی۔ ان میں سے انعام پانے والوں میں بھیکھا سنگھ اور بھورے سنگھ خاص ہیں۔ ان میں ہر ایک کو ہزار ہزار رُپے مال گذاری کی زمین داریاں دی گئیں اور ان کی زندگی بھر کے لیے ایک چوتھائی مال گذاری معاف رہی،

اور اسی گاؤں کے گنگا رام مصرا اور چندن پرساد برہمن دونوں کو دو دو ہزار رُپے مال گذاری کی جائیدادیں انعام میں دی گئیں۔ ان کی بھی حین حیات چوتھائی مال گذاری معاف رہی۔

وفادار مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ مثلاً میکلین (Mr. Maclean) اور اس کے رشتے داروں کو پناہ دینے کے صلے میں۔ شاہ جہان پور کے ناصر خاں اور امیر علی جنھوں نے مقتول انگریزوں کی لاشیں اس روز دفن کی تھیں اور غلام حسن نے کمسریٹ (رسدگاہ) کی بلڈنگ کی حفاظت کی تھی اور یہاں ملازم بعض ہندو سرکاری وفادار ملازمین کو بچانے میں انسانیت اور وفاداری کا ثبوت دیا تھا۔ اب امن وامان بحال ہوگیا ہے۔ اور جملہ سرکاری اور عوامی کاروباری امور معمول کے مطابق انجام پا رہے۔

(شاہ جہان پور۔ اے گزیٹیر۔ الہ آباد، ۱۹۱۰ء: صفحہ ۱۵۱-۱۴۰)

شاہ جہان پور کی بغاوت

خان بہادر مولوی مطیع اللہ خاں

ایک دردناک مشہور واقعہ ہے جس کی ہجری تاریخ "غدر ہندی" (۱۲۷۳ھ) ہے یہ سانحہ ہماری ولادت سے کئی سال پہلے کا ہے اس لیے سرکاری تحریروں کو سامنے رکھ کر ہم اس کا نقشہ کھینچنا چاہتے ہیں، مگر جو واقعہ زبانوں سے دوسرے طور پر دریافت ہوا اس کا تذکرہ مختصراً کریں گے۔

یہ عبرت خیز ہنگامہ جس نے دہلی میں بزم تیموریہ کی ٹمٹمائی ہوئی شمع کو ہمیشہ کے لیے خاموش اور مسلمانوں کے اقتدار و اعتبار کو حرف غلط کی طرح صفحۂ ہند سے مٹا دیا۔ یہ ۱۸۵۷ء کا اندوہ ناک واقعہ ہے۔ اس کا شگوفہ اس سرزمین پر کھلا جہاں سو برس پہلے لارڈ کلایو نے انگریزی حکومت کا پودا نصب کیا تھا یعنی بارک پور کی مشہور چھاؤنی میں جو کلکتہ سے سولہ میل پر تھی شورش پیدا ہوئی اور صوبہ ہذا میں اس کا آغاز چھاؤنی میرٹھ سے ہوا۔ آغاز ۱۸۵۷ء میں بازاروں اور فوجی چھاؤنیوں میں یہ افواہ مشہور ہوئی کہ گورنمنٹ نے گائے وسور کی چربی ملے ہوئے کارتوس منگائے ہیں، جو فوج کو منہ سے کاٹ کر استعمال کرنا پڑیں گے اور گائے وسور کی ہڈی کا برادہ ملا ہوا آٹا منگوایا ہے جو رعایا کے استعمال کے لیے بازاروں میں فروخت کیا جائے گا۔ اور ان تدابیر سے ہندو مسلمانوں کو بے دھرم کر کے عیسائی بنایا جائے گا انھی دنوں آغاز ماہ اپریل میں ایک ہندو فقیر فیل سوار جس کی اردلی میں کئی سوار چلا کرتے تھے۔ بڑے ساز وسامان سے میرٹھ میں وارد ہوا۔ ہندوستانی فوج کے سپاہیوں نے اس سے اظہار عقیدت کیا۔ حکام نے اس کو جاسوس سمجھ کر میرٹھ چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ بہ ظاہر اس نے تعمیل کی مگر بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ پلٹن نمبر ۲۰ کی لین میں کئی دن تک چھپا رہا جس کی وجہ سے کرنل کو فوج کی وفاداری پر شبہ ہوا اور انھوں نے اس کے خیالات کا پتا لگانے کے لیے

رسالہ نمبر ۳ بنگال احاطہ کو نئے کارتوس استعمال کرنے کا حکم دینا تجویز کیا اور ایک سپاہی برجموہن نے جس کا باپ سور پالا کرتا تھا اظہار وفاداری یا کسی اور وجہ سے یہ مشہور کیا کہ اس نے نئے کارتوس استعمال کیے ہیں اور سب کو بے تامل استعمال کرنا چاہیے جس کا یہ نتیجہ پیدا ہوا کہ اس کا گھر ۱۳ / اپریل کو پھونک دیا گیا اور اس کے بعد آتش زنی کے واقعات کنٹونمنٹ میں ادھر اُدھر ہونے لگے۔ جس کا کرنل نے باوجود اختلاف رائے افسران ماتحت کے ۲۳ / اپریل کو رسالہ نمبر ۳ کی پریڈ مقرر کی تاریخ مقررہ سے ایک دن پہلے ہندو مسلمانوں نے یک جا ہو کر حلف کیا کہ اگر کارتوس کاٹنے کا حکم ملے تو اس کی تعمیل نہ کی جائے۔ چناں چہ دوسرے دن پریڈ پر کمانڈنگ افسر نے بندوقچیوں کو کارتوس کاٹنے کا حکم دیا تو انھوں نے اس کی تعمیل سے انکار کر دیا۔ عدول حکمی کے الزام میں وہ گرفتار کر لیے گئے اور کورٹ مارشل نے اسی سواروں کو دس دس سال قید اور پانچ سپاہیوں کو پانچ پانچ سال قید کی سزا تجویز کر کے حکم سزا سنانے کے لیے پریر ہندوستانی و یورپین سپاہ جمع کی گئی ملزمان پاپیادہ حراست میں لائے گئے اور حکم سزا بہ آواز بلند پڑھ کر ان کو سنایا گیا پھر ان کی وردی اُتاری گئی اور بیڑیاں ان کے پیروں میں ڈالی گئیں جس سے ان کی بے عزتی کی کوئی حد باقی نہیں رہی۔ دیکھنے والے افسوس کرتے تھے کہ وہ سپاہی جنھوں نے بڑے نازک اوقات میں گورنمنٹ کی مدد کی تھی اس طرح ذلیل و خوار کیے گئے! کوئی سپاہی ایسا نہ تھا جس کی گردن کی رگیں غصے سے بھری نہ ہوں مگر گورا سپاہ کی موجودگی سے وہ خاموش اپنی لاین کو چلے گئے قیدیوں کو پلٹن نمبر ۲۰ کی حراست میں سورج کنڈ کے نئے جیل میں بھیج دیا۔

یہ کارروائی ایسی بدنما و احمقانہ تھی کہ لارڈ کیننگ نے اس سے آگاہ ہو کر کہا تھا کہ پریڈ پر سواروں کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالنا برگیڈ کے تیز ڈنک لگانا تھا اور قیدیوں کو ہندوستانی پلٹن کے پہرے میں جیل پہنچانا ایسی شدید بیوقوفی تھی جو خیال میں نہیں آسکتی کمانڈر انچیف نے کہا کہ پریڈ پر سپاہیوں کے پاؤں میں بیڑی ڈالنا خلاف مصلحت تھا۔ (تاریخ ہند۔ عہد انگلشیہ: جلد پنجم، صفحہ ۹۵-۳۹۴)

قیدیوں کے رفقا نے اس حکم کی تنسیخ کے لیے پہلے اپنی کوشش کرنے کا ارادہ کیا

مگر بالآخر ۱۰ر مئی ۱۸۵۷ء روز یک شنبہ (اتوار) وقت دوپہر کو اسلحہ کے استعمال سے اس بحث کا فیصل کرنا طے کیا اور اسی دن شام کے قریب صدر بازار پلٹن نمبر ۲۰ کی لین میں یہ چرچا پھیلا کہ ہندوستانی پلٹن کے میگزین پر قبضہ کرنے کے لیے گورے آرہے ہیں، جس کو سن کر پوری پلٹن کھلم کھلا باغی ہوگئی۔ کرنل فنینسن پلٹن نمبر ۱۱ اس کو اطمینان دلانے کے لیے پہنچے مگر پلٹن نے ان کے ٹکڑے اڑا دیے۔ بعدہٗ کیپٹن میکڈانلڈ پلٹن نمبر ۲۰ کو منانے کے لیے پہنچے ان کا بھی وہی حشر ہوا اور مسٹر فریجر افسر سرشتہ تعلیم جو اتفاق سے چھاؤنی میں آئے ہوئے تھے مارے گئے۔ یہ رنگ دیکھ کر دونوں رجمنٹ کے اور افسروں نے کنارہ کشی کی بعدہٗ شہر و بازار کے سرکش لوگوں نے ہنگامہ برپا کر دیا جس میں وہ عیسائی و گورے جو اس وقت بازار میں تھے مقتول و مجروح ہوئے۔ اسی وقت رسالہ نمبر ۳ کے ایک دستہ نے جیل پہنچ کر اپنے دوستوں کو چھڑا لیا فرنگی جیلر سے کوئی تعرض کیا نہ اور قیدیوں کو رہا کیا مگر آدھی رات کو دیہاتیوں نے پہلے نئے و پرانے جیل کے سارے قیدیوں کو چھڑا لیا اس کے بعد عام بلوہ اور قتل اور لوٹ مار شروع ہوگئی سرکاری دفاتر جلا دیے گئے اور ہر طرف شورش و بدامنی پھیل گئی۔

میرٹھ میں گورہ! فوج کافی تعداد میں اس وقت موجود تھی مگر حکام کچھ ایسے ست پٹا گئے کہ فوج باغی کے مقابلہ کرنے کا کوئی انتظام نہ کر سکے اور وہ بے روک ٹوک دہلی کی طرف چل کھڑی ہوئی۔ (گزیٹیر میرٹھ: صفحہ ۹۵-۳۹۴)

سپاہ میرٹھ کی بغاوت کی خبر ۱۵ر مئی ۱۸۵۷ء کو چھاؤنی شاہ جہان پور میں پہنچی اس وقت ہندوستانی پلٹن نمبر ۲۸ تعینات تھی اور مسٹر بریملی بہ وجہ رخصت جانے مسٹر مارونٹ ریکس کے قایم مقام مجسٹریٹ ضلع تھے۔ ناپاک آٹا اور نجس کارتوس استعمال کرنے کی افواہ نے یہاں بھی جذبات ناراضی پلٹن کے دل میں پیدا کر دیے تھے۔ مگر فوجی افسران کو اس پر اب تک اعتماد و بھروسا تھا۔ گزیٹیر میں لکھا ہے کہ سپاہی چند روز سے زیر اثر مولوی سرفراز علی گورکھپوری جو بعد میں لشکر غازیان دہلی کے سردار ہوئے، آچکے تھے۔ مگر ہم نے ثقات کی زبانی سنا ہے کہ مولوی صاحب کا کسی پولیٹکل تحریک سے کوئی تعلق نہ تھا اور باغی سپاہی ان کو کشاں کشاں دہلی لے گئی تھی اور وہاں پہنچ کر ان

کو لشکر مجاہدین کی سرداری مجبوراً قبول کرنا پڑی تھی۔

بہ ہر حال ۲۵ مئی ۱۸۵۷ء کو عید الفطر کے دن چند سپاہیوں نے اپنے افسروں سے کہا کہ شہر کے باغی کل چنور کے میلے کے دن خزانہ لوٹنے والے ہیں، کمانڈنگ افسر نے جو شہر والوں کو پہلے سے مشتبہ سمجھ رہا تھا سپاہیوں کے بیان پر اعتبار کر کے اسٹیشن گارد کے بڑھانے اور سنتری ڈبل کر دینے کا حکم دے دیا۔ اس حکم کا نتیجہ بہت برا نکلا گارد کے سپاہیوں نے اس کو اپنی بے اعتباری سمجھ کر باغیانہ انداز سے کارتوسوں کے متعلق گفتگو شروع کر دی۔ مسٹر ریکس نے جو ۱۷ مئی کو رخصت سے واپس آگئے تھے کمانڈنگ افسر کو حکم کے منسوخ کرنے پر توجہ دلائی مگر اس نے اس کو بحال رکھا اور میلہ چنور ہو جانے کے بعد بھی سنتری کم نہیں کیے جس کی وجہ یہ تھی کہ پلٹن میں ڈیڑھ سو سکھ و دیگر مختلف الاقوام سپاہی موجود ہونے سے اس کے بغاوت پر متحد و متفق ہو جانے کا اس کو شبہ نہ تھا۔ ۳۰ مئی ۱۸۵۷ء تک یہاں کوئی بات واقع نہیں ہوئی۔

۳۱ مئی کو اتوار تھا یورپین زن و مرد عبادت کے لیے گرجا میں مجتمع ہوئے کہ سپاہیوں کی ایک جماعت نے قاتلانہ حملہ کیا مسٹر ریکس مجسٹریٹ ضلع مارے گئے۔ اس کشمکش میں اور افسروں نے موقع پا کر دروازہ گرجا کا بند کر لیا عورتوں کو اوپر والے برج میں پہنچا دیا۔ اسی وقت کیپٹن سینڈ بندوق لیے ہوئے آ پہنچا اور ایک دستہ سکھوں کا اور چند نجی ملازمین افسران اسلحہ لیے ہوئے پہنچ گئے بلوائی گرجا سے ہٹ کر شہر کی طرف چل دیے اور یورپین جماعت جو گرجا میں مقیم تھی محفوظ ہو گئی مگر خلفشار میں کئی افسروں کی جان بلا وجہ ضایع گئی۔ کیپٹن جیمس کمانڈنگ افسر کے سپاہیوں کو فہمایش کرنے کے وقت پریڈ پر بارگوں کے قریب گولی ماردی گئی۔ ریورینڈ مسٹر جے میکیلم کو جو زخمی ہو کر گرجا سے بھاگ نکلے تھے دیہاتیوں نے سول لین سے ایک میل کے فاصلے پر قتل کر دیا۔ مسٹر لمسڑ جو دفتر کلکٹری میں کلرک تھے گرجا کے اندر مارے گئے اور ان کی بیٹی ایسی غایب کی گئی کہ پھر اس کا حال ہی نہ معلوم ہوا۔ مسٹر اسمتھ کلرک کلکٹری کو قـ۔ کلکٹری قتل کر دیا گیا اور مسٹر اے سی اسمتھ اسسٹنٹ مجسٹـ... [illegible] پناہ لینے بنگلے سے قلعے جا رہے تھے بخشی خانہ کے پاس، ای جی باولنگ کو جو گرجا کی طرف جا رہے تھے

راستہ میں باغی سپاہیوں نے قتل کر دیا۔ اب جس قدر افسراں پلٹن اور ان کے بیوی بچے باغیوں کے ہاتھوں سے بچ رہے تھے گرجا میں جمع ہو گئے۔ باغی سپاہیوں نے پھر گرجا پر حملہ نہیں کیا وہ کنٹونمنٹ کے بنگلوں کو لوٹنے وجلانے پر جھک پڑے۔ اور جیل خانہ توڑ کر ایک ہزار قیدیوں کا غول ساتھ لیے ہوئے شہر کی طرف بڑھے۔ سرکاری دفاتر جلا دیے، خزانہ لوٹ لیا اور خزانچی کا مکان لوٹنے کے ارادے سے شہر کی طرف بڑھے۔ فوج کے سوا دیگر ملازمانِ سرکار اس وقت تک سرکار کے خیر طلب تھے۔ کلکٹری کے سوار اسی دن تحصیل تلہر سے خزانہ لیے ہوئے آئے گھاٹ پر ان کو غدر ہو جانے کا علم ہوا مگر وہ نیک نیتی کے ساتھ ارسال کو خزانچی کے مکان پر لے گئے اور اس کے حوالے کر کے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اسی ارسال کے آنے کی خبر سن کر باغیوں نے خزانچی کے مکان کا رخ کیا تھا۔ (گزیٹیر شاہ جہان پور: حصہ پنجم صفحہ ۸۲۴ و تاریخ عہد انگلشیہ)

ان واقعات پر نظر ڈالنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ شہر والوں کا کوئی تعلق فوج کی بغاوت سے نہ تھا، نہ انھوں نے کسی انگریز کو قتل کیا، نہ کسی مکان یا دفتر سرکاری کو جلایا، نہ خزانہ لوٹا، نہ باغیوں کو مدد پہنچائی اور کمانڈنگ افسر نے جوان کے رویے پر شبہ کیا تھا وہ سراسر بیجا تھا۔

باغی سپاہ کی توجہ دوسری طرف منعطف ہو جانے اور وفادار دستۂ فوج کے کمر بستہ ہونے سے مقیمین گرجا کے لیے گو بہ ظاہر زیادہ خطرہ محسوس نہ تھا مگر مسٹر جینکشن جوائنٹ مجسٹریٹ نے جو مجسٹریٹ ضلع کے مارے جانے سے انتظام ضلع کے ذمے دار باغیوں کو دوسرے گرجا پر گولیاں چلاتے دیکھ کر محصورین کو پوایاں بھاگ چلنے کا زور کے ساتھ مشورہ دیا اور حکیم امجد علی خان تحصیل دار شاہ جہان پور کو جو امروہہ ضلع مراد آباد کے کمبوہ خاندان سے تھے حکم دیا کہ انتظام قایم رکھنے کے لیے جو کچھ مناسب ہو کریں اور جب باغی سپاہ اسٹیشن سے چلی جائے تو اطلاع دیں۔ ان کی پارٹی نے مشورے کو قبول کیا اور میموں اور بچوں کو گاڑی میں سوار کرا کر سب پوایاں کی طرف چلے ان میں گیارہ افسر اور ایک سارجنٹ اور باقی میمیں و بچے تھے اور مجموعی تعداد اس کی ۲۲ نفوس تھی۔ دو میل چلے تھے کہ جینکشن معہ دو مسلمان سواران کلکٹری کے اس جماعت سے

آ ملے ایک سوار راستے واپس چلا گیا اور دوسرا پوایاں تک ہم راہ رہا پوایاں پہنچ کر مسٹر جیکشن نے راجہ جگن ناتھ سنگھ سے پارٹی اپنے یہاں مہمان رکھنے کی درخواست کی مگر راجہ نے اپنے معتمد سے مشورہ کرنے کے بعد جواب دیا کہ باغی سپاہ کے حملہ کرنے کی صورت میں حفاظت کرنا اس کے قابو کی بات نہیں ہے اور دوسرے دن اس نے پارٹی سے محمدی چلے جانے پر اصرار کیا۔ (گزیٹیر شاہ جہان پور) تب مسٹر جیکشن نے مسٹر جیمس طامسن ڈپٹی کمشنر محمدی کو گاڑیاں بھیجنے کے لیے لکھا۔ اس وقت کھیری صدر مقام ضلع نہ تھا بلکہ محمدی تھا۔ وہ بعد غدر ۱۸۵۹ء میں ہیڈ کوارٹر ضلع کا قرار پایا ہے۔ چٹھی پہنچنے پر مسٹر طامسن نے فوراً گاڑیاں روانہ کیں اور ۳/ جون ۱۸۵۷ء کو پارٹی پوایاں سے روانہ محمدی ہوئی جس میں ۱۶ مرد اور ۱۳ عورتیں و بچے تھے۔ راجہ نے ایک گارد اپنے آدمیوں کا حفاظت کے لیے ساتھ کر دیا۔ اور پارٹی بہ خیریت محمدی پہنچ گئی۔ وہاں مسٹر شیلڈ مشہور مال دار تاجر لکڑی جو شاہ جہان پور سے بھاگ کر وہاں پہنچا تھا پارٹی کو ملا اس وقت تک فوج محمدی کی حالت قابل اطمینان تھی، مگر ۴/ جون کو اس کے تیور بدلے ہوئے پائے گئے، تب پارٹی سیتا پور روانہ ہوئی اور ۵/ جون کو اورنگ آباد سے آدھ میل کے فاصلے پر فوج باغی نے حملہ کر کے سب کو قتل کر دیا اور بعد میں مسٹر شیلڈ کے تمول کی شہرت نے فوج کو اس پارٹی پر حملہ کرنے کے لیے برانگیختہ کیا تھا۔ (اورنگ آباد، ضلع ستیا پور میں ہے)

جس روز فوج شاہ جہان پور باغی ہوئی اسی دن کوٹھی روسر بھی لوٹی اور جلائی گئی۔ مسٹر آر آر کیرو مالک کوٹھی اس وقت یورپ میں تھے اور ان کا بھائی مسٹر جی پی کیرو منیجر کوٹھی تھا اور مسٹر برانڈ ان کے اسسٹنٹ تھے۔ جب کوٹھی پر حملہ ہوا تو منیجر معہ مسٹر برانڈ بھاگ نکلا اور گواری و کٹیگ میں پناہ گزین رہنے کے بعد اس نے بھی پوایاں کا راستہ لیا اور وہاں سے ملان پور چلا گیا۔ (گزیٹیر کھیری) جو اس وقت صدر مقام ایک ضلع کا قرار دیا گیا تھا۔ وہاں سے گھاگرا پار جانے کے قصد سے روانہ ہوا مگر راستے کی حالت مخدوش دیکھ کر دھورہرا پارٹی سے جاملا اور گڑھی ٹیاری میں جو راجہ صاحب دھورہرا کی ملکیت ہے پناہ لی۔ دو مہینے پارٹی وہاں مقیم رہ کر لکھنؤ روانہ ہوئی راجہ نے حفاظت کے لیے گارد ہم راہ کر دیا۔ راستے میں ممبران پارٹی کو گارد کی نیت خراب معلوم ہوئی تب وہ

اس کی آنکھ بچا کر کھیر! گڑھ کی طرف بھاگ نکلے اور بن بیر پور بہ خیریت پہنچ گئے۔ مگر وہاں پہنچ کر دھورہرا گارد کا متعاقب آنا دریافت ہوا تب فوراً لوہان ندی کی طرف چل دیے ندی میں اس وقت پانی زیادہ تھا پایاب موقع کی تلاش میں متفرق ہوگئے اور مسٹر کیرو اور چندان کے ساتھی گرفتار کر لیے گئے، باقی جنگل میں چھپ گئے۔ مسٹر کیرو قید ہونے کے بعد لکھنؤ بھیج دیے گئے۔ وہ قید ہی میں تھے کہ انگریزی فوج محصورین بیلی گارڈ کو رہائی دلانے کے لیے لکھنؤ کی طرف بڑھی اس وقت سب انگریز قیدی قتل کردیے گئے۔ ان میں مسٹر کیرو بھی تھے۔ مسٹر برانڈ عرصے تک عاقہ ترائی میں آوارہ پھرتے رہنے سے مبتلائے بخار ہوکر بٹول علاقہ نیپال میں مرگئے۔ (گزیٹیر ضلع سیتاپور)

قتل وغارت کے بعد باغی سپاہ شہر میں داخل ہوئی۔ نظام علی خان کو جو سابق میں کوتوال رہ چکے تھے کوتوال شاہ جہان پور اور نواب قادر علی خان کو ناظم اور نواب غلام حسین خان (شاعر) کو نایب ناظم مقرر کر کے شام کو اپنے چھاؤنی میں واپس گئی۔ بعدہٗ مولوی سرفراز علی کو اپنے ہم راہ لے کر بریلی روانہ ہوگئی۔ قادر علی خان نے حامد حسن خان ڈپٹی کلکٹر اور نظام علی خان شہباز نگری سابق تحصیل دار دیگر ملازمین سرکار کو نوکر رکھ کر انتظام شروع کیا جب بریلی میں خان بہادر خان نبیرہ حافظ الملک حافظ رحمت خان روہیلہ کی جن کو شاہ دہلی نے خطاب انتظام الدولہ محافظ الملک خان بہادر خان ہزبز جنگ دے کر والی روہیل کھنڈ مقرر کیا تھا۔ (اخبار الصنادید: جلد دوم، صفحہ ۴۷) حکومت قایم ہونے کی خبر آئی تو قادر علی خان نے شہر میں جلوس نکالا اور بجائے برٹش حکومت کے اُن کی حکومت قایم ہونے کا باجراے اشتہار اعلان کیا۔ ۸ر جون ۱۸۵۷ء کو باغی فوج سیتاپور سے آکر عزیز گنج میں خیمہ زن ہوئی اور ایک دستہ اس کا لوٹنے کے لیے شہر میں داخل ہوا مگر شہر والے مقابلے پر تلے بیٹھے تھے، لہٰذا فتح گڑھ کو کوچ کر گئی۔

(گزیٹیر شاہ جہان پور)

اس وقت تک نواب غلام قادر علی خان سلمہ سرغنہ خاندان نواب بہادر خان شاہ جہان پور میں نہ تھے، وہ شرکت عرس کے لیے بانسی گئے ہوئے تھے۔ وہاں اُن کو قادر علی خان کے ناظم ہونے کی خبر ملی، جس کے سنتے ہی جذباتِ رقابت خاندانی بھڑک

اُٹھے۔ ظہور احمد میاں ورؤف احمد میاں مرشد زادگان کے مشورے سے وہ عجلت کے ساتھ بانسی سے چل کھڑے ہوئے اور ۱۶؍جون کو شاہ جہان پور پہنچ کر صبح تڑکے بڑے تزک واحتشام کے ساتھ فوراً بریلی روانہ ہوگئے اور چند روز میں خان بہادر خان سے فرمان عہدۂ نظامت اپنے نام کا حاصل کر کے نقارہ بجاتے ہوئے واپس آئے۔ متوسلین نے نذریں پیش کیں۔ ہر طرف سے مبارک باد کی صدائیں بلند ہوئیں اور آتے ہی انتظام شروع کر دیا ظہور احمد میاں، نظام علی خان شہباز نگری وحامد حسن خان وخان علی خان برادر نسبی حامد حسن خان نایب ناظم ورؤف احمد میاں وعبدالرؤف خان افسر فوج مقرر ہوئے انھوں نے چار پلٹن پیادہ اور نو اسکوارڈن سواروں کے بھرتی کرنا شروع کیے۔ اور نواب حشمت اللہ خان جو فوج انگریزی کے پینشن یافتہ تھے افسر توپ خانہ مقرر ہوئے اور ۱۲ ضرب توپ پیتل تیار کرنے کے اہتمام میں لگ گئے۔ تقریباً دو مہینے کے بعد عبدالرؤف خان نے حالات کا صحیح اندازہ کر کے سپہ سالاری سے استعفا دیا اور حامد حسن خان و چند دیگر افسران نے بھی ان کی مثال کی تقلید کی، عبدالرؤف خان کی جگہ واجد علی ناظر عدالت منصفی اور حامد حسن خان کی جگہ نجیب خان ساکن جلال آباد جو چند سال اودھ میں ملازم رہے تھے مقرر ہوئے اور پرگنہ کانٹ کی مال گذاری وصول کرنا ان کے سپرد ہوا۔ راجپوتان لاڑ پور وغیرہ نے ادائے مال گذاری میں سرتابی کا اظہار کیا۔ مگر لڑائی ہونے پر دب گئے جون ۱۸۵۷ء کے ختم کے بعد راجپوتان نے شہر پر حملہ کرنے کی دھمکی دینا شروع کی نظام علی خان نے بھٹیلا پر حملہ کر کے سرکشی کو دبا دیا پھر مردان علی خان چیف افسر خان بہادر خان نے معہ فوج بریلی سے آکر سہرامئو کے راجپوتوں پر جو ہر طرف لوٹ مار کر رہے تھے حملہ کیا سہرامئو لوٹ لیا بہت راجپوت مارے گئے اور ان کے سر پھاٹک قلعہ پر لٹکائے گئے مال غنیمت جس میں کوٹھی روسر کی لوٹ کا مال شامل تھا شاہ جہان پور لایا گیا۔

مسٹر منی نے لکھا ہے کہ بغاوت فوج شاہ جہان پور کی خبر ۳۱؍مئی ۱۸۵۷ء کی شام کو تلہر پہنچی۔ باثر رئیسوں میں سے غلام محمد خان نے تحصیل دار کو فوراً بے دخل کر دیا اور پولیس اسٹیشن پر قبضہ کر کے دفتر کو برباد کر دیا۔ تحصیل دار نے ایک پٹھان کے مکان

میں پناہ لی جہاں سے دوسرے دن باغیوں نے اس کو گرفتار کیا۔ غلام محمد خان کو خان بہادر خان نے ناظم اور کفایت اللہ خاں اور ان کے بھائی کو تحصیل دار مقرر کیا تھا، مگر چھ مہینے بعد دونوں بھائیوں نے خان بہادر خان سے پرگنہ تلہر کا ٹھیکہ حاصل کرلیا اور خود ناظم بن گئے۔ صرف فوج کی کمانڈ غلام محمد خان کے متعلق رہی جو ہلدوانی کی لڑائیوں تک اس کے سپرد تھی۔ دونوں ٹھیکے دار آخر تک پرگنہ پر قابض رہے غدر رفع ہونے پر بھاگ کھڑے ہوئے اور بعد میں گرفتار کر کے دریائے شور بھیج دیے گئے اور ساری املاک ان کی ضبط کرلی گئی۔ کٹرا میں فیض محمد خان اور غلامی خان نے ایک پلٹن بھرتی کی۔ جلال آباد میں احمد یار خان تحصیل دار نے غدر ہوتے ہی حوالاتیوں کو چھوڑ دیا۔ احمد یار خان کو اولاً تحصیل داری اور ایک مہینے کے بعد نظامت دی گئی۔ بہ حیثیت ناظم انھوں نے بہت سرگرمی سے انتظام کیا اور بریلی سے فوج زیر کمانڈ اسمٰعیل خان بلا کر راجپوتان کھنڈر کو مطیع بنایا، بچپوریا کی کئی لڑائیوں میں وہ شریک ہوئے مگر ۲۸ اپریل ۱۸۵۸ء کو انگریزی فوج کے جلال آباد آنے پر علاحدہ ہو گئے اور گرفتار ہونے پر پھانسی پائی۔ پوایاں میں راجہ نے پرگنے کا اپنے طور پر انتظام کر کے مال گذاری وصول کی اور بریلی سے مال گذاری وصول کرنے کے لیے فوج آنے پر تیس ہزار رُپے سالانہ نذرانہ اور ایک لاکھ رُپے سالانہ مال گذاری بابتہ پوری تحصیل کے ادا کرنا منظور کر کے مصالحت کرلی مصالحت ہو جانے پر لاکھن شاہ رئیس کھوٹار بریلی گیا اور معافی کھوٹار و پورن پور کی حاصل کی۔ بعد غدر اس پر الزام بغاوت لگایا گیا مگر عدالتی طور سے تحقیقات نہیں ہوئی۔

باغیوں کا کام اچھی طرح چل رہا تھا کہ دہلی فتح ہو جانے کی خبر پھیلنے سے ان میں ہل چل پیدا ہو گئی۔ قاضی سرفراز علی نے جو اس وقت منصف تھے محمدی جھنڈا کھڑا کرنے کا ارادہ کیا مگر لوگوں نے ادھر توجہ نہیں کی اس لیے وہ خیال چھوڑ دیا گیا۔

کچھ دن بعد بخت خان دہلی سے ۳۰ ہاتھی اور ۴۰۰ سوار اور ۱۵۰۰ پیادے اور ۴ توپ لے کر آیا اور چند روز ناظم کا مہمان رہ کر چلا گیا۔ اس کے بعد نواب فرخ آباد معہ فیروز شاہ و اسمٰعیل خان فتح گڑھ سے پسپا ہو کر یہاں آئے اور ان کے بعد نانا

صاحب مشہور مرہٹہ سردار آیا اور دس دن گرجا کے پاس ڈونڈا باغ میں خیمہ زن رہ کر بریلی چلا گیا۔

اب ہوا بدلتی گئی انگریزی ملازمین نے جو ضلع میں ہر طرف موجود تھے مسٹر الیگزینڈر کمشنر بریلی مقیم نینی تال و دیگر انگریزوں کو جو آگرہ وغیرہ میں تھے خبریں بھیجنا شروع کر دیا تھا ان میں ایک حامد حسن خان ڈپٹی کلکٹر جو پہلے نایب ناظم شاہ جہان پور رہ چکے تھے اور دوسرے ان کے بھائی محمد حسن خان تھے جو آگرہ میں صدر اعلار ہے تھے دونوں بھائی قلعہ سے واپسی میں اتفاقیہ تکرار سپاہ نواب سے ہو جانے پر مارے گئے۔ اور قاسم حسن خان و احمد حسن خان ان کے حقیقی بھائی خوش قسمتی سے محفوظ رہے۔

فتح گڑھ اور لکھنؤ کے فتح ہو جانے کے بعد سر کولن کیمپبل نے جو نہایت بہادر و شجاع و نامی گرامی تھا اور عین بنگالہ غدر میں بہ وجہ وفات جنرل انبسن کے کمانڈر انچیف ہند مقرر ہو کر آیا تھا روہیل کھنڈ کی طرف توجہ کی۔ اور حکم دیا کہ ایک دستہ فوج کا زیر کمانڈ جنرل پینی گنگا کو ندولی کے پاس عبور کر کے کٹرا پر بڑھے اور وہاں جنرل والپول کے ڈویژن سے جو لکھنؤ سے آ رہا ہے مل جائے اور برگیڈیر جان جونس رڑکی سے مراد آباد پر بڑھے تا کہ ایک چکر فوج کا شمالی و مغربی حصہ روہیل کھنڈ میں ہو جائے اسی زمانے میں برگیڈیر سیٹن نے جو فتح گڑھ میں ٹھہرا ہوا روہیل کھنڈ کے جنوبی دروازے کی حفاظت کر رہا تھا یہ معلوم کر کے کہ سڑک بریلی پر باغی زور پکڑے ہوئے ہیں اور ان کے زبردست مورچے اللہ گنج کانکر اور بن گاؤں میں ہیں۔ ۶/اپریل ۱۸۵۸ء کو کانکر کے مورچے پر کامیاب حملہ کیا جس کے اثر سے باغی اللہ گنج کو چھوڑ کر روہیل کھنڈ میں بھاگ گئے۔ اور ان کے دوآب پر حملہ آور ہونے کا اندیشہ باقی نہیں رہا مگر جنرل والپول کے ڈویژن سے باغیان اللہ گنج نے ۲۸/اپریل ۱۸۵۸ء کو مزاحمت کی اور بچھوریا پر لڑائی ہوئی جس میں نظام علی خان شہباز نگری و بخشی رام کایستھ بخشی فوج شکست کھا کر جان سے مارے گئے اور برٹش فوج کو جلال آباد پر قبضہ کر لینے کا موقع حاصل ہوا پھر والپول کی فوج سر کولن کیمپبل کی فوج سے مل گئی اور متفقہ فوج ۳۰/اپریل کو شاہ جہان پور کی طرف بڑھی۔ شہر اس سے پہلے باغیوں نے جو زیر کمانڈ احمد اللہ شاہ

کے تھے خالی کر دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ نانا صاحب بھی اس وقت یہاں پر موجود تھا۔ جس نے تمام سرکاری عمارتوں کو برباد کر کے برٹش فوج کے لیے کوئی جائے پناہ باقی نہیں رکھی تھی اس لیے انگریزی فوج عزیز گنج میں خیمہ زن ہوئی اور دو کمپنی ۷۹ ہائی لینڈرس کی قلعے پر قبضہ کر لینے کے لیے بھیج دی گئی۔

۲رمئی ۱۸۵۸ء کو سر کولن کیمپبل کمانڈر انچیف نے کٹرا کی طرف کوچ کیا اور ندولی والی فوج سے جس کی کمانڈ جنرل پینی کے ضلع بدایوں میں مارے جانے کی وجہ سے کرنل جونس کر رہا تھا، مل گیا کمانڈر انچیف خود بریلی کی طرف بڑھے اور کرنل ہیل کو شاہ جہان پور جانے کا حکم دیا اس کے ساتھ ایک دستہ پلٹن نمبر ۸۲ اور لفٹنٹ ڈی کنزو کے آمنی سوار اور چار توپیں تھیں۔ کٹرا سے کرنل ہبل کے روانہ ہونے کے بعد ایک دن بعد احمد اللہ شاہ محمدی کی طرف سے پھر شاہ جہان پور آ پہنچا[1]۔

انگریزی فوج پرانے جیل میں جو دمدمہ بنا کر مورچہ تیار کر لیا گیا تھا، پناہ لینے پر مجبور ہوئی۔ شاہ جی نے آٹھ توپیں لگا کر جیل پر گولہ باری شروع کی جو ۳رمئی سے ۹ر مئی تک برابر جاری رہی پرانے قلعہ پر اس نے قبضہ کر لیا اور شہر سے رُپے وصول کرنے کی کوشش کی (اب یہ عمارت پرانے جیل کی عمارت کنٹونمنٹ میں موجود ہے مگر کمسریٹ گودام کے کام میں ہے)۔ محصورین کی حالت نہایت نازک ہو رہی تھی مگر سر کولن کیمپبل کو وقت پر اس کی اطلاع مل گئی انھوں نے فوراً ایک بریگیڈ جس میں ۶۰ رائفل، ۷۹ ہائی لینڈرس اور ۸۴ پلٹن پیدل ۴۴ پنجابی، دو اسکوڈرن قرابینچی اور ملتانی

---

[1] قصہ احمد اللہ شاہ: گزیٹیر میں احمد اللہ شاہ کو فیض آبادی مولوی کے لقب سے یاد کیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ غدر شروع ہونے کے وقت جیل فیض آباد میں تھے اور ۸رجون ۱۸۵۷ء کو جب باغیوں نے جیل توڑ کر قیدیوں کو چھوڑ دیا تو وہ بھی رہا ہو کر باغیوں کے شریک حال ہو گئے اور جیتے جی اسی کام میں لگے رہے گزیٹیر فیض آباد میں غلطی سے ان کا نام سکندر شاہ لکھا ہے ان کا نام احمد اللہ شاہ تھا اور یہی انھوں نے اپنے سکے میں لکھایا تھا جو ایام غدر میں جاری کیا تھا:

سکہ زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ
حامئ دین محمدؐ احمد اللہ بادشاہ

رسالہ اور ایک باٹری رائل ہارس ارٹیلری شامل تھی زیر کمانڈ بریگیڈیر جان جونس روانہ کیا۔ ۱۱رمئی ۱۸۵۸ء کو جب وہ نبیا گھاٹ پر پہنچا تو غنیم نے اس کو روکا اس نے غنیم کو ہٹا کر گرا کے بائیں کنارے کنارے کوچ کیا اور غنیم کو قلعہ و پل پختہ کھنوت اور دیگر مورچوں سے نکال کر شہر کے پورپ کے کنارے کنارے ہوتا ہوا کرنل ہیل سے جاملا۔ شاہ جی کا مورچہ جس کے زیر (عقب) میں شہر تھا۔ بہت مضبوط تھا اس لیے دھاوا نہیں ہوسکتا تھا بے ترتیب لڑائیاں جاری تھیں جب فیروز شاہ و بیگم اودھ کی فوجیں آ گئیں تو ۱۵رمئی کو شاہ جی نے دہس پر سخت حملہ کیا خوں خوار لڑائی ہوئی مگر جونس اپنی جگہ پر مضبوطی سے قایم رہا۔ تاہم محاصرہ قایم رہا۔

(۱۸رمئی ۱۸۵۸ء) سر کولن کیمپبل بریلی سے شاہ جہان پور آئے غنیم پر ناگہانی حملہ کرنے کا ان کو موقع نہیں ملا۔ سواروں کے دھاوے کا انتظام کیا گیا مگر باغی حملہ ہوتے ہی ہٹ گئے اور ان کا تعاقب بہ وجہ کم ہونے فوج و سوار کے ممکن نہ ہوا سر کولن نے کرنل کوک کو جو ایک بریگیڈ کے ساتھ پیلی بھیت کی طرف خان بہادر خان کے تعاقب میں بھیجا گیا تھا طلب کیا اس کے آنے پر باغیوں نے شہر کو چھوڑ دیا اور فوج محصور جیل خانہ پوری طرح آزاد ہوگئی۔

انگریزی فوج نے باغیوں کا تعاقب محمدی کی طرف کیا خوب لڑائی ہوئی اور قصبہ محمدی پر قبضہ کرلیا گیا۔

باغیوں کو شاہ جہان پور سے ہٹا دینے کے بعد انگریزی فوج لوٹ مار کرنے کے لیے شہر میں گھس پڑی مگر سارا شہر خالی پڑا تھا باشندگان شہر پہلے سے دیہات کو بھاگ گئے تھے۔ سپاہیوں نے جو کچھ گھروں میں پایا لوٹ لیا، جو ملا اس کو مار دیا، مگر بستیاں ویران تھیں شکار کم ہاتھ آیا، اس لیے جانوں کا نقصان زیادہ نہیں ہوا۔

۲۵رمئی ۱۸۵۸ء کو سر طامس سٹین کمانڈر شاہ جہان پور مقرر ہوا۔ ۵ر جون ۱۸۵۸ء کو احمد اللہ شاہ جو شاہ جہان پور سے ہٹ گیا تھا ہاتھی پر سوار پوایاں پہنچا راجہ کی گڑھی کا دروازہ بند پایا راجہ اور اس کا بھائی اور اس کے نوکر فصیل سے لگے کھڑے تھے ان میں اشاروں میں کچھ باتیں ہوئی شاہ جی نے اندر چلنے کے لیے مہاوت سے کہا

ہاتھی نے دروازے پر دو تین ٹکریں ماریں کہ راجہ کے آدمیوں نے اندر سے باڑھ ماری شاہ جی کے گولی لگی جس کے صدمے سے وہ فوراً ہلاک ہوئے۔ راجہ کے بھائی نے فوراً سر کاٹ لیا جس کو لے کر راجہ فوراً شاہ جہان پور کو روانہ ہوا اور مسٹر منی مجسٹریٹ ضلع کے پاس جو اس زمانے میں مقبرہ نواب احمد علی خان واقع محلہ گوہر پورہ میں رہتے اور کچہری کرتے تھے ایسے وقت پہنچا کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے اس نے پہنچتے ہی سر احمد اللہ شاہ کا ان کے آگے زمین پر ڈال دیا جس کو دیکھ کر سب انگریز دنگ رہ گئے۔ لاش ان کی پھونک دی گئی اور سر کوتوالی میں لٹکایا گیا۔

(گزیٹیر شاہ جہان پور و تاریخ ہند عہد انگلشیہ: جلد دوم، حصہ سوم، صفحہ ۹۳ و خط لین صاحب بہ نام مولوی عبداللہ صدر امین مین پوری)

احمد اللہ شاہ نے انگریزوں کو تکلیف دینے میں حتی المقدور کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا مگر مثل مشہور ہے:

قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

مسٹر طامس سیٹن جو نامور جنرل و بہادر سپاہی تھا اور ان سے لڑا تھا ان کی نسبت جو کچھ بیان کرتا ہے اس کا خلاصہ سننے کے قابل ہے۔ کہتا ہے کہ مولوی احمد اللہ بڑی لیاقت و قابلیت رکھتا تھا وہ ایسا شجاع تھا کہ خوف اس کے نزدیک نہیں آتا تھا۔ عزم میں پکا اور ارادے میں بڑا مستقل تھا۔ باغیوں میں اس سے بہتر کوئی سپاہی نہ تھا یہ فخر اسی کو حاصل ہے کہ اس نے دو مرتبہ سر کولن کیمپبل کو میدان جنگ میں ناکامیاب رکھا وہ بہ نسبت اور باغیوں کے خطاب شاہ کا زیادہ مستحق تھا۔ اگر محب وطن ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اپنے ملک کی آزادی کے لیے جو غلطی سے برباد ہوگئی ہو سازشیں کی جائیں اور لڑائیاں لڑی جائیں مولوی یقیناً اپنے ملک کا محب صادق تھا اس نے کبھی اپنی تلوار کو مخفی اور سازشی قتل سے خون آلودہ نہیں کیا۔ وہ بہادرانہ و معززانہ طور پر ان بے گناہوں اور اجنبیوں سے معرکہ آرا ہوا جنھوں نے اس کا ملک چھین لیا تھا۔ دنیا کی ساری قومیں اس تعظیم و ادب کے ساتھ جو شجاعت و صداقت کے لیے لازمی ہیں اور جن کا مولوی مستحق تھا اس کو یاد کریں گی۔ (تاریخ انگلشیہ: جلد دوم، باب چہارم، صفحہ ۹۲)

اس اتفاقیہ کامیابی کے مصالحے نے مسٹر جیکنسن کو پناہ نہ دینے کا دھبہ راجہ کے دامن وفاداری سے مٹا دیا۔ اور پچاس ہزار رُپے شاہ جی کے سر کا انعام علاوہ اس کے راجہ کے حصے میں آیا۔

اسی زمانے میں لفٹنٹ ڈی کنیرو نے فوج امدادی روہیل کھنڈ لے جا کر قلعہ و قصبہ پلیا سے باغیوں کو نکال کر قبضہ کرلیا اور سر طامسن سیٹن نے شاہ جہان پور سے چند میل پورب موضع برنئی کے قریب باغیوں کی بڑی جماعت کو تباہ کر کے تین سو کو قتل کیا اور تین توپیں چھین لیں اس کے بعد باغیوں سے کوئی لڑائی نہیں ہوئی اور اکتوبر ۱۸۵۸ء میں حکومت انگریزی پختہ طور پر قایم ہو کر ہنگامہ ختم ہوا جس کے بعد باغیوں کے مقدمات کا فیصلہ شروع ہوا ان کے اکثر سردار مر گئے تھے یا مارے جا چکے تھے بچے کچھے جو گرفتار کیے گئے تھے ان کو سخت سزائیں دی گئیں اور ہر حال میں ان کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔

غلام قادر خان انگریزی حکومت واپس آنے کے تھوڑے دن بعد مر گئے۔ ان کی تمام جائیداد ضبط کر لی گئی۔ قادر علی خان و عبدالرؤف خان دایم الحبس ہو کر دریاے شور بھیج دیے گئے اور ان کی تمام املاک ضبط ہوگئی۔ قاضی سرفراز علی بھی سزایاب ہو کر دریاے شور بھیج دیے گئے، مگر بعد میں قصور معاف ہو کر رہائی ملی۔ نظام علی خان شہباز نگری کی بھی کل جائیداد ضبط ہوگئی۔ باد سموم غدر نے شاہ جہان پور و تلہر کے پٹھانوں کو سخت نقصان پہنچایا اور بہت سے قدیم خاندان تباہ ہوگئے۔ اسباب بغاوت پر طوالانی قصایص [1] انگریزوں و ہندوستانیوں کے قلم سے شایع ہو چکے ہیں اس لیے ان صفحات پر بحث کے چھیڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر اس میں شبہ نہیں ہے کہ یہ سوزش قومی و ملکی بغاوت نہ تھی صرف بنگال احاطے کے بعض رسالوں اور پلٹنوں کی سرکشی تھی جس نے ملک میں بدامنی پیدا کر کے آتش فساد کو زیادہ مشتعل کر دیا اور باضابطہ حکومت باقی نہ رہنے سے قدیم زمین دار جو اپنی موروثی جائیدادوں سے

---

[1] تاریخ مطبع میں تو لفظ ''قصایص'' (قصے کی جمع) ہی ہے۔ شاید اس موضوع پر بعض تالیفات کی طرف مؤلف کا اشارہ ہو، لیکن میری راے میں تو لفظ ''قصاید'' ہوتا تو زیادہ صحیح ہوتا۔

عدالت دیوانی کی ''ڈگریوں کے اثر سے محروم ہو گئے تھے موقع پاکر اس کو واپس لینے پر آمادہ ہو گئے بد وضع اشخاص قید سے رہا ہو جانے پر قتل و غارت کے مشغلوں سے دل بہلانے لگے۔ خاندانی رقابتیں و قومی مخالفتیں حکومت کا دباؤ نہ رہنے سے اُبھر آئیں۔ ایک [شخص] دوسرے کا گلا کاٹنے پر اُتر آیا۔ ہندو مسلمان شروع شروع میں ہم خیال رہے کچھ دن بعد جب ہنود کو مسلمانوں کے غلبہ پانے کے آثار نظر آئے تو وہ ان کو برباد کرنے کی تدبیریں کرنے لگے (۱) ان وجوہ سے سخت تلاطم پیدا ہو کر بدامنی کے فروغ کا باعث ہوا۔ جہاں تک غور کیا جاتا ہے، انگریزوں سے قومی نفرت اس ہنگامے کا باعث معلوم نہیں ہوتی ہے کیوں کہ ہندو سپاہیوں نے انگریزوں سے برٹش جھنڈے کی عزت کے قایم رکھنے کے لیے اپنی جانیں قربان کیں (۲) اور فساد کا دایرہ صرف چند اضلاع ممالک مغربی و شمالی وادہ تک محدود رہا اگر قومی منافرت اس کا باعث ہوتی تو واقعات کی کچھ اور ہی صورت ہوتی۔

شاہ جہان پور گزیٹیر میں جو فہرست یابندگان انعام دی ہوئی ہے وہ بالکل نامکمل ہے باشندگان شاہ جہان پور نے بیرون شاہ جہان پور عمدہ خدمات انجام دینے کے صلے میں جو انعامات پائے اس کا پتا مؤلف گزیٹیر کو نہیں چلا ورنہ وہ ہندو خیر خواہوں کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ نہ سمجھتا (۳)۔ بعد رفع غدر خیر خواہ و بدخواہ دوست و دشمن کے امتیاز میں حکام نے اس قسم کی کھلی غلطیاں کیں جو جوش انتقام کے اثر سے واقعات کا صحیح اندازہ نہ ہو سکنے پر انسان سے ہو جاتی ہیں، جس کی تفصیل زبانی عرض داشت

(۱) اگر کسی نے ایسا بھی سوچا ہو تو تعجب بھی کرنا چاہیے لیکن یہ عام انداز فکر نہ تھا۔ تحریک آزادی ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد جب انگریز کی انتقام کی صلیبیں کھڑی کی تھیں اور ہر شخص کے لیے تختہ دار پر کھینچے جانے، قتل ہونے اور کالے پانی بھیجے جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا اور نفسا نفسی کا عالم تھا۔ اس وقت کے رویے کی کوئی مثال سودمند نہیں ہو سکتی۔ یہ طعنہ عام طور پر دیا گیا ہے۔

(۲) تاریخ میں اس قسم کی مثالوں کا دایرہ مسلمانوں تک وسیع ہے۔

(۳) گزیٹیر کا تالیف کنندہ انگریز تھا۔ اس کے ہاتھ میں مؤرخ کا قلم نہیں تھا ایک غرض مند، بدیشی حکمران اور استعمار کا قلم تھا۔ اسے یہی لکھنا تھا اور ہمیشہ اس کے قلم سے ایسا ہی لکھا گیا ہے۔

لارڈ کیننگ مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۸۵۷ء سے جو ملکہ معظّمہ قیصر ہند کی خدمت میں ارسال کی تھی سننا چاہیے لکھتے ہیں کہ ''دیوانگی اور کمینہ توزی، بے تمیزی کے ساتھ ان لوگوں میں بھی جن کو خود بہتر مثال بننا چاہیے ایسی پھیل رہی [ہیں] کہ ناممکن ہے کہ اپنے ملک کے آدمیوں کا خیال کوئی شخص بغیر شرم کے کر سکے۔ دس آدمیوں میں سے ایک بھی شخص ایسا معلوم نہیں ہوتا ہے کہ وہ یہ خیال کرے کہ چالیس یا پچاس ہزار باغیوں کو اور ان کے علاوہ اور سرکشوں کو پھانسی یا گولی مارنے کے سوا کسی اور طرح سے عملاً انصاف ہوسکتا ہو [1] وہ یہ نہیں خیال کرتے کہ بہت مثالیں ایسی ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنی مہربانی اور فیاضی کو ایسا دکھایا ہے کہ جن سے ان آٹھ مہینوں کی مصیبت راحت بن گئی ہیں۔ (سوانح عمری ملکہ معظمہ: صفحہ ۶۰۰)

تاریخ شاہ جہان پور موسومہ تاریخِ مطیع مؤلفہ مولوی مطیع اللہ خان خلیل شایع کردہ جمیل احسن خان پختہ تالاب۔ شاہ جہان پور ۲۴۲۰۰۱ (یوپی) انڈیا

---

[1] گویا کہ اس عرض داشت کے مطابق اہل ہند کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ ان کی طرف سے یہ سراسر قتل و غارت گری کا عمل تھا اور انھیں خود سوچ لینا اور سمجھ لینا چاہیے کہ ۴۰، ۵۰ ہزار باغیوں اور سرکشوں کو پھانسی پر چڑھا دینے اور گولی سے اڑا دینے کے سوا کمپنی بہادر کے پاس کوئی چارہ کار انصاف کے قیام کے لیے نہیں تھا۔ اور یہ انھیں کی دیوانگی، کینہ توزی اور بے تمیزی کا نتیجہ اور سزا تھی جو انھیں بھگتنا پڑی۔

واقعہ غدر ۱۸۵۷ء

مولوی محمد صبیح الدین

انگریزی حکومت قایم ہونے کے بعد سے یہاں کی پبلک کو دم راست کرنے کا موقعہ ملا۔ قلعہ آباد تھا رعایا خوش حال اور اپنے کاروبار میں اطمینان سے مشغول تھے ہندوستان میں امن وامان کا دور دورہ تھا۔ مغلیہ خاندان لال بٹارہ میں ایک چھوٹے پیمانہ پر اپنی گذشتہ عظمت وشان کی دُھندلی تصویر کی طرح خاموش زندگی کے دن کاٹ رہا تھا کہ ۱۸۵۷ء کا منحوس سال اپنی ابلہ فریب شکل میں خون خواری اور تباہی و بربادی کو بغل میں دبائے ہوئے نمودار ہوا جس نے ہندوستان میں ہلچل ڈال دی۔ غدر کا واقعہ ہندوستان کے لیے ایک سخت مصیبت ثابت ہوا جس نے ہزارہا معزز اور نام ور خاندانوں کا چراغ ہستی گل کر کے مغلیہ سلطنت کا نام ونشان تک صفحہ ہستی سے مٹا دیا اس قیامت خیز ہنگامہ سے مسلمانوں کے اقتدار اعتبار اور ان کی عزت وثروت کو وہ صدمہ پہنچا کہ جس کی تلافی قیامت تک ہونا دشوار ہے۔ شاہ جہان پور کا مشہور آفاق نواب بہادر خاں کا خاندان اور ان کا فلک رفعت قلعہ اسی فتنے کی آگ میں جل کر بے نشان ہو گیا۔ اس فتنے کی ابتدا چھاؤنی بارک پور مضافاتِ کلکتہ سے ہوئی اور اس صوبے میں یہ آگ میرٹھ کی چھاؤنی سے لگی۔ مفسدہ پرداز لوگوں نے مشہور کر دیا تھا کہ گائے اور سور کی چربی لگے ہوئے کارتوس فوج کو دیے جائیں گے اور گائے اور سور کی ہڈی کا برادہ ملا ہوا آٹا رعایا کو کھانا ہوگا۔ ہندوستان چوں کہ ایک مذہبی ملک ہے اور مذہبی دیوانگی کا جوش جاہلوں کو بہت جلد دیوانہ بنا دیتا ہے۔ اس نے جاہل باشندوں کو مذہب کی آڑ پکڑ کر ایسا مجنون اور سر باختہ کر دیا کہ وہ ہر چیز کو قربان کر دینے کے لیے بلاتحقیقات کے آمادہ وتیار ہو گئے۔ اس بے بنیاد افواہ نے واقعیت کا جامہ پہن کر تقریباً سارے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف ایک آگ لگا دی اور فوجی افسران کے

ناعاقبت اندیشانہ تشدد نے کام بالکل بگاڑ دیا۔ اس شورش کا نتیجہ راعی اور رعایا دونوں کے لیے خراب نکلا۔ ہندوستان کی تباہی و بربادی جو ہونا تھی ہوئی مگر سرکار کمپنی کی حکومت کا بھی ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوگیا اور ہندوستان برٹش حکومت میں لے لیا گیا۔

جب سپاہیوں کو نئے کارتوس دیے گئے تو انھوں نے ان کے استعمال سے انکار کردیا اور جب فہمایش سے کام نہ چلا تو افسران فوج نے سپاہیوں کو پریڈ پر ہتکڑیاں بیڑیاں پہنا کر جیل خانہ بھیج دیا۔ فوجیوں نے اس متشددانہ کارروائی سے برافروختہ ہوکر کھلم کھلا بغاوت کرکے اپنے افسران کو قتل کر ڈالا۔ لارڈ کیننگ کو جب سپاہیوں کے سزا کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے کہا کہ پریڈ پر سواروں کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالنا تیز ڈنک لگانا تھا اور قیدیوں کو ہندوستانی پلٹن کے پہرہ میں جیل بھیجنا ایسی شدید حماقت تھی جو خیال میں نہیں آسکتی تھی کمانڈر انچیف نے کہا کہ پریڈ پر سپاہیوں کے پاؤں میں بیڑی ڈالنا خلاف قانون تھا۔ (عہد انگلشیہ: جلد پنجم تاریخ ہند: صفحہ ۳۹۴ و ۳۹۵) چھاؤنی شاہ جہان پور میں میرٹھ کی فوج کی خبر بغاوت ۱۵/ مئی ۱۸۵۷ء کو پہنچی۔ اس وقت پلٹن نمبر ۲۸ یہاں تعینات تھی اور مسٹر مارونٹ ریکیٹس (M. Rickatts) ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے رخصت پر ہونے سے مسٹر بریملے (Bramley) قایم مقام کلکٹر تھے۔ گزیٹیر میں تحریر ہے کہ سپاہی چند روز سے مولوی سرفراز علی گورکھ پوری کے زیر اثر آچکے تھے مگر ثقہ حضرات نے اس کی تائید نہیں کی ہے۔ یہ بے بنیاد افواہیں گو یہاں مشہور ہورہی تھیں مگر فوجی افسر بالکل مطمئن تھے بہ تاریخ ۲۵/ مئی ۱۸۵۷ء کو عید الفطر کے روز چند سپاہیوں نے اپنے افسروں سے کہا کہ شہر کے باغی کل چنور کے دن خزانہ لوٹنے والے ہیں کمانڈنگ آفیسر نے اس کو صحیح باور کرکے اسٹیشن گارڈ اور سنتری ڈبل کردینے کا حکم دے دیا۔ اس حکم سے سپاہی بددل ہوگئے اور اس کو اپنے بے اعتباری پر محمول کیا اور کارتوسوں کے متعلق چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ مسٹر ریکٹس ۱۷/ مئی ۱۸۵۷ء کو رخصت سے واپس آگئے تھے انھوں نے کمانڈنگ کو اس کی غلطی پر توجہ دلائی مگر اس نے اس مفید مشورہ کو نہ مانا کمانڈنگ کا خیال تھا کہ ڈیڑھ سو سکھ اور نیز دیگر وفادار سپاہی پلٹن میں موجود ہیں ان میں اتفاق نہیں ہوسکتا ہے، مگر یہ خیال غلط ثابت ہوا کیوں کہ خیالات

بدل چکے تھے آخر کار اس کا وقت آ گیا تھا ۳۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو اتوار کا دن تھا انگریز گرجا میں عبادت میں مشغول تھے کہ چھاؤنی میں سپاہیوں نے بلوہ کر کے گرجا کو گھیر لیا۔ یہ خبر سنتے ہی کپتان فوج ایک دستہ سکھوں کا معہ اپنے نجی ملازمین کے لے کر فوراً گرجا پہنچ گیا۔ باغی سپاہی وہاں سے ہٹ کر شہر کی طرف چلے گئے اور قلعہ جا کر نواب قادر علی خاں کو ناظم شہر بنا دیا۔

اس ہنگامہ میں چند انگریز افسروں کی جانیں ضایع گئیں ❶۔ کوٹھی روضہ اور چھاؤنی کے بنگلے خوب لوٹے گئے۔ غلام قادر خاں نے سند نظامت نواب بریلی سے حاصل کر کے انتظام ضلع کا اپنے سر لے لیا۔ تقریباً ایک سال تک یہ طوفان بے تمیزی برپا رہا۔ اس ہنگامے کے دوران بخت خان مشہور سرغنہ اور نواب فرخ آباد معہ فیروز شاہ و اسمٰعیل خاں فتح گڑھ سے پسپا ہو کر شاہ جہان پور آئے۔ اور نانا صاحب مشہور باغی میرٹھ سے یہاں آ کر دس روز گرجا کے پاس ڈونڈے باغ میں خیمہ زن رہ کر بریلی چلا گیا اور اس نے شہر کی سرکاری عمارات کو جلا کر تباہ و برباد کر ڈالا۔ ۲۸ر اپریل ۱۸۵۸ء کو بچپوریا کے مقام پر نواب صاحب کی فوج کا انگریزی فوج سے مقابلہ ہوا۔ نواب غلام قادر خاں کی فوج کے کمانڈر نظام علی خاں ساکن شہباز نگر تھے اس لڑائی میں نظام علی خاں معہ چند دیگر ہمراہیوں کے جاں سے گئے بقیہ فوج نے راہ فرار اختیار کی۔ شہر کی حفاظتی فوج احمد اللہ شاہ کے زیر کمانڈ تھی۔ جب بچپوریا پر نوابی فوج کو شکست ہو گئی تو انگریزی سپاہ شاہ جہان پور کی طرف بڑھی احمد اللہ شاہ نے شہر کو خالی کر دیا اور دو تین روز بعد پلٹ کر شاہ جہان پور پر شاہ جی نے دھاوا کر دیا۔ انگریزی سپاہی جو یہاں

---

❶ مسٹر کیلس ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو گرجا میں، کیپٹن جیمس کمانڈنگ افسر کو پریڈ پر، سپاہیوں نے مسٹر جے لیک لم (ریورنڈ) کو گرجا سے ایک میل کے فاصلہ پر دیہاتیوں نے اور گرجا میں ایک کلرک کو بھی سپاہیوں نے قتل کیا تھا اور اس کی لڑکی کے قسمت کے فیصلہ کا پتا نہیں چلا۔ اور مسٹر اسمتھ (Smith) کو کچہری کلکٹری کے پاس اور مسٹر اے سی اسمتھ (A. C. Smith) اسسٹنٹ مجسٹریٹ جو بخار میں مبتلا تھے وہ کوتوالی کے پاس قتل کیے گئے اور اس جماعت کا آخری مقتول ایچ ایم مسٹر باڈلنگ تھے یہ چھ قیمتی جانیں شاہ جہان پور میں اس بلوے کی نذر ہوئیں۔ (گزیٹیر شاہ جہان پور)

موجود تھے وہ پرانے جیل میں دہس بندی کر کے مورچہ زن ہو گئے۔ احمد اللہ شاہ نے جلی کوٹھی کو باغیوں کا مکان سمجھ کر پھونک دیا۔ شاہ صاحب کا حملہ ۳ر مئی ۱۸۵۸ء سے ۹ر مئی سنہ صدر تک جاری رہا۔ محصورین کی حالت نہایت نازک ہو رہی تھی۔ کہ سر کولن کیمپبل کو وقت پر اس کی اطلاع ہوگئی۔ اس نے ایک فوج بہ سرکردگی بریگیڈیر جان جونس روانہ کردی۔ ۱۱ر مئی ۱۸۵۸ء کو اسے باغیوں نے نبیا گھاٹ پر روکنے کی فضول کوشش کی۔ انگریزی فوج باغیوں کو قلعہ و بل کھنوت اور دیگر مورچوں سے نکال کر شہر کے پورب کنارے کنارے کرنل ہیل سے جا کر مل گئی۔ شاہ صاحب چوں کہ مضبوط مورچہ پر قابض تھے لہٰذا اُن پر دھاوا نہیں ہوسکتا تھا اور بے ترتیب لڑائیاں باہم ہو رہی تھیں کہ اس عرصے میں شاہ صاحب کی امداد پر فیروز شاہ اور بیگم اودھ کی فوجیں آ گئیں ۱۵ر مئی ۱۸۵۸ء کو شاہ جی نے دہس پر سخت حملہ کیا، مگر جونس اپنی جگہ پر قایم رہا۔ ۱۸ر مئی سر کولن کیمپبل بریلی سے فوج لے کر شاہ جہان پور آئے مگر اُن کو غنیم پر ناگہانی حملہ کا موقعہ نہیں ملا۔ اس امدادی کمک کے آ جانے سے باغی پیچھے ہٹ گئے اور انگریزی فوج اپنی کمی تعداد کی وجہ سے باغیوں کا تعاقب نہ کرسکی۔ سر کولن نے مسٹر کلک کو جو پیلی بھیت کی طرف خان بہادر خان کے تعاقب میں تھا طلب کرلیا۔ شاہ جی نے انگریزی فوج کی طاقت کا صحیح اندازہ کر کے شہر کو خالی کر دیا اور محمدی کے قریب ہٹ گئے وہاں انگریزوں سے مقابلہ ہوا اور گھمسان کا رَن پڑا۔ (تاریخ ہند عہد انگلشیہ: جلد دوم، حصہ سوم، صفحہ ۹۲ و خط صاحب بہ نام مولوی عبداللہ صاحب صدر امین مین پوری) جس میں شاہ جی کو شکست ہوگئی۔ انگریزی فوج نے شہر کو خالی پا کر خوب لوٹا۔ باشندے پہلے سے شہر کو خالی چھوڑ کر دیہات کو چلے گئے تھے اس وجہ سے جانوں کا نقصان کم ہوا۔ ۵ر جون ۱۸۵۸ء احمد اللہ شاہ پرگنہ پوایاں میں نمودار ہوئے۔ اور تنہا ہاتھی پر سوار ہو کر راجہ پوایاں کی گڑھی پر گئے۔ راجہ نے ڈر کر پھاٹک بند کرالیا اور وہ معہ ملازمین کے فصل میں دبکا ہوا تھا شاہ جی نے فیل بان کو حکم دیا۔ ہاتھی نے دروازے پر دو تین ٹکریں ماریں تھیں کہ راجہ کے ملازمان نے باڑہ ماردی۔ اتفاق سے ایک گولی شاہ جی کے لگ گئی جس کے صدمے سے وہ فوراً جاں بہ حق ہو گئے۔ راجہ کے بھائی نے ان کا سر کاٹ کر شاہ جہان پور منی

(Money) صاحب کلکٹر کے سامنے لاکر رکھ دیا۔ منی صاحب مقبرہ نواب احمد علی خاں میں کچہری کیا کرتے تھے وہ اس وقت معہ انگریز دوستوں کے کھانا کھا رہے تھے۔ احمد اللہ شاہ کے سر کو دیکھ کر انگریز حیرت زدہ ہو گئے۔ سر کو توالی کے دروازے پر لٹکا کر نعش پھونک دی گئی۔ احمد اللہ شاہ نے انگریزوں کا بڑی بہادری سے خوب مقابلہ کیا تھا۔ جنرل مسٹر طامس آسیٹن (Sir Thomas Seaton) جو ایک بہادر سپاہی تھا اور اس کا بھی شاہ صاحب سے مقابلہ ہو چکا تھا اس نے حسب ذیل ریمارک کیا ہے کہ مولوی احمد اللہ بڑی لیاقت و قابلیت رکھتا تھا وہ ایسا شجاع تھا کہ خوف اس کے نزدیک نہیں آتا تھا عزم کا پکا اور ارادہ کا مستقل تھا باغیوں میں اس سے بہتر کوئی سپاہی نہ تھا یہ فخر اسی کو حاصل ہے کہ اس نے دو مرتبہ سر کولن کیمپبل کو میدان جنگ میں ناکامیاب رکھا وہ بہ نسبت اور باغیوں کے خطاب شاہ کا زیادہ مستحق تھا۔ اگر محب وطن ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اپنے ملک کی آزادی کے لیے جو غلطی سے برباد ہو گئی ہو سازشیں کی جائیں اور لڑائیاں لڑی جائیں تو مولوی یقیناً اپنے ملک کا محب صادق تھا اس نے کبھی اپنی تلوار کو مخفی اور سازشی قتل سے خون آلود نہیں کیا وہ بہادرانہ اور معززانہ طور پر ان بیگانوں سے معرکہ آرا ہوا جنھوں نے اس کا ملک چھین لیا تھا دنیا کی ساری قوتیں اس تعظیم و ادب کے ساتھ جو شجاعت و صداقت کے لیے لازمی ہیں اور جن کا مولوی مستحق تھا، اس کو یاد کریں گے۔ یہ ایک آزاد حکمران اور بہادر قوم کے ایک شریف جنرل کے قیمتی الفاظ ہیں، جو اس نے احمد اللہ شاہ کی بابت نہایت بے باکی اور سچائی سے ظاہر کیے ہیں راجہ پوایاں کی اس اتفاقیہ کامیابی نے مسٹر جیکس کے پناہ نہ دینے کا دھبہ راجہ کے دامن سے مٹا دیا۔ (تاریخ انگلشیہ: جلد دوم، باب چہارم، صفحہ ۹۲) پچاس ہزار رُپے راجہ کو انعام میں دیا گیا۔ اسی زمانے میں لفٹننٹ ڈی کنزو نے امدادی فوج روہیل کھنڈ سے قلعہ اور قصبہ بلیا سے باغیوں کو نکال کر قبضہ کر لیا اور سر طامس اسیٹن نے شاہ جہان پور سے چند میل کے فاصلہ پر موضع برنئی میں باغیوں کو کامل شکست دے دی باغیوں نے پھر یہاں کوئی مقابلہ نہیں کیا۔ اکتوبر ۱۸۵۸ء میں کامل طور سے امن و امان قایم ہو گیا اور انگریزی حکومت نے باغیوں کی سزا دہی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا نامی سردار یا تو لڑائی

میں کام آچکے تھے یا وہ اپنی موت سے مر چکے تھے جو بچے کچھے ہاتھ آئے ان کو عبرت ناک سزائیں دے دی گئیں۔ نواب غلام قادر خان کا علاقہ بٹول کی طرف انتقال ہو گیا۔ نواب قادر علی خان، عبدالرؤف خان، قاضی سرفراز علی دائم الحبس ہو کر دریائے شور بھیج دیے گئے اور باغیوں کی جائیدادیں ضبط کر کے خیر خواہوں کو دے دیں گئیں اور ان کے مکانات کھود ڈالے گئے۔ قاضی سرفراز علی کا قصور چند سال بعد ایک کارگذاری کی وجہ سے معاف ہو گیا اور وہ اپنے وطن کو چلے آئے۔ نواب قادر علی خان ۲۷ برس بعد قید سے چھوٹے۔ رؤسائے تلہر نے بھی اپنے آپ کو اس آتش فساد میں جھونک دیا تھا۔ غلام محمد خان و کفایت اللہ خان رؤسائے تلہر نے تحصیل دار تلہر کو بے دخل کر کے پولیس اسٹیشن پر قبضہ کر لیا اور دفتر کو برباد کر ڈالا۔ مسٹر منی صاحب نے تحریر کیا ہے کہ اس کارروائی کے بعد خان بہادر خان نے غلام محمد خان کو ناظم اور ان کے بھائی کفایت اللہ خان کو تحصیل دار مقرر کیا تھا سابق تحصیل دار جو ایک پٹھان کے گھر میں روپوش تھا اس کو گرفتار کر لیا۔ چھ ماہ بعد دونوں بھائیوں نے خان بہادر خان سے پرگنہ تلہر کا ٹھیکہ حاصل کیا اور خود ناظم بن گئے اور فوج کی کمان غلام محمد خان کو دے دی گئی جب غدر فرو ہو گیا تو یہ بھی فرار ہو گئے اور گرفتاری کے بعد دریائے شور بھیج دیے گئے اور ان کی کل جائیداد معہ قلعہ کے ضبط کر لی گئی۔ اسی طرح کٹرا میں فیض محمد خاں و غلامی خاں نے پلٹن بھرتی کی اور جلال آباد میں احمد یار خاں تحصیل دار نے غدر ہوتے ہی حوالاتیوں کو چھوڑ دیا۔ یہ پہلے تحصیل دار اور ایک ماہ بعد ناظم بنائے گئے، انھوں نے بہت سرگرمی سے انتظام کیا اور بریلی سے فوج زیر کمانڈ اسماعیل خاں بلا کر راجپوتانِ کھنڈر کو مطیع بنایا۔ مشہور ہے کہ یہ بچھوریا کی لڑائی میں بھی شریک تھے۔ جب ۲۸ر اپریل ۱۸۵۸ء کو سرکاری فوج جلال آباد پر قابض ہو گئی تو یہ اپنے عہدہ سے علاحدہ ہو کر گرفتار ہوئے اور پھانسی پر چڑھائے گئے۔ پرگنہ پوایاں کے راجہ نے اپنے طور پر انتظام کر کے مال گذاری وصول کی اور بریلی سے مال گذاری وصول کرنے کے لیے جب فوج آئی تو تیس ہزار رُپے سالانہ اور ایک لاکھ رُپے سالانہ مال گذاری بابت پوری تحصیل کے ادا کرنا منظور کر کے مصالحت کر لی۔ مصالحت کے بعد لاکھن شاہ سنگھ

رئیس کھوٹار بریلی گیا اور معافی کھوٹار و پورن پور حاصل کی بعد غدر اس پر الزام بغاوت لگایا گیا مگر اس کی عدالتی طور پر تحقیقات نہیں ہوئی۔ غدر میں باغیوں کا کام اچھا چل رہا تھا کہ دہلی فتح ہو جانے کی خبر پھیلنے سے اُن میں ہلچل پڑ گئی۔ قاضی سرفراز علی جو اس وقت منصف تھے انھوں نے بھی محمدی جھنڈا کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر کسی نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ حامد حسن خاں خلیل ڈپٹی کلکٹر جو کچھ دنوں پہلے نایب ناظم شاہ جہان پور مقرر ہوئے تھے اور بعد کو انھوں نے دور اندیشی سے کام لے کر استعفا دے دیا تھا۔ (ماخذ از تاریخ مطیع) یہ اور ان کے بھائی محمد حسن خاں جو آگرہ میں صدر اعلا رہ چکے تھے انگریزوں کی طرف داری میں مشتبہ ہو گئے تھے یہ دونوں بھائی اور خان بہادر قاسم حسن خاں تحصیل دار احمد حسن خاں معہ دیگر اعزا کے صفائی کے لیے قلعہ گئے تا کہ نواب صاحب کے غضب سے محفوظ رہیں۔ واپسی پر جب یہ قلعہ کے گھڑیالی دروازہ سے نکل رہے تھے نواب صاحب کے سپاہیوں سے جھگڑا ہو گیا۔ حامد حسن خاں و محمد حسن خاں مارے گئے اور بقیہ ساتھی خوش قسمتی سے جو دوسرے دروازہ سے نکلے تھے وہ بچ گئے۔ ادھر شاہ جی نے جلی کوٹھی کو پھونک دیا تھا۔ اس صلے میں اس خاندان کو خیر خواہ گورنمنٹ کا سرٹیفکیٹ مل گیا۔ اور گورنمنٹ برطانیہ کی مہربانیوں سے یہ خاندان اب تک مستفیض اور مالا مال ہے۔ یہ ہے مختصر سرگذشت ان واقعات کی جو اس عالم گیر آشوب میں شہر شاہ جہان پور اور ضلع شاہ جہان پور میں واقع ہوئے [1]۔

(تاریخ شاہ جہان پور، مؤلفہ مولوی محمد صبیح الدین خلیل، لکھنؤ، ۱۹۳۲ء: صفحہ ۱۳۱-۱۳۵)

[1] اس مقام پر مولوی صبیح الدین صاحب تاریخ صبیح نے تاریخ مطیع سے ماخوذ ایک طویل اقتباس نقل کیا ہے جسے یہاں نقل نہیں کیا گیا۔ اس لیے کہ وہ صاحبِ تاریخ مطیع کے مقالے میں شامل ہے۔

(ا۔س۔ش)

شاہ جہان پور۔ایک تحقیقی مطالعہ

شاہ جہان پور اور ۱۸۵۷ء

چند تاریخی معلومات

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

(۱)

برٹش حکومت کی مرتبہ رپورٹوں کی روشنی میں

جی پی منی مجسٹریٹ اینڈ کلکٹر شاہ جہان پور کا خط بہ نام آر الیگزینڈر کمشنر آف روہیل کھنڈ مورخہ ۹ر تمبر ۱۸۵۸ء

پیرا نمبر ۱۳: باغی سپاہیوں نے شہر میں آنے کے بعد نظام علی خاں کو شہر کا کوتوال بنانے کا اعلان کیا۔ نظام علی خاں پہلے بھی شہر کے کوتوال تھے اور اب وہ ریٹائر ہونے کے بعد پنشن پاتے تھے۔ اس کے بعد سپاہی ان کے ساتھ اسی روز جیل سے نکلنے والے قیدی، جن مین نظام علی کے داماد ہدایت حسین اور منگل خاں، اجو خاں جیسے خراب کیریکٹر کے لوگ جو کئی بار جیل جا چکے تھے اور بہت سے شہر کے لوگ قادر علی خاں اور غلام حسین خاں کے پاس پہنچے اور انھیں شہر کا ''نواب'' بنایا اور پھر اس مجمع نے ایک جلوس کی شکل میں کنٹونمنٹ کا رخ کیا اور رجمنٹ کے صوبے دار گھنشیام سنگھ سے جا کر ملے۔ ان کو سلامی دی اور ان کو مبارک باد دی کہ فوج کے جو صوبے دار برٹش حکومت کے خلاف میدان میں نکلے ان میں گھنشام سنگھ بہت نمایاں تھے۔

پیرا نمبر ۱۴: اس زمانے شہر کے جن دیہات وقصبات نے برٹش حکومت کے خلاف اور انگریز دشمنی میں جوش وجذبات کا خاص طور پر اظہار کیا اور گڑبڑ میں حصہ لیا۔

ان میں ان گاؤں کے نام آئے ہیں:

"دلاور پور، رس رتھ پور، زین الدین نگر، بنی پور، سراؤرا، مصری پور، روسر، عزیز گنج، الار پور، سہرامئو (شمالی تحصیل پوایاں)، دھنی پور، شہباز پور، بکلا پور، نوادا، ایندے پور، اولدو پورہ، کاری، مکرند پور اور چونڈیرا۔

پیرا نمبر ۱۶: سپاہیوں کی ایک جماعت بریلی کے لیے روانہ ہوگئی اور مولوی سرفراز علی باشندہ گورکھ پور بھی اس جماعت کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ یہ شخص سپاہیوں کی بغاوت سے تقریباً بیس دن پہلے شاہ جہان پور آیا تھا۔ اسی میں کوئی شبہ نہیں کہ سپاہیوں میں اسی شخص نے بغاوت کے جذبات بھڑکائے تھے۔ شاہ جہان پور میں اس کے کئی مرید اور شاگرد تھے۔ ان میں سررشتہ فوج داری کا نایب قدرت علی اور اس کا بھائی نیاز علی دونوں باغی ہیں۔

پیرا نمبر ۱۹: یکم جون ۱۸۵۷ء سے نواب قادر علی خاں (ناظم) اور نظام علی خاں (کوتوال) نے شہر کے انتظام کے لیے اپنے عہدے دار مقرر کرنے شروع کیے۔ سب سے پہلے گورنمنٹ کے سابق ملازمین کو منتخب کیا جو کام کا تجربہ رکھتے تھے، پھر ان لوگوں کو جو ملازمت کے خواہش مند تھے۔ حامد حسن خان ڈپٹی کلکٹر اور نظام علی خاں سابق تحصیل دار نے اس سلسلے میں مختلف مشورے دیے۔ بریلی میں بغاوت کی خبر جوں ہی شاہ جہان پور پہنچی نواب قادر علی خاں نے ایک جلوس مرتب کیا اور شہر میں اعلان کرادیا کہ شہر سے برٹش راج اُٹھ گیا ہے اور نظام علی کوتوال نے اعلان کیا کہ آیندہ اگر کسی شخص نے برٹش حکومت کا نام لیا تو وہ اپنی جان گنوا بیٹھے گا۔

پیرا نمبر ۲۱: شاہ جہان پور میں سپاہیوں نے بغاوت کی تو قادر علی خاں کو ناظم مقرر کرلیا گیا، لیکن وہ ایک ماہ بھی اپنے منصب پر قایم نہ رکھ سکے۔ نہ وہ کوئی خاص کارنامہ انجام دے سکے اور وہ حالات پر قابو بھی نہ پاسکے تھے۔ ان کے زمانے میں ایک سنار سے کسی نے زیورات خریدے تھے اور پھر رقم کی ادائیگی سے انکار کردیا تھا۔ نواب بہادر خاں (بریلی) کے سامنے اس کا مقدمہ پیش ہوا۔ ابھی کوئی خاص کارروائی عمل میں نہ کرلی تھی کہ نواب غلام قادر خاں شاہ جہان پور کے ناظم بنائے گئے۔ وہ اس

معاملے کی طرف فوراً توجہ نہ دے سکے۔ سنار تقریباً دو مہینے بریلی میں رہا۔ ابھی اس کی رقم وصول نہ ہوئی تھی۔ کہ اسے قتل کر دیا گیا۔

پیرا نمبر ۲۲: تقریباً ۸؍جون کو سیتا پور سے ۴۱ویں باغی رجمنٹ فتح گڑھ جانے کے لیے شاہ جہان پور سے گزری۔ اس نے رات کو عزیز گنج میں پڑاو ڈالا اور صبح کو فتح گڑھ روانہ ہوگئی۔

پیرا نمبر ۲۳: ۳۱؍مئی کو بغاوت کا آغاز ہوا تو غلام قادر خاں اودھ کے ایک مقام بانسی ضلع بستی گئے ہوئے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ اپنے پیر و مرشد کی زیارت اور ملاقات کو گئے ہوئے تھے۔ شاہ جہان پور میں بغاوت کا شعلہ بھڑکا اور قادر علی خاں کو ناظم اور نظام علی خاں جو پہلے سے کوتوال تھے، اب انقلابی حکومت کا کوتوال مقرر کر لیا گیا۔ مظہر کریم سررشتہ دار فوج داری نے غلام قادر خاں کو حالات سے مطلع کیا اور انھیں فوراً شاہ جہان پور واپس آنے اور شہر کو اپنے قبضے میں لینے کا مشورہ دیا۔ وہ یہ اطلاع ملتے ہی تقریباً ۱۵؍جون کو شاہ جہان پور لوٹ آئے اور اپنے دوستوں سے مشورہ کر کے آیندہ چند دنوں میں مندرجہ ذیل لوگوں پر مشتمل ایک وفد لے کر بریلی روانہ ہو گئے۔

(۱) عبدالرؤف خاں سابق ڈپٹی انسپکٹر آف ایجوکیشن، (۲) نقش بند خاں، (۳) فیضاب (فیض، فیاض؟) خاں، (۴) ولایت علی خاں، (۵) غلام علی خاں محمد مجسٹریٹ آفس، (۶) ناصر خاں محلہ خلیل، (۷) نظام علی خاں آف شاہ جہان پور، (۸) نظام علی خاں سابق کوتوال، (۹) سیتل سنگھ (۱۰) دولت رائے، (۱۱) ظہور خاں، (۱۲) محمد حسین خاں بخشی آف چوکیداری، (۱۳) فضل خاں، (۱۴) حکیم مظہر علی خاں، (۱۵) واجد علی سابق ناظر منصف آفس۔

یہ تمام حضرات غلام قادر خاں کے ساتھ تھے، خان بہادر خان کے سامنے پیش ہوئے اور درخواست کی کہ شاہ جہان پور کے لیے غلام قادر خاں کو ناظم مقرر کیا جائے!

پیرا نمبر ۲۴: شاہ جہان پور کے ناظم کی حیثیت سے غلام قادر خان کا تقرر عمل میں آ گیا اور ذیل کے تقررات کا فیصلہ بھی اسی وقت کر دیا گیا۔

(۱) نظام علی خاں آف شہباز نگر سابق تحصیل دار، بہ حیثیت نایب ناظم

(۲) خان علی خاں سابق تحصیل دار آف بیسل پور ضلع بریلی، بہ حیثیت دوسرے نایب ناظم۔ یہ اپنے ساتھ خزانہ بھی لائے تھے، جو انھوں نے خان بہادر خان کی خدمت میں پیش کر دیا۔

(۳) حامد حسن خاں سابق ڈپٹی کلکٹر بہ حیثیت تیسرے نایب ناظم

نایب ناظم کے عہدے کی تنخواہ پانچ سو رُپے ماہانہ مقرر ہوئی۔

(۴) عبدالرؤف خان کو فوج کا کمانڈر بنایا گیا تھا، ان کی تنخواہ چار سو رُپے تھی۔

(۵) سیتل سنگھ۔ دیوان مقرر کیے تھے۔ ان کی تنخواہ دو سو رُپے تھی۔

پیرا نمبر ۲۵: یہ وفد جو نواب بہادر خان سے ملاقات کے لیے بریلی گیا تھا، ۲۳ر جون کو اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر شاہ جہان پور لوٹ آیا۔ واپس آنے کے بعد شہر کا انتظام غلام قادر خاں نے بہ حیثیت ناظم اپنے ہاتھ میں لیا اور فوج کی جدید تنظیم کی طرف بھی توجہ کی۔ پیدل اور گھوڑ سواروں کی رجمنٹیں از سر نو قایم کیں اور کیولری اور انفنٹری کے بجاے رسالہ نام رکھا۔

(۱) کیولری کے رسالوں میں؛

(۱) ظہور خان، (۲) اسرار خان، (۳) قدرت اللہ خان، (۴) مہدی علی خاں، (۵) نواب حشمت خاں، (۶) نواب حیدر خاں، (۷) الطاف خاں، (۸) فجو خاں (۹) رجب علی اور

(۲) انفنٹری میں ذیل کے حضرات کو رسالدار مقرر کیا گیا؛

(۱) ولایت علی خان، (۲) ابنِ فیض یا فیاض خان، (۳) ناصر علی خاں (جو بعدہٗ اللہ گنج کے معرکے میں شہید ہوئے)

(۳و۴) علی حسن خان اور منگل خان (دو برادران عبدالرؤف خان)

پیرا نمبر ۲۶: (۵و۶) ان کے علاوہ ظہور احمد اور رؤف احمد دونوں بھائی سابق گورنمنٹ ملازمین پیش کار ہاتھرس (ضلع علی گڑھ) ہیں۔ اب شعبۂ فوج داری میں محرر ہیں۔ اس نے باغیوں میں نہایت مستعدی اور سرگرمی سے حصہ لیا۔ دونوں نواب

(بہادر خان) کے نہایت وفادار ہیں اور غیر معمولی اثر رکھتے ہیں۔ اب دونوں کا تعلق اودھ کی انقلابی فوج سے ہے۔

پیرا نمبر ۲۹: عبدالرؤف خان کے استعفے کے بعد واجد علی (سابق منصف کے آفس کے ناظر) ملٹری کمانڈ کے چیف مقرر ہوئے اور برٹش فورسز کے دوبارہ قبضے تک مسلسل خدمات انجام دیتے رہے۔

پیرا نمبر ۳۱: حامد حسن خاں کے نایب نظامت سے استعفے کے بعد نواب خان بہادر خاں کا ایک حکم نامہ موصول ہوا کہ ان کی جگہ پر نجیب خاں کو نایب ناظم مقرر کیا جاتا ہے۔

پیرا نمبر ۳۶: غلام محمد خان کو ضلع کے اس حصے (تحصیل تلہر) کا نواب خان بہادر خاں کی طرف سے ناظم مقرر کیا گیا۔ یہ تقرر خان بہادر خان سے سیف اللہ خان سابق جیلر بریلی کی دوستی کی وجہ سے عمل میں آیا تھا۔ وہ (سیف اللہ خان) خان بہادر خان پر بہت اثر رکھتے تھے۔ انھوں نے کیولری اور انفنٹری کے قیام میں بہت مدد اور رہنمائی کی تھی۔ (فریڈم اسٹرگل اتر پردیش جلد پنجم سے استفادہ)

(۲)

انقلابی حکومت کے عمال

جی پی منی مجسٹریٹ اینڈ کلکٹر شاہ جہان پور کے خط بہ نام ارالیگزینڈر کمشنر روہیل کھنڈ نمبر ۲۱ مورخہ ۹ ستمبر ۱۸۵۸ء کی روشنی میں

(الف)

ریونیو صدر آفس شاہ جہان پور

شمار	نام عہدۂ عامل	عہدہ بغاوت سے پہلے برٹش حکومت میں	عہدہ بغاوت کے بعد انقلابی حکومت میں
۱	قدرت علی	نایب سرشتہ دار	پیش کار تحصیل تلہر
۲	عابد علی	ناظر	ناظر بعدہ تھانے دار کٹرا

۳	علی احمد	اہل مد مہر آباد	منصرم نیلام
۴	ابوالحسن	اہل مد پوایاں	تحصیل دار پیلی بھیت
۵	کالکا پرشاد	منصرم نیلام	کماندار۔انفنٹری
۶	خورشید حسین	نایب ناظر	عہدہ معلوم نہیں۔باشندۂ بریلی
۷	حبیب الرحمٰن	مددگار	سوار
۸	اعتقاد علی	مددگار روزنامچہ نویس	سوار، جہاد میں شریک ہونے کے لیے دہلی چلے گئے۔
۹	شہاب الدین	مددگار۔مہر آباد	عہدہ معلوم نہیں۔
۱۰	فیض الدین	روزنامچہ نویس۔تلہر	عہدہ معلوم نہیں۔
۱۱	کرشن سہاے	روزنامچہ نویس۔ پوایاں	عہدہ معلوم نہیں۔
۱۲	احمد خان	دفتری	دفتری ہی رہے
۱۳	فیض اللہ خاں	محافظ دفتر	معطل کیے گئے۔ برٹش حکومت کے لیے جاسوسی کے الزام میں قتل۔
۱۴	علی محمد	دفتری	جمعدار
۱۵	عنایت اللہ	محرر دفتر	عہدہ معلوم نہیں
۱۶	مول چند	محرر دفتر	محرر
۱۷	ولایت علی خاں	محرر دفتر	عہدہ معلوم نہیں
۱۸	درگا پرشاد	محرر دفتر	عہدہ معلوم نہیں
		ڈپٹی کلکٹر ریگولیشن ۹/۱۸۳۳ء	
۱۹	کفایت علی خاں	منصرم پیمایش	زیر غور
۲۰	علیم اللہ خاں	محرر شاہ جہان پور	عہدہ معلوم نہیں
۲۱	بھجن لال	واصل باقی نویس	سابقہ عہدے پر برقرار
۲۲	چرن بہاری لال	سیاہ نویس	سابقہ عہدے پر برقرار

۲۳	جانکی پرشاد	قانون گو	سابقہ عہدے پر برقرار
۲۴	بلدیو سہاے	قانون گو	سابقہ عہدے پر برقرار
		ریوینو۔تلہر	
۲۵	رام سہاے	پیش کار	سابقہ عہدے پر برقرار رہا
۲۶	منولال	سیاہ نویس	سابقہ عہدے پر برقرار رہا
۲۷	گردھاری لال	قانون گو	ایضاً۔پرگنہ نگوہی تحصیل تلہر
۲۸	شنکر سہاے	قانون گو	ایضاً۔پرگنہ کھیڑا بجھیڑا تلہر
۲۹	بلدیو سہاے	قانون گو	ایضاً۔پرگنہ جلال پور تلہر
		مہر آباد	
۳۰	احمد یار خاں	تحصیل دار	ناظم۔جلال آباد (ضلع شاہ جہان پور)
۳۱	امراؤ سنگھ	قانون گو	سابقہ عہدے پر برقرار رہا
		پوایاں	
۳۲	چیت رام	پیش کار	Ulushdar in one of the regiments.
		سررشتۂ فوج۔صدر آفس (شاہ جہان پور)	
۱	مظہر کریم	سررشتہ دار	مفتی۔گرفتاری کے خطرے کی وجہ سے انھیں ایک ہزار رُپے دیے گئے۔
۲	شمو خاں	نایب سررشتہ دار	مفتی کی عدالت میں
۳	خوب چند	ناظر	نایب دیوان۔دو سو رُپے یک مشت دیے گئے۔
۴	گوری شنکر	دوسرے نایب سررشتہ دار	سررشتہ دار
۵	رؤف احمد	اظہار نویس	(مفتی مظہر کریم کے داماد) کئی دفتروں میں رہے۔دو سو رُپے یک مشت دیے گئے۔
۶	فضل الامام	پروانہ نویس	پروانہ نویس

۷	درگا پرشاد	نقش نویس	محرر
۸	وزیر خاں	نایب ناظر	ناظر
۹	رحیم بخش	کلینڈر نویس	کلینڈر نویس
۱۰	ہدایت اللہ خاں	نایب پروانہ نویس	پروانہ نویس
۱۱	فضل حسین خاں	محرر	عدالت مفتی کے محرر
۱۲	متھرا پرشاد	محافظ دفتر	دفتر عدالت مفتی کے محافظ
۱۳	سلیم اللہ خاں	نایب محافظ دفتر	محافظ دفتر مفتی کورٹ
	کوہولی (Cohoolee)		
۱۴	غلام نبی	محرر اوّل	محرر
۱۵	رستم خان	جمعدار	جمعدار
	تھانے، پتھرا (Puthra)		
۱۶	یار محمد خاں	جمعدار	اٹلاق (Itlaq) نویس
	کانٹ (ضلع شاہ جہان پور)		
۱۷	نتھو خاں	جمعدار	تھانے دار
	تلہر		
۱۸	شہباز خاں	محرر	سوار
۱۹	انور علی	جمع دار	سوار
	کٹرا (میران پور کٹرا)		
۲۰	علیم اللہ	محرر	وکیل
۲۱	شیر انداز خاں	جمعدار	سوار
۲۲	حسن خان	جمعدار چوکی خداگنج	جمعدار (خداگنج پرگنہ مہدی پور، تحصیل تلہر)
۲۳	لالہ پرشاد	محرر	تمن دار
پوایاں			
۲۴	کرامت خاں	جمعدار	دفع دار

پورن پور (ضلع پیلی بھیت)			
۲۵	سعد اللہ خاں	محرر	عرایض نویس
کھٹار (تحصیل پوایاں ضلع شاہ جہان پور)			
۲۶	برکت اللہ خاں	محرر	Ulushdar
۲۷	عبد الرحیم خاں	جمعدار	جمع دار آف انفنٹری
۲۸	میر باز خاں	جمعدار (چوکی سہرامئو)	سوار
(د): جیل انتظامیہ			
۲۹	اشوری سنگھ	نایب جمعدار گارڈ	کمانڈنٹ آف نجیب
۳۰	غلام محی الدین خاں	جمعدار چالی	دفع دار آف گھوڑ سوار
۳۱	ماتا دین	دفع دار نجابت	دفع دار آف نجابت
(ہ) بخشی خانہ			
۳۲	محمد حسین خاں	بخشی	نایب کوتوال (آخر تک)
۳۳	چھوٹے لال	محرر	بخشی آف فورسز

(ب)

فہرست اہم شخصیات جو بعد میں انقلابی حکومت میں شامل نہیں رہی تھیں لیکن باغیوں سے ان کا تعلق تھا۔ ترتیب وار

شمار	نام	رہایش	خدمات کی نوعیت اور حوالہ
۱	نواب قادر علی خاں	شاہ جہان پور شہر	رپورٹ کے پیرا نمبر ۳۱ کے مطابق ایک ہزار رُپے ایوارڈ تجویز کیا گیا۔
۲	غلام حسین خاں	شاہ جہان پور شہر	رپورٹ کے پیرا نمبر ۱۳ کے مطابق؟
۳	غلام قادر خاں	شاہ جہان پور شہر	رپورٹ کے پیرا نمبر ۲۳ کے مطابق ان کے لیے تین ہزار رُپے ایوارڈ تجویز کیا گیا۔
۴	نظام علی خاں	شاہ جہان پور شہر	نایب ناظم رہے تھے۔ بچپوریا کے معرکے میں شہید ہوئے تھے۔

۵	قاسم علی خاں	شاہ جہاں پور شہر	کمانڈنٹ۔ بچپوریا کے معرکے میں شہید ہوئے۔ تحصیل دار شاہ جہاں پور رہے تھے۔ انھیں سو رُپے کی سکیورٹی پیش کی گئی تھی۔ جی سی او نمبر ۱۰۶۸ کی بنیاد پر۔ مورخہ ۲۸/ اپریل ۱۸۵۸ء۔
۶	نیاز علی خاں	شاہ جہاں پور شہر	رسالدار آف کیولری
۷	رجب علی خاں	شاہ جہاں پور شہر	رسالدار آف کیولری
۸	نجیب خاں	جلال آباد	نایب ناظم
۹	اسرار علی خاں	شاہ جہاں پور شہر	رسالدار جی سی او نمبر ۱۰۲۸ مورخہ ۲۸/ اپریل (۱۸۵۸ء) کی بنیاد پر اپنے آپ ۵۰۰ رُپے کی سکیورٹی کی بنیاد پر پیش کی
۱۰	قدر علی خاں	شاہ جہاں پور شہر	ایضاً
۱۱	عظمت علی خاں	شاہ جہاں پور شہر	ایضاً
۱۲	فضل علی خاں عرف فجو خاں	شاہ جہاں پور شہر	رسالدار
۱۳	ولایت علی خاں	شاہ جہاں پور شہر	کمانڈنٹ۔ ایوارڈ سو رُپے
۱۴	ظہور خاں	شاہ جہاں پور شہر	رسالدار
۱۵	نواب حشمت علی خاں	شاہ جہاں پور شہر	رسالدار
۱۶	منگل خاں	شاہ جہاں پور شہر	کمانڈنٹ۔ مجسٹریٹ کی رپورٹ نمبر ۱۶ مورخہ ۲۳/ جون ۱۸۱۸ء مجوزہ ایوارڈ ایک ہزار رُپے
۱۷	غلام علی خاں	شاہ جہاں پور شہر	رسالدار
۱۸	علی حسن خاں	شاہ جہاں پور شہر	کمانڈنٹ
۱۹	ولایت علی خاں	شاہ جہاں پور شہر	رسالدار
۲۰	شاہ جہاں خاں	شاہ جہاں پور شہر	رسالدار

۲۱	مہدی علی خاں	شاہ جہان پور شہر	رسالدار۔ایوارڈ مجوزہ پانچ سو رُپے
۲۲	غلام محمد خاں	تلہر	ناظم اینڈ کمانڈنٹ۔ایوارڈ مجوزہ پانچ سو رُپے
۲۳	خادم حسین خاں	تلہر	تحصیل دار تلہر۔ایوارڈ مجوزہ پانچ سو رُپے
۲۴	کفایت علی خاں	تلہر	ناظم تلہر۔ایوارڈ مجوزہ دو سو رُپے
۲۵	ہدایت علی خاں	تلہر	ناظم تلہر۔ایوارڈ مجوزہ دو سو رُپے
۲۶	غلام حسین	تلہر	نایب ناظم تلہر۔ایوارڈ مجوزہ دو سو رُپے
۲۷	عبدالغفار خاں	تلہر	نایب ناظم تلہر۔الش دار آخر تک رہے۔
۲۸	رعایت علی خاں	تلہر	ناظم تلہر۔ایوارڈ مجوزہ دو سو رُپے
۲۹	واحد علی خاں	تلہر	وفات تک فوجوں کی رہنمائی نینی تال میں
۳۰	فیض محمد خاں	کٹرا	کمانڈنٹ آخر تک
۳۱	غلامی خاں	بچھی پور تحصیل ساولی ضلع بدایوں	کمانڈنٹ آخر تک
۳۲	بہاری شاہ	شاہ جہان پور شہر	کمانڈنٹ آخر تک
۳۳	احمد یار خاں	محلہ بھرگواں	فی الحال زیر جی سی او نمبر ۱۰۹۸ مورخہ ۲۸/ اپریل ۱۸۵۸ء
۳۴	محمد حسین خاں	شاہ جہان پور شہر	
۳۵	سید نیاز علی	شاہ جہان پور شہر	سر شتہ دار۔ایوارڈ مجوزہ سو رُپے
۳۶	رام پرشاد	شاہ جہان پور شہر	فی الحال زیر جی سی او نمبر ۱۰۹۸ مورخہ ۲۸/ اپریل ۱۸۵۸ء
۳۷	سیتل سنگھ	شاہ جہان پور شہر	ایضاً
۳۸	دولت راؤ	شاہ جہان پور شہر	بخشی۔بچوریا کے معرکے میں وطن پر قربان ہو گئے۔
۳۹	احمد جان خاں	شاہ جہان پور شہر	ناظر آف جلال آباد۔پھانسی پا گئے۔
۴۰	غلام حسین خاں	شاہ جہان پور شہر	داروغہ پیلی بھیت

۴۱	سرفراز علی	شاہ جہان پور شہر	منصف ۔۱۴ برس کے لیے کالا پانی
۴۲	سید محمد حسین	شاہ جہان پور شہر	مفتی پیلی بھیت ۔کیس زیر التوا
۴۳	نذر علی خاں	شاہ جہان پور شہر	کمانڈنٹ تلہر ۔آخر تک رہے۔
۴۴	سلطان حسین خاں (خان بہادر خاں بریلی کے بھتیجے)	شاہ جہان پور شہر	منصف تلہر ۔آخر تک رہے۔
۴۵	اسد علی خاں	شاہ جہان پور شہر	رسال دار
۴۶	الطاف علی	شاہ جہان پور شہر	فی الحال زیر جی سی او نمبر ۱۰۹۸ مورخہ ۲۸/ اپریل ۱۸۵۸ء
۴۷	نظام علی خاں پنشنر	شاہ جہان پور شہر	کوتوال ۔آخر تک رہے۔ایوارڈ پانچ سو رُپے
۴۸	Fyzab	شاہ جہان پور شہر	Aide-de- Comp. فی الحال زیر جی سی او نمبر ۱۰۹/ مورخہ ۲۸/ اپریل ۱۸۵۸ء
۴۹	خان علی خاں	شاہ جہان پور شہر	نایب ناظم ۔ایوارڈ مجوزہ تین سو رُپے

(فریڈم اسٹریگل ان اُتر پردیش، جلد پنجم سے استفادہ)

(۳)

۱۸۵۷ء کی چند اہم شخصیات
جن کا ذکر شاہ جہان پور اور جنگ آزادی کے ضمن میں آیا ہے

(۱) اجو (یا عزو) خاں: ساکن شاہ جہان پور سٹی، یہ انقلابیوں میں شامل ہو گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اس سے پہلے کئی بار جیل جا چکے تھے۔ (جلد ۵، صفحہ ۲۹۶)

(۲) احمد خاں: برٹش گورنمنٹ کے دور میں صدر ریونیو آفس (شاہ جہان پور) میں دفتری تھے۔ پھر انھوں نے اپنی اسی حیثیت میں شاہ جہان پور کی انقلابی حکومت میں خدمت انجام دیں۔ (جلد ۵، صفحہ ۳۰۳)

(۳) احمد یار خاں: برٹش حکومت کے عہد میں جلال آباد میں تحصیل دار تھے۔ شاہ جہان پور میں قومی حکومت قایم ہوئی تو وہ غلام قادر خاں (ناظم شاہ جہان پور) سے ملے اور گذارش کی کہ انھیں جلال آباد کا تحصیل دار برقرار رکھا جائے۔ (جلد۵، صفحہ۲۰۹) اس سے پہلے وہ مہر آباد کے تحصیل دار رہ چکے تھے۔ (۲۸/اپریل ۱۸۵۸ء کو انھیں جلال آباد (تحصیل) میں انقلابی گورنمنٹ کے تحت ناظم مقرر کیا گیا۔ (جلد۵، صفحہ۳۰۳)

(۴) انور علی: باشندہ تلہر۔ برٹش حکومت میں جمع دار تھے۔ انقلابی حکومت میں وہ سواروں میں شامل ہو گئے تھے۔ (جلد۵، صفحہ۳۰۵)

(۵) اسد علی خاں: باشندۂ شاہ جہان پور۔ انقلابی حکومت میں رسالدار کے عہدے پر فایز تھے۔ (جلد۵، صفحہ۳۱۱)

(۶) اسرار خاں: ایک نامی گرامی شخص گھوڑ سوار رسالے سے وابستہ تھے۔ انقلابی حکومت کے تحت کیولری فورس قایم کی گئی تو اس کے مختلف رسالے ظہور خاں، قدرت اللہ خان، مہدی علی خاں، نواب حشمت خاں، حیدر خاں، الطاف خاں، فجو خاں، رجب علی خاں اور اسرار خاں کے نام سے تھے۔ (جلد۵، صفحہ۳۰۰-۲۹۹)

(۷) امراؤ سنگھ: قانون گو کی حیثیت برٹش عہد حکومت میں مہر آباد میں خدمات انجام دے رہے تھے۔ جب انقلابی حکومت قایم ہوئی تو اس کے تحت وہ اسی حیثیت و منصب پر خدمات انجام دیتے رہے۔ (جلد۵، صفحہ۳۰۳)

(۸) برکت اللہ خاں: برٹش گورنمنٹ میں ایک محرر تھے۔ انقلابی گورنمنٹ میں شریک ہوئے تو انھیں کھوٹار ضلع شاہ جہان پور کا الش دار بنا دیا گیا۔ (جلد۵، صفحہ۳۰۶)

(۹) بہاری شاہ: باشندۂ شاہ جہان پور انقلابی حکومت میں شامل ہوئے تو کمانڈنٹ بنایا گیا۔ (جلد۵، صفحہ۳۱۰)

(۱۰) بھجن لال: برٹش دورِ حکومت میں شاہ جہان پور میں واصل باقی نویس تھے۔ انقلابی حکومت قایم ہوئی تو اس میں بھی ان کی یہی ملازمت تھی۔ (جلد۵، صفحہ۳۰۲)

(۱۱) بھیکن خاں: شاہ جہان پور میں ۲۸ ویں نیٹو انفنٹری کے ہسپتال میں ڈریسر تھے۔ انھوں نے ایک، بیان حلفی میں بتایا کہ ہسپتال میں کس کے مردے آئے

تھے اور اس نے بتایا تھا کہ اسے میر قاسم علی سے معلوم ہوا کہ جواہر رائے نے اسے انقلابیوں میں شامل ہو جانے کی مشورہ یا ترغیب دی تھی۔ (جلد ۵، صفحہ ۲۰۳-۲۰۱)

(۱۲) ٹورنا سنگھ: شیو چرن سنگھ کا دفاع کیا اور اس الزام کی تردید کی کہ شیو چرن سنگھ شاہ جہاں پور کے چرچ پر حملے میں شریک تھا۔ (جلد ۵، صفحہ ۲۰۴)

(۱۳) جواہر رائے: کے بارے میں کہا گیا کہ انھوں نے شاہ جہان پور میں بغاوت کا ہنگامہ کھڑا کرنے میں حصہ لیا۔ (جلد ۵، صفحہ ۲۰۲) چرچ پر حملہ کرنے والوں میں وہ شریک تھے۔ (جلد ۵، صفحہ ۲۸۱) ایم رکیٹس کو انھوں نے تلوار کے ایک وار میں قتل کر دیا۔ (جلد ۵، صفحہ ۱۹۵) کیپٹن جیمس کو شوٹ کرنے کا بھی ان پر الزام تھا۔ (جلد ۵، صفحہ ۱۹۶) شاہ جہان پور کے اہم انقلابیوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ (جلد ۵، صفحہ ۲۰۳ و ۲۰۴) ایم رکیٹس پر نوٹ میں یہ مضمون اضافہ ہے کہ اس نے خزانے کو کسی اور جگہ محفوظ کرنے کا فیصلہ کیا۔ (جلد ۵، صفحہ ۲۰۷) وہ تیزی کے ساتھ چرچ سے نکلا اور اپنے گھر کی طرف گیا۔ جواہر رائے شاید اس کی تاک میں تھا، اس نے اس کا پیچھا کیا۔ (جلد ۵، صفحہ ۱۹۵ و ۲۰۱) اور موقع پاتے ہی تلوار کے ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا۔

(۱۴) حشمت علی خان، نواب: شاہ جہان پور کے باشندے تھے۔ انقلابی گورنمنٹ میں کمانڈنٹ کی حیثیت میں خدمات انجام دیں۔ (جلد ۵، صفحہ ۳۰۹)

(۱۵) خان علی خان: قادر علی خاں کی نظامت کے زمانے میں خاں علی خاں کو چیف کمانڈر مقرر کیا گیا تھا۔ (جلد ۵، صفحہ ۵۵۴)

(۱۶) رام سہائے: شاہ جہان پور کی انقلابی گورنمنٹ کے تحت تلہر میں پیش کار کے آفس میں ملازم تھے۔ (جلد ۵، صفحہ ۳۰۲)

(۱۷) رام نرائن ڈوبے: ڈوبے کا بیان حلفی جیوا چرن سنگھ کے دفاع میں ہے کہ وہ شاہ جہان پور چرچ کے حملے میں شریک نہیں تھا۔ (جلد ۵، صفحہ ۲۰۴)

(۱۸) رجب علی خاں: باشندۂ شاہ جہان پور، انقلابی حکومت کے تحت گھوڑ سوار فوج قایم ہوئی تو اس میں ایک رسالہ ان کے نام کا بھی تھا۔ یہ بہت مستعد اور ہوشیار رسالدار مانے جاتے تھے۔ (جلد ۵، صفحہ ۳۰۰-۳۰۸)

(۱۹) رحمت علی خاں: گرینڈیر کمپنی میں حوالدار تھے۔ شاہ جہاں پور کے چرچ پر انقلابیوں نے حملہ کیا تو میر قاسم علی کو انھیں نے اطلاع دی تھی۔ (جلد۵، صفحہ۲۰۰)

(۲۰) رعایت علی خان: باشندۂ تلہر، شاہ جہاں پور کی انقلابی حکومت کے رکن تھے۔ تلہر کے ناظم کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ (جلد۵، صفحہ۳۰۹)

(۲۱) رؤف احمد: شاہ جہاں پور کے فوج داری آفس میں محرر تھے۔ انھوں نے برٹش حکومت کی مخالفت میں سرگرم حصہ لیا۔ (جلد۵، صفحہ۳۰۰) اور شاہ جہاں پور کی گورنمنٹ کے تحت کئی دفاتر میں کام کیا۔ انھیں دو سو رُپے وظیفہ ملتا تھا۔ (جلد۵، صفحہ۳۰۴)

(۲۲) سرفراز علی: شاہ جہاں پور کی انقلابی حکومت میں خدمات انجام دی تھیں۔ تحریک آزادی میں شکست کے بعد گرفتار ہوئے اور عمر قید کی سزا ہوئی اور چودہ برس کے لیے جیل چلے گئے۔ (جلد۵، صفحہ۳۱۰)

(۲۳) سلطان حسین خان: انقلابی گورنمنٹ کی طرف سے تحصیل تلہر (ضلع شاہ جہاں پور) میں منصف مقرر ہوئے تھے۔ (جلد۵، صفحہ۳۱۰)

(۲۴) سلمان: شاہ جہاں پور میں چرچ پر حملے کے بعد جو یورپین حکام بچ بچا کر پوایاں چلے گئے تھے، ان کے ساتھ جو چند مقامی حضرات تھے۔ ان میں سلمان صاحب بھی تھے، جنھوں نے شاہ جہاں پور سے پوایاں کا پورا سفر پیدال طے کیا تھا۔ اس قافلے میں ایک ایشوری سنگھ نامی شخص بھی تھا۔ اسی نے اس سفر کی پوری روداد بیان کی ہے۔ (جلد۵، صفحہ۹۷-۱۹۴)

(۲۵) سلیم اللہ خاں: شاہ جہاں پور میں برٹش حکومت میں محافظ دفتر کی حیثیت سے ملازم تھے۔ جب انقلابی حکومت قایم ہوئی تو اظہار نویس کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ (جلد۵، صفحہ۳۰۴)

(۲۶) سیتل سنگھ: کیپٹن لائی سوٹ کا اسسٹنٹ تھا یہی وہ شخص ہے جس نے شیوا چرن سنگھ کو چرچ پر حملے میں شریک ہونے والوں میں بیان کیا ہے، لیکن ایشوری سنگھ ولد رام ناتھ سنگھ دریاپوری (ضلع آرہ) راجپوت نے اس سے انکار کیا ہے۔

(جلد۵، صفحہ۲۰۲، ۲۰۵ و ۲۰۶)

(۲۷) سرکوجا: سیتل سنگھ نے شیوا چرن سنگھ کے شاہ جہان پور میں چرچ پر حملے کے بارے میں جو بیان دیا تھا، سرکوجا نے اس کی تصدیق کی ہے۔ (جلد۵، صفحہ۲۰۵)

(۲۸) شاہ جہان خاں: باشندہ شاہ جہان پور انقلابی حکومت میں رسالدار تھے۔

(جلد۵، صفحہ۳۰۹)

(۲۹) شموخان: برٹش گورنمنٹ کے تحت شاہ جہان پور میں سرشتہ دار تھے۔ پھر انھوں نے انقلابی حکومت کے دور میں اسی عہدے پر مفتی کی عدالت میں ملازمت کرلی تھی۔ (جلد۵، صفحہ۳۰۴)

(۳۰) شنکر سہائے آف کھیڑا نجیڑا: برٹش حکومت میں قانون گو تھے۔ شاہ جہان پور کی انقلابی حکومت میں شرکت کے بعد بھی قانون گو کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ (جلد۵، صفحہ۳۰۲)

(۳۱) شیو چرن سنگھ: اٹھائیسویں رجمنٹ میں سپاہی تھا، بتایا گیا ہے کہ شاہ جہان پور میں چرچ پر حملہ کرنے والوں میں شامل تھا۔ (جلد۵، صفحہ۲۰۵) اس موقع پر زخمی ہوگیا تھا۔ (جلد۵، صفحہ۲۰۰-۲۰۲) ۳؍ اگست ۱۸۶۰ء کو شناخت کے موقع پر سیتل سنگھ نے انھیں پہچان لیا۔ (جلد۵، صفحہ۲۰۴) اس نے خود اپنے بیان میں چرچ پر حملہ کرنے والوں سے الگ بتایا اور کہا کہ جواہر راؤ نے حملہ میں شرکت سے انکار پر اسے زخمی کردیا تھا۔ شیو چرن نے بتایا کہ وہ شیوا چرن کمپنی نمبر۲ کا دوسرا شخص ہے اور اس کا عہدہ نائک کا ہے جب کہ میں صرف سپاہی ہوں۔ (جلد۵، صفحہ۲۰۵)

(۳۲) ظہور خاں: باشندۂ شاہ جہان پور۔ انقلابی حکومت میں شامل ہوگئے تھے۔ گھوڑ سواروں میں رسالدار تھے۔ کہا جاتا ہے کیولری میں بڑے سرگرم اور مستعد شخص تھے۔ (جلد۵، صفحہ۲۹۹)

(۳۳) ظہور علی، جمعدار: انھوں نے نعمت علی خاں کو ایک خط لکھا تھا جس میں جہادی سنگھ کی نقل و حرکت سے انھیں مطلع کیا تھا۔ (جلد۵، صفحہ۲۳۱)

(۳۴) ظہور علی، سید: انھوں نے مولوی احمد اللہ شاہ کو خراج عقیدت پیش کیا تھا اور اپنے تئیں ان کی فوج کے جنرل بننے کی صلاحیت کو بیان کیا تھا اور شاہ جہان پور کی

جنگ میں اور حالیہ پوائیں کے معرکے میں مولوی مرحوم کی شہادت کے وقت اپنی صلاحیت اور خدمات کا اظہار کیا تھا۔ (جلد۲، صفحہ ۴۸، ۱۴۹و ۳۷۶)

(۳۵) عابد علی: برٹش گورنمنٹ کے ایک ملازم تھے۔ پھر وہ شاہ جہان پور کی انقلابی حکومت میں ناظر اور اس کے بعد کٹرا کے تھانے دار مقرر ہوئے۔ (جلد۵، صفحہ ۳۰۱)

(۳۶) عبدالغفار خاں: ساکن تلہر ضلع شاہ جہان پور انقلابی حکومت میں شریک ہوئے اور نائب ناظم اور الش دار (Ulushdar) مقرر ہوئے۔

(جلد۵، صفحہ ۳۰۹)

(۳۷) عبدالحسن: برٹش گورنمنٹ میں اہل مد تھے۔ شاہ جہان پور کی انقلابی حکومت میں شریک ہوئے اور پیلی بھیت میں تحصیل دار کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ (جلد۵، صفحہ ۳۰۱)

(۳۸) علی احمد مہر آباد: برٹش حکومت کے دور میں اہل مد تھے۔ انقلابی حکومت میں صدر آفس (شاہ جہان پور) میں منصوم نیلام کے عہدے پر فائز تھے۔

(جلد۵، صفحہ ۳۰۱)

(۳۹) علی محمد: برٹش حکومت کے تحت صدر آف شاہ جہان پور میں ایک دفتری تھے۔ انقلابی حکومت میں وہ جمع دار ہو گئے تھے۔ (جلد۵، صفحہ ۳۰۲)

(۴۰) علیم اللہ: برٹش حکومت میں وہ ایک محرر تھے۔ انقلابی حکومت کے دور میں انھوں نے وکالت اختیار کر لی تھی۔ (جلد۵، صفحہ ۳۰۵)

(۴۱) غلام حسین: (اور قادر علی خاں) کا شاہ جہان پور کے نواب کی حیثیت میں جلوس نکالا گیا تھا۔ (جلد۵، صفحہ ۲۹)

(۴۲) غلام قادر خاں: احمد یار خاں ان کے پاس یہ درخواست لے کر آئے کہ انھیں جلال آباد کے تحصیل دار کی حیثیت سے برقرار رکھا جائے۔ غلام قادر خاں حال ہی میں قادر علی خاں کی جگہ پر شاہ جہان پور کے ناظم مقرر ہوئے تھے۔ (جلد۵، صفحہ ۶۰۱)

(۴۳) فضل حق، مولوی: باشندۂ شاہ جہان پور۔ یہ میر فضل حق نامی انقلابی ہیں۔ ان کا ذکر فریڈم اسٹرگل اِن اُتر پردیش کی جلد۲ کے صفحہ ۱۴۹، ۵۱۷، ۵۶۵، جلد ۵

کے صفحہ ۸۴۴اور جلد ۶ کے صفحہ ۲۶۹، ۳۱۹، ۴۳۱، ۶۰۱، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۱۲، ۸۱۰، ۸۲۰، و ۸۴۴ پر آیا ہے۔ چوں کہ ان کے حالات میں مضمون موجود ہیں۔ اس لیے اس مقام پر مضمون و معلومات کی تکرار مناسب نہیں۔

(۴۴) فضل خان نے خان بہادر خان کے حضور درخواست کی کہ غلام قادر خان کو شاہ جہان پور کا ناظم مقرر کیا جائے۔ (جلد ۵، صفحہ ۲۹۹)

(۴۵) فیض محمد خاں آف کٹرا: بہ حیثیت کمانڈنٹ انقلابی حکومت میں شامل ہوئے تھے۔ (جلد ۵، صفحہ ۳۱۰) (ایف ایم خاں آف میران پور کٹرہ۔ ایک دوسرے ماخذ سے۔)

(۴۶) قادر علی خاں کو شاہ جہان پور کا نواب تسلیم کیا گیا تھا اور ہندوستانی فوجیوں نے شاہ جہان پور میں ان کا جلوس نکالا تھا۔ (جلد ۵، صفحہ ۲۹۶) وہی شاہ جہان پور کے پہلے ناظم تھے۔ بعد میں غلام قادر خاں کو ناظم مقرر کر دیا گیا تھا۔ (جلد ۵، صفحہ ۲۹۷، ۲۹۸ و ۳۰۸) قادر علی خاں کے حالات میں ایک مضمون زیر نظر کتاب میں شامل ہے۔ تفصیل وہاں مطالعہ فرمائیں۔

(۴۷) قدرت علی: باشندۂ شاہ جہان پور۔ برٹش حکومت میں فوج داری میں نایب سرشتہ دار تھے۔ وہ (مولوی) سرفراز علی (گورکھ پوری) کے مرید تھے۔ (جلد ۵، صفحہ ۲۹۷) شاہ جہان پور کی انقلابی گورنمنٹ کے تحت تلہر (تحصیل) کے پیش کار مقرر ہوئے تھے۔ (جلد ۵، صفحہ ۳۰۱) کچھ عرصے کے بعد اس خدمت سے دست بردار ہو گئے تھے۔ (جلد ۵، صفحہ ۳۰۸)

(۴۸) قدرت علی (سید): شاہ جہان پور سرشتہ فوج داری میں نایب تھے۔ جی پی منی مجسٹریٹ اور کلکٹر شاہ جہان پور نے اپنے خط مورخہ ۹ ر ستمبر ۱۸۵۸ء میں انھیں اور ان کے بھائی نیاز علی دونوں کو باغی لکھا ہے۔ (جلد ۵، صفحہ ۲۹۷)

(۴۹) قدرت اللہ خاں: انقلابی حکومت کے تحت گھوڑ سوار فوج قایم کی گئی تو اس کے ایک نہایت ہوشیار اور مستعد رسالدار یہ بھی تھے۔ (جلد ۵، صفحہ ۲۹۹)

(۵۰) کرشنا سہائے: برٹش گورنمنٹ کی طرف سے پوایاں میں روزنامچہ نویس تھے پھر شاہ جہان پور کی انقلابی حکومت میں شریک ہو گئے۔ (جلد ۵، صفحہ ۳۰۲)

(۵۱) کنھی (کھنیا) لال: صدر نظامت (شاہ جہان پور) میں وکیل ہوئے اور پھر مجسٹریٹ شاہ جہان پور نے انھیں فوج داری میں سررشتہ دار مقرر کیا۔

(جلد۵، صفحہ۵۳۹)

(۵۲) گل زار علی کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ شاہ جہان پور سے یورپینز کی ایک جماعت کو بہ حفاظت نکال لے گئے تھے۔ (جلد۵، صفحہ۱۹۵)

(۵۳) گل زاری لال: کلکٹری آف شاہ جہان پور بعدہٗ: اب گنج کے تحصیل دار مقرر ہوئے۔ (جلد۵، صفحہ۴۸۵)

(۵۴) گنگا ڈوبے کے بارے میں بھیکن خان نے اپنے بیان میں اظہار کیا کہ اس نے ڈوبے کو شاہ جہان پور میں بغاوت کے اول روز چرچ میں دیکھا تھا۔

(جلد۵، صفحہ۲۰۲)

(۵۵) گھنشام سنگھ: رجمنٹ نمبر ۲۸ سے متعلق ہسپتال کے کمپوڈر قاسم علی بن مقسوم علی نے اپنے بیان میں کہا کہ ۳۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو میں باہر نکلا تو چند باغیوں نے مجھے پکڑ لیا لیکن اسی چند دوسرے لوگوں نے مجھے چھڑا دیا لیکن اس کے بعد ہی گھنشام سنگھ نے مجھے پکڑ لیا اور ایک زخمی سپاہی کی ڈریسنگ کے لیے کہا۔ میں نے زخمی کو دیکھا تو پہچان لیا کہ یہ کمپنی نمبر۲ کا سپاہی شیو چرن ہے۔ گھنشام سنگھ نے مجھے بتایا کہ یہ چرچ حملے میں موقع پر زخمی ہو گیا ہے۔ اسی تفتیش کے سلسلے میں بتایا گیا ہے کہ جب باغی فوج نے قادر علی خاں اور غلام حسین خاں کو شاہ جہان پور نواب تسلیم کیا گیا اور اسی شام کو یہ دونوں ایک جلوس میں کنٹونمنٹ (شاہ جہان پور) میں رجمنٹ کے صوبے دار سے ملاقات کے لیے آئے تو ان کے ساتھ گھنشام سنگھ نمایاں اور سرگرم شخص تھا۔

(فریڈم اسٹرگل ان اتر پردیش: جلد۵، صفحہ۲۰۰، ۲۹۶)

(۵۶) لیسٹ (Lysut) کیپٹن نے کیپٹن اسنیڈ (Sneyd) کی شرکت میں رہائش کے لیے شاہ جہان پور میں ایک بنگلا کرایے پر لیا تھا چرچ پر انقلابیوں کے حملے سے بچ کر نکل بھاگے تھے اور بچتے بچاتے دونوں کیپٹن پیدل پوایاں پہنچ گئے تھے۔

(جلد۵، صفحہ۱۹۵تا۱۹۷، ۲۰۱، ۲۰۲)

(۵۷) متھرا پرشاد شاہ جہان پور کی انقلابی حکومت کے مفتی کورٹ میں محافظ دفتر تھے۔ (جلد۵، صفحہ۳۰۴)

(۵۸) محمد حسین، سید: شاہ جہان پور کی انقلابی گورنمنٹ نے انھیں پہلی بھیت میں مفتی کے عہدے پر تعینات کیا تھا۔ (جلد۵، صفحہ۳۱۰)

(۵۹) محمد حسین خاں: برٹش حکومت کے دور میں شاہ جہان پور میں بخشی تھے۔ انقلابی حکومت کے عہد میں نایب کوتوال بنائے گئے تھے۔ (جلد۵، صفحہ۳۰۷)

(۶۰) مداری سنگھ: شاہ جہان پور چرچ پر حملے کے موقع پر شیو چرن کے زخمی ہو جانے پر مداری سنگھ نے ان کی ڈریسنگ کی تھی۔ (جلد۵، صفحہ۲۰۰)

(۶۱) مفتی مظہر کریم: برٹش حکومت میں شاہ جہان پور میں محکمہ فوج داری کے سررشتہ دار تھے۔ غلام قادر خاں کو ناظم شاہ جہان پور بنانے میں مظہر کریم کا خاص حصہ تھا۔ ان کے بلانے پر وہ بانسی ضلع بستی سے واپس آئے تھے۔ جب وہ ناظم مقرر ہو گئے۔ (جلد۵، صفحہ۳۰۳) تو مظہر کریم شاہ جہان پور کی انقلابی حکومت کے تحت مفتی مقرر ہو گئے۔ انھی مفتی صاحب نے اگلے سال جب کہ انقلابی حکومت کے مستقل قیام سے مایوسی ہوتی جارہی تھی، عیدگاہ شاہ جہان پور میں برٹش حکومت کے خاتمے کے لیے اجتماعی دعا اور نماز کا انتظام کیا تھا۔ (جلد۵، صفحہ۳۶۰)

مظہر کریم، مفتی: شاہ جہان پور میں برٹش حکومت کے خلاف بغاوت کا شعلہ بھڑکا تو غلام قادر خاں اپنے پیر و مرشد سے ملنے بانسی ضلع بستی گئے ہوئے تھے۔ مفتی مظہر کریم نے انھیں حالات سے مطلع کیا اور مشورہ دیا کہ حالات کا تقاضا ہے کہ وہ فوراً شاہ جہان پور پہنچیں۔ انھوں نے اس مشورے پر عمل کیا اور شاہ جہان پور لوٹ آئے۔ طے پایا کہ قادر علی خاں کی جگہ شاہ جہان پور کا ناظم انھیں ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ خان بہادر خاں ناظم بریلی کی سرپرستی حاصل کی جائے۔ چناں چہ فوراً ایک وفد مرتب کیا گیا اور اگلے چند روز میں یہ وفد بریلی روانہ ہو گیا۔ فریڈم اسٹرگل ان اترپردیش کے مطابق یہ مندرجہ ذیل حضرات وفد میں شامل تھے:

(۱) عبدالرؤف خاں (ڈپٹی انسپکٹر آف ایجوکیشن)،

(۲) نقش بند خاں،

(۳) فیضاب (شاید فیضیاب) خاں،

(۴) ولایت علی خاں (ابن فیضاب خاں)

(۵) غلام علی خاں (محرر مجسٹریٹ آفس)

(۶) ناصر خاں (ساکن محلہ خلیل)،

(۷) نظام علی خاں (ساکن شاہ باز نگر تحصیل و ضلع شاہ جہان پور)،

(۸) نظام علی خاں (کوتوال)،

(۹) سیتل سنگھ،

(۱۰) دولت راے،

(۱۱) ظہور خاں،

(۱۲) محمد حسین خاں (چوکیداروں کے بخشی، نگراں و حاکم)،

(۱۳) فضل خاں،

(۱۴) حکیم مظہر علی خاں اور

(۱۵) واجد علی (ناظر منصف آفس)۔

یہ حضرات خان بہادر خاں کے حضور پیش ہوئے اور درخواست کی کہ ضلع شاہ جہان پور کا ناظم غلام قادر خاں کو ہونا چاہیے کہ وہ اس کے زیادہ حق دار ہیں۔ خان بہادر خاں نے یہ درخواست منظور کر لی اور غلام قادر خاں کا بہ حیثیت ناظم شاہ جہان پور تقرر کر دیا گیا۔ (جلد ۵، صفحہ ۳۰۰-۲۹۹)

غلام قادر خاں تقریباً ۱۵/جون ۱۸۵۷ء کو شاہ جہان پور پہنچے، اگلے چند ہی دنوں میں قادر علی خاں کی جگہ غلام قادر خاں نے نظامت کی ذمے داریاں سنبھال لی تھیں۔

(۶۲) رؤف احمد: مفتی مظہر کریم کے داماد تھے ان کا تعلق بھی انقلابی حکومت سے تھا اسی مضمون میں نمبر ۱۲ پر ان کا ذکر آیا ہے۔ تیز جی پی سی کے خط مورخہ ۹/ستمبر ۱۸۵۸ء کے حوالے سے سررشتہ فوج کے عمال میں نمبر ۵ میں انھی کا نام آیا ہے۔ اس

سے زیادہ تفصیل نظر سے نہیں گزری۔

(۶۳) منگل خاں: عبدالرؤف خاں شاہ جہان پور کے سالے (برادر اِن لا) تھے۔ (جلد۵، صفحہ۳۰۰) شاہ جہان پور شہر کی لوٹ مار میں شرکت کی۔ (جلد۵، صفحہ۲۹۶) کمانڈنٹ کی حیثیت سے انقلابی حکومت کی خدمت کی۔ پیدل فوج کی رجمنٹ میں کمانڈنٹ تھے۔ (جلد۵، صفحہ۳۰۰و۳۰۹)

(۶۴) مولی چند: برٹش گورنمنٹ میں محرر دفتر تھے۔ اسی حیثیت میں انھوں نے شاہ جہان پور کی انقلابی حکومت میں خدمات انجام دیں۔ (جلد۵، صفحہ۳۰۲)

(۶۵) مہدی علی خاں: انقلابی حکومت کی فوج میں کیولری میں نہایت مستعد اور طرار شخصیت کے مالک تھے۔ (جلد۵، صفحہ۲۹۹)

(۶۶) میر باز خاں: برٹش کے دور میں شاہ جہان پور کی چوکی سہرامئو کے جمعدار تھے۔ انقلابی حکومت کے زمانے میں کیولری میں سوار ہو گئے تھے۔

(جلد۵، صفحہ۳۰۶)

(۶۷) میر قاسم علی کا تعلق عظیم گڑھ ضلعے کے کسی گاؤں سے تھا۔ شاہ جہان پور میں ۲۸ ویں رجمنٹ کے ہسپتال میں ایک نیٹو (ہندوستان) ڈاکٹر تھے۔ حکومت پر انگریزوں کے دوبارہ قبضے کے بعد حالات کی تفتیش میں ان کا بیان ہے۔ (جلد۵، صفحہ۲۰۰)

(۶۸) نظام علی خاں: آف شاہ جہان پور: برٹش گورنمنٹ کی طرف سے شاہ جہان پور کے ریٹائرڈ کوتوال تھے۔ (جلد۵، صفحہ۲۹۶) اور باغی سپاہیوں نے ان کا جلوس نکالا تھا اور انھیں شہر کا ''نواب'' بنایا تھا۔ (جلد۵، صفحہ۳۱۱) شاہ جہان پور کی انقلابی حکومت کو منظم کرنے کی کوشش کی اور حکومت چلانے کے لیے عملہ بھرتی کرنا شروع کیا۔ (جلد۵، صفحہ۲۹۷) سہرامئو پر حملے کی کمانڈ انھی نے کی تھی۔ (جلد۵، صفحہ۴۰۷) آخری جنگ بچھوریا میں انگریزوں کے خلاف لڑی۔ (جلد۵، صفحہ۹۴۴) اسی جنگ (بچھوریا نزد اللہ گنج تحصیل جلال آباد) میں وال پول سے مقابلے میں شہادت پائی۔ (جلد۵، صفحہ۳۰۸، ۴۲۴، ۹۴۳و۹۴۴)

(۶۹) نظام علی خاں نامی ایک نہیں دو شخص ہیں۔ ایک وہ جو ریٹائرڈ کوتوال تھے اور قادر علی خان کی نظامت کے زمانے میں کوتوال ہی بنائے گئے لیکن جب غلام قادر

خاں ناظم بنائے گئے تو انھیں نایب ناظم بنایا گیا۔ سہرامئو پر حملے میں انقلابی سپاہ کی کمان کی اور یہی بچپوریا کے معرکے میں شہید ہوئے تھے۔

(۷۰) نظام علی کوتوال کے بارے میں مولوی صبیح الدین خان مؤلف تاریخ شاہ جہان پور المعروف بہ ''تاریخ صبیح'' نے لکھا ہے:

''نظام علی خاں آفریدی کوتوال: محلہ پی بی زی بچپوریا میں عالی شان مکان تھا۔ یہ خاندان قدیم سے معزز اور نجیب الطرفین شمار ہوتا تھا۔ نظام عرصے تک قبل غدر کوتوال شاہ جہان پور رہے۔ مولوی سلطان احمد خاں صاحب شاہ آبادی ان کے حقیقی بھانجے تھے اور ان کے بھائی احمد علی خاں کو مولوی عبدالجبار خاں صاحب کی بیٹی منسوب تھیں اور ان کے بیٹے امانت علی خاں کو مولوی عبدالرحمٰن خاں منصف کی دختر منسوب ہوئی تھیں۔ اس قدیم اور معزز خاندان میں اب کوئی اولاد ذکور نہیں ہے، امانت علی خاں کی دختری اولاد ہے۔ مکانات کا بھی نشان نہیں رہا۔''

(تاریخ صبیح: حصہ دوم، صفحہ ۲-۳۰۱)

(۷۱) نظام علی خاں آف شہباز نگر: دوسرے شہباز نگر کے باشندے اور سابق تحصیل دار تھے۔ یہ وہ ہیں جنھیں جی پی منی مجسٹریٹ اور کلکٹر شاہ جہان پور نے اپنے خط بہ نام آرالیگزینڈر کمشنر روہیل کھنڈ کے پیراگراف نمبر ۱۹ میں سابق تحصیل دار بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ نظام علی خاں سابق تحصیل دار اور حامد حسن ڈپٹی کلکٹر نے قادر علی خان اور نظام علی کوتوال کو مشورہ دیا تھا۔

"Hamid Hassan Khan (Deputy Collector) and Nizam Ali Khan (Formerly Tahsildar) gave their advice in the different arrangement to be carried out."

اور یہ وہ ہیں جن کا ذکر مذکورہ بالا خط کے پیرا نمبر ۲۳ میں آیا ہے۔ اور اس وفد میں دونوں شخصیتیں شامل تھیں جو غلام قادر خاں کو شاہ جہان پور کا ناظم بنانے کی

درخواست لے کر خان بہادر خان کے پاس بریلی گیا تھا۔

نمبر ۷ نظام علی خاں آف شہباز نگر اور نمبر ۸ نظام علی خاں کوتوال ہیں۔ اس کے بعد نظام علی خاں نامی دو اشخاص ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔ اگلے پیراگراف نمبر ۲۴ کی یہ وہ شخصیت ہیں جو غلام قادر خان کی نظامت میں خان علی خان تحصیل دار بیسل پور، حامد حسن خاں (سابق ڈپٹی کلکٹر) کے ساتھ نایب ناظم مقرر کیے گئے تھے۔ ان کے نام کے ساتھ شہباز نگر کی صراحت موجود ہے۔ اور پہلے نایب ناظم یہی تھے اور حامد حسن خاں تیسرے نایب ناظم تھے۔

غلام قادر خاں کے ساتھ جو نظام علی ہیں وہ شاہ جہان پور کے تھے اور وہیں کے سابق کوتوال اور انقلابی حکومت میں بھی کوتوال ہی بنائے گئے تھے۔ انھی نے سہرامئو میں انقلابی سپاہ کی کمان کی تھی، وہی بچھوریا کی جنگ کے کمانڈر تھے اور اسی جنگ میں انھوں نے شہادت پائی تھی۔ نظام علی خان شہباز نگری سابق تحصیل دار تھے وہ شاہ جہان پور کے کوتوال کبھی نہیں رہے تھے۔

(۷۲) نعمت اللہ، نواب: ان کے تعارف میں صرف یہ ایک جملہ ہے:
''انگریزی حکومت کے دشمن تھے۔'' (جلد ۵، صفحہ ۲۴۰)

(۷۳) نیاز علی، سید: شاہ جہان پور کی انقلابی گورنمنٹ کے ماتحت سررشتے دار کی حیثیت سے انھوں نے خدمات انجام دی تھیں۔ قدرت علی کے بھائی تھے۔

(جلد ۵، صفحہ ۲۹۷، ۳۱۰)

(۷۴) واجد علی خاں: برٹش گورنمنٹ کے زمانے میں شاہ جہان پور کی منصفی میں ناظر تھے۔ جو وفد غلام قادر خاں کی نظامت کے قیام کے بارے بریلی جا کر خاں بہادر خاں سے ملا تھا۔ اس میں واجد علی بھی شامل تھے۔ اور شاہ جہان پور کی انقلابی حکومت کی ریویلیوشنری فورسز کے چیف ملٹری کمانڈنٹ تھے۔ (جلد ۵، صفحہ ۳۰۰ و جلد ۲، صفحہ ۱۱۳)

(۷۵) واحد علی خاں: تلہر کے رہنے والے تھے۔ نینی تال میں انقلابی افواج کے ہیڈ تھے۔ اسی حیثیت میں ان کا انتقال ہوا۔ (جلد ۵، صفحہ ۳۰۹)

(۷۶) وزیر خاں: شاہ جہان پور کی انقلابی گورنمنٹ میں نایب محرر کی حیثیت

سے خدمات انجام دیتے تھے۔(جلد ۵، صفحہ ۳۰۴)

(۷۷)وزیر خاں: نواب فرخ آباد کے کوچ مین (کوچ جان) تھے بعد میں وہ احمد یار خاں ناظم جلال آباد کے پاس آگئے تھے، برٹش حکومت کے سخت خلاف تھے۔

(جلد ۵، صفحہ ۹۵۳)

(۷۸)ولایت علی خاں: برٹش حکومت میں شاہ جہان پور کے صدر ریونیو آفس میں محرر دفتر تھے۔ جب انقلابی حکومت قایم ہوگئی تب بھی وہ اسی حیثیت میں خدمات انجام دیتے رہے تھے۔(جلد ۵، صفحہ ۳۰۲)

(۷۹)ولایت علی خاں ابن فیضاب (فیضیاب؟) خاں کو غلام قادر خاں نے شاہ جہان پور سے بریلی بھیج دیا تھا۔ (جلد ۵، صفحہ ۲۹۹) انقلابی فوج میں انفنٹری کے کمانڈنٹ تھے۔(جلد ۵، صفحہ ۳۰۰)

(۸۰)ہدایت حسین خاں: نظام علی خاں سابق کوتوال آف شاہ جہان پور کے داماد تھے۔ جو ۳۱ رمئی تک کسی جرم کی سزا میں عزو (Ajjoo) خاں اور منگل خاں کے ساتھ جیل میں تھے۔ جیل توڑ کر جو قیدی چھڑانے گئے تھے، ان میں یہ تینوں بدمعاش بھی تھے۔ یہ اس سے پہلے بھی کئی بار گرفتار ہوئے اور جیل جا چکے تھے۔

اسی شام کو فوج کے دیسی سپاہیوں اور عوام نے قادر علی خاں اور غلام حسین خاں کے ''نواب'' شاہ جہان پور ہونے کی خوشی میں جلوس نکالا گیا اور سب کنٹونمنٹ گئے تا کہ صوبے دار گھنشام سنگھ کو انقلاب میں فوج کی رہنمائی کی مبارک باد دی جائے۔

(فریڈم اسٹریگل ان اُترپردیش: جلد ۵، صفحہ ۲۹۶ و جلد ۶، صفحہ ۲۶۶)

(۸۱)یار محمد خاں: برٹش دور میں پتھرا (شاہ جہان پور) میں جمعدار کی حیثیت سے اور شاہ جہان پور کی انقلابی حکومت میں اطلاق نویس کی حیثیت سے خدمات انجام دی تھیں۔(جلد ۵، صفحہ ۳۰۴)

(فریڈم اسٹریگل ان اترپردیش: جلد ۵، ۶ سے خصوصی استفادہ)

شاہ جہان پور اور ۱۸۵۷ء

غدر کی کہانی

تاریخ شاہ جہان پور ۱۸۵۷ء کا ایک اہم ماخذ

''غدر کی کہانی'' شاہ جہان پور اور ۱۸۵۷ء کے حوالے سے مریم نامی ایک خاتون کی یادداشتوں پر مشتمل ہے۔ حالات و مشاہدات مس میری یا اس کی ماں مسز لیویٹر (Laveter) کی زبان سے بیان کیے گئے ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ یہ مؤلف کا طرزِ بیان ہے یا واقعی ماں بیٹیوں میں سے کوئی ایک یہ حالات و مشاہدات بیان کر رہی ہے؟ چوں کہ اصل کتاب ناپید اور ترجمہ نامکمل ہے اس لیے بالیقین یہ بات نہیں کہی جا سکتی! ترجمے یا کسی متعلقہ بحث میں مؤلفہ کے لیے ''مس میری'' کا جملہ استعمال ہوا ہے تو یہ حقیقت بھی ہو سکتی ہے اور محض قیاس بھی!

یہ تالیف ناول کی صنف میں انگریزی میں لکھی گئی اور ۱۸۹۶ء میں بنارس (یوپی) سے شایع ہوئی تھی۔ اس کا ترجمہ سید برکات احمد (علیگ) کے قلم سے تھا اور اسی عنوان سے سہ ماہی العلم۔ کراچی کے جنوری ۱۹۵۸ء تا ستمبر ۱۹۵۹ء کے سات نمبروں میں شایع ہوا تھا۔ لیکن یہ ترجمہ مکمل نہیں، اندازاً بہ قدر نصف یا ایک تہائی کتاب کا ہے۔ اس حصے کی اشاعت کے بعد وقفہ پیدا ہوا اور مترجم سے بقیہ حصے کے ترجمے کے لیے رابطے کی کوشش کی گئی تو پتا چلا کہ فاضل مترجم کا انتقال ہو گیا ہے۔ بقیہ حصے کے ترجمے یا اصل کتاب کی جستجو ہوئی تو مترجم کے خاندان اور کراچی کی لائبریریوں اور دوست احباب کے علمی ذخایر کی حد تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

یہ تالیف اپنی صنفی صفات کی حیثیت سے تیسرے درجے کا ناول ہے اور اس

حیثیت میں اپنی تاثیر میں اس کے بھی بعد کی چیز ہے اور اگر اس کی اس حیثیت کو خاک سار کے ذوق کے ترازو میں تولا جائے تو یہ کسی درجے میں بھی لایق التفات نہیں۔

البتہ ۱۸۵۷ء اور شاہ جہان پور کی تاریخ کا ایک حوالہ ضرور ہے اور قیمتی حوالہ! اور مجھے اس رائے کے اظہار میں کوئی تکلف نہیں کہ ۱۸۵۷ء کے اس موقعے پر شاہ جہان پور کی انتظامیہ اور فوج کے عملے کے بارے میں اتنی معلومات اور مئی جون میں پیش آنے والے واقعات خصوصاً ۳۱ رمئی کو "سینٹ میری گرجا" کے سامنے پریڈ میدان کے قتل گاہ بننے کی اتنی تفصیل کسی دوسری تاریخ میں موجود نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے؛

۱۔ اس کی مؤلفہ ایک اینگلو انڈین خاتون ہے۔ جس کے بارے میں یقین کیا جاسکتا ہے کہ وہ کسی دوسرے مؤلف کے مقابلے میں شاہ جہان پور میں برٹش انتظامیہ اور متعین فوج کے عہدے داروں، ان کے خاندانوں اور دیگر افراد کے بارے میں ضرور زیادہ معلومات رکھتی ہوگی۔

۲۔ اس کے علاوہ اس وقت شاہ جہان پور میں جو واقعات پیش آتے تھے، ان کے راوی لالہ رام جی مل تھے، جنھوں نے حادثے کے وقوع کے بعد چھبیس دن تک مسز لیویٹر کو اور ان کے خاندان کے نصف درجن افراد کو پناہ دی تھی اور نہایت خطرناک حالات میں ان کی دل داری اور تواضع کی تھی۔ لالہ جی چوں کہ ایک مقامی شخص تھے اور جیل کے محرر بھی! اس لیے جیل، کلکٹری اور اس کے دیسی بدیسی عملے سے زیادہ واقف تھے اور انھوں نے انقلابی گورنمنٹ میں کوئی ذمے داری قبول نہیں کی تھی، اس لیے ان کے پاس فرصت ہی فرصت تھی۔ دن بھر شہر میں گھومتے پھرتے اور حالات کو دیکھتے رہتے تھے۔ اور شام کو گھر آکر سناتے تھے، جنھیں مس یا مسز لیویٹر قلم بند کر لیتی تھیں۔ ان کی معلومات صرف سنی سنائی باتیں ہی نہ ہوتی تھیں بلکہ لالہ رام جی مل کے ذاتی مشاہدات اور تجربات ہوئے تھے۔

اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسز لیویٹر اور لالہ جی، دونوں نے جو کچھ بیان کیا اور مس لیویٹر نے اسے تالیف کر دیا تھا، وہ ان دونوں کے مشاہدے اور تجربے میں آنے

والی باتیں تھیں۔ اگر ان میں کوئی بات خلافِ حقیقت بھی ہو تو وہ جھوٹ کے دایرے کی بات نہیں مبالغے کے درجے کی چیز ہو سکتی ہے۔ مبالغے سے حقیقت کا رشتہ بالکل منقطع نہیں ہوتا، سچائی کو محسوس کر لیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ اس میں بالکل ہی جھوٹ نہ ہو، اس میں جھوٹ ہے اور غضب کا جھوٹ ہے۔ البتہ جس پوزیشن میں اس نے جھوٹ بولا ہے اس کے لیے ہم اسے معاف کر سکتے ہیں، جھوٹ سے انکار نہیں!

۳۔ ان بیانات کی صحت یا قریب صحت ہونے کا یہ ثبوت بھی ہے کہ ''فریڈیم اسٹریگل اِن اتر پردیش'' اور دوسری ڈاکومنٹری رپورٹوں اور دیگر ذرایع سے معلوم شدہ حقایق جو ہمارے سامنے آئے ہیں، ان سے ان کی صحت یا قریب صحت ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس لیے مجھے امید ہے کہ زیر نظر ماخذ ''غدر کی کہانی'' کے تاریخی اندراجات، مجاہدین آزادی کے بارے میں معلومات اور شاہ جہان پور میں تعینات انگریز عملے کے جن کوایف پر اس سے جو روشنی پڑتی ہے اور جو حقایق جزواً یا کلاً ہمارے سامنے آتے ہیں ان کی تاریخی اہمیت سے ہم انکار نہیں کر سکتے۔ اگر ان واقعات میں کسی درجے میں حقیقت سے دوری اور تفصیلات میں کمی محسوس ہو تو وہ اسی قدر ہو سکتی ہے کہ یہ ایک ناول ہے۔ اس کی مؤلفہ نے تاریخ نویسی کی ذمے داری بھی قبول نہیں کی تھی۔ یہ مؤلفہ کی اصول پسندی اور اس کی تالیف کی بڑی خوبی ہے۔

خاک سار نے اپنے موضوع کی مناسبت سے اور ضرورت کے مطابق اس تالیف سے چند چیزیں اخذ کر لی ہیں اور وہ تمام چیزیں جن پر کسی ناول کے ادنا و اعلا ہونے کا مدار ہوتا ہے، انھیں چھوڑ دیا ہے، جو چند چیزیں اس کے مواد سے اخذ کی ہیں، وہ یہ ہیں:

☆ پہلی چیز شاہ جہان پور کے حوالے سے ۱۸۵۷ء کے وہ چند تاریخی حوالے ہیں جو اس تالیف کو ناول کی خصوصیات سے صریح امتیاز بخشتے ہیں۔

☆ دوسری چیز شاہ جہان پور کے وہ مجاہدین اور سرفروشانِ وطن ہیں جن کی قربانیوں اور عزایم و ہمم کی بنیاد پر براعظم پاکستان ہندوستان کی آزادی کا عظیم الشان قصر تعمیر ہوا ہے۔ تاریخ میں بعض کم زور سیرت کی شخصیتیں بھی ہیں، خواہ ہم انھیں پسند

نہ کریں، لیکن ان کے وجود کا نہ انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ انھیں تاریخ تحریک آزادی سے نکال ہی دیا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی شاہ جہان پور کے کھوٹے دوسروں کے کھروں سے بہتر ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم مجبور ہیں کہ تاریخ میں ان کو گوارا کریں۔ ان میں بیشتر شخصیتیں وہی ہیں جن کا مختلف رپورٹوں میں ذکر ملتا ہے اور ان کی سیرت کی کمزوریوں اور خوبیوں کا پتا زیرِ تبصرہ ''غدر کی کہانی'' سے چلتا ہے۔ ان شخصیات کے تعارف میں جن کا ذکر دوسرے مآخذ میں بھی موجود ہے، ان کے حوالوں کی صراحت کر دی ہے۔ اس اہتمام نے ''غدر کی کہانی'' کی تاریخی حیثیت کو مستحکم کر دیا ہے۔

☆ ۱۸۵۷ء کے وقوعے کے قریبی زمانے میں جو انگریز اپنی حکومت کے کسی شعبے میں کسی حیثیت سے خدمات انجام دیتے تھے اور جن کا ذکر کسی درجے میں ''غدر کی کہانی'' میں آیا ہے، انھیں مرتب کر دینے کے ساتھ دوسرے مآخذ کے اثبات و استدلال سے کہانی کے بیان کو مدلل کر دیا ہے۔ ان میں چند ہی شخصیات ایسی ہیں جن کے بارے میں کہانی سے باہر کا کوئی حوالہ میسر نہیں آیا۔

یہ بات نمبر ۲ کے ضمن میں ۱۸۵۷ء کے چند مجاہدین وطن کے بارے میں بھی کہی گئی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ جنگ آزادی کے زمانے میں، کسی دایرے میں جن شخصیات نے کسی قسم کا کوئی کردار ادا کیا تھا یا کسی معرکے میں وہ کام آ گئی تھیں، ان کی کل تعداد اور ان سب کے ناموں سے ہم ہرگز واقف نہیں ہو سکتے تھے، نہ ہوئے، لیکن ایسے تمام وطن دوستوں اور دشمنوں کے وجود کا ہم انکار نہیں کر سکتے، جن کے لیے ہم کوئی دوسرا حوالہ پیش نہیں کر سکے!

یہ باتیں میں نے یہاں اس یقین کے ساتھ مرتب کر دی ہیں کہ ان کی اصل جگہ ناول کے صفحات نہیں، تاریخ کا دامن ہے۔ میں یہ کام انجام دیتے ہوئے ایک خوشی اور اطمینان محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کام پسند کیا جائے گا۔

''غدر کی کہانی'' کی تاریخی حیثیت کے بارے میں اوپر کی سطروں میں خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، کسی ثبوت کے بغیر ان کی صحت کا یقین کر لینا، میں خیال کرتا ہوں کہ قارئین کرام کے لیے مشکل ہوگا! اس لیے خاکسار راقم الحروف نے اپنے

دعوے کا ثبوت اگلے صفحات میں مختلف عنوانات سے تین مضامین میں مرتب کر دیا ہے۔ یہ ثبوت ''فریڈم اسٹریگل اِن اتر پردیش'' کی پانچ ضخیم جلدوں میں پھیلا ہوا ہے، جس سے ان کی سچائی ثابت ہو جاتی ہے اور دیگر کتب و مقالات سے بھی ان معلومات کی صحت کا ثبوت مل جاتا ہے۔ مذکورہ بالا تینوں مضامین یہ ہیں؛

۱۔ شاہ جہان پور اور ۱۸۵۷ء۔ چند اہم تاریخیں اور وقوعات

۲۔ شاہ جہان پور اور ۱۸۵۷ء۔ چند رجال کار، تاریخ جنگ آزادی کے واقعی کردار

۳۔ شاہ جہان پور اور ۱۸۵۷ء۔ برٹش حکومت کے چند عہدے دار اور ملازم، مختلف شعبوں اور محکموں میں

قارئین کرام ان مضامین کے مطالعے سے اندازہ کر سکیں گے کہ فریڈم اسٹریگل اِن اتر پردیش نے ان شخصیت کے حقیقی وجود اور کم و بیش ان کے تاریخی کردار کے ثبوت مہیا کر دیے ہیں۔

مریم کا یہ ناول پہلی بار جے ایف فینتھوم نے مرتب کر کے ۱۸۸۶ء میں بنارس سے چھپوا دیا تھا۔ اس کی دوسری اشاعت ۱۹۳۰ء میں منصۂ شہود پر آئی تھی اور حال میں بھی امریکا سے شایع ہوئی ہے۔ اس وقت میرے سامنے ناول کے تقریباً ڈیڑھ سو صفحات کا اردو ترجمہ ہے، جو سید برکات احمد (علیگ) شاہ جہان پوری نے کیا تھا اور ''غدر کی کہانی'' کے عنوان سے سہ ماہی العلم۔کراچی (جنوری ۱۹۵۸ء تا ستمبر ۱۹۵۹ء) کے سات نمبروں میں شایع ہوا تھا۔

(ا۔س۔ش)

(۱)

شاہ جہان پور اور ۱۸۵۷ء

چند اہم تاریخیں اور وقوعات

مریم کے ناول "A Story of the Indian Mutiny of 1857" کی روشنی میں

مولوی سرفراز علی کی آمد:

یکم مئی: مولوی سرفراز علی گورکھ پوری کئی دنوں سے شاہ جہان پور تشریف لائے ہوئے تھے۔ چند خاص لوگوں نے ان کے خطاب کا انتظام کیا گیا تھا۔ غدر کی کہانی میں جلسے کی غایت، اس کے اہتمام اور اس کے اثرات کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے۔ مطالعہ فرمائیے:

پندرہ دن پہلے انگریزی حکومت کے خلاف حلف اٹھائے دشمن (مولوی) سرفراز علی گورکھ پوری شاہ جہان پور آ چکے تھے، یہ ایک دراز قد ردبلے پتلے مرد قوی تھے ان کے اُبھرے ہوئے رخسار، لانبے پتلے ہونٹ، اونچی نوک دار ناک، گہری بڑی بڑی آنکھیں، سیاہ ابرو اور لانبی داڑھی تھی۔ بال سخت سیاہ تھے، زلفیں کاندھوں پر پڑی تھیں یہ صاحب اس شہر میں جلد جلد آیا کرتے تھے یہاں اُن کے بہ کثرت مرید تھے انھیں میں دو بھائی یعنی قدرت علی نائب سررشتہ دار فوج داری اور نیاز علی تھے۔ (مولوی) سرفراز علی مذہبی واعظ تصور کیے جاتے تھے لہٰذا ان کی نقل وحرکت پر کوئی توجہ نہیں کی جاتی تھی اس خاص موقع پر انھوں نے مظہر کریم سررشتہ دار فوج داری کے مکان پر قیام کیا تھا۔

جلسے کا انتظام:

یکم مئی کو مظہر کریم کے مکان پر ایک جلسہ منعقد ہوا اس میں قادر علی خاں (ایک

معزز زمین دار)، نظام علی (پنشنر کوتوال)، قدرت علی (نایب سررشتہ دار فوج داری) عبدالرؤف خاں ضلع وزیٹر (انسپکٹر مدارس اردو)، منگل خاں زمیندار (عبدالرؤف خاں کے سالے) نظام علی خاں (زمیندار شہباز نگر)، سیتل سنگھ اور دولت رائے (چھوٹے چھوٹے زمیندار)، کالکا پرشاد (منصرم نیلام) اور گھنشیام سنگھ (دیسی پیدل فوج اٹھائیسویں بنگال کے صوبے دار میجر) شریک تھے۔

حسب معمول میزبانی مظہر کریم کے سپرد ہوئی (مولوی) سرفراز علی کو کہ انھیں سے سب لوگ ملنے آئے تھے صدارت دی گئی۔ رؤف احمد (محرر فوج داری) کو بہ غرض نگرانی دروازے پر تعینات کیا گیا تاکہ وہ سازش کنندگان کو ہر امکانی خطرے سے آگاہ کر دیں۔

جب سب مہمان بیٹھ گئے تو بہ شمول ہنود سب کو پان دیے گئے۔ ایک فرشی حقہ تھا جس کا سب لوگ ایک ایک کش لے کر نال دوسرے کی طرف بڑھا دیتے تھے۔ ہنود کے لیے علاحدہ علاحدہ مٹی کے حقے تھے۔ اس کے بعد مظہر کریم نے اپنی جاے نشست سے اس طرح کارروائی کا افتتاح کیا۔

افتتاحی تقریر:

"جناب من! ہم سب یہاں مولوی سرفراز علی اپنے معزز ہمدرد سے ملنے آئے ہیں۔ آپ ہمارے واسطے پھر یہی خبر لائے ہیں کہ ہماری تحریک کو ہر شہر و قصبے سے نئے معاونین مل رہے ہیں۔ یہ خبر سب کے لیے ہمت افزا ہونی چاہیے لیکن اب امر غور طلب یہ ہے کہ آیندہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ آپ سب صاحبان اپنے آرا سے ہمیں مطلع فرمائیں کہ اس اہم کام کو انجام دینے کے لیے کون سا جلد اور بہترین راستہ اختیار کیا جائے؟ ہم ماہِ رمضان کے زیادہ دن طے کر چکے ہیں۔ اسی ماہ مقدس کے آخر دن تک ہمارے منصوبے کا قطعی تکملہ ہو جانا چاہیے۔ کچھ اور عرض کرنے سے پہلے میری گذارش یہ ہے کہ آپ صاحبان خود مولوی صاحب کے ان نظریات کو سنیں جو کافر حکومت کے متعلق ہیں۔ نیز وہ طریقہ بھی جس سے ہم انھیں کیفر کردار کو پہنچا دیں۔"

مولوی سرفراز علی کی تقریر:

اس افتتاحیہ تقریر کے بعد مولوی صاحب نے فرمایا:

''حضراتِ جلسہ اور مقاصد مشترکہ کے بھائیو! مجھے مسرت ہے کہ آپ کے سامنے اس وقت مجھے اپنے نظریات پیش کرنے کا موقع ملا ہے کہ اسی غرض سے ہم سب یہاں جمع ہوئے ہیں۔ مولوی صاحب نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر آہستہ آہستہ کچھ پڑھتے ہوئے چاروں طرف نظر دوڑا کر فرمایا:

''آپ کو معلوم ہے کہ فرنگی فریب کاری سے ہمارے آقا بن بیٹھے ہیں۔ ملک میں سوداگری کے بھیس میں آئے، سیاسیات میں دخل انداز ہو کر ایک صوبہ کو دوسرے کے خلاف بھڑکایا اور خود تنازعات کا فایدہ اٹھانے لگے اسی طرح انھوں نے کرناٹک پر قبضہ جمالیا ہم سب کو معلوم ہے کہ جس عیاری سے انھوں نے کلکتہ کو دارالسلطنت بنایا کبھی مکاری کبھی خوشامد اور کبھی دونوں سے! بادشاہ وقت پر اثر انداز ہو کر بنگال کی صوبے داری کی سند حاصل کر لی پھر میسور پر فرماں روائی حاصل کر کے وسط ہندوستان کے سبزہ زاروں پر قابض ہو گئے روہیل کھنڈ جیسے نفیس صوبے پر قابض ہو گئے پنجاب اور برما پر دست داری کی بالآخر ایک نمایاں تخریبی کارروائی سے جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی انھوں نے بغیر کسی وجہ کے شاہ اودھ کو معزول کر دیا، اور باغ ہند کے غیر متنازعہ آقا بن بیٹھے۔ اسی طرح آہستہ آہستہ انھوں نے ہمارا سب ملک چھین لیا اور اپنی ملعون حکومت ملک کے گوشہ گوشہ پر قایم کر دی۔

قابل غور سوال یہ ہے کہ آیا انھیں ایک لحظہ بھی ہمارا آقا بنا رہنا چاہیے؟ خدا ان کی قوم کو غارت کرے اس موقع پر واعظ نے پر جوش ہو کر کہا ''نہیں نبی آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وسلم) کی قسم! وہ ہماری حق تلفی اور ہماری زمین کو اب ہرگز ناپاک نہ کر سکیں گے۔'' اسی مقصد کی تکمیل کے وسایل و ذرایع فراہم کرنے کے لیے میں یہاں آیا ہوں۔ غور فرمائیے کہ اس ملک پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے انھوں نے کیا کیا حربے استعمال کیے؟ بے شک ہماری تلواریں ہماری گردنوں پر چلائیں۔ یہ ہمارے سپاہیوں کی فوج ہی تو ہے جس نے ان کے لیے ہندوستان فتح کر کے رکھ دیا ضرغام علی

کی قسم! یہی آلہ انھیں نیست و نابود کرنے کے لیے استعمال کیا جائے گا۔

شاید آپ یہ دریافت کریں کہ اُن کے کون سے فعل ایسے سلوک کے مستحق ہیں؟ میں کہتا ہوں اگر ''سور، گدھا'' عام راستہ پر اور ''تمہاری جہنمی آنکھیں'' عام عدالتوں میں ایسے ستایش کے الفاظ ہیں جو آپ کو مقبول ہوں تو وہ ہر طرح بر سر حق ہیں کہ اس نے اپنے کسی ہم وطن کو ان سفید فاموں کی ٹھوکریں کھاتے نہیں دیکھا، کیا کبھی اُن کی پیٹھ پر بید لگتے نہیں دیکھے؟ کیا آپ نے انھیں سور ''حبشی اور کالا سور'' کے کسی اور نام سے بھی پکارے جاتے سنا ہے؟ یہ روزمرہ کی باتیں ہیں اگر آپ اس پر کہیں کہ یہ عادت محض جاہل فرنگیوں سے متعلق ہے اور وہ جنھیں اعلا حاکم کہتے ہیں ان پر ایسی بدتہذیبیوں کا الزام عاید نہیں ہوتا تو میں آپ سے کہوں گا کہ آپ بڑے صاحب لوگوں کے جنھیں انگریز شرفا کہا جاتا ہے گھروں پر جا کر خود دیکھ آئیے کہ وہ ہمارے کتنے ہم وطنوں کو یوں ہی جہنم رسید کرتے رہتے ہیں۔ یہ اندازہ لگانا بھی ناممکن ہے کہ کتنوں کو وہ قبل از وقت جہنم میں ڈال بھی دیتے ہیں کسی قصور کی بنا پر نہیں بلکہ نہایت معمولی فروگذاشت پر جس کے لیے محض ہدایت یا تنبیہ کافی ہو سکتی تھی۔

آپ کہیں گے کہ ہم محکوم قوم ہیں قدرت کی طرف سے ہمارا یہی مقسوم ہے ہمیں شکایت کا کوئی حق نہیں ہے۔ اچھا یہی سہی۔ لیکن اے بھائیو! اب تو ہمارا دین و مذہب بھی خطرے میں ہے۔ حکومت گئی، ناپاک کافر کی اطاعت بھی کی، کیا اب ہم وہ ناقابل انتقال نعمت بھی ان کے حوالہ کر دیں جو ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملی ہے؟

شاید آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ میرے بیانات کن واقعات پر مبنی ہیں؟ دوستو! جان بوجھ کر کافر کی عیاریوں پر پردہ نہ ڈالو! کیا ملک کے عرض و طول میں ان کے پادری نہیں پھیل گئے ہیں؟ کیا وہ نصرانی عقاید کے ممنوعہ بیج نہیں بو رہے ہیں؟ کیا انھوں نے گیہوں میں ہڈی کا برادہ ملا کر فروخت کرنے کا حکم نہیں دیا ہے؟ کیا سادہ دل جہلا کو ان کے مذہب سے نہیں کھینچا جا رہا ہے؟ کیا انھوں نے فوج کے سپاہیوں کو گائے اور سور کی چربی لگا کر کارتوس نہیں دیے ہیں؟ کیا اس ناپاک چیز کو بہ جبر جاری کرنے کے لیے انھوں نے ہر اس شہر میں جہاں دیسی فوج ہے دو دو ہزار لوہے کی

ہتھکڑیاں ڈھلوا کر اس حکم کے ساتھ نہیں بھیجی ہیں کہ جو کوئی دانت سے کاٹنے سے انکار کرے اُسے فوراً گرفتار کر کے جیل بھیج دیا جائے؟

برادران ہنود! آپ کی قوم کی تقدیس خطرے میں ہے آپ کے مذہبی امتیاز پر جو آپ کا طرۂ افتخار ہے، ان گمراہ کن نو وارد فرنگیوں نے حملہ آوری کر دی ہے۔ مسلح ہو کر کھڑے ہو جائیے۔ بتائیے تو اب آپ کب اُٹھیں گے؟ افسوس! کیا ہم میں کوئی بھی ایسا سمجھ دار نہیں جسے اپنے تقدس کی خاطر ایسی مردانہ وار ہمت ہو کہ وہ ہماری مذہبی آزادی میں دخل اندازی کا مقابلہ کرے؟ کیا ہم مردہ ہیں؟ بالکل مردہ ہیں؟ کیا ہمیں یاد نہیں کہ ہمارے آبا و اجداد نے ان کافروں کو کیسی سخت سزا دی تھی؟ اسے ابھی سو برس ہی ہوئے ہیں۔ یہ اس بات کی سزا تھی کہ انھوں نے بادشاہ وقت یعنی ان کے نایب شجاع الدولہ کی توہین کی تھی۔ کیا ہم بھول گئے کہ ہمارے ہم وطنوں نے کتنی مرتبہ اور بار باران ناقابل تسخیر انگریزوں کو شکست دی ہے؟ میسور میں، وسط ہند میں، کابل میں اور دیگر مقامات پر ان کی پوری کی پوری فوجیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیں اور ایک بھی ان کے رونے کو باقی نہیں چھوڑا تھا۔ ان شاء اللہ یہی پھر ہوگا۔

مجھ سے یہ بھی پوچھا جاتا ہے کہ کس کو فنا کیا جائے؟ صرف کافروں کو یا اُن کے کھلے منہ والی عورتوں یا بچوں کو بھی؟ کیسا بے وقوفانہ سوال ہے؟ میں کہتا ہوں ان کی سب کی سب قوم صاف کر دی جائے! کیا تم ناگن کو مار کر اس کے بچے کو بڑا ہونے کے لیے چھوڑ دو گے کہ وہ بڑا ہو کر تمھیں کاٹ کھائے؟ ایسا ہرگز نہ ہونا چاہیے۔ شیخ کے الفاظ یاد رکھو سانپ کو مارنا اور اس کے بچے کی پرورش کرنا عقل مندی کا کام نہیں ہے۔

دیکھو! میں حکم دیتا ہوں کہ کوئی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا، کوئی رحم اس منحوس قوم پر نہیں کیا جائے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، نوعمر ہو یا دودھ پیتا بچہ، سب کے ٹکڑے اڑا دو زمین پر پٹک کر شمشیر انتقام سے ہر لاش پارہ پارہ کر دو[1]۔

---

[1] جوش، جنوں اور جنگ میں سب کچھ جائز ہو جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہ طور قرارداد کے جنگ آزادی کے کسی ہندو مسلم رہنما کے سامنے عورتوں اور بچوں سے متعلق ایسی کوئی بات نہ تھی۔ مولوی سرفراز علی کے تو وہم و خیال میں بھی یہ بات نہ گزری ہوگی کہ بچوں اور عورتوں کو قتل کیا جائے اور اس وحشیانہ ◄

صاحبو! میں پھر کہتا ہوں آپ کا دین خطرے میں ہے۔ میرے ایک دوست جو ابھی دکن سے آئے ہیں ذرا ان کا بیان بھی سنیے اُن کا کہنا ہے کہ پادریوں نے ایک عرضی فرنگی ملکہ کو بھیجی اور یہ شکایت کی کہ ہندو بڑی دیر اور سستی سے عیسائی کیے جا رہے ہیں۔ انھوں نے ایام ماضی کے بعض مسلمان واعظین کے رویے کا ذکر کیا کہ علاء الدین، عالم گیر اور ٹیپو سلطان نے ہندوؤں کو مسلمان ہونے پر مجبور کیا تھا، چناں چہ پادریوں نے ویسے ہی اختیارات حاصل کرنے کی استدعا کی۔ پادریوں نے کہا:

"اے ملکہ ہماری نصیحت سن! گاے اور سور کی چربی کارتوسوں میں ملا دے تاکہ دانتوں یا ہونٹوں سے چھو کر سپاہی لامذہب ہو جائیں اور نصرانیت قبول کرلیں۔ ملکہ نے اس تجویز پر اظہار مسرت کیا اور حکم دیا کہ اس پر عمل درآمد کیا جائے ❶۔ اے مسلمانو! اے ہندو دوستو! بتاؤ اب کیا کہتے ہو؟

کیا آپ کو برہام پور سے وہ خطوط موصول نہیں ہوئے جن میں تحریر ہے کہ چوبیسویں دیسی فوج کے کرنل صاحب نے اپنی فوج کو گمراہ کرنے کے لیے مذہبی اشتہارات تقسیم کیے ہیں، جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ حق کے خلاف ہر قسم کی لغو بیانی کی گئی ہے۔

ٹھیک سو برس ہوئے کہ کافروں کا راج شروع ہوا تھا۔ اب میں اعلان کرتا

➤ طریقے پر! شیخ (سعدیؒ) کے مقولے کا یہ مطلب نکالنا بھی ان کے لیے ہرگز پسندیدہ نہیں ہوسکتا تھا، لیکن مؤلفہ کی زبان سے کسی ایسی بات کا نکل جانا ہرگز تعجب انگیز نہیں ہوسکتا!

❶ انگلستان کی ملکہ سے اس بات کا منسوب ہونا ہرگز درست نہیں۔ یہ بات مولوی سرفراز علی کی یکم مئی ۱۸۵۷ء کی تقریر سے نقل ہوئی ہے۔ اس سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹر کو یہ حکم پہنچ جانا درست نہیں ہوسکتا۔ اگرچہ ہندوستان میں مذہبی انقلاب لانے کے بارے میں پادریوں اور کمپنی کے بعض حکام کی خواہشیں اور عزائم معلوم ہیں۔

قارئین کرام اس بات کو نہ بھولیں کہ یہ پوری تقریر ہی جعلی ہے۔ انگریز قوم کی ایک مؤلفہ کے قلم سے یہی بات نکلنی چاہیے تھی۔ اس کے لیے یہ نہایت ضروری تھا کہ وہ اہل ہند کے دماغوں سے جنگ آزادی کے تصور کو مٹا دے! اس کے لیے یہ مضمون اور اسلوب ناگزیر تھا۔

ہوں کہ اس کا خاتمہ ہو۔ پیر دست گیر کے الفاظ یاد رکھو کہ پلاسی کی صدی کے ساتھ ہی کفر کی حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا!

میرے دوستو! یہ صدی پوری ہونے والی ہے۔ کیا میں آپ سب کی متفقہ رائے سے یہ اعلان کر دوں کہ اس دن تک کافروں کی نسل بیخ و بنیاد سے قطع کر دی جائے گی؟

سب اہل جلسہ بہ یک آواز چلا اُٹھے: نہیں! نہیں! اس سے بھی پہلے!

میرٹھ سے بغاوت کا آغاز:

۱۰ رمئی: میرٹھ میں اس بات پر بغاوت ہوئی کہ گھوڑ سواروں کی تیسری رجمنٹ کے بہت سے فوجیوں کو جنھوں نے کارتوس لینے سے انکار کیا تھا، بیڑیوں کے ساتھ جیل بھیج دیا گیا۔ بنابریں مولوی سرفراز علی کے اس بیان سے تصدیق ہو کر باغیوں کے دل بڑھ گئے تھے۔ میرٹھ میں جو کچھ ہوا اس سے انھیں ایک بنا بنایا لائحۂ عمل دست یاب ہو گیا۔

مجلس ناؤ نوش:

۳۰ رمئی: خزانے کو لوٹے جانے، فساد کے پھیل جانے اور بغاوت کے پھوٹ پڑنے کی افواہیں عوام اور سرکاری حلقوں میں پھیلی ہوئی تھیں اور خطرہ تھا کہ یہ ۳۰ رمئی سے پہلے ہی سب ظہور میں آ جائے گا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ انگریز سرکاری حکام متعلق انتظامیہ و فوج داری نے، جو پریشان تھے، اطمینان کا سانس لیا اور اس خوشی میں انھوں نے اسی شام کو ایک مجلس ناؤ نوش کا انتظام کیا۔ اس کی تفصیل غدر کی کہانی میں بیان کی گئی ہے، ملاحظہ فرمائیے:

> ''۳۰ رمئی حسب معمول گزر گئی۔ ڈاکٹر باؤلنگ کے یہاں سب جمع ہوئے۔ مسز باؤلنگ نے شام کی ضیافت کی۔ لیفٹننٹ روتھر فورڈ اور لیفٹننٹ اسکاٹ نے مل کر گانا گایا۔ آخر الذکر کی بہن مس اسکاٹ نے ستار پر ان کا ساتھ دیا پھر خوش الحانی سے شام کا راگ سنایا۔ کیپٹن لائیسٹ،

کیپٹن اسیڈ، لیفٹنٹ کی، لیفٹنٹ پل بیٹھے کھیلتے رہے۔ مسٹر ریکٹس، مسٹر جنکنس اور کیپٹن جیمس اکس شانمبر ایک کے گھونٹ پر گھونٹ اُڑاتے دن کی خبروں پر تبصرہ کرتے رہے۔ نوعمر مسٹر اسمتھ گھر پر بیمار پڑے تھے۔ لیفٹنٹ رابرٹسن آرڈرلی افسر کا کام کرتے رہے۔ کیپٹن سالمن کسی ذاتی کام میں مشغول ہوتے ہوئے شام تک گھر سے باہر نہیں نکلے۔ باقی جوان یعنی اسپائرس، جانسٹن، اسکاٹ اور ڈاکٹر باؤلنگ خواتین مسز باؤلنگ، مسز کی، مسز لائیسٹ، مسز اسکاٹ اور مس اسکاٹ کی خاطر داری و تواضع میں مصروف رہے۔ مسز باؤلنگ کا چھوٹا بچہ اپنی حسین پری کی طرح اچھل کود رہا تھا اور پادری میک کلم اس کے ساتھ دھائی مچونا کھیل رہے تھے۔''

انگریزوں کا قتل، خزانہ کی لوٹ اور قیدیوں کی رہائی:

۳۱رمئی: آج اتوار کا دن تھا اور حکومت کے کرسچن ارکان معمول کے مطابق شاہ جہان پور سینٹ میری چرچ میں جمع ہوئے ہی تھے کہ باغی فوجیوں نے پروگرام کے مطابق انھیں گھیر لیا۔ ان میں سے بہت سوں کو وہیں قتل کر دیا، کچھ مرد، عورتیں اور بچے چرچ میں بند ہو گئے، وہ سہ پہر تک باغیوں کے وہاں سے منتشر ہو جانے کی وجہ سے چند بگھیوں کا انتظام کر کے کچھ چند وفادار ہندو مسلمان مسلح فوجیوں کی حفاظت میں پوایاں کے لیے روانہ ہو گئے۔ بعض انگریز آفیسر جو اپنے گھروں میں رہ گئے تھے، انھیں بھی رات گئے تک یا دوسرے روز قتل کر دیا گیا۔ غدر کی کہانی کے مطابق مسٹر لیویٹر کی بیوی، بیٹی اور ان کی عزیز چند بوڑھی اور جوان عورتیں، لالہ رام جی مل کی پناہ میں آگئی تھیں۔ گھر سے نکالنے کے بعد چند گھنٹے انھیں تلوکی نامی اپنے پڑوسی کے گھر میں رکھا تھا۔ لالہ جی انھیں وہاں چھوڑ کر شہر کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے نکل گئے تھے۔ بعد میں انھوں نے مسز لائٹر کو بتایا تھا:

''سرکار! آپ کو معلوم ہے کہ آپ سب کو تلوکی کے مکان میں چھوڑ کر میں گھر جا کو گیا لیکن یہ دیکھ کر کہ میں وہاں کوئی خدمت انجام نہیں دے سکتا تھا

وہیں سے سیدھا جیل کو چلا گیا یہ دیکھنے کے لیے کہ وہاں کیا حال تھا؟ صرف یہی ٹکڑا جو بنگلے میں آگ لگتے دیکھ کر دوڑ کے گھر سے اُٹھا لایا تھا میرے ہاتھ میں تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ گرجا میں یورپ والوں پر قاتلانہ حملہ کرنے کے بعد سپاہیوں نے علاحدہ علاحدہ گروہ بنا لیے تھے۔ اُن کا ایک جتھا جیل آیا اور دوسرا تیزی سے کچہری چلا گیا، جہاں انھوں نے کاغذات سرکاری میں آگ لگا دی اور سب خزانہ لوٹ لیا جسے اسلحہ کی گاڑیوں میں لاد کر لاین کو لیے چلے گئے، سب ملا کر چار لاکھ رُپے ہوتے۔ دوسرا گروہ جیل توڑ کر داخل ہوا اور قیدیوں کو آزاد کر دیا۔"

(غدر کی کہانی: صفحہ ٦٧)

پوائیں جانے والا قافلہ:

٦ر جون: ۳۱ر مئی کو جو انگریز مرد، عورت اور بچے پوائیں کے لیے بچ کر نکل گئے تھے، ان میں بارہ مرد، آٹھ عورتیں اور تین بچے کل ۲۳ نفر تھے۔ ان کے ساتھ چند وفادار محافظ تھے۔ وہ اسی روز شام کو پوائیں پہنچ گئے، لیکن راجہ جگن ناتھ ڈرا ہوا تھا۔ راجہ نے کہا:

"میں اتنے بڑے قافلے کو پناہ دینے سے معذور ہوں۔ اگر باغی آ گئے تو میں کیا کروں گا؟ تاہم راجہ نے انھیں ایک گاڑی اور ایک راہبر دیا کہ انھیں محمدی تک پہنچا آئے۔ چناں چہ ایک رات راجہ کے قلعے میں آرام کر کے دوسرے صبح کو یہ لوگ محمدی روانہ ہو گئے۔ جہاں وہ اسی دن گیارہ بجے پہنچ گئے۔ یہاں انھیں ضلع محمدی کے حاکم (ڈپٹی کمشنر) مسٹر ٹامسن مل گئے۔ بہ ہر حال یہ صورت اطمینانی بھی بہت کم عرصے تک قایم رہی۔ کیوں کہ سیتا پور کی بغاوت کے بعد اکتالیسویں رجمنٹ ٦ر جون کو محمدی آئی اور ان سب لوگوں کو بندوقوں اور تلواروں سے بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیا اور ایک بھی فسانۂ غم کہنے کو باقی نہیں چھوڑا!" (صفحہ ۸۳)

غلام قادر خاں اور سعی منصب:

۱۶؍ جون: ۳۱؍ مئی کا حادثہ پیش آیا اور قادر علی خاں کو ناظم بنایا گیا تھا تو غلام قادر خاں اپنے پیر و مرشد سے ملنے بانسی ضلع بستی تشریف لے گئے تھے۔ مفتی مظہر کریم نے انھیں فوراً بلوایا، وہ ۱۵؍ جون کو شاہ جہان پور کو لوٹے اور جو لوگ ان کی نظامت کے حق میں تھے، ان کا ایک وفد لے کر ۱۹؍ جون کو بریلی روانہ ہو گئے اور ایک ہفتے کی جدوجہد اور مشورے کے بعد اپنے حق میں فیصلہ کرانے کے بعد ۲۳؍ جون کو بریلی سے شاہ جہان پور لوٹے۔ مؤلفہ غدر کی کہانی کا بیان ہے:

> ''جب غدر شروع ہوا تو غلام قادر خاں اودھ کے ایک مقام بانسی میں تھے...... مظہر کریم انھیں کے ساتھ [ہم خیال] ہیں۔ نظام علی خاں، منگل خاں، عبدالرؤف خاں، سیتل سنگھ اور بہت سے خوش حال و با اثر خاندان ان کے طرف دار ہیں۔
>
> ۱۵؍ جون کو وہ شاہ جہان پور آئے، دوسرے دن اپنے دوست احباب کے ساتھ بریلی پہنچ کر خان بہادر خان کے سامنے حاضر ہوئے۔ یہ وہ بوڑھا باغی ہے جو اپنے آپ کو نایب مسلمین کہتا ہے۔ غلام قادر خاں نے شاہ جہان پور کی نظامت کے لیے اپنے حقوق فائق پیش کیے اور نذر گذرانی بالآخر ان کی درخواست منظور ہو گئی۔ کل وہ شاہ جہان پور آئے اور فوراً حکومت کی تشکیل شروع کر دی۔'' (صفحہ ۱۰۹)

نظامت میں تبدیلی:

۲۴؍ جون: غلام قادر خاں ۱۶؍ جون کو نواب بہادر خاں بہادر سے ملاقات کے لیے بریلی گئے تھے، تاکہ شاہ جہان پور کی نظامت کا فیصلہ اپنے حق کرائیں۔ ۲۳؍ جون کو وہ کامیاب و کامران شاہ جہان پور لوٹے۔ ۲۴؍ کو انھوں نے نظامت کی ذمے داری کو خود سنبھال لیا اور قادر علی خاں نظامت بریلی کے فیصلے کے مطابق اس ذمے داری سے سبک دوش ہو گئے۔ انھوں نے کوئی ردِّ عمل ظاہر نہیں اور ہمیشہ انقلابی

حکومت کے وفادار رہے۔ غدر کی کہانی کی مؤلفہ نے لکھا ہے:

''۲۴؍ جون کو بہت ڈھول بجے صحن میں آ کر ہم نے نوبت ونفیری کی صاف آوازیں سنیں، آوازیں ہمارے لیے نئی نہیں تھیں، مگر غدر کے بعد سے اب تک نہیں سنی گئی تھیں آوازوں کے ساتھ شوروغل بھی تھا گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں بھی تھیں ہمیں خیال آیا کہ باہر کوئی غیر معمولی معاملہ پیش آیا ہے جب لالہ جی گھر میں آئے تو ہمارا استعجاب اس طرح رفع ہوا جب انھوں نے کہا:

''سرکار! آج نوابوں کی بدلی ہوگئی۔''

ماں نے کہا درست ہے مگر اس کا مطلب (۱)؟

میں تو سمجھتی تھی کہ اب تک قادر علی خاں حکمراں تھے۔

ہاں آج صبح تک وہ برسر حکومت رہے لیکن اب انھیں غلام قادر خاں نے بے دخل کر دیا ہے۔ ان دونوں میں شدید اختلافات تھے، دونوں ایک ہی خاندان اور موروثی خطاب کے دعوے دار ہیں، دونوں انگریزی حکومت کے دشمن ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ قادر علی خاں بدوضع، شہوت پرست، ظالم اور امور حکومت سے بے بہرہ ہیں (۲)۔ غلام قادر خاں قوی اور نیک ہیں مگر کافروں کو وہ بھی بیخ و بن سے اکھیڑنے والے ہیں۔''

(صفحہ ۹-۱۰۸)

---

(۱) اس جملے سے صاف اشارہ ملتا ہے کہ ''غدر کی کہانی'' کی مؤلفہ مسز لیویٹر نہیں، مس لیویٹر ہے!

(۲) یہاں قادر علی خاں کے کیریکٹر کے بارے میں جو بات کہی گئی ہے، اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ سیرت کی اس پستی سے بہت بلند تھے۔ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ان کی نظامت ہی کئے دن رہی تھی؟ ۳۱؍ مئی سے ۲۳؍ جون ۱۸۵۷ء تک ۲۴؍ کو نظام حکومت غلام قادر خاں نے سنبھال لیا تھا۔ قادر علی خاں نے ۲۴ دن کے شب و روز جن تفکرات اور حالات میں گزارے تھے، مؤلفہ کے لیے ان کا تصور بھی ناممکن تھا۔ اور اگر انھیں حکومت چلانے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ تو غلام قادر خاں کب حکومت کی کرسی پر بیٹھے تھے؟

(۲)

شاہ جہان پور اور ۱۸۵۷ء

چند رجالِ کار

(۱) احمد یار خاں: برٹش دور میں جلال آباد کے تحصیل دار تھے۔ انقلابی حکومت کے دور میں بھی وہ کچھ عرصہ تحصیل دار رہے۔ انقلابی حکومت میں انھیں (جلال آباد) ناظم بنایا گیا تھا، لیکن جلد ہی نواب بہادر خاں سے سفارش کروا کے وہ پھر تحصیل دار ہو گئے تھے

(غدر کی کہانی: صفحہ ۸۳، ۸۴ و فریڈم اسٹریگل ان اُتر پردیش: جلد ۵، صفحہ ۲۰۹ و ۳۰۳ و جلد ۶، صفحہ ۱۴)

(۲) الکھ سنگھ: تیسری کمپنی کے جمعدار تھے۔ انھیں خزانے کی حفاظت پر خاص طور پر مقرر کیا گیا تھا۔ (کہانی: صفحہ ۱۹، ۲۰ و ۴۹)

(۳) امجد علی خاں، حکیم: شاہ جہان پور میں فوج داری کے سررشتہ دار تھے اور ٹھیک انھیں دنوں میں، ۳۱ رمئی ۱۸۵۷ء سے پہلے انگریزی حکومت کے انقطاع ہونے تک وہی شاہ جہان پور کے تحصیل دار تھے۔ ان کا وطن قصبہ امروہہ (ضلع مراد آباد) تھا۔ ۳۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو شاہ جہان پور میں آزادی کا جھنڈا لہرایا گیا اور نعرۂ حیدری بلند کیا گیا تو انھوں نے نعرہ نہیں لگایا تھا۔ لوگوں نے اسے پسند نہیں کیا۔ نواب قادر علی خاں نے انھیں ان کے منصب تحصیل داری پر بحال رکھنا چاہا تو انھوں نے خدمات انجام دینے سے انکار کر دیا تھا۔

نظام علی خاں (کوتوال) کے اس اعلان کے بعد کہ اب اگر کوئی انگریزی حکومت کا نام لے گا تو اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ ''غدر کی کہانی'' کی روایت کے مطابق، وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے تھے۔ چناں چہ وہ اپنے وطن امروہہ جانے کے لیے روانہ ہوئے، لیکن ابھی انھوں نے گرّا پار نہ کی تھی کہ انقلابیوں

نے انھیں پکڑ لیا اور ان کے کپڑے اتار کے ان کے کوٹ سے ایک دھجی پھاڑی اور ان کی کمر سے باندھ دی اور کہا ''جاؤ! فرنگیوں کی خدمت بجالاؤ! جو لوگ برطانیہ کی حکومت کے وفادار ہیں۔ ہم ان کا یہی حال کرتے ہیں۔''

(کہانی: صفحہ ۸۳، ۸۴، وفریڈم......: جلد ۵، صفحہ ۲۹۴ و جلد ۶، صفحہ ۳۲)

(۴) باد اللہ خاں: ناصر علی خاں سے مل کر باد اللہ خاں نے کیپٹن جیمس کی لاش کو دفن کرنے کا انتظام کیا تھا۔ اس موقعے پر کہا تھا: کبھی ہم بھی اس حکومت کے ملازم تھے۔ ہم نے جس کا نمک کھایا ہے، اب ہم نے ارادہ کیا ہے کہ ان صاحب لوگوں کی لاشیں مادرِ گیتی (زمین) کے سپرد کر دی جائیں، جنھیں ہمارے ہم وطنوں نے بے سبب قتل کر دیا ہے۔ (کہانی: صفحہ ۸۰)

(۵) بہاری سنگھ: یہ صاحب فوج کی آٹھویں کمپنی میں جمعدار تھے۔ انھوں نے بتایا کہ کارتوس کے کاغذ کی ساخت معلوم کرنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ وہ سخت ہے۔ اسے جلایا تو اس سے ایسی چرچراہٹ اور بو آئی کہ گویا اس میں چربی ملی ہے۔

(کہانی: صفحہ ۲۰ و ۴۶)

(۶) بھگوت سنگھ: یہ صاحب فوج میں جمعدار تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ گئو ماتا کی بے حرمتی نہیں ہونی چاہیے۔ (کہانی: صفحہ ۲۰، ۲۱)

(۷) پربھوپ سنگھ: فوج کا ایک سپاہی جو بغاوت میں شریک تھا۔

(کہانی: صفحہ ۵۶)

(۸) پریم سنگھ: یہ فوج میں حولدار تھے۔ ان سے کارتوس کے بارے میں پوچھا گیا تو جواب دیا کہ مجھے بذاتہ اس کے استعمال میں اعتراض نہیں لیکن اگر میرے ساتھیوں کو اعتراض ہوگا تو یقیناً مجھے بھی اعتراض ہوگا۔ (کہانی: صفحہ ۲۱)

(۹ و ۱۰) پوتھی سنگھ اور پیتمبر سنگھ: دونوں فوج میں نایک تھے اور دونوں چربی کے کارتوس استعمال کرنے کے خلاف تھے۔ (کہانی: صفحہ ۲۱)

(۱۱) پیتم سنگھ: صوبے دار گھنشیام سنگھ کا اردلی تھا۔ اس نے سب کی موافقت میں تقریر کی۔ (کہانی: صفحہ ۲۱)

(۱۲) تراب علی: سٹی مجسٹریٹ کا خبر رساں، ایک ڈرپوک شخص جو انقلابیوں میں بھی شامل رہا۔ برطانوی دور حکومت میں شاہ جہان پور کا کوتوال تھا۔

(کہانی: صفحہ ۲۹، ۴۵، ۴۶، ۴۸)

(۱۳) ترلوک ناتھ بابا: اجودھیا کی ایک مذہبی و سیاسی انقلابی شخصیت، انقلابی حکومت کے آغاز میں وہ کسی وقت شاہ جہان پور سے گزرے تھے اور بہت سے ہندو مسلمانوں نے ان سے ملاقات کی تھی۔ ایک وفد جس میں انتظامیہ اور فوج کے یہ حضرات شامل تھے، ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور اشیر باد لی تھی:

''عبدالرؤف خاں، نظام علی خاں، کالکا پرشاد، گھنشیام سنگھ، زورآور سنگھ اور مدح خان۔'' (غدر کی کہانی: صفحہ ۷، ۸)

''غدر کی کہانی'' کے مترجم نے انھیں مولوی سرفراز علی گورکھ پوری کی سی ایک مذہبی انقلابی شخصیت لکھا ہے، لیکن مجھے کسی کتاب بالخصوص ''فریڈم اسٹریگل اِن اترپردیش'' کی کسی جلد میں ان کے واقعی وجود کا سراغ نہیں ملا۔ اشہر بار بسنے والے واقعتاً تاریخ ہیں!

(۱۴) تلوکی: ایک معمار جس کے گھر میں مسٹر لیویٹر کے خاندان نے ۳۱ رمئی کو چرچ پر حملے والے روز چند گھنٹے پناہ لی تھی۔ کسی ہنگامہ و فساد اور انقلابی سرگرمیوں سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ (کہانی: صفحہ ۷۴تا۷۶)

(۱۵) چھنالال: سرکاری خزانچی تھا۔ جلال آباد سے چھ ہزار رُپے آئے تھے زورآور سنگھ صوبے دار نے اس سے وہ رقم مانگی، لیکن اس نے رقم دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر زورآور سنگھ نے اسے درخت میں الٹا لٹکا دیا اور اس کے کھاتے کوئیں میں پھینک دیے۔ فوجی دستہ چلا گیا تو خزانچی کے ملازموں نے اسے درخت سے اُتارا اور کوئیں سے کھاتے نکالے، جنھیں خزانچی نے چھپا دیا۔ (کہانی: صفحہ ۷۹)

(۱۶) حامد حسن خاں: برطانوی عہد میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور حکومت کے بہت وفادار، غلام قادر خاں کے نظامت کے عہد میں انھیں تیسرا نایب ناظم مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن جلد ہی انھوں نے اس منصب سے استعفیٰ دے دیا تو خان بہادر خان نے ان کی

جگہ نجیب خان کو نایب ناظم مقرر کر دیا تھا۔

(کہانی: صفحہ ۸۴ و ۱۰۹، وفریڈم...... جلد ۵، صفحہ ۱۹۴ اور دیگر صفحات وجلد ۶، صفحہ ۲۵۴)

(۱۷) خادم حسین خاں، ملک: ان صاحب نے اسسٹنٹ کلکٹر آرتھر اسمتھ کو پناہ دینے کا وعدہ کیا تھا اور اسمتھ نے اپنا کچھ سامان ان کے گھر پہنچا بھی دیا تھا۔ لیکن حالات نے اچانک ایسا پلٹا کھایا کہ وہ اس پیش کش سے فایدہ نہ اُٹھا سکے۔ عوام میں پھنس گئے اور قتل کر دیے گئے۔ (کہانی: صفحہ ۸۱، وفریڈم...... جلد ۵، صفحہ ۳۰۹)

(۱۸) خلیل خاں، حافظ: غدر کی کہانی میں انھیں غلام قادر خاں کا معاون بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل موجود نہیں اور تاریخ کا پتا نہیں چلا۔ (کہانی: صفحہ ۱۰۹)

(۱۹) دولت رائے: شاہ جہان پور کے ایک زمین دار جو یکم مئی ۱۸۵۷ء کو مظہر کریم کے مکان پر بہ موقع آمد مولوی سرفراز علی گورکھ پوری اور اہتمام تقریر کے جلسے شریک تھے۔ (کہانی: صفحہ ۴)

(۲۰) رام نراین پانڈے: ایک انقلابی اور انقلابی سپاہیوں کے مشیر۔

(کہانی: صفحہ ۲۱ تا ۲۵ و ۵۶، ۵۷)

(۲۱) رازق داد خاں: شاہ نواز خاں ہوش مند خاں اور رازق داد خاں انگریزوں کے ہمدرد تھے اور انھیں حالات کی خرابی کی اطلاع دینے اور انھیں ہوشیار کرنے کے لیے آفیسران سے ملے تھے۔ (کہانی: صفحہ ۲۶ و ۲۸)

(۲۲) رام جی مل، لالہ: قوم کے کایستھ، انگریزوں کے ملازم جیل کے محرر انگریزی، مسٹر لیویٹر کے ہمدرد و مخلص اور ان کے قتل کے بعد ان کے خاندان کو حفاظت اور پناہ گاہ مہیا کرنے والے، نہایت ذمے دار اور شریف انسان، غدر کے واقعات کے چشم دید گواہ اور مؤلفہ کو حالات و واقعات سے آگاہ کرنے والے تھے۔ کہانی میں ان کے بہ کثرت بیانات نقل ہوئے ہیں۔ غدر کی کہانی کی مؤلفہ مس لیویٹر نے ان کا خاکہ بھی لکھا دیا ہے:

"رام جی مل بہ ذات خود ایک لانبے، دبلے، سانولے رنگ کے آدمی تھے۔ مونچھیں اور گل مُچھے رکھتے تھے۔ ان میں جوہر تعظیم بہ درجۂ غایت تھا،

ہمارے اور ہماری قوم (انگریزوں) کے کامل وفادار تھے۔ ان کا طور طریقہ ہمیشہ مودبانہ رہتا تھا اور ان میں ایک ایسی قوت ارادی کارفرما تھی، جو کایستھوں کی ذات میں بالعموم نہیں پائی جاتی۔" (کہانی: صفحہ ۷۶)

(۲۳) رام نراین پنڈت: ان کے بارے میں "غدر کی کہانی" کا بیان ہے:

"رام نراین پنڈت کو سب سے زیادہ پرجوش پایا گیا۔ انھوں نے کہا کہ میں ہرگز ہرگز گئو ماتا کی چربی اپنے ہاتھ میں لے کر "بھرسٹ" ہونا نہیں چاہوں گا، جو لوگ اس کے خلاف رائے رکھیں وہ عاقبت کار "نرکھ" (دوزخ) میں ہوں گے۔" میرا فیصلہ کل رجمنٹ کا فیصلہ ہے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔ کیا میں نے ہر شخص کو کتھا نہیں سنائی؟ اسی قریبی تاریخ یعنی ماگھ سنکرانت پر "ست نراین" کی کتھا کی تقریب میں جب میں نے دھرم شاستر کا ذکر کیا کہ کس طرح "گئو رکشا" اور "بیماروں کی تیمارداری" سے اعلا مرتبہ حاصل ہوتا ہے، تو تمام مجمعے میں ہماری رجمنٹ کی دسوں کمپنیوں کے قومی نمائندے موجود تھے، سب کے سب چلا اٹھے "جے سری گئو ماتا کی!" یہی ہمارے مذہبی جوش کا مظاہرہ تھا، جس میں "مدروکی" پلٹن ہمیشہ ممتاز رہی ہے۔" (کہانی: ۲۱،۲۲)

اس تقریر کے ردِّ عمل میں گھنشیام سنگھ، جمعدار بہاری سنگھ اور پھر رام نراین پنڈت اور دیگر حضرات کے جو خیالات سامنے آئے، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سب لوگ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا تختہ اُلٹنے میں کتنے پختہ اور مستعد تھے۔

(۲۴) رؤف احمد: یکم مئی ۱۸۵۷ء کے خفیہ جلسہ برمکان مفتی مظہر کریم، کے موقعے پر رؤف احمد کو بہ غرض نگرانی دروازے پر کھڑا کیا گیا تھا تاکہ وہ سازش کنندگان کو ہر امکانی خطرے سے آگاہ کر دیں۔

(کہانی: صفحہ ۴، وفریڈم...... جلد ۵، صفحہ ۳۰۰ و جلد ۶، صفحہ ۴۹۴)

(۲۵) زور آور سنگھ: ساتویں کمپنی کے صوبے دار زور آور سنگھ اپنی حریت پسندی کے لحاظ سے صف اول کے مجاہدین وطن میں تھے، یہ گھنشیام سنگھ صوبے دار میجر اور چند

دوسرے ساتھیوں کے ساتھ رجمنٹ کے کمانڈنگ آفیسر سے ملنا اور صورت حال کی سنگینی سے اسے متنبہ کر دینا چاہتے تھے۔ لیکن جو تاریخ اور وقت اس کام کے لیے مقرر ہوا تھا، اس پر وہ کمانڈنگ آفیسر سے ملنے کے لیے گئے، لیکن وہ بہ وجہ بیمار ہونے کے مل نہیں سکے اور پھر انھیں اس کا موقع نہیں ملا اور ۳۱؍مئی کو چرچ والا حادثہ پیش آ گیا اور اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ غدر کی کہانی میں متعدد صفحات پر صوبے دار زور آور سنگھ کا نام آیا ہے جس سے ان کی مستعدی، کارگذاری اور ذوق حریت پرستی کا پتا چلتا ہے۔

(۲۶) سرفراز علی گورکھ پوری: پیر، مولوی اور مجاہد آزادی۔ تحریک حریت وطن کی ایک سرگرم اور پر جوش شخصیت تھے۔ ان کے بہت مرید اور عقیدت مند تھے اور دعوت وارشاد اور اصلاح دینی کی ضرورت سے اردگرد کے علاقے اور شہروں میں خصوصاً شاہ جہان پور میں ان کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اور تحریک آزادی وطن کے سلسلے میں ان کی آمد و رفت بہت بڑھ گئی تھی۔ غدر کی کہانی میں ان کا حلیہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

> ''سرفراز علی....... دراز قد، دبلے پتلے مرد قوی تھے۔ ان کے اُبھرے ہوئے رخسار، لانبے پتلے ہونٹ، اونچی نوک دار ناک، گہری بڑی بڑی آنکھیں، سیاہ ابرو اور لانبی داڑھی تھی۔ بال سخت و سیاہ تھے۔ زلفیں کاندھوں پر پڑی تھیں۔''

اپریل کے آخر میں وہ شاہ جہان پور پہنچے تھے۔ یکم مئی ۱۸۵۷ء کو مفتی مظہر کریم کے مکان پر ایک خفیہ جلسہ ہوا تھا۔ مفتی صاحب نے افتتاحی تقریر کی۔ اس کے بعد مولوی سرفراز علی نے ایک طویل اور پر جوش تقریر کی۔ جلسے میں مسلمان اور ہندو دونوں قوم کے سامعین تھے۔ انھوں نے دونوں کے قومی اور وطنی فرض کو یاد دلایا تھا۔ سب لوگ ان کی تقریر اور خیالات سے بہت متاثر ہوئے۔ ان کی یہ مفصل، پر جوش اور حقیقت سے بھری تقریر غدر کی کہانی میں درج ہے۔ کہانی میں ان کا ذکر متعدد صفحات پر آیا ہے۔ (فریڈم...... جلد ۵، صفحہ ۳۱۰ و جلد ۶، صفحہ ۵۱۹)

(۲۷) سیتل سنگھ: غلام قادر خاں، نظام علی خان کی شکار پارٹی کے ایک فرد۔ (کہانی: صفحہ ۶۴)۔ کیپٹن لائی سوٹ (Lysoght) کے اردلی (سپاہی)، ۳۱؍مئی ۱۸۵۷ء

کوچرچ کے حادثے کے موقعے پر کیپٹن لائی سوٹ کی مسلح مدد کی۔

(فریڈم...... جلد۵، صفحہ۲۰۴، ۲۰۶ و جلد۶، صفحہ ۵۴۵)

(۲۸) شاہ نواز خاں: دیکھیے: ''رازق داد خاں'' (کہانی: صفحہ ۲۶ تا ۲۸)

(۲۹) شمو خاں: ایک شخص جس پر عزو خاں (اجو خاں) نے حملہ کیا تھا اور عزو خاں کو تین ماہ کی سزا ہوئی تھی۔ (کہانی: صفحہ ۳۰) شمو خاں انگریزی حکومت کے دور میں نایب سررشتہ دار تھے۔ جب قومی انقلابی حکومت قایم ہوئی۔ تو اس میں شامل ہو گئے اور مفتی کورٹ میں سررشتہ دار بنائے گئے۔ (فریڈم...... جلد۵، صفحہ ۳۰۴ و جلد۶، صفحہ ۵۳۹)

(۳۰) عبدالرؤف خاں: جنگ آزادی کے ابتدائی ایام سے تحریک کے ایک سرگرم رکن تھے۔ غدر کی کہانی کے بیسیوں صفحات پر ان کا تذکرہ آیا ہے۔ برٹش حکومت کے دور میں وہ اردو مدارس کے انسپکٹر تھے۔ جب غلام قادر خاں شاہ جہان پور کے ناظم بنائے گئے تو عبدالرؤف خاں کو کل فوج کا کمانڈر بنایا گیا۔

(فریڈم...... جلد۵، صفحہ ۹۹، ۲۹۸، جلد۶، صفحہ ۲)

(۳۱) عزو/ اجو خاں: ایک نامی غنڈا جو کئی بار جیل جا چکا تھا۔ کہانی میں اس کے بارے میں ہے کہ ''وہ بدمعاش، ظالم اور جابر تھا۔ ایک وزنی کلّے دار لاٹھی لے کر بازار میں ہر اس کام کے لیے جایا کرتا تھا، جس میں پھرتی اور بہادری کی ضرورت ہوتی۔ وہ اپنے جرایم میں کسی اور کو شریک کرنے سے نفرت کرتا تھا۔ حکام اس کے چال چلن سے واقف تھے اور کئی مرتبہ اسے سزا دلا چکے تھے۔

(کہانی: صفحہ ۲۰، ۵۱۔ فریڈم...... جلد۵، صفحہ ۲۹۶، جلد۶، صفحہ ۱۶)

(۳۲) غلام غوث خاں: مسٹر لیویٹر کے مکان کو آگ لگانے والا ایک شخص۔

(کہانی: صفحہ ۷۷)

(۳۳) غلام قادر خاں: انقلابی حکومت کے دوسرے ناظم شاہ جہان پور۔

(غدر کی کہانی: بیسیوں صفحات میں مختلف انداز میں ان کا تذکرہ آیا ہے۔)

(فریڈم...... جلد۵، صفحہ ۱۰۶، جلد۶، صفحہ ۳۵-۲۳۴)

(۳۴) قادر علی خاں: جنگ آزادی کے اولین اراکین کی ایک نامور شخصیت

شاہ جہان پور میں قومی حکومت کے پہلے ناظم۔ غدر کی کہانی کے بیسیوں صفحات میں مختلف انداز سے ان کا ذکر آیا ہے۔ (فریڈم...... جلد ۵، صفحہ ۲۹۷ و جلد ۶، صفحہ ۴۶۶)

(۳۵) قدرت علی خاں: انگریزی حکومت میں نایب سررشتہ دار فوج داری تھے۔ انقلابی حکومت میں پیش کار تحصیل تلہر (ضلع شاہ جہان پور) ہوئے۔

(کہانی: صفحہ ۴۱، ۴۵ و ۵۱ و فریڈم...... جلد ۵، صفحہ ۲۹۷ و ۳۰۸ و جلد ۶، صفحہ ۴۶۷)

(۳۶) کالکا پرشاد (کایستھ): برٹش عہد حکومت میں کالکا پرشاد منصرم نیلام تھے اور انقلابی حکومت کے دور میں وہ ۲۸ ویں پیدل فوج میں صوبے دار تھے۔

(کہانی: صفحہ ۴، ۸ و فریڈم...... جلد ۵، صفحہ ۳۰۱ و جلد ۶، صفحہ ۳۰۳)

(۳۷) کھگا لال (دھنی باغ بان کا لڑکا): ۳۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو شاہ جہان پور کے سینٹ میری گرجا پر انقلابیوں کا حملہ ہوا اور چند قتل ہوئے تو دھنی باغ بان کا لڑکا کھگا دوڑتا اور چلاّتا ہوا آیا اور مس میری، مسز لیویٹر کو بتایا کہ "غدر پڑ گیا ہے اور صاحب (مسٹر لیویٹر) اور دیگر لوگ مار ڈالے گئے ہیں۔ (کہانی: صفحہ ۷۵)

(۳۸) کنچن سنگھ: فوج میں جمعدار تھے۔ ان کی رائے تھی کہ ہر شخص چربی کے کارتوس سے غیر مطمئن ہے۔ چربی کے استعمال کا یہ ثبوت ہے کہ وہ موم جامے کی طرح چمک دار ہے۔ (کہانی: صفحہ ۲۰)

(۳۹) گوپال سنگھ: گوپال سنگھ کے بارے میں پریم سنگھ نے بتایا کہ اس نے کہا کہ گئو ماتا کی بے حرمتی نہیں ہونی چاہیے۔ (کہانی: صفحہ ۲۰، ۲۱ و فریڈم...... جلد ۶، صفحہ ۲۳۸)

(۴۰) گھنشیام سنگھ اور زور آور سنگھ: دونوں صوبے دار کھنوت میں نہانے کے لیے گئے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں سے ملاقات کے لیے بھی وہی موقع اور وقت مقرر کیا تھا۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں سے چربی والے کارتوس کے بارے میں ان کی رائے دریافت کی۔ سب نے اپنے اپنے انداز و الفاظ میں ان سے نفرت کا اظہار اور ان کے استعمال سے انکار کیا۔ اس موقعے پر یہ حضرات موجود تھے۔ جمعدار الکھ سنگھ، جمعدار بہاری سنگھ، جمعدار کنچن سنگھ، حولدار گوپال سنگھ، جمعدار بھگوت سنگھ، حولدار پریم سنگھ، نایک پوتھی سنگھ، نایک پیتمبر سنگھ، رام نراین پانڈے، پیتم سنگھ، گھنشیام سنگھ کا

اردلی، اس موقعے پر رجمنٹ کی دسیوں کمپنیوں کے نمایندے موجود تھے۔ صرف حولدار پریم سنگھ نے کہا تھا کہ ذاتی طور پر اسے کارتوس کے متعلق کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن سب کا ساتھ دینے کا اس نے بھی فیصلہ کر لیا تھا۔

(کہانی: صفحہ ۱۹، تا ۲۱ وفریڈم......: جلد ۶، صفحہ ۲۳۲)

(۴۱) مال راو ہر سہائے: مجسٹریٹ وکلکٹر ضلع شاہ جہان پور مسٹر ریکٹس خاص بے چینی کے زمانے میں تین ماہ کی چھٹی کے بعد اپنی ڈیوٹی پر واپس آئے تھے۔ تحصیل دار وغیرہ روزانہ نئی نئی افواہیں ان کے گوش کرتے تھے لیکن ان کے سررشتہ دار اور عملے کے دیگر افراد کے علم میں جو کچھ آتا تھا۔ مال راو ہر سہائے صحیح حالات سے مطلع کر دیتے تھے، لیکن اس کے برعکس مظہر کریم سررشتہ دار فوج داری بالکل ساکت تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مال راو ہر سہائے انگریزوں کے بہی خواہ اور برٹش حکومت کے وفاداروں میں سے تھے۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ہوا کا رخ بدل چکا تھا۔ انگریزوں کے وفاداران سے کھل کر وفاداری بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مال راو ہر سہائے بھی کسی شعبے کے سررشتے دار تھے۔ (کہانی: صفحہ ۵۴)

(۴۲) مدح خاں: ۲۸ ویں دیسی پیدل فوج کی ایک رجمنٹ کے صوبے دار تھے اور گھنشیام سنگھ، کالکا پرشاد، زور آور خاں وغیرہ کے ساتھیوں اور راز دانوں اور انگریز حکومت کے مخالفین میں سے تھے۔ (کہانی: صفحہ ۸، ۴۷ وفریڈم......: جلد ۶، صفحہ ۳۵۷)

(۴۳) مظہر خاں: سررشتہ دار فوج تھے اور برٹش حکومت کے مخالفین کے گروپ سے تعلق رکھتے تھے۔ (کہانی: صفحہ ۲۹)

(۴۴) مظہر کریم: جنگ آزادی کے اہم اور سرگرم رکن تھے۔ برطانوی عہد حکومت میں شاہ جہان پور میں محکمہ فوج کے سررشتہ دار تھے۔ غلام قادر خاں کی نظامت کے زمانے میں مفتی کے عہدے پر فائز تھے۔ غدر کی کہانی میں ان کے بارے میں لکھا ہے:

> ''مظہر کریم بہرائچ کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی قابل عزت لانبی داڑھی تھی۔ وہ حافظ تھے، سر گھٹا رہتا تھا اور ادائیگی فرض میں ان کی کبھی کوئی غلطی نہیں پائی گئی۔ وہ ایک سنجیدہ وغیور دیسی شریف

انسان کی حیثیت رکھتے تھے۔ مؤلفہ غدر کی کہانی کا خیال تھا کہ موجودہ حکومت کا تختہ اُلٹنے کی اگر کوئی تحریک ہو رہی ہو تو یہ اس کے سربراہ ہونے کے لائق تھے۔“

(کہانی: صفحہ ۵۵ و دیگر متعدد صفحات و فریڈم...... جلد ۵، صفحہ ۳۶، جلد ۶ صفحہ ۳۶۷)

(۴۵) منگل خاں: شاہ جہان پور کے زمین دار جو عبدالرؤف خاں انسپکٹر آف اردو اسکول کے سالے تھے۔ جب شاہ جہان پور کے ناظم غلام قادر ہوئے تو منگل خاں چوں کہ ان کے مددگاروں میں تھے۔ اس لیے انھیں ایک ہزار پیدل فوج کی کمان ملی اور ان کے بہنوئی (عبدالرؤف خاں) کو جو شاہ جہان پور میں جنگ آزادی کے خاص بانیوں میں سے تھے کل فوج کی کمان سپرد ہوئی۔

(کہانی: صفحہ ۱۱۷ و فریڈم...... جلد ۵، صفحہ ۳۰۰، ۳۰۹، جلد ۶، صفحہ ۳۷۳)

یہی وہ منگل خاں ہے، جو کسی موقع پر مس لیویٹر کو دیکھ کر اس کے عشق میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ان کے فوج کو لڑانے، کسی معرکے میں فتح پانے یا وطن کی آزادی کے لیے بہادری کا کوئی کارنامہ انجام دینے کا کوئی ذکر سامنے نہیں آیا! البتہ ایک پون مہینے میں لالہ رام جی مل کے گھر سے مس لیویٹر کو نکال لانے اور اپنے گھر کی عورتوں میں بیٹھ کر اور اپنی چچی کے سامنے اپنے واحد کارنامے کی ڈینگیں مارنے میں مزا لیتے ہوئے دکھایا گیا۔ چوں کہ ”غدر کی کہانی“ کا صرف نامکمل ترجمہ ہی سامنے ہے۔ اس لیے ان کے اس کارنامے کا اختتام وانجام کیا ظہور میں آیا، معلوم نہیں لیکن پوری تحریک آزادی کا جو انجام ہمارے سامنے ہے جس میں مزید نوے (۹۰) برس قوم کو جس طرح کڑھائی میں تلا گیا، وہ ایسے منحوسوں کی عشق بازیوں اور بدمعاشیوں ہی کا نتیجہ تھا۔

(۴۶) مولا کوری: لالہ رام جی مل کے قابل اعتماد اور شریف پڑوسی جنھیں معلوم تھا کہ لالہ جی نے قوم کے ایک دشمن خاندان کے افراد کو چھپا رکھا ہے لیکن ان کے دل میں یہ خیال کبھی نہیں آیا کہ خاندان کی ان مظلوم عورتوں کو گرفتار کروا کے حکومت کی نظر میں سرخ روئی حاصل کرے۔ اس خاندان کا کہانی میں کئی بار ذکر آیا ہے۔

(کہانی: صفحہ ۷۵)

(۴۷) مہتاب خاں: ایک سویلین جس پر مسٹر لیویٹر نے کبھی کوئی احسان کیا تھا۔ اس نے یاد رکھا۔ اب اس نے انگریزوں کے لیے خطرات محسوس کیے تو مسٹر لیویٹر کے پاس آیا اور پیش کش کی کہ وہ اپنے خاندان کو لے کر اس کے گھر چلے۔ وہ ان کی حفاظت کا ذمے دار ہوگا۔ مسٹر لیویٹر چوں کہ آخر تک حالات کی سنگینی کا اندازہ نہیں کر سکے تھے، اس لیے نہ مہتاب خاں کی پیش کش قبول کی نہ خود ہی کوئی انتظام کیا۔ اسی حالت میں خود بھی مارے گئے اور بیوی، بیٹی اور دیگر متعلقین بھی در بہ در مارے مارے پھرے۔ (کہانی: صفحہ ۳۷، ۳۸ و ۷۳، ۷۵)

(۴۸) فاخر علی خاں: باد اللہ خاں کے ساتھ مل کر کیپٹن جیمس کی تدفین کا انتظام کرنے والا۔ برٹش حکومت کا وفادار اور اپنے آفیسروں کا بہی خواہ تھا۔ (کہانی: صفحہ ۸۰)

(۴۹) نبلے: یہ صاحب مسٹر لیویٹر کے خان ساماں تھے۔ (کہانی: صفحہ ۷۳)

(۵۰) نظام علی خاں: شاہ جہان پور کے برٹش عہد حکومت کے کوتوال اور انقلاب کے بعد قادر علی خاں کے عہد نظامت کے بھی کوتوال تھے۔ البتہ غلام قادر خاں کی نظامت کے دور میں نایب ناظم اور انقلابی فوج کا کمانڈر بنا دیا گیا۔ بچھوریا کے معرکے میں کام آئے تھے۔ غدر کی کہانی کے بیسیوں صفحات پر ان کا ذکر آیا ہے۔

(فریڈم..... جلد ۵، صفحہ ۳۰۸، ۳۱۱، ۴۰۷، ۴۲۴، ۴۴۴، ۹۴۴ و جلد ۶، صفحہ ۴۴۳)

(۵۱) نیاز علی: قدرت علی نایب سررشتہ دار فوج داری کے بھائی اور انقلابی حکومت کے ایک اہم کارکن اور مولوی سرفراز علی کے مرید خاص تھے۔

(کہانی: صفحہ ۴، ۴۵ و فریڈم..... جلد ۵، صفحہ ۳۹۷، ۳۲۹، و ۳۸۰ و جلد ۶، صفحہ ۴۴۰)

(۵۲) ہدایت حسین خاں: کلکٹر و مجسٹریٹ ضلع شاہ جہان پور مسٹر ریکٹس اور مسٹر جنکسن کی گفتگو میں ان کا نام آیا تھا۔ مسٹر ریکٹس نے کہا:

”بے شک میں جانتا ہوں، وہ (عزد خاں) ان میں کا ایک شخص تھا، جنھوں نے ہدایت حسین کے ساتھ جو ایک مقبول شخص نظام علی سابق کوتوال کا داماد ہے۔ شمو خاں پر حملہ آوری کے سلسلے میں سزا پائی تھی۔“

اس کے جواب میں مسٹر جنکسن نے بے ساختہ کہا:

''ہاں ہاں! وہی آدمی! اگر چہ ہدایت حسین چھوٹ گیا، لیکن عزو خاں کو تین مہینے کی سزا ہوگئی۔ ہدایت حسین آج کل نقض امن کے سلسلے میں قید ہے۔

لیکن میں عزو خاں کی بابت کچھ کہنے والا تھا۔'' (کہانی: صفحہ ۳۰)

مسٹر ریکٹس اور مسٹر جنکسن دونوں عزو خاں اور ہدایت حسین خاں، دونوں ہی ان دونوں کے بدمعاش اور فسادی ہونے پر متفق تھے۔ ہدایت حسین خاں کا ذکر بھی فریڈم اسٹریگل ان اتر پردیش کی جلد ۵ میں صفحہ ۲۹۶ پر اور جلد ۶ میں صفحہ ۲۶۶ پر آیا ہے۔

(۵۳) ہوش مند خاں: انگریزوں کے وفادار تھے، انھوں نے مجسٹریٹ وکلکٹر شاہ جہان پور مسٹر ریکٹس اور کیپٹن جیمس سے مل کر انھیں حالات سے مطلع کیا تھا اور بہ حفاظت انھیں نینی تال پہنچا دینے کی حامی بھری تھی۔ (کہانی: صفحہ ۲۶ تا ۲۸)

(۳)

شاہ جہان پور اور ۱۸۵۷ء

برٹش حکومت کے چند انگریز عہدے دار اور خدمت گذار

(۱) اسکاٹ، مسٹر: انگریزی حکومت کی فوج میں ان کا عہدہ لیفٹنٹ کا بتایا گیا ہے۔ ۳۰ رمئی کی مجلس عیش ونشاط میں ان کی بہن اور بیوی بھی شریک تھیں۔ لیفٹنٹ روتھر فورڈ نے مسٹر اسکاٹ کے ساتھ گانا گایا تھا تو ان کی بہن (مس اسکاٹ) نے ستار پر ان کا ساتھ دیا تھا۔ (غدر کی کہانی: ص ۶۰ و ۱۷)

ان کی والدہ، بہن اور بیوی کی شاہ جہان پور میں موجودگی کا پتا چلتا ہے، انجام کا نہیں!

(۲) اسکاٹ، جانسٹن: ۳۰ رمئی کی دعوت ناؤ نوش کے ایک شریک۔

(کہانی: صفحہ ۶۰)

(۳) اسنیڈ، مسٹر: یہ تیسری کمپنی کے کمانڈنگ آفیسر تھے۔

(کہانی: صفحہ ۵۶ تا ۵۸، ۶۰ و فریڈم...... : جلد ۶ صفحہ ۵۴۷)

(۴) اسمتھ، مسٹر: مسٹر اسمتھ کلکٹر کے آفس میں ہیڈ کلرک تھے وہ مارچ ۱۸۵۷ء میں اس ضلع میں آئے تھے۔ وہ ایک نوعمر سویلین تھے۔ (کہانی: صفحہ ۳۰) ہیڈ کلرک ۳۱ رمئی کے ہنگامۂ چرچ کے موقعے پر قتل کر دیے گئے تھے۔ (کہانی: صفحہ ۸۰) مسٹر اسمتھ پناہ کی تلاش میں مسٹر ریکٹس کے بنگلے پر گئے لیکن دیکھا کہ باغی لوٹ رہے ہیں وہ ایک پاخانے میں چھپ گئے۔ تھوڑی دیر میں ان کا سائیس ان کی تلاش میں وہاں پہنچا اور ان کے بارے میں دریافت کیا۔ لوگوں کو شبہ ہوا۔ انھیں ڈھونڈھا اور پکڑ لیے گئے۔ لوگوں نے توہین کی، گھڑی اور چین لے لی پھر بھی نہ چھوڑا۔ لودھی پور کے فجو نے لوہے کا ڈنڈا سر میں مارا۔ بے ہوش ہو کر گر گئے، پھر نہ اُٹھ سکے، نہ ایک لفظ

زبان سے نکلا۔ (کہانی: صفحہ ۸۱ نیز مقالہ مسٹر نیول: صفحہ ۱۴۲)

(۵) اسمتھ، اے سی: اسٹنٹ مجسٹریٹ تھے، وہ بھی قتل کردیے گئے۔ (کہانی: صفحہ ۸۱ نیز مقالہ مسٹر نیول: صفحہ ۱۴۲)

(۶) الیگزینڈر، مسٹر: روہیل کھنڈ کے کمشنر اور بریلی میں مقیم تھے۔ ان کی بیوی مسٹر ٹایلر کمشنر آگرہ کی بیٹی تھیں اور اس وقت نینی تال میں مقیم تھیں اور مسز ریکٹس کو بھی وہ اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ (کہانی: صفحہ ۲۶)

(۷) ایفی: یہ ڈاکٹر باؤلنگ کا بچہ تھا۔ اور ۳۰ رمئی کی دعوت کے موقع پر موجود تھا "غدر کی داستان" میں ہے کہ "مسز باؤلنگ کا چھوٹا بچہ "ایفی" حسین پری کی طرح اچھل کود رہا تھا اور پادری میک کلم اس کے ساتھ دھائی مچونا کھیل رہے تھے۔" (کہانی: صفحہ ۶۰) اگلے دن کے حادثے میں مسٹر باؤلنگ چرچ کے سامنے پریڈ کے میدان میں مار ڈالے گئے تھے، ایفی زخمی ہوا تھا اور ماں بچ گئی تھی۔

شاہ جہاں پور کے اِس قافلے میں بارہ مرد، آٹھ عورتیں اور تین بچے تھے، جو پوائیں کے لیے روانہ ہوا تھا۔ بچے کھچے لوگ جن میں یقین ہے کہ ایفی بھی شامل ہوگا۔ پوائیں بہ خیریت پہنچ گیا لیکن پوائیں کے راجہ نے انھیں تحفظ دینے کے بجاے، دوسرے روز ہی محمدی کو روانہ کردیا تھا۔ لیکن غدر کی کہانی کی مؤلفہ لالہ رام جی مل کے حوالے سے لکھتی ہے:

> "صورت اطمینانی (محمدی میں) بھی بہت کم عرصے تک قایم رہی۔ کیوں کہ سیتا پور کی بغاوت کے بعد اکتالیسویں رجمنٹ ۶ رجون کو محمدی آئی اور ان سب لوگوں کو بندوقوں اور تلواروں سے بے رحمی کے ساتھ قتل کردیا اور ایک بھی فسانۂ غم کہنے کو باقی نہیں چھوڑا۔" (کہانی: صفحہ ۸۳)

اس روداد کے بعد کیسے یقین کرلیا جائے کہ "ایفی" بچ گیا ہوگا!

(۸) آرتھر اسمتھ: مسٹر آرتھر اسمتھ اسسٹنٹ کلکٹر و مجسٹریٹ ڈاکٹر باؤلنگ کی شب کی دعوت ناؤ نوش میں تو شریک نہ ہوسکے تھے کہ وہ بخار میں مبتلا تھے لیکن دن میں جب ہنگامہ سارے شہر میں پھیل گیا وہ کنٹونمنٹ میں اپنی کوٹھی میں تھے۔ گھبرا کر اُٹھے

اور کسی محفوظ جگہ پر جانے کے لیے باہر نکلے۔ ڈپٹی کلکٹر حامد حسن خاں کی کوٹھی پر پہنچ گئے لیکن اندر نہ جا سکے تھے۔ وہاں سے سیدھے تحصیل گئے۔ مظہر کریم سے ملے وہ انھیں بخشی محمد حسین خاں کے گھر لے گئے، لیکن وہ ٹھہرانے اور پناہ دینے کے لیے آمادہ نہ ہوئے اور انھیں چلتا کر دیا، وہاں سے کوتوالی گئے اور ایک صندوق میں چھپ گئے۔ لیکن ان کا پتا چلا لیا گیا اور دفتر کے ایک چپراسی نے انھیں عبدالرؤف کے مکان پر پہنچا دیا، وہاں منگل خاں ان کے سالے سے، ان کا سامنا ہوا منگل خاں نے عبدالرؤف خاں کو اطلاع دینے سے پہلے ہی بھگا دینا چاہا، لیکن وہاں بہت لوگ جمع ہو گئے تھے جنھوں نے ان کی توہین کی، ذلیل کیا منہ پر تھوکا، لیکن اسسٹنٹ کلکٹر مسٹر آرتھر اسمتھ نے اپنا ریوالور نکال لیا۔ لیکن بے سود! اب لوگوں نے ان کی تکا بوٹی کر دی اور لالہ رام جی مل کے بیان کے مطابق "ان کے قتل کے ساتھ ساتھ دردناک اور غیر متوقع بے رحمی بھی کیا گئی۔" (کہانی: صفحہ ۲۹، ۶۰، ۸۰ تا ۸۲)

(۹) باؤلنگ، ایچ ایچ: سرجن ڈاکٹر رجمنٹ کے ہسپتال کے ڈاکٹر ۳۰ رمئی ۱۸۵۷ء کی رات کو ان کے گھر شاہ جہان پور کی برٹش انتظامیہ اور فوج کے لوگ اپنی بیویوں کے ساتھ جمع تھے اور گانے بجانے اور شراب (اکس شا نمبرا) سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ خوش تھے کہ ۳۰ رمئی تک پیش آنے والے خطرات اور فوج اور عوام کی بغاوت کی خبریں محض افواہیں ثابت ہوئیں۔ سب خوش، نشے میں سرشار اور مست تھے۔ افسوس کہ کسی کو پتا نہ تھا کہ ان کے کلینڈر کے مطابق بغاوت کی صبح نمودار ہو چکی ہے۔ سورج نکلتے ہی انقلاب کا نقارہ بج جائے گا اور تاریخ کی ایک کروٹ سے سب کچھ بدل جائے گا۔

۳۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو چرچ آتے ہوئے ایک باغی سپاہی کی گولی کا نشانہ بن گئے۔ ان کا بچہ جو گذشتہ شب دعوت کے موقع پر چہک رہا تھا اور پادری صاحب اس کے ساتھ کھیل رہے، زخمی ہو گیا، بیوی بچ گئی تھی۔

(کہانی: صفحہ ۶۰، ۶۷ و مقالہ مسٹر نول: صفحہ ۱۴۲)

(۱۰) برانڈ، مسٹر: مسٹر برانڈ روضہ کی فیکٹری سے وابستہ ایک شخص تھے اور مسٹر

کیرو کے ساتھ روضے سے نکلے تھے۔ لکھنؤ پہنچنے سے پہلے مسٹر کیرو سے الگ ہوگئے تھے اور کسی طرح ترائی کے علاقے میں پہنچ گئے تھے۔ کافی عرصہ مارے مارے پھرتے رہے۔ پھر بخار میں مبتلا ہوئے اور بنوال (نیپال کے علاقے) میں انتقال ہوگیا۔

(غدر کی کہانی: صفحہ ۸۳، شاہ جہان پور گزیٹیر ۱۹۱۰ء: صفحہ ۱۴۳)

(۱۱) بریملے، مسٹر: شاہ جہان پور میں کسی سول عہدے پر فایز تھے۔ مسٹر مورڈنٹ ریکٹس مجسٹریٹ وکلکٹر ضلع رخصت پر گئے تھے تو ان کے قایم مقام یہی مسٹر بریملے تھے۔ تین ماہ کے بعد مسٹر ریکٹس رخصت سے واپس آئے اور چارج سنبھالا تو حالات خراب ہو چکے تھے۔ ان کی واپسی اور دوبارہ چارج لینا مئی ۱۸۵۷ء کے وسط کا واقعہ ہے۔ مسٹر بریملے کا ذکر ''غدر کی کہانی'' میں مسٹر ریکٹس کی قایم مقامی کے سلسلے میں صرف ایک جگہ ہی آیا ہے۔ (کہانی: صفحہ ۲۶)

(۱۲) پل: برطانوی حکومت کی فوج میں لیفٹنٹ کے عہدے پر فایز تھے۔

(کہانی: صفحہ ۶۰)

(۱۳) ٹامسن، مسٹر: محمدی کے حاکم تھے (کہانی: صفحہ ۸۳) مسٹر تھامسن (Thomson) محمدی (ضلع کھیری) کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ (فرزم......: جلد ۶، صفحہ ۵۶۴)

(۱۴) ٹایلر، مسٹر: انیسویں صدی کے وسط میں آگرہ کے کمشنر تھے۔

(کہانی: صفحہ ۲۶)

(۱۵) جنکسن، مسٹر: شاہ جہان پور میں جوائنٹ مجسٹریٹ کے عہدے پر فایز تھے اور حالات کا اندازہ لگانے کے لیے انگریز آفیسرز نے شہر کا گشت نکالنے کا جو فیصلہ کیا تھا، اس کے مطابق گشتی پارٹی میں مسٹر جنکسن شریک تھے اور صلاح ومشورے کے دوسرے مواقع پر بھی ان کی موجودگی اور مستعدی کا پتا چلتا ہے۔ ایک مرتبہ کلکٹر نے انھیں عزو خاں نامی بدمعاش کو چھوڑ دینے کے فیصلے پر ٹوکا تھا اور کہا تھا ''بہ حیثیت جج کے تم نے ٹھیک کیا، لیکن مجسٹریٹ کی حیثیت سے عجلت کر گئے۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو اس شخص کو کم از کم پندرہ دن اور حوالات میں رکھتا تاکہ شرارت سے باز رہتا۔''

(کہانی: صفحہ ۳۱) ۳۰ رمئی کو ڈاکٹر باؤلنگ کے مکان پر مجلس ناؤنوش کا جو انتظام کیا گیا تھا

اس میں مسٹر جنکسن موجود تھے۔ (کہانی: صفحہ ۶۰) شاہ جہان پور کے کلکٹر اور مجسٹریٹ مار ڈالے گئے تو ان کے عہدے کے کاموں کو جوائنٹ مجسٹریٹ مسٹر جنکسن نے، عملے میں سب سے سینیئر رکن کی حیثیت سے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ (کہانی: صفحہ ۸۲) اور خوش اسلوبی سے چلایا۔ ۳۱ر مئی کو جس وقت مسٹر ریکٹس کو گرجا میں قتل کیا گیا تھا، جنکسن ان کے پاس کھڑے تھے مسٹر ریکٹس تلوار سے زخمی ہوئے اور گر کر مر گئے۔ (کہانی: صفحہ ۸۲) مسٹر جنکسن بھی پوائیں جانے والے قافلے میں ضرور شامل تھے، پوائیں سے وہ محمدی بھی گئے۔ جہاں دیگر حضرات تو مارے گئے، لیکن مسٹر جنکسن کی زندگی باقی تھی، خدا نے انھیں بچالیا۔

جب تحریک آزادی زوال پذیر ہوئی اور انقلابیوں کو بار بار شکست کا سامنا ہوا اور شاہ جہان پور پر دوبارہ انگریز قابض ہو گئے تو مسٹر جنکسن واپس آ گئے اور جب تک جی بی منی کو شاہ جہان پور کلکٹر اور مجسٹریٹ مقرر نہیں کر دیا گیا، وہ قایم مقام مجسٹریٹ و کلکٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ (نیز مقالہ مسٹر نیول: صفحہ ۱۴۲)

(۱۶) جیمس، جے این، کیپٹن: فوج کے سرگرم عہدے دار اور فرض شناس آفیسر اور ۲۸ ویں دیسی فوج کے کیپٹن تھے۔ گذشتہ شب کی دعوت میں مسٹر ریکٹس، مسٹر جنکسن کے ساتھ بیٹھے شراب پی رہے تھے اور دن کی خبروں پر تبصرے اور غور و فکر میں مصروف نظر آتے تھے۔ ۳۱ر مئی کی صبح کو گھوڑے پر سوار چرچ جا رہے تھے۔ ایک باغی سپاہی کی گولی لگنے سے گھوڑے سے گرے اور روح ان کے قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ کیپٹن جیمس نے ریکٹس کلکٹر و اسسٹنٹ مجسٹریٹ سے ایک موقع پر کہا تھا:

> ''ہم افسران اپنی دیسی فوج کے آدمیوں جو ہماری کمانڈ میں ہیں، ہمیشہ اپنے بچے سمجھتے اور ان سے اسی طرح کا سلوک کرتے ہیں۔''

(کہانی: صفحہ ۳۲)

اور اسی لیے انھیں اعتماد تھا کہ ان کی رجمنٹ بغاوت نہیں کرے گی۔ مسٹر ریکٹس ہی سے ایک گفتگو میں کہا تھا:

> ''میں اپنی بات پر قایم ہوں مجھے اپنی رجمنٹ کے باغی ہونے کا ذرا بھی

خوف نہیں ہے۔اس کے باوجود میں تقریباً پانچ سو یعنی نصف رجمنٹ کے
افسروں کو مطیع رہنا شمار کروں گا۔میرا اعتماد اس امر سے اور قوی ہو جاتا ہے
کہ ان میں ڈیڑھ سو سکھ ہیں۔'' (کہانی: صفحہ ۵۴)

کیا تعجب کہ کیپٹن جیمس کو اسی کی رجمنٹ کے کسی سپاہی نے گولی ماری ہو! اس لیے کہ ماتحت اپنے آفیسر سے محبت اور نفرت دونوں میں انتہا پسند ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے موقع پر عوام، سرکاری ملازمین اور فوج میں جذبۂ حب الوطنی اور ذوق حریت کو کم اور انگریز سے نفرت اور تعصب کا جذبہ زیادہ اُبھارا گیا تھا۔

فریڈم اسٹریگل ان اتر پردیش کی جلد ۵ میں صفحہ ۱۹۶ء، ۲۰۳، ۲۰۴ پر جیمس کا ذکر آیا ہے۔

(۱۷) رابرٹس: شاہ جہان پور میں مقیم برطانوی حکومت کی فوج میں لیفٹنٹ کے عہدے پر فائز تھے۔ (کہانی)

(۱۸) ریکٹس، مورڈنٹ: ان کا تعلق، بنگال سروس سے تھا، جہاں سے یوپی میں سروس کے لیے ان کی خدمات حاصل کر لی گئی تھیں۔ شاہ جہان پور میں مجسٹریٹ اور کلکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔

میرٹھ میں فوج نے بغاوت کی اور دہلی اور یوپی کے اضلاع میں امن کے حالات دگرگوں ہوئے تو وہ گذشتہ تین ماہ سے رخصت پر تھے اور مسٹر بریملے ان کی قایم مقامی کے فرایض انجام دے رہے تھے۔ وہ مئی کے آخری ایام میں رخصت سے لوٹے تھے اور اپنے منصب کی ذمے داریوں کو ہاتھ میں لیا تھا۔

غدر کی کہانی میں ان کے بارے میں اصول سے ہٹ کر بعض خاص معلومات درج کی گئی ہیں: مثلاً یہ کہ

(۱) اس وقت تیس برس کے نوجوان تھے۔ ان کی مدت ملازمت تھوڑی تھی۔ گویا کہ وہ ضلع شاہ جہان پور میں سب سے جونیئر، کم عمر، نا تجربے کار لیکن ضلع کے سب سے اونچے منصب پر فائز تھے۔ ان تصریحات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ

وہ ضلعی حکام سے سب سے قابل، فرض شناس اور ذمے دار آفیسر تھے۔

(۲) ان کی شادی مسٹر ٹایلر کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ جو اسی صدی کے نصف ثانی میں آگرہ کے کمشنر تھے۔

(۳) وہ ایک پست قد، دبلے پتلے، داڑھی مونچھ منڈی ہوئی، معمولی شکل کے مالک تھے۔

(۴) جب امن وامان کی صورت حال بگڑی تو ان کی بیوی بریلی میں تھیں اور کمشنر بریلی الیگزینڈر کی بیوی انھیں مجبور کر کے اپنے ساتھ نینی تال لے گئی تھیں۔

شاہ جہان پور کے کلکٹر اور مجسٹریٹ ہونے کی وجہ سے وہ انتظامیہ اور فوج کے حکام سے صلاح ومشورے میں پیش پیش اور سرگرم رہتے تھے اپنے ماتحت افیسران اور فوج کے حکام کے مشورے سے جو شہر کے گشت کا فیصلہ ہوا تھا، اس میں شریک رہے تھے۔ گشت کا آغاز ان کی کوٹھی سے ہوا اور شہر کے گشت کے بعد آغاز کے مقام ہی پر ختم ہوا تھا۔ گشت میں سرکاری افیسران کے ساتھ، فوجی حکام اور کوتوال وتحصیل دار بھی شامل تھے۔ جنھیں گشت کے خاتمے پر واپس کر دیا تھا اور انتظامیہ اور فوج کے حکام کے ساتھ گشت کے نتایج اور تاثرات پر غور اور مشورہ کرنے، تاثرات کے اظہار کے لیے اور تبادلہ خیالات کے لیے بیٹھ گئے تھے۔ حالات کی طرف سے سب مطمئن تھے لیکن افواہوں نے سب کو متاثر اور مشوش کر دیا تھا۔ اس صلاح ومشورے میں مسٹر جیمس، مسٹر جنکسن، مسٹر سالمن، مسٹر اسمتھ نے حصہ لیا تھا۔ میں یہاں مسٹر ریکٹس اور مسٹر جیمس کی گفتگو کا ایک ٹکڑا نقل کرتا ہوں۔ کیپٹن جیمس نے مسٹر ریکٹس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"جہاں تک میرا نظریہ کام کرتا ہے۔ لوگوں کا طور طریقہ مہذب اور ایسا ہی باعزت تھا، جیسا ہمیشہ رہا ہے۔ مجھے ان میں کوئی بات شک وشبہے کی معلوم نہیں ہوئی جس سے کوئی علامت شر ظاہر ہوتی ہو۔"

مسٹر ریکٹس نے جوابا کہا:

جیمس! جہاں تک ظاہری رویے کا تعلق ہے، میں تم سے متفق الرائے ہوں

لیکن یہ نہ بھولنا کہ ہم دیسیوں کے اطوار کا محض سطحی اندازہ کر سکتے ہیں۔
میں نے آج عزم کر لیا تھا کہ عزت میں کمی یا بے عزتی کی کوئی علامت ہوئی تو معلوم کر لوں گا۔ اور ایسے شخص کو گرفتار کرا کے، حوالات بھیج کر ایک مثال قایم کر دوں گا۔ لیکن مجھے بے حد مسرت ہے کہ ایسا موقع پیش نہیں آیا، ورنہ میں سخت غلطی کا مرتکب ہو جاتا۔ نجی طور پر مجھے اطلاع ملی ہے کہ ملکوں نے جو کچھ اس دن کہا تھا، اس میں بہت کچھ حقیقت ہے۔ حال آں کہ سازش ابھی چند اشخاص تک محدود ہے، جن کے خطرات تحقیق کر کے مجھے بتائے بھی گئے ہیں۔ بہ ہر حال حکومت کے خلاف ایک عام احساس پیدا ہو گیا ہے اور کارتوسوں کے معاملے کو بہت بڑھانے چڑھانے کا ارادہ کر لیا گیا ہے۔'' (کہانی: صفحہ ۲۹)

مسٹر ریکٹس فوج اور انتظامیہ کے عہدے داروں کے علاوہ اپنے عملے کے دیگر لوگوں کے ذریعے سے بھی صحیح صورت حال معلوم کرنے کی ٹوہ میں رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ بھی متاثر ہوئے۔ مسٹر ریکٹس ۳۰ مئی کو ڈائرکٹر باؤلنگ کے گھر مجلس عیش و طرب میں شریک تھے۔ لیکن انھیں نغمہ و سرور سے کوئی دل چسپی نہ ہوئی وہ مسٹر جیکس اور کیپٹن جیمس سے دن کی خبروں پر تبصرہ کرتے اور شراب سے شوق فرماتے رہے۔ جب وہ گھر لوٹ کر آئے تو بہت پریشان تھے۔ وہ خیالات ہی میں کھوئے نہیں رہے، انھوں نے کئی مرتبہ حکم دیا کہ گھوڑی کو زین لگا کر لایا جائے۔ جب انھیں تعمیل حکم کی اطلاع دی گئی تو کاٹھی کھلوا دینے کا حکم دیا۔ ایسا کئی مرتبہ ہوا۔ وہ اپنے کمرے میں ٹہلتے رہے، بوٹ پہنا، شکاری کوٹ پہنا، دونوں جیبوں میں پستول رکھے۔ پھر ٹہلنے لگے، ان پر گھبراہٹ کا عالم طاری تھی۔ خیالات کے ہجوم میں کھوئے تھے، ہوش و احساس کھو گئے تھے۔ رات انتہائی کرب، بے چینی اور گھبراہٹ میں گزری، معلوم ہوتا ہے صبح کو پیش آنے والے واقعات نے ان کے ذہن اور قلب پر اپنی پرچھائیں ڈال دی تھی!

مسٹر ریکٹس کے قتل کا واقعہ مس لیویٹر نے اپنے چشم دید واقعے کے طور پر بیان کیا ہے۔ وہ غدر کی کہانی میں لکھتی ہے:

''ایک وحشت ناک نظارہ میرے سامنے آیا، جس نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ عبادت خانے (چرچ) کے دروازے سے بارہ پندرہ قدم پر مسٹر ریکٹس (کلکٹر) دو ٹکڑوں میں کٹے ہوئے پڑے تھے۔ ان کے قاتل نے شمشیر زنی کا شاہ کار ہاتھ دکھایا تھا۔ تلوار الٹے شانے سے ترچھی نکلتی۔ دھڑ کو کاٹتی، سیدھے ہاتھ کو متوازی طور پر باقی حصہ جسم سے علاحدہ کرتی ہوئی صاف نکل گئی تھی۔ میں خوف زدہ ہو کر بلا ارادہ پیچھے ہٹ گئی۔''

(کہانی: صفحہ ۲۷، ۳۰ و شاہ جہان پور گیزیٹیر، ۱۹۱۰ء: صفحہ ۱۴۱-۱۴۰)

(۱۹) روتھر فورڈ: برطانوی فوج میں لیفٹننٹ کے عہدے پر فائز تھے۔

(کہانی: صفحہ ۶۰)

(۲۰) سالمن، این ایم: سرکاری حکام نے طے کیا تھا کہ حالات کا جایزہ لینے کے لیے ایک روز شہر کا گشت کیا جائے۔ اس گشت کی روداد میں کیپٹن جیمس، مسٹر جنکسن جوائنٹ مجسٹریٹ، مسٹر آرتھر اسمتھ اسسٹنٹ مجسٹریٹ، کوتوال تراب علی اور حکیم امجد علی خاں تحصیل دار شاہ جہان پور کے ساتھ کیپٹن سالمن کا نام بھی آیا ہے۔

(کہانی: صفحہ ۲۹)

سالمن شاہ جہان پور آنے سے پہلے ایک مدت پنجاب میں گزار چکے تھے اور انھوں نے ایک لمبی داڑھی رکھ لی تھی۔ (کہانی: صفحہ ۸۲)

سالمن کی موت کے بارے میں کئی باتیں کہی گئی ہیں؛

۱۔ جب ان کے بنگلے میں آگ لگائی گئی اور وہ اس میں جل کر مر گئے۔

۲۔ ان کے پنکھا قلی کی روایت کے مطابق انھیں گھر پر چرچ کے حادثے کی خبر ملی تو وہ اپنے گھر کی چھت پر دن بھر چھپے رہے۔ رات کی تاریکی میں وہ کہیں بھاگ جانے کی فکر میں تھے کہ انھیں سپاہیوں نے دیکھ لیا اور انھیں قتل کر دیا۔

۳۔ ایک افغان صورت شخص کو توپ گاڑی کے پہیے سے باندھ کر کچھ باغی انھیں دہلی لے گئے۔ یہ افغان صورت شخص مسٹر سالمن تھے۔ پھر ان کا کچھ پتا نہیں چلا۔

۴۔ یہ خیال بھی کیا گیا کہ وہ پوایاں جانے والے قافلے میں تھے لیکن پوایاں اور پھر وہاں محمدی جا کر اس قافلے کا بھی ایک ایک فرد قتل کر دیا گیا تھا۔

(۲۱) کی، مسٹر: ایڈاجوئنٹ لیفٹنٹ کا تذکرہ غدر کی کہانی میں کئی جگہ اور ایک جگہ ان کی مسز کی کا نام آیا ہے۔

پہلا موقع وہ ہے جب خزانے کی حفاظت اور اس کے لیے گارڈ بڑھا دینے کا مسئلہ زیرِ غور تھا۔ کیپٹن جیمس نے یہ باتیں رجمنٹ کے ایڈجوائنٹ لیفٹنٹ کی سے جو میز پر بیٹھے ہوئے تھے، کہیں! اور پھر میجر گھنشیام سے مخاطب ہو کر کہا:

"صوبے دار میجر آپ دیکھ لیں کہ احکام وقت سے جاری ہو گئے؟ میں ایک چھٹی مجسٹریٹ کو بھی لکھوں گا۔" (کہانی: صفحہ ۴۹)

دوسری بار جب مسٹر جیمس، مسٹر جنکسن، مسٹر سالمن اور کلکٹر مسٹر ریکٹس اس موضوع پر گفتگو کر رہے تھے کہ آیا ہمیں اپنے بچاؤ کے لیے کسی مناسب جگہ کو تلاش و طے کر لینے کی ضرورت ہے؟ کیپٹن سالمن نے کلکٹر کو مخاطب کر کے کہا:

"اس کام کے لیے آپ کی اور مسٹر کی کی عمارت سے موزوں اور بہتر کوئی اور مکان نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک مکان مدافعت کے لیے استعمال ہو سکتا ہے۔" (کہانی: صفحہ ۳۲)

تیسری جگہ ۳۰ر مئی کی مجلس عیش و طرب میں مسز کی کی شرکت کا ذکر آیا ہے۔ یقین ہے کہ اس مجلس میں مسٹر کی خود بھی شریک ہوئے ہوں گے۔ (کہانی: صفحہ ۶۰)

(۲۲) کیرو: شاہ جہان پور کے جنوب مغرب میں چند میل کے فاصلے پر ایک مقام روضہ ہے، جہاں شراب اور شکر کی دو بڑی فیکٹریاں مشہور ہیں۔ شراب کے کارخانے کے بانی و مالک مسٹر کیرو (G. P. Carew) تھے۔ ان شراب و شکر کے کارخانوں کو لوٹا اور پھونکا گیا تھا۔ مسٹر کیرو وہاں سے نکل بھاگے تھے۔ لیکن وہ لکھنؤ تک صحیح سلامت نہ پہنچ سکے اور انھیں قتل کر دیا گیا۔ ان کے ساتھ فیکٹری کے ایک شخص مسٹر برانڈ بھی تھے جو کسی طرح بچ بچا کر ترائی کے علاقے میں چلے گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ (غدر کی کہانی: صفحہ ۸۳، شاہ جہان پور گزیٹیر، ۱۹۱۰ء: صفحہ ۱۴۳)

(۲۳) لائیسٹ: فوج میں کیپٹن کے عہدے پر فائز تھے۔ ۳۱ رمئی کے چرچ کے ہنگامے میں یہ بھی مشکلات سے دوچار ہوئے تھے۔ (کہانی: صفحہ ۶۰، ۶۷)

(۲۴) لینی اسپائریس: ۳۰ رمئی کو ڈاکٹر باؤلنگ کی مجلس عیش ونشاط کے ایک شریک۔ (کہانی: صفحہ ۶۰)

(۲۵) لیوٹر: یہ کلکٹر آفس شاہ جہان پور کے ایک کلرک کا نام ہے۔ یہ وہی شخص ہے جسے ''غدر کی کہانی'' کی مرتب مریم کا شوہر بتایا گیا ہے۔ اور دکھایا ہے کہ ۳۱ رمئی ۱۸۵۷ء بہ روز اتوار اپنی بیٹی کے ساتھ گرجا میں داخل ہورہا تھا کہ باغیوں نے اسے قتل کردیا۔ وہ بھاگ کر گھر پہنچی اور ماں کو باپ کے اندوہ ناک قتل کی روداد سنائی۔ انھوں نے اسی وقت اپنا گھر چھوڑ دیا اور دونوں ماں بیٹی اپنے چند دیگر افرادِ خاندان کے ساتھ لالہ رام جی مل کے گھر میں پناہ گزین ہوگئے۔

ان ماں بیٹی اور شوہر کا نام فریڈم اسٹریگل اِن اتر پردیش کے مجلدات میں نہیں ملا۔ البتہ شاہ جہان پور گزیٹیر (الہ آباد ۱۹۱۰ء) کے مؤلف ایچ آر نیول نے اپنے مقالے میں لیویٹر کے قتل اور بیٹی کے اغوا کا ذکر کیا ہے۔ مقالہ نگار لکھتے ہیں:

"Mr. Laveter ❶, A Clerk in the collector's office was actually killed in the church and the fate of his daughter in unknown." (pp. 141-142)

مولوی مطیع اللہ خاں نے اپنی ''تاریخ مطیع'' نے اسی حوالے سے لیویٹر اور اس کی گم شدہ بیٹی کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

مسٹر لیویٹر جو کلکٹر آفس میں کلرک تھے، گرجا کے اندر مارے گئے اور ان کی بیٹی ایسی غائب کی گئی کہ پھر اس کا حال ہی نہ معلوم ہوا۔''

اب اس سے یہ شبہ دور ہوگیا کہ یہ ناول کے فرضی کردار ہیں۔ اور باغیوں کو محض

---

❶ اس نام کے دو املا میرے سامنے آئے Laveter اور Lamaister میں لیویٹر کو پہلے املا سے قریب پا کر اکثر استعمال کیا۔ اگر کوئی محترم قاری ''لمیسٹر'' کو صحیح یا مقابلتاً زیادہ صحیح سمجھتے ہوں تو وہی صحیح!

بدنام کرنے کے لیے ایک فرضی وجود کو تراشا گیا ہے۔

(۲۶) مریم: مسز لیویٹر کا نام کتب تاریخ میں نہیں، صرف غدر کی کہانی میں ہے، لیکن جب شوہر اور بیٹی کا وجود ثابت ہو گیا تو درمیان کی کڑی تو خود بہ خود ثابت ہو گئی۔ مسز لیویٹر کو غدر کی کہانی میں ایک ہندوستانی گھرانے کی خاتون کہا گیا ہے۔ یہ صرف اس لیے کہ اس کے باپ نے ہندوستانی قومیت اختیار کر لی تھی۔ غدر کی کہانی میں ''لیویٹر کے گھر والے'' کے عنوان سے ایک باب ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مریم کے باپ فرانس کے صوبے چمپین کی شاہی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ انقلاب ۱۷۸۹ء کے بعد فرانس کی فضا کو اپنے لیے ساز گار نہ پا کر ہندوستان چلے آئے تھے۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے ریمنڈ کی ماتحتی میں ایک عرصے تک نظام کی ملازمت کی تھی۔ اس کے بعد وہ بھوپال، گوالیار اور جے پور کی ریاستوں میں ملازمت کی۔ ان کے بارے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جب وہ ریاست جے پور کے ملازم تھے تو مادھو پور سے جنگ میں اس کے راجہ سے دست بہ دست مقابلے میں اس کی تلوار چھین لی تھی۔ کچھ عرصہ نواب احمد علی خان کے عہد میں رأم پور کے وزیر اعظم بھی رہے۔ ان کی زندگی کے حالات ایک ڈرامائی زندگی کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔

(۲۷) مس لیویٹر: لیویٹر کی بیٹی اس زمانے میں فتح گڑھ کے مشنری اسکول میں زیر تعلیم تھی۔ ۱۰ رمئی کو اسے شاہ جہان پور بلا لیا گیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر چودہ برس تھی۔ غدر کی کہانی میں دونوں ماں بیٹی کے حسن و جمال کا فتنہ کھینچا گیا ہے۔ منگل خاں [1] نامی ایک کینہ فطرت اور آوارہ مزاج نے دونوں ماں بیٹی کو لالہ رام جی مل کر گھر سے نکالا تھا اور اپنے گھر لے گیا تھا۔ چوں کہ اسی مقام پر غدر کی کہانی کے اوراق ختم ہو جاتے ہیں۔ اس سے انجام کا پتا نہیں چلتا۔

(۲۸) میک کلم، پادری: ''سینٹ میری چرچ''، شاہ جہان پور میں پادری تھے۔ ۳۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو قتل کر دیے گئے۔ (کہانی: صفحہ ۶۰ و ۸۰)

---

[1] منگل خان پر ایک تعارفی نوٹ اسی سلسلے کے دوسرے مضمون میں نمبر ۴۵ پر آچکا ہے۔ قارئین کرام کو اس شخص کی سیرت اور کارنامے پر ضرور نظر ڈال لینی چاہیے۔

J. Maccullum (پادری) چرچ سے نکل بھاگے تھے۔ ایک میل دور دیہاتیوں نے انھیں مارڈالا۔

(شاہ جہان پور گزیٹیر، ۱۹۱۰ء: صفحہ ۱۴۱ اوفریڈم اسٹریگل.....: جلد ۵، صفحہ ۵۴۶ وجلد ۶ صفحہ ۳۵۶)

نوٹ:

یقین رکھنا چاہیے کہ شاہ جہان پور کی انتظامیہ اور وہاں مقیم فوج اور ہسپتال کے عملے میں صرف یہی ۲۴ انگریز نہیں ہوسکتے، جن کا ذکر ''غدر کی کہانی'' میں آیا ہے۔ اگر ان کی تعداد سیکڑوں میں ہو تو تعجب نہ کرنا چاہیے۔

(ا۔س۔ش)

حصہ چہارم

۱۸۵۷ء

شاہ جہان پور کا نظامِ حکومت

اور

عمالِ حکومت

ترتیب و تدوین

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

شاہ جہان پور کا نظامِ حکومت

اور عمالِ حکومت

حصۂ چہارم

شاہ جہان پور کے پہلے ناظم:

نواب قادر علی خان

(۱)

حافظ مطیع اللہ خاں خلیل شاہ جہان پوری

والد کا نام بہادر خاں تھا جن کی تاریخ ولادت ''بختور'' ہونے کی وجہ سے بختور بہادر خاں مشہور تھے۔ بہادر خاں کے والد ظفر خان اپنے والد سعد اللہ خان خلف نواب عبداللہ خان کی حیات میں ۱۲۲۴ھ میں فوت ہو گئے تھے دادا نے اپنی زمین داری میں سے بہ قدر چھ آنہ اسد اللہ خان اپنے دوسرے بیٹے کو اور بہ قدر دس آنہ بہادر خان کو دیا تھا۔ بہادر خان نے ۱۲۶۳ھ میں وفات پائی۔ تاریخ یہ ہے:

گذاشت دارِ فنا ثانی بہادر خان
بخلد رفت و شدہ دفن روضۂ اجداد
ولادتش کہ ز تاریخ ''بختور'' پیداست
چہ لغز سال وفاتش کہ ''بختور جان داد''

بہادر خان کی استعداد فارسی میں اچھی تھی خط نستعلیق بھی خوب لکھتے تھے اور گھوڑے کے شاہ سوار اور فنون سپاہ گری کے ماہر، خوش اندام وموزوں قامت تھے۔ صنعت وحرفت کا بھی شوق تھا مگر تند خو و تیز مزاج تھے۔ اور شاہ نصیر الدین عرف احمد میاں نبیرہ شاہ یٰسین قلندر بلگرامی کے مرید تھے بعد وفات مقبرہ بہادر خان میں بہادر خان اول کے سیدھے ہاتھ پر دفن ہوئے۔

بہادر خان کی شادی صبیہ نواب امین الدولہ نبیرہ نواب محمد خان بنگش فرخ آبادی سے ہوئی تھی۔ ان کے دو بیٹے تھے بڑے شاہ جہان خان چھوٹے قادر علی خان۔ شاہ جہان خان نے بہ حیات والد نوجوان قضا کی۔ ان کے بیٹے عبداللہ خان تھے جو ۱۹۱۹ء

میں فوت ہوئے نہایت مہذب و متین اور خاندانی روایات کے حامل تھے۔

قادر علی خان بعد وفات اپنے والد کے قابض جائیداد ہوئے جو بیع و نیلام ہو جانے کی وجہ سے گھٹ کر چند مواضعات میں محدود ہو گئی تھی۔ جب غدر ۱۸۵۷ء ہوا تو یہ شاہ جہان پور میں موجود تھے۔ باغی پلٹن کے صوبہ دار نے جو اس وقت حاکم مطلق بنا ہوا تھا ان کو حاکم شہر بنایا چند روز بعد نواب غلام قادر خان بریلی جا کر نواب خان بہادر خان سے سند نظامت لائے تب قادر علی خان خاموش ہو کر بیٹھ رہے اور نواب غلام قادر خان کی حکومت قایم ہوئی۔ جب انگریزی سپاہ کی آمد آمد مشہور ہوئی تب وہ اپنے موضع سسنئی کو معہ متعلقین چلے گئے۔

جب فوج انگریزی کانٹ میں خیمہ زن ہوئی تب وہ سسنئی چھوڑ کر راہی اودھ ہوئے۔ تھوڑے عرصے بعد متعلقین کو شاہ جہان پور بھیج دیا اور خود جریدہ اِدھر اُدھر پھرتے رہے اور بالآخر مجبور ہو کر سیتا پور میں کمانڈنگ افسر کے پاس حاضر ہو گئے۔ اس نے تمام حالات سن کر اودھ کے واسطے ان کو معافی نامہ لکھ دیا۔ یہ اپنی صاف دلی سے اس کو کامل صفائی سمجھ کر اپنے متعلقین سے ملنے کے لیے شاہ جہان پور آئے اور محلّہ گاڑی پورہ میں قیام کیا کوتوال شہر نے مجسٹریٹ ضلع کو اطلاع دی عدالت میں طلب ہو کر پہلے ہتھیار داخل کرنے کا حکم ہوا اور دوسرے دن وہ حکم منسوخ ہو کر حوالات بھیجے گئے اور تحقیقات الزام ہو کر سپرد دشن ہوئے وہاں سے حبس دوام بہ عبور دریائے شور و ضبطی جائیداد کی سزا ہوئی، مواضعات سسنئی، پنتھی، پنچولی، کیلھا، سربانگ پورا، کانکر اور ساری املاک شہر ضبط کر لی گئی اور وہ پورٹ بلیر بھیج دیے گئے۔

یورپین گورنمنٹ نے بہ نظر ترحم پنتھی، پنچولی، کیلھا، کانکر، بانگ پورا اُن کے بیٹوں کو واپس کر دیا۔ باقی جائیداد خیر خواہوں کو انعام میں دے دی۔ مکان واقع قلعہ کھود ڈالا گیا ۲۷ برس پورٹ بلیر میں رہے کمشنر پورٹ بلیر نے کئی مرتبہ ان کی رہائی کے لیے سفارش کی مگر منظور نہیں ہوئی ۱۸۷۷ء میں دربار قیصرِ ہند کے سلسلے میں ان کی رہائی اس شرط پر منظور ہوئی کہ ہندوستان نہ جائیں جس کو انھوں نے لاحاصل سمجھ کر منظور نہیں کیا اس کے کئی سال بعد بیگم صاحب کی طرف سے لوکل گورنمنٹ میں

میموریل بھیجا گیا سر الفرڈ لائل اس وقت لیفٹننٹ گورنر تھے جن کو بعد غدر شاہ جہان پور میں جوائنٹ مجسٹریٹ رہنے کی وجہ سے یہاں کے حالات سے ذاتی واقفیت تھی انھوں نے مسٹر جی ایس پورٹر مجسٹریٹ ضلع سے رپورٹ مانگی انھوں نے لکھ دیا کہ قادر علی خان اب بہت بوڑھا ہوگیا ہے اس کے شاہ جہان پور آنے میں کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ جو منظور ہوگئی اور مارچ ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۵ء میں وہ شاہ جہان پور واپس آئے کچھ دن مقبرہ گوہر پورہ اور کچھ دن قلعے پر قیام رہا بعدہٗ عارضۂ استسقا میں مبتلا ہوکر ۶۷ سال کی عمر میں ۱۹ر جمادی الاخریٰ ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۵ر مارچ ۱۸۸۷ء کو راہی دار البقا ہوئے اور احاطہ مزار شاہ اسحٰق صاحبؒ میں پائین مزار میاں سعادت علی صاحب اپنے مرشد کے دفن ہوئے۔ ع

خاک پائے قدم پیر شدی

مادۂ تاریخ وفات یہی ہے۔ نواب صاحب کے کئی بیٹے ہیں جن میں سے ضمیر حسن خان تحصیل دار ہوئے اب پنشن پاتے ہیں۔ نہایت خلیق وملنسار فی زماننا۔

(تاریخ مطیع: صفحہ ۲۶-۴۲۵)

(۲)

مولوی محمد صبیح الدین میاں

اپنے والد بختور خاں کے بعد جائیداد کے مالک ہوئے۔ غدر ۱۸۵۷ء میں باغی پلٹن نے ان کو ناظم شہر بنایا تھا۔ جب سند نظامت خان بہادر خان نے غلام قادر خان کو لکھ دی تو یہ نظامت سے علاحدہ ہوگئے اور اس آشوب میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا مگر اہل خاندان ہونے کے سبب ان پر بھی الزام بغاوت تھا۔ یہ سیتاپور میں کمانڈنگ آفیسر کے پاس حاضر ہوگئے اس نے ان کو اودھ کے واسطے معافی نامہ لکھ دیا جس کو یہ غلطی سے پورا معافی نامہ سمجھ کر شاہ جہان پور چلے آئے اور گرفتار کر کے جزیرہ انڈمان کو جلا وطن کردیے گئے۔ جائیداد جو باقی رہ گئی تھی وہ ضبط ہوگئی۔ سر الفرڈ لائل کے عہد لیفٹننٹ گورنری میں مسٹر جی ایس پورٹر مجسٹریٹ ضلع کی سفارش پر رہا ہوکر ۱۸۸۵ء میں وطن

واپس آئے کچھ دن مقبرہ گوہر پورہ میں قیام کیا تھا پھر گھر کی محبت کی وجہ سے قلعہ کے ڈھیر پر ایک چھپر ڈال کر چندروزہ زندگی بسر کردی۔

بہ تاریخ ۱۵/ مارچ ۱۸۸۷ء کو مرض استسقا میں وفات پائی اور احاطہ مزار شاہ اسحٰق صاحب میں پائیں مزار سعادت علی میاں اپنے مرشد کے دفن ہوئے۔ گورنمنٹ نے جائیداد منضبط میں سے کچھ جائیداد بہ نظر ترحم ان کی اولاد کے واسطے ان کے زمانہ جلاوطنی میں واگذاشت کردی تھی۔

قطعہ تاریخ وفات نواب قادر علی خان

امنا برب العالمین ان الابرار لفی نعیم. ۱۳۰۴ھ

دم مزن قادر علی خاں نواب — پیشتر صاحب شمشیر شدی
بعد آں قدر ز بس ہندی غدر — قیدی خانہ زنجیر شدی
ناتواں کرد چناں حبس دوام — قبل از وقت مگر پیر شدی
مہرباں گشت گورنر آخر — باز از او ز تقدیر شدی
در وطن آمدہ مثل یوسف — از عزیزان تو بغل گیر شدی
ہم بریں حال گزشتہ دو سال — ناگہاں ریختہ و دل گیر شدی
نوزدہ ماہ . جمادی الاخریٰ — در جہاں صاحب توقیر شدی

یافتی گنج سعادت ز علی
خاک پاے قدمِ پیر شدی

۱۳۰۴ھ

ان کے بیٹے نواب ضمیر حسین خاں تحصیل دار پنشنر بہ قیدِ حیات ہیں، جو نہایت خلیق، ملن سار اور اپنے آباء تہذیب واخلاق کی عمدہ یادگار ہیں۔ مقبرہ نواب احمد علی خان میں نشست ہے اسی کے متصل سکونتی مکانات ہیں۔ صاحب اولاد ہیں۔

(تاریخ صبیح: صفحہ ۱۳۱-۳۲)

(۳)

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے لکھا ہے کہ نواب صاحب شعر و شاعری کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ جزیرہ انڈمان میں جب مسلمانوں نے مسجد تعمیر کی تو اس کی تاریخ نواب قادر علی خان نے کہی، جو درج ذیل ہے:

زنورِ بیتِ خدا انڈماں معرا بود
شنوکہ راست می گویم کدام موجد شد
بہ صوبہ دار بہادر ملقب و در نام
مُسمّیٰ سبط خلیل خدائے واحد شد
بہ فکر سال چورفتم زغیب قادر گفت
ہزار شکر کہ ایں جا بنائے مسجد شد
۱۲۹۷ھ

(جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ واقعات و شخصیات: صفحہ ۴۵۵)

شاہ جہان پور کے دوسرے ناظم:

نواب غلام قادر خاں

(۱)

حافظ مطیع اللہ خاں خلیل شاہ جہان پوری

غدر ۱۸۵۷ء سے کئی سال پہلے اپنے والد کے جانشین ہوئے بہ حیثیت افسر خاندان خطاب نواب موافق ضابطے کے حاصل ہوا۔ نہایت سلیم الطبع، برد بار، مخیرّ، پابند مذہب تھے۔ سعادت علی میاں نبیرہ شاہ غلام علی صاحب بانسوی کے مرید تھے اور پیر پرستی میں مثل اپنے باپ و چچا کے نہایت غلو رکھتے تھے جب غدر ہوا شاہ جہان پور میں نہ تھے اپنے مرشد کی زیارت کے لیے بانسہ گئے ہوئے تھے خبر پا کر شاہ جہان پور آئے اور فوراً بریلی جا کر سندِ نظامت لائے اور انتظام شروع کیا جس کا تذکرہ حالات غدر میں کیا جاوے گا۔

جب برٹش فوج نے فرخ آباد پر قبضہ کر کے شاہ جہان پور آنے کا رخ کیا اور نظام علی خان کمانڈر و بخشی رام کایستھ بخشی فوج اس کے روکنے کے واسطے بھیجے گئے تھے۔ بچھوریا گھاٹ پر مارے گئے اور سپاہی نوچے کھوچے بھاگ کر شاہ جہان پور آئے نواب صاحب انگریزی فوج کے قریب آنے کی خبر سن کر اپنے دفتر کو جلا کر معہ اہل و عیال و ظہور احمد میاں و رؤف احمد میاں رفقا اور چند سپاہیوں کے اودھ کی طرف چل دیے اور اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے گونڈا پہنچے قریب ندی ساردا پہنچ کر شمون خان مدار المہام بیگم صاحبہ لکھنؤ نے ان کا سب مال و اسباب ضبط کر لیا جو کچھ ضبطی سے بچا تھا، وہ نواب صاحب نے احمد اللہ خان و حامد علی خان برادر زادگان و غلام محمد خان اپنے فرزند کو دے کر معہ مستورات کے شاہ جہان پور روانہ کیا اور خود پہاڑ کی طرف چلے گئے اور وہاں کسی مقام پر عالم مسافرت و تنہائی میں انتقال کیا اور اسی جگہ دفن ہوئے۔

برمزارِ ما غریباں نے چراغے، نے گلے
نے پر پروانہ آمد، نے صدائے بلبلے

کل جائیداد گورنمنٹ نے ضبط کر لی اور قلعے کو کھود کر خاک کے برابر کر دیا گرد و

نواح قلعے کے کئی محلے بھی ہمسائیگی کی وجہ سے زد میں آگئے۔ احمد اللہ خان و حامد علی خان کل جائیداد میں برابر کے حصے دار تھے اور نواب صاحب کی تقصیرات نظامت وغدر سے محض بے تعلق تھے مگر بدقسمتی سے ان کی جائیداد بھی، بلاوجہ ضبطی کی لپیٹ میں آگئی۔ نواب صاحب بڑے علاقے کے مالک تھے مواضعات بادشاہ نگر، جلال پور، دلاور پور، دیوکلی، اونٹھا، شجاعت پور، میاں پور، مونڈ گنواں، اکرّا، منڈہا، عزیز گنج، پرولہ، بکیان، ستواپور، بھید پور، رم پورہ جموہی، برئی، ٹکری وغیرہ اور متعدد چکات و باغات اور وسیع علاقہ بتیا وغیرہ جس میں بہت مواضعات شامل تھے اور شہر کی گراں قدر املاک معہ مقبرہ نواب بہادر خان وعزیز خان ضبط ہوکر خیر خواہوں کو دے دی گئی۔ خطاب نواب جو افسر خاندان کو موروثی طور سے حاصل تھا، واپس لے لیا گیا۔ اور اعزاز خاندانی کا عملی طور سے خاتمہ ہوگیا۔ (تاریخ مطیع: صفحہ: ۲۳-۴۱۲)

(۲)

مولوی محمد صبیح الدین میاں

نواب احمد خاں کے یہ منجھلے بیٹے تھے ان کے بڑے بھائی کا انتقال والد کی حیات میں ہوگیا تھا والد کی وفات کے بعد بہ حیثیت افسر خاندان کے غلام قادر خاں کو نواب کا خطاب ملا تھا۔ یہ سلیم الطبع، متحمل مزاج، مخیّر اور پابند صوم صلوٰۃ تھے۔ سعادت علی میاں نبیرہ شاہ غلام علی صاحب بانسوی کے مرید تھے۔ پیر پرستی کے طفیل میں سارا خاندان آشوب غدر ۱۸۵۷ء کی نذر ہوگیا۔ ایام غدر میں انگریزی فوج کے باغی ہوجانے سے ملک کا نظام حکومت بگڑ گیا تھا۔ مثل مشہور ہے کہ بگڑے رئیس کو نوابی اور بادشاہی کے خواب نظر آتے ہیں۔ اس عالم آشوب ہنگامہ میں بجائے اس کے کہ دور بینی اور ہوش مندی سے کام لیتے۔ شاہ جہان پور کی نوابی کا اعلان کردیا میں نے ثقات سے سنا ہے کہ شاہ جہان پور میں جب فوج نے بلوہ کرکے اپنے افسروں کو قتل کردیا تو باقی پلٹن نے قلعہ جاکر نواب قادر علی خاں کو ناظم شہر بنایا تھا۔ نواب صاحب بانسہ اپنے پیرزادگان کے ہاں گئے ہوئے تھے واپسی پر راستہ میں ان کو اس افراتفری کی اطلاع ملی رؤف احمد میاں وظہور احمد میاں پیرزادگان کے مشورہ سے بریلی جاکر

شاہ جہان پور کی نظامت کا پروانہ خان بہادر بریلوی (جنھوں نے اپنے آپ کو نواب کٹھیر ہونے کا اعلان کر دیا تھا) سے حاصل کر کے واپس آئے۔ نواب قادر علی خاں یہ سن کر خاموش ہو گئے اور انھوں نے نظامت پر کوئی جھگڑا نہیں کیا۔ نواب صاحب کی فوج کا انگریزی سپاہ سے موضع بچپوریا پر مقابلہ ہوا۔ ان کی فوج کے کمانڈر نظام علی خاں تھے (جو شہباز خاں بانی شہباز نگر کی نسل سے تھے اور سرکار کمپنی میں تحصیل دار ہی کے عہدہ پر مقرر تھے) مقابلہ ہوتے ہی نوابی فوج نے ضیغہ زار فرار گردانا اور نظام علی خاں کمانڈر فوج اور بخشی رام کالیتہ معہ چند ہمراہیوں کے مردانہ وار میدان کارزار میں کام آئے۔ شکست کی خبر سنتے ہی نواب صاحب نے نہایت ہوشیاری اور دور بینی سے دفتر کو نذر آتش کر دیا اور خود معہ اہل و عیال و پیرزادگان وغیرہ کے اودھ کی طرف چلے گئے۔ گونڈہ کے مقام پر شموخاں مدار المہام بیگم صاحبہ لکھنؤ نے دریائے سارو پر ان کا مال و اسباب ضبط کر لیا جو کچھ ضبطی سے بچ گیا تھا اس کو غلام محمد خاں اپنے صاحب زادے اور احمد اللہ خاں و حامد علی خاں برادر زادگان کو دے کر معہ مستورات کے شاہ جہان پور روانہ کر دیا اور آپ بٹول پہاڑ کی طرف چلے گئے اور وہیں عالم غربت و بیکسی میں وفات پائی۔ گورنمنٹ برطانیہ نے شاہ جہان پور پر قبضہ کر کے نواب صاحب کے کل علاقہ کو معہ قلعہ، مقبرہ نواب بہادر خاں و نواب عزیز خاں کے ضبط کر کے قلعہ کو بیخ و بن سے کھود کر میدان کر دیا اور جائیداد و املاک خیر خواہان سرکار کو انعام میں دے دیں قلعہ کے ملحقہ محلے میں عتاب میں آئے۔ احمد اللہ خاں، حامد علی خاں برادر زادگان نواب صاحب کا نصف جائیداد بھی ضبط کر لیا گیا۔ حالاں کہ اُن کا بغاوت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ خطاب نواب: جو اس خاندان کا حق موروثی تسلیم کیا گیا تھا وہ بھی واپس لے لیا گیا۔ اور اس معزز و مقتدر خاندان کے اعزاز و امارات کا عملی طور سے ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔ اولاد موجود ہے جو نان شبینہ کو محتاج ہے۔ یہ نتیجہ تھا اس کوتاہ اندیشی اور بد عقلوں کی صحبت کا۔ اگر نواب مرحوم سنجیدگی اور عقل مندی سے کام لیتے تو اس خاندان کے عروج کا اتفاق سے ایک نادر موقعہ ہاتھ آ گیا تھا جس کو ضایع کر کے اپنے گھر کے ساتھ شہر کو بھی تباہ اور بدنام کرا دیا۔ (تاریخ صبیح: ص ۱۳۰-۱۲۹)

جوائنٹ گورنر یا نایب ناظم شاہ جہان پور:

(۱)

نواب غلام حسین خان حسین

(۱)

محمد صبیح الدین

بانی شاہ جہان پور اور عمدۃ الملک نواب بہادر خان چغتا کے پوتے اور نواب شیر داد خان کے لخت جگر تھے۔ ۱۲۰۶ھ میں ان کی ولادت ہوئی۔ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے بڑے ناز ونعم سے پلے اور اپنے ہی شہر میں تعلیم پائی۔ فارسی میں استعداد فاضلانہ تھی۔ حافظہ اور ذہن بلا کا تھا۔ قدرت نے آپ کو مادر زاد شاعر پیدا کیا تھا۔ آپ کے کلام میں تشبیہات لطیف اور غریب استعارہ وتلمیحات اس خوبی سے پائے جاتے ہیں کہ جس کو دیکھ کر طبیعت وجد میں آجاتی ہے۔ طبقہ شعرا میں آپ اپنے زمانے میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ ناسخ وغالب نے آپ کی شاعرانہ قابلیت شیریں زبانی، پُر گوئی نکتہ رسی اور سخن سنجی کی داد دی ہے۔ یہ دونوں استاد فن نواب صاحب کی دقتِ نظر اور برجستہ گوئی کے قایل اور مداح تھے آپ کا تخلص حسین تھا مگر یہ معلوم نہ ہوا کہ تلمذ کس سے تھا۔ چوں کہ آپ کے زمانے میں امارت وثروت کی دلچسپیوں کے جملہ سامان قلعے میں موجود تھے علما وفضلا اہل ہنر شعرا کی آمد ورفت سے قلعہ علمی دلچسپیوں کا گہوارہ ہو رہا تھا شعر وسخن کا برابر چرچا رہتا تھا۔ مشاعروں میں دور دراز کے شعرا شریک ہوتے تھے ایک موزوں اور چلبلی طبیعت والے کے لیے یہ قدرتی اسباب کیا کم تھے۔ حسین کو شاعری سے فطرتاً مناسبت تھی ان کا میلان خاطر بھی شاعری کی طرف ہو گیا باکمال شعرا کی روز وشب کی صحبت اور طبیعت کی موزونی اور علمی استعداد اور ہر وقت شعر وسخن کے چرچوں سے شعر موزوں کرنے لگے اور رفتہ رفتہ مشق سخن سے ایک باکمال شاعر ہو گئے۔ نواب احمد خان کہتے ہیں کہ حسین کو بچپن

سے شاعری کا شوق تھا اور طبعی مناسبت سے وہ ابتدا ہی سے بے تکلف اشعار موزوں کیا کرتے تھے.........

شاعری سے نواب صاحب کو فطرتاً مناسبت تھی۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے مگر آپ کی شاعری کا اصلی جولان گاہ مرزا غالب کی طرح میدان فارس تھا۔ کلام فارسی دیکھنے سے بلند خیالی، معنی آفرینی، زور طبیعت، جدت طرازی کا پتا چلتا ہے۔ وہ خود بھی اپنے آپ کو فارسی کا شاعر سمجھتے تھے، مگر باوجود اس پُرگوئی اور دلچسپی کے کبھی اپنا دیوان مرتب کرنے کی طرف خیال نہیں کیا۔ شاگرد اور احباب کو جس قدر ان کا کلام ہاتھ آ گیا۔ انھوں نے اپنے بیاضوں میں لکھ لیا۔ میرے کارندہ منشی احسان خان نے ایک بیاض جس میں نواب صاحب کی فارسی کی غزلیں تھیں، دیا تھا۔ مگر مجھ کو اب باوجود تلاش کے نہیں ملی خدا معلوم کہ وہ کیا ہوگئی جس کا مجھ کو سخت افسوس ہے۔ نواب نیاز الدین خان نیاز نے مجھ کو آپ کی اردو غزلیات کی ایک کاپی دکھلائی جس میں تقریباً ڈھائی سو غزلیں ہیں، مگر فارسی کا اس میں ایک شعر بھی نہیں ہے تایب کہتے ہیں کہ غدر سے پہلے نواب صاحب کے تین دیوان فارسی کے اور تین دیوان اردو کے جمع ہو گئے تھے مگر وہ طبع نہ ہو سکے میرے اصرار پر اردو کا ایک دیوان بعد غدر جمع کیا تھا مگر وہ بھی بلا طبع رہ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کے دو نسخے دیوان کے نواب رام پور کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔

نواب صاحب چوں کہ فطرتاً غیور اور ایک شجاع، بہادر، عالی خاندان اور معزز گھرانے سے تھے۔ عالی ہمتی، شریفانہ غیرت وحمیت، جواں مردی، مستقل مزاجی میں اپنے اجداد کے بہترین یادگار تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے عالم آشوب ہنگامے میں ان کو بھی باغی پلٹن نے نایب ناظم بنا دیا تھا جب ہنگامۂ غدر فرو ہو گیا اور انگریزی حکومت پھر قایم ہوئی تو باغیوں کی فہرست میں ان کا نام بھی درج تھا جب دار و گیر شروع ہوئی تو یہ اور باغیوں کے ساتھ گرفتار بلا ہوئے۔ لوگوں کو اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں نواب صاحب گھبرا کر دوسروں کو بھی نہ مبتلائے عذاب کریں۔ اس لیے احباب ان سے حوالات میں ملنے گئے تاکہ ان کا منشا معلوم کریں۔ احباب نے آپ کے خیالات کی

ٹٹول شروع کی، یہ ان کا منشاے دلی سمجھ گئے فوراً دو شعر موزوں کر کے سنائے:

برس رہی ہے مرے دل پہ بے کسی دن رات
شکستہ حال ہوں اُجڑا ہوا دیار ہوں میں!
میں وہ نہیں ہوں کہ یاروں کا بار خاطر ہوں
شکستہ دست ہوں اپنے گلے کا ہار ہوں میں!

انگریزی تسلط کے بعد مسٹر منی صاحب شاہ جہان پور کے مجسٹریٹ ضلع مقرر ہوئے یہ غدر سے پہلے یہاں جائنٹ مجسٹریٹ بھی رہ چکے تھے۔ جب نواب صاحب کا مقدمہ پیش ہوا تو منی صاحب نے بہ نظر ترحم ان کی پیرانہ سالی پر رحم کر کے ان کی رہائی کا حکم دے دیا اور حکم سناتے وقت کہا کہ تحقیقات سے ثابت ہے کہ عہدہ نایب ناظم پر چند روزہ آپ کا تقرر رہا تھا مگر چوں کہ آپ بہت بوڑھے ہیں اور بصارت میں بھی نقصان ہو چکا ہے، لہٰذا آپ کی جان بخشی کر کے رہا کیا جاتا ہے۔ آپ نے کہا شاعر ہوں حکم سن کر ایک شعر ذہن میں آ گیا ہے، اگر اجازت ہو تو عرض کر دوں منی صاحب نے کہا ضرور سنائیے آپ نے شعر پڑھا:

جنبش لب بھی ہوئی جنبش ابرو ہو کر
کام عیسیٰ کا کیا تو نے ہلاکو ہو کر

کلکٹر صاحب شعر سن کر بہت خوش ہوئے اور مسکرا کر کہا جائیے ....

آخری زمانۂ حیات میں حسینؔ کو مصایب و آلام نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا جائیداد جو زندگی کا سہارا تھی وہ مہاجنوں کے پاس پہنچ گئی تھی، آتش و ناسخ و گویا جوان کے یاران طریقت اور رفیقِ دمساز تھے وہ ایک ایک کر کے بزم سخن کو خالی کر گئے تھے اور مستزاد برآں ان کی بصارت میں بھی بہت کمی آ گئی تھی یہ سخت پریشان و مضطر رہتے تھے۔ ....

نواب صاحب کو پیرانہ سالی، افلاس و تنگ دستی نے بہت مجبور کر دیا تھا اور گوناگوں افکار و آلام میں گھرے ہوئے تھے مگر شریفانہ غیرت وحمیت میں کمی نہیں آئی تھی۔ وہی آن بان باقی تھی۔ خاندانی غیرت و استقلال کا خون ویسے ہی ان کی غیور

رگوں میں موجزن تھا۔ مصایب و پریشانیوں سے مطلق شکستہ دل نہیں ہوئے۔.........

اولوالعزمی، فراخ حوصلگی، سیر چشمی کی روح مرتے دم تک، ان کے دم سے لگی رہی۔ اس زمانۂ افلاس وتنگ دستی میں بھی جب کچھ ہاتھ آجاتا تھا تو حاجت مندوں کی امداد سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ آپ کا دسترخوان وسیع تھا۔ وقت پر جو موجود ہوتا اس کو بلا کھانا کھلائے نہیں جانے دیتے تھے۔ چار کہار، دو خدمت گار، دو باورچی آخر عمر تک نوکر رہے شہر کے شریف ورئیس آپ کی عزت وتکریم کرتے اور عیدین کو حسب دستور قدیم سلام کو حاضر ہوتے۔........

غدر کے بعد کا جو کلام ہے اس میں یاس وحسرت اندوہ وغم کی جھلک نمایاں ہے نواب صاحب کی شاعری میں ایک خصوصیت خاص اور وہ یہ کہ انھوں نے شاعری کو ذریعۂ کسب معاش نہیں بنایا۔ کوئی مدحیہ قصیدہ، قطعہ کسی امیر یا رئیس کی شان میں نہیں لکھا آپ کی شاعری کی دور دور شہرت تھی۔ والیان ملک آپ کی شرافت اور عالی خاندانی سے واقف تھے اور ان سے دوستانہ تعلقات اور مراسم تھے مگر آپ نے خود داری اور وفا کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ میں نے آپ کے سارے کلام میں جہاں تک کہ مجھ کو دستیاب ہوا ایک شعر یا ایک مصرعہ بھی ایسا نہیں پایا جو کسی رئیس کی تعریف میں ہو۔ آخری زمانے میں ان کا نہایت حسرت انگیز اور تنگ دستی کا تھا۔ بڑھاپے نے مضمحل اور بیکار کر دیا تھا۔ مگر مزاج میں وہی شانِ استغنا تھی۔ اگر نواب اودھ، نواب رام پور اور شاہ دکن سے امداد کی استدعا کرتے تو چنداں معیوب بھی نہیں تھا، مگر اس سے بھی اپنے دامن کو بچالیا۔ مجھ کو آپ کا یہ مطلع بار بار یاد ہوتا ہے:

بگوش کبر من افسونِ فقر کارنہ کرد
مرا بخاک نشاند و خاکسار نہ کرد

واقعی اس کو آپ نے اپنی طرزِ زندگی سے عملی طور پر ثابت بھی کر دیا تھا۔

نواب غلام حسین خان بہ خلاف اکثر باکمال شعرا کے نہایت منصف مزاج تھے اہلِ کمال کی قدر کرتے اور ان کے کلام کی فراخ دلی سے داد دیتے آپ کو میر و مصحفی کی روش پسند تھی۔

۱۲۸۱ھ (۶۵-۱۸۶۴ء) میں نواب صاحب نے داعی اجل کو لبیک کہا اور موضع مصری پور کے آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے۔ شاگردوں نے رحلت کی تاریخیں لکھیں۔ من جملہ ان کے صرف حضرت تایب کی ایک تاریخ لکھتا ہوں:

قطعہ تاریخ وفات

عیش و سرور سے مجھے تائب فراغ ہے
دل محوِ درد ہے تو جگر وقفِ داغ ہے
اندھیر ہے جہاں میں وفاتِ حسین سے
ہاتف پکارتا ہے ہوا گل چراغ ہے

منشی احسان خان مختار نے مصرعہ ذیل سے تاریخ نکالی ہے۔

فخر دوراں حسین بود بگفت

(تاریخ صبیح ملخصاً)

(۲)

مبارک شمیم

مبارک شمیم مرحوم لکھتے ہیں:

نواب صاحب شعرائے لکھنؤ کے بڑے مداح تھے اور انھیں کی روش پر چلنا چاہتے تھے غزلوں میں وہی لکھنؤ کا رنگ ہے۔ اس کے ثبوت میں چند شعر دیکھیے۔

کیا ظریفانہ لکھا بحر نے مصرع یہ حسین
کھل گیا قفل دہن یار کا جھوٹا ہو کر

یاد رکھنا کہ وہ ریختہ گوئی میں حسین
ناروا ہے جو قدم بر قدمِ میر نہ ہو

کیا ہی سنجیدہ لکھا شعر یہ قاسم نے حسین
دیکھ انصاف سے تو یک دل و یک رو ہو کر

آزمانے کو ہر اک کے، کہ ہے کس وزن کا کون
تول لیتا ہے ترا تیر ترازو ہو کر

اگر چہ نخل سخن کی بہت ہیں فرع حسین
اصول میر ہے کافی غزل سرا کے لیے

بعدِ میر و مصحفی اس میں نہیں شک اے حسین!
ناسخ و آتش یہ دونوں لکھنؤ کی جان تھے

....

چند شاگرد:

نواب غلام حسین کے کثیر تلامذہ تھے۔ مگر ان میں زیادہ نام ور میر امداد علی شاد، حافظ نثار احمد خاں نایب، رؤف احمد شفا، سید محمد محسن عرشی، شیخ امید علی ساکن گاڑی پورہ اپنے وطن کے ہر وضیع و شریف کو جوان سے ملتا تھا محبت و عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ہر ایک کے ساتھ ان کا برتاؤ یکساں تھا۔........

نواب صاحب اپنے خاندان میں عجیب وغریب انسان تھے۔ نہایت خوش تقریر، معاملہ فہم، بڑے سحر بیان و سلیم الطبع، آپ کی اصابت رائے تمام شہر میں مشہور تھی۔ نواب صاحب کی وجاہت ظاہری بھی قابل دید تھی۔ بہت خوش رو سرخ وسفید رنگ، کشیدہ قامت مگر جسامت متوسط تھی وہ بھی نہایت سڈول، گول چہرہ، فراخ سینہ، بڑی بڑی آنکھیں غرض یہ کہ خوب صورت شخص تھے۔ جب ملکہ وکٹوریہ نے ہندوستان کی حکومت کمپنی بہادر سے اپنے ہاتھ میں لی تو ہندوستان کے معزز خاندانوں کے ارکان پر عنایات شاہانہ مبذول کر کے ان کی عزت افزائی کی تو چند خلعت خیر خواہانِ سلطنت کے لیے شاہ جہان پور بھی آئے۔ ایک خلعت وایسرائے نے نواب غلام حسین خان حسین کو بھی پہنایا۔ نواب صاحب کی قبر موضع مصری پور کے آبائی قبرستان میں ہے۔

نواب صاحب کی فاضلانہ قادر الکلامی

سپید ایسا ہوا ہے خون سب کا اس زمانے میں
کہ مہرِ مادری ہے استعارہ ام صبیاں کا

طائر روح کے اڑنے سے نہ ہوں گے منفک
دل میں ہیں بیضۂ فولاد کے جوہر کردار

دل سے بسم اللہ نکلتی ہے یہاں بے اختیار
ہم سمجھتے ہی نہیں مجرور کو اور جار کو

ممکن کی آنکھ سے ہے یہاں سر بہ سر وجوب
واجب نہیں ہے عالم امکاں ہے بے خبر

آئینۂ وجوب کا عکس آشنا ہے عشق
امکاں میں اپنے روپ بدلنے لگا ہے عشق

منطق مظہر ناقص کو اتم سمجھا میں
یہ مقولہ ہے نیا کیف کو کم سمجھا میں

☆

سمجھ لے توڑ ڈالوں گا ابھی میں رشتۂ جاں کو — اگر جراح تو نے میرے دل کے زخم کو ٹانکا
عبادت سے مجھے اتنی غرض ہے عہد پیری میں — کہ وقتِ واپسیں رہ جائے پردہ میرے ایماں کا

☆

لگائی مجھ پہ جو تلوار دردِ شانہ ہوا — حساب پاک بہم دل میں دوستانہ ہوا
طلسم گاہ نہیں ہے جو عالم دنیا — جہاز عمر کا خشکی میں کیوں روانہ ہوا
رولایا مجھ کو بہت میری بدگمانی نے — ہنسی خوشی سے جو قاصد ادھر روانہ ہوا
لگا کے مہندی وہ کس درجہ باغ باغ ہوئے — وفائے وعدہ کا اچھا انھیں بہانہ ہوا

☆

ہمارا دردِ سر ہرگز نہیں صندل سے جانے کا — خدا قایم رکھے پتھر بتوں کے آستانے کا
حسینؔ بے گنہ کی آنکھ کب مقتل میں جھپکے گی — کہ عالم اس نے دیکھا ہے تری تیوری چڑھانے کا

☆

اس کے کوچے میں اگر اپنا کبھی جانا ہوا — آہ! بے تاثیر کی صورت پلٹ آنا ہوا
دل جو ناخوش ہو تو دار العیش ہے بیت الحزن — مجھ کو رونا آگیا جب اس کے گھر جانا ہوا
میری حالت سن کے لوگوں سے وہ بولا ناز سے — کیا حسینؔ متقی بھی مجھ پہ دیوانہ ہوا

☆

ناصحا جیب دری سینہ زنی کرنے دے! — ہاتھ اپنا ہے، جگر اپنا، گریباں اپنا

☆

حضرت واعظ عبث تشریف لاتے ہیں حسینؔ — خود تو وہ سمجھے نہیں ہیں مجھ کو سمجھائیں گے کیا

☆

در پردہ دل کا یار سے یارا نہ ہوگیا — اپنا جو تھا رفیق وہ بے گانہ ہوگیا

نواب غلام حسین خاں حسینؔ کا اصلی مذاقِ سخن فارسی گوئی تھا۔ نثر فارسی بھی عمدہ لکھتے تھے۔ نواب صاحب خوش مذاق شاعر تو ضرور تھے مگر بہت کم شعر کہتے تھے تاہم ان کی اس قدر غزلیں ضرور تھیں کہ دیوان مرتب ہوگیا۔

نواب صاحب کے دو دیوان ایک اردو کا اور ایک فارسی کا، ان کی زندگی ہی

میں مرتب ہو گئے تھے مگر ان کی نگہ داشت نہیں ہوئی اور وہ غایب ہو گئے۔ سنا ہے کہ نواب صاحب کی زندگی میں کوئی مسلمان ماسٹر جو خوشنویس بھی تھے، مسودات صاف کرنے کو لے گئے اور وہ کل دیوان صاف کر گئے۔ نہ مسودات واپس دیے نہ صاف شدہ غزلیں۔ البتہ کلام اردو نواب احمد اللہ خاں عرف ہکلے نواب کا جمع کیا ہوا موجود رہا اور حسن اتفاق سے نواب صاحب کا کلام فارسی کچھ اِدھر اُدھر شاگردوں کے پاس موجود تھا۔ اس سے بھی ایک مجموعہ تیار ہو گیا۔ سنا ہے کہ فارسی کا کلام بشکل دیوان کسی طرح منشی رفعت علی رفعت مرحوم کے کتب خانے میں پہنچ گیا تھا، منشی رفعت علی اور ان کے فرزند منشی والاشان کے بعد کم علم بلکہ بے علم اولاد نے دیوان خانہ جس میں کتب خانہ بھی تھا جب ضروریات کے لیے استعمال کیا تو کل کتابوں کو نکال کر بالا خانے کے سائبان میں ڈھیر کر دیا جو دھوپ بارش بوچھار اور گرد و غبار سے گل سڑ گئیں اور جو صاف ستھری نکلیں وہ ایک پاکستانی کے ہاتھ دو چار سو رُپے میں فروخت کر دیں۔ وہ کتب خانہ جس میں تقریباً اسّی فیصد قلمی نسخے تھے اور لاکھوں رُپے کی مالیت کے ہوتے نااہل ورثا کی ناقدری کا شکار ہو گیا۔ نواب صاحب کے صرف چند فارسی اشعار جس میں سے چند ''تاریخ صبیح'' میں بھی درج ہیں یہاں ناظرین کے لیے پیش کرتے ہیں:

☆

غائب از چشم جہاں باشد جہانِ کوے دوست یافتم از بے نشانیہان نشانِ کوے دوست

☆

فشاندم دست از و دنیا و عقبیٰ طفیل ہمت مردانہ خویش
بہ گوش کبر من افسون فقر کارنکرد مرا بخاک نشانید و خاکسار نکرد

(سخن وران شاہ جہان پور از مبارک شمیم، دہلی، ۱۹۹۵ء: صفحہ ۶۵ تا ۷۱ ملخصاً)

خاک سار (ابو سلمان شاہ جہان پوری) نے یہ بیان پڑھ کر کتب خانۂ رام پور سے دریافت کیا تھا کہ آیا وہاں حضرت نواب صاحب کا کوئی دیوان محفوظ ہے؟ میں جناب ابو سعد اصلاحی صاحب کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے از راہِ طالب علم نوازی

ذیل کے جواب سے سرفراز کیا:

۲۴ر نومبر ۲۰۰۸ء

از رام پور

ڈاکٹر ابو سلمان صاحب سلام مسنون

محترم جیسا کہ آپ نے تاریخ شاہ جہان پور کے حوالہ سے نواب غلام حسین خاں حسینؔ کا رام پور رضا لائبریری میں موجود دیوان کے بارے میں دریافت کیا ہے۔

جناب رام پور رضا لائبریری میں نواب غلام حسین خاں حسینؔ کا ایک نسخہ موجود ہے، جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

مخطوطہ نمبر ۱۰۰۷ اوراق ۱۲۱ سائز ۱۸×۳۰

دیوان کا پہلا شعر جو ردیف الف سے شروع ہوتا ہے۔

مرا دعویٰ خدا شاہد نہیں محتاج برہاں کا
یہی حجت یہی سامع جمع ہونا میرے دیواں کا

دیوان کا آخری شعر یہ ہے:

بے وفا نیست دگر باتو سروکار حسینؔ
تو دیار دگر و یادِ خدا یار حسین

ان کا دیوان غزلیات کے علاوہ پانچ مخمس اور ایک مسدس در شان امام حسنؓ پر مشتمل ہے۔

امید ہے مزاج بہ خیر ہوگا۔

آپ کا مخلص

ڈاکٹر ابو سعد اصلاحی

لائبریرین و انکارمیشن آفیسر

رام پور رضا لائبریری- رام پور

(۳)

خان بہادر مطیع اللہ خاں

.....

(۱۱) غدر ۱۸۵۷ء میں فوج باغی نے نواب خان بہادر خان بریلوی نبیرہ حافظ الملک کو والی روہیل کھنڈ بنایا اور ان کی جانب سے تمام اضلاع میں ناظم مقرر ہوئے۔ شاہ جہان پور کی نظامت نواب غلام قادر خان کو عطا ہوئی۔ اور ان کی نیابت حسین کو ملی چند ہفتے گذرنے نہ پائے تھے کہ انگریز آگئے غلام قادر خان بھاگ گئے مگر حسین مضمون فرار سوچتے رہ گئے۔ گرفتاری دے کر داخل حوالات ہوئے۔ تمام عمر سوائے اسیری دام محبت و مریدی سلسلہ زلف عنبریں کے اور طرح کی پابندی کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ مزاج نازک، مصیبت سخت، اعزہ واحباب کو قوت برداشت کی بابت شبہ ہوا۔ دل میں کہنے لگے مبادا گھبرا کر زبان سے ایسی باتیں نکال ڈالیں جو اوروں کو ان کی رفاقت کے لیے قید خانے میں پہنچائیں اس لیے وفد احباب ان کے ماضی الضمیر کا پتا چلانے کے لیے حوالات میں ان سے ملا اور باتوں باتوں میں ان کے خیالات کی ٹٹول کرنے لگا۔ نواب صاحب وفد کا منشا سمجھ گئے فوراً شعر موزوں کر کے پڑھا جو وفد کے ذہنی سوال کا جواب تھے۔

برس رہی ہے مرے سر پہ بے کسی دن رات
شکستہ حال ہوں اجڑا ہوا دیار ہوں میں!
میں وہ نہیں ہوں کہ یاروں کا بار خاطر ہوں
شکستہ دست ہوں اپنے گلے کا ہار ہوں میں!

پھر کسی وقت اور شعر کہہ کر اُس کو داخل غزل کر دیا۔

(۱۲) آتش فساد و سرکشی سپاہ سرد ہو چلی تھی کہ مسٹر منی جو سابق میں یہاں اسسٹنٹ مجسٹریٹ رہ چکے تھے، مجسٹریٹ ضلع مقرر ہو کر آئے اور گوہر پورہ کے مقبرے میں مقیم ہوئے۔ بازار دار و گیر گرم ہوا اور تحقیقات الزام ملزمین بغاوت شروع

ہوئی۔نواب صاحب بھی گرفتار دام بلا تھے عرصے تک تحقیقات جاری رہی اور کئی مہینے بعد حکم رہائی صادر ہوا۔منی صاحب نے تجویز سناتے ہوئے کہا کہ تحقیقات سے آپ کا تقرر عہدہ نائب ناظم پر عارضی پایا جاتا ہے اور کبرسنی کے ساتھ عارضۂ ضعف بصارت بھی آپ کو ہے۔لہٰذا قصور معاف کر کے رہائی دی جاتی ہے۔حکم سنتے ہی نواب صاحب بول اٹھے کہ میں شاعر ہوں حکم سن کر ایک شعر ذہن میں آگیا اگر اجازت ہو تو سناؤں۔اس زمانے کے انگریز مشرقی السنہ کا کچھ نہ کچھ مذاق ضرور رکھتے تھے۔منی صاحب نے کہا ضرور سنایئے! نواب صاحب نے یہ شعر پڑھا:

جنبش لب جو ہوئی جنبش ابرو ہو کر
کام عیسیٰ کا کیا تو نے ہلاکو ہو کر

منی صاحب بہت خوش ہوئے اور مسکرا کر بولے: جایئے۔(تائب و دیگر ثقات)

کچھ زمانے بعد خیال آیا تو اس زمین میں اور شعر کہہ کر پوری غزل کر دی جو دیوان میں موجود ہے۔

نواب صاحب کی شاعری کا خمیر مایہ حسن پرستی و عشق کے فطری جذبات تھے۔ ان کے شباب کے زمانے میں بریلی میں شاعری کا شباب تھا۔عطا حسین کنبوہ خلف شیخ عظمت علی کے یہاں مشاعرہ بڑے اہتمام سے ہوتا تھا جس میں آزاد، استاد، شہیدی، عطا، عنایت، نور، منتظر وغیرہ شعرائے بریلی و بیرونجات کے نامی شعرا آکر شریک ہوتے تھے۔نواب صاحب کے دوستانہ تعلقات ایک طرف نواب خان بہادر خان بریلوی سے بوجہ ہم مذاقی بہت بڑھے ہوئے تھے۔وہ بھی شاعر تھے اور معروف تخلص کرتے تھے۔......"

"دوسری طرف نواب احمد علی خان نوید والی رام پور سے بہ سبب ہم مشربی گہرے مراسم تھے نوید کو ذوق سخن بہت تھا۔......"

ان تعلقات کی کشش سے نواب صاحب کبھی کبھی بریلی و رام پور جاتے تھے۔ بریلی میں نواب خان بہادر خان کے مہمان ہوتے تھے۔مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔آزاد سے جو اس وقت بریلی کے شعرا میں مرتبہ استادی رکھتے تھے صحبتیں گرم رہتی

تھیں اور تحسین و آفریں کے پھول مجالس شعر خوانی میں نواب صاحب کے سر پر نثار کیے جاتے تھے۔.....“

حضرت شاہ عبدالعزیز کے حضور:

نواب صاحب عنفوان شباب میں ایک مرتبہ وارد دہلی ہوئے مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کے فضل وکمال کی شہرت نے نواب صاحب کو مشتاق زیارت کیا، حاضر خدمت بابرکت ہوئے، ان دنوں مولانا صاحب تفسیر عزیزی کی تالیف میں مشغول تھے اور نواب صاحب کے حاضر خدمت ہونے کے وقت تفسیر سورۂ تین لکھ رہے تھے جب نواب صاحب کی طرف مخاطب ہوئے تو انھوں نے عرض کی کہ حضرت ”اونچی دکان اور پھیکا پکوان“ مثل مشہور ہے اس کا مصداق کون چیز ہے؟ آپ نے فرمایا اونچی دکان آسمان اور پھیکا پکوان اولے ہیں جو آسمان سے گرتے ہیں۔ (زبانی مولوی غلام محی الدین خان) نواب صاحبؒ نے اس مثل کو ایک شعر میں باندھا ہے غالباً اسی وجہ سے تحقیق ضرب المثل کی ہوگی۔

منبر و پند کو ان کے تو ہمارا ہی سلام
پھیکا پکوان اور اونچی ہے دکانِ واعظ

شوقِ سیر و سیاحت:

نواب صاحب کو ہمیشہ سے سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا مگر ان کی سیاحت کا دائرہ قریب کے شہروں تک محدود تھا۔ دہلی ولکھنؤ کے امراو شعرا سے مراسم اتحاد بڑھے ہوئے تھے قبل غدر اکثر وہاں جایا کرتے تھے دونوں شہر رشکِ گلزار ارم تھے، مہینوں ٹھہر کر وہاں کی صحبتوں کا لطف اٹھاتے تھے۔.......

بعد غدر جب دہلی گئے اور اس کو ویران پایا۔ دل بھر آیا بیساختہ شعر موزوں کیا:

شہر بند شہر سے بہتر ہے ویرانہ حسین
جس کا دل چاہے رہے وہ شاہ جہاں آباد میں

ناسخ و آتش و گویا ان کے یاران طریقت تھے ان کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد جب لکھنؤ جاتے ہیں تو وہاں کی مجالس سخن میں سناٹا دیکھ کر ان کو یاد کرتے ہیں اور حسرت کے ساتھ فرماتے ہیں:

بعد میر و مصحفی اس میں نہیں شک اے حسین
آتش و ناسخ بھی گویا لکھنؤ کی جان تھے
زندہ در گور ہوا فرقت گویا میں حسین
لکھنؤ کو وہ مگر شہر خموشاں سمجھا

جب گورنمنٹ انگریزی نے اودھ کو ممالک محروسہ میں شامل کر لیا اور واجد علی شاہ لکھنؤ سے کلکتہ چلے گئے اور وہاں کی دل چسپ صحبتیں درہم برہم ہوگئیں، نواب صاحب نے لکھنؤ جانا چھوڑ دیا ایک غزل کے مقطع میں کہتے ہیں ۔

کرا دماغ کہ نازِ بتاں حسین کشد
مگر تو باش من اینک ز لکھنؤ رفتم

کس خوبی سے تغیر حال کی طرف تلمیح کی ہے۔

بعد غدر نواب صاحب کی بصارت زیادہ خراب ہوگئی تھی مگر شوق سیاحت مضمحل نہیں ہوا تھا کبھی کبھی دل بہلانے باہر چلے جاتے تھے۔ اسی زمانے میں ایک مرتبہ گوالیار تشریف لے گئے۔......

مگر وہاں جا کر کچھ خوش نہیں ہوئے وہ دہلی و لکھنؤ و بریلی کی صحبتوں کے خوگر و شیدا تھے اور وہاں ان کا پتا نہ تھا اس لیے جتنے دن وہاں رہے بے لطف و پریشان رہے اسی غزل میں کہتے ہیں

نبودہ ام ہدف طعن ناقصاں لیکن
بہ مجمعے کہ ہدف را ہزار بار زدم

ماسوا اس کے وہ گھبرا کر گھر سے نکل کھڑے ہوتے تھے مگر سامانِ راحت پہلے کی طرح ساتھ نہ ہوتا اس لیے جلد پریشان ہو جاتے تھے۔ ایک غزل کے مقطع میں اس حالت کو پُر درد الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں۔

کس سے کہوں کہ گردش افلاک نے حسینؔ
کیا کیا دکھائے رنج وطن سے نکال کے
مجھ کو غربت میں نہ صحرا نہ چمن یاد آیا
ہاں مگر جلسۂ یارانِ وطن یاد آیا!

ان کی سیاحت صرف شوقیہ اور دور افتادہ احباب سے ملنے کے لیے ہوتی تھی فرماتے ہیں:

منم کہ قبلہ حاجت مراست خانۂ خویش
جبیں خویش کنم وقفِ آستانۂ خویش
بہ رنگ مصرعہ برجستہ آسمان سیرم
قدم بروں نہادم گہے زخانۂ خویش
عدوئے خود شوم وداد خود زخود خواہم
مگر بہ تیر ملامت شوم نشانۂ خویش

نواب صاحب نے ترکہ پدری سے ہر قسم کا گراں بہا سرمایہ واثاثہ پایا تھا، مگر شب و روز شعر و سخن کے چرچے اور آٹھوں پہر بے خودی و سرشاری کے مشغلے اور آئے دن نشاط و تفریح کے جلسے ہوتے رہتے تھے۔ تحصیل و تشخیص علاقے کے تردد میں کون پڑتا اس لیے آمدنی کا انتظام نہ تھا..... اس لیے موروثی سرمایہ قبل غدر تلف ہو گیا تھا۔ مثل مشہور ہے "بڑی دیگ کی کھرچن بھی زیادہ ہوتی ہے۔" جو کچھ بچا کچھا تھا وہ غدر میں صاف ہو گیا۔ جب الزام بغاوت سے رہائی پائی تو بالکل خالی ہاتھ تھے۔ صرف عسرت و تنگ دستی بہ طور یارِ غار ساتھ تھی۔ اس حالتِ زار کا ذکر ایک رباعی میں اس طرح کرتے ہیں:

افلاس من خستہ گذشت است از حد
راجع نشوم بہ کس بجز ذاتِ احد
توہین عبید ذلت مولی است
پسند کہ حاجتم بغیرت افتد

ایک غزل میں اپنی ناداری و عالی حوصلگی کا خاکہ اس طرح کھینچتے ہیں:

شدہ است خرقۂ ما صرفِ مے پرستی ما
فراخ حوصلگی بین و تنگ دستی ما
عیاں زلمعۂ خورشید و لطمۂ دریا ست
سر بلندی ما طمطراقِ پستی ما

(تاریخ مطیع (غیر مطبوعہ): صفحہ ۴۶-۸۴۱، ملخصاً)

(۲)

حامد حسن خاں

(۱)

مولوی صبیح الدین شاہ جہان پوری

شاہ جہان پور کے نامی علما میں ایک بزرگ مولوی شیخ محمد خاں تھے۔ ان کا اور ان کے خانوادہ علم وتہذیب کا تذکرہ مورخین شاہ جہان پور میں نواب محمد خان، مطیع اللہ خان اور صبیح الدین میاں نے بڑے احترام اور تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ مولوی شیخ محمد خان کے تین بیٹوں--مولوی محمد اعظم خان، محمد وارث خان اور شیخ محمد اکرم خان، آخر الذکر کے اخلاف میں ایک حافظ احسن خان گزرے ہیں جن کی عزت ووجاحت اور اقتدار وشہرت کا ذکر مولوی صبیح الدین میاں نے اپنی تاریخ شاہ جہان پور میں کیا ہے۔ ان کے دو بیٹوں، مولوی محسن خان اور حامد حسن خان میں آخر الذکر کے بارے میں لکھتے ہیں:

حافظ (احسن خان) صاحب کے دوسرے بیٹے حامد حسن خان ڈپٹی کلکٹر نے غدر کے ابتدائی دور میں نواب غلام قادر خان کی ملازمت کر لی تھی چند روز کے لیے نایب ناظم ہو گئے تھے، مگر دور اندیشی سے کام لے کر استعفا دے دیا۔ ایام غدر میں ان کے نام سے لکرا گھاٹ پر ایک چٹھی گرفتار ہوئی تھی جو انگریزوں کے نام تھی۔ اغلباً نواب صاحب کی بدگمانی دور کرنے کی غرض سے اپنے بھائی محمد حسن خان ونیز دیگر اہل خاندان کے ساتھ صفائی کے لیے قلعہ گئے واپسی پر صدر دروازۂ قلعہ کے جاہل سپاہیوں سے معمولی تکرار ہو پڑی ان جاہلوں نے ان لوگوں پر حملہ کر دیا۔ اس ہنگامے میں حامد حسن خان و محمد حسن خان کام آئے۔ احمد اللہ شاہ نے اسی بنا پر کہ یہ خاندان انگریزوں کا طرف دار ہے۔ کوٹھی لب سڑک خان بہادر قاسم حسن خان میں آگ دی

تھی جس کی وجہ سے وہ جلی کوٹھی کے نام سے مشہور ہوگئی۔ یہ خون بھی آیندہ کے لیے اس خاندان کے حق میں اکسیر کا کام کر گیا۔ سارا خاندان گورنمنٹ برطانیہ کا خیر خواہ اور وفادار قرار دے دیا گیا۔ اور گورنمنٹ کی شاہانہ مہربانیوں سے خوب پھولا پھلا۔ مولوی محسن خان کی اولاد میں ڈپٹی کلکٹر اور خطاب یافتہ بہت ہوئے محمد حسن خان سب جج اور حامد حسن خان ڈپٹی کلکٹر۔ خان بہادر قاسم حسن خان تحصیل دار، خان بہادر ابرار حسن خان ڈپٹی کلکٹر۔ خان بہادر محمود حسن خان تحصیل دار، خان بہادر مسعود حسن خان تحصیل دار، محمد اعزاز حسن خان تحصیل دار، عبدالقادر خان ڈپٹی کلکٹر ہوئے ہیں۔ اور اب بھی خان بہادر منسوب حسن خان اسپیشل مجسٹریٹ، خان بہادر موجود حسن خان تحصیل دار پنشنر، خان بہادر سر اسرار حسن خان صاحب ڈپٹی کلکٹر و نصیر المہام بھوپال و خان بہادر اشفاق حسن خان ڈپٹی کلکٹر پنشنر، محمد ممنون حسن خان ڈپٹی کلکٹر پنشنر، محمد سلطان حسن خان و محمد الطاف حسن خان ڈپٹی کلکٹران و نور الحسن خان ڈپٹی کلکٹر پنشنر و عبدالواحد خان ڈپٹی کلکٹر اس خاندان میں موجود ہیں۔ موجودہ زمانہ میں سر اسرار حسن خان اپنے خاندان میں بہت نامور اور ذی وجاہت ہیں یہ ڈپٹی کلکٹری سے ریاست بھوپال کے نصیر المہام بنائے گئے گورنمنٹ نے خطاب خان بہادری ۱۹۰۶ء میں اور سی آئی اے ۱۹۱۲ء کو اور خطاب نائٹ ۱۸۲۱ء میں عطا کیا اور ریاست بھوپال سے خطاب و بیر الملک ۱۹۱۴ء میں ملا اور ۱۹۱۳ء میں بھوپال کی پبلک نے امیر الامرا کا خطاب دیا۔ بھوپال سے پنشن یاب ہونے کے بعد ریاست خیر پور کے مدار المہامی پر ۱۹۲۸ء میں تقرر ہوتھا مگر صحت کی خرابی کے سبب سے جنوری ۱۹۲۹ء میں مستعفی ہوکر شاہ جہان پور اپنے وطن کو چلے آئے آپ کے چھوٹے بھائی خان بہادر اشفاق حسن خان ڈپٹی کلکٹر پنشنر ریاست جے پور میں ہوم ممبر سینیٹ تھے۔ انھوں نے مراد آباد میں کوٹھی بنا کر مستقل طور سے وہیں کی سکونت اختیار کرلی تھی ۷/ اگست ۱۹۳۱ء کو جے پور میں انتقال ہوگیا اور وہیں قبر بنی۔ ان کے بھائی نور حسن خان ڈپٹی کلکٹر علی گڑھ کے ساکن ہوگئے اور خان بہادر حبیب اللہ خان ڈپٹی کلکٹر پنشنر ساکن محمد تارین بہادر گنج نے علی گڑھ کو اور خان بہادر محمد شفیع خان پنشنر کلکٹر ساکن محلہ رنگین چوپال نے لکھنؤ کو آباد کیا۔ کاش! یہ

حضرات پنشن یاب ہونے کے بعد اپنے وطن میں رہ کر قوم کی خدمت کرتے تو زیادہ بہتر تھا۔ شاہ جہان پور کے کسی خاندان میں اب تک اتنے ڈپٹی کلکٹر اور خطاب یافتہ اصحاب نہیں ہوئے حال آں کہ ان حضرات میں کوئی گریجویٹ بھی نہیں تھا۔ یہ خاندان اب تک معزز اور خوش حال ہے آیندہ کا خدا حافظ۔

(تاریخ شاہ جہان پور از صبیح الدین: صفحہ ۶۱-۱۵۸)

(۲)

ابوسلمان شاہ جہان پوری

ڈپٹی کلکٹر حامد حسن خان جلی کوٹھی والے خاندان کی نامور شخصیت ہیں۔ حالات سے متاثر ہو کر ۱۸۵۷ء میں وہ شاہ جہان پور کے نایب ناظم بن گئے تھے، لیکن جس ماحول میں انھوں نے پرورش و تربیت پا کر عملی زندگی میں قدم رکھا تھا، اور جس ذوق حریت نوازی وطن دوستی اور قوم پروری کی ضرورت تھی اور وقت کا تقاضا تھا، دونوں میں سخت تضاد تھا اس لیے وہ جلد ہی اس ذمے داری سے سبک دوش ہو گئے۔ مولوی صبیح الدین صاحب تاریخ شاہ جہان پور نے جو یہ لکھا ہے کہ انھوں نے "دور اندیشی" سے کام لے کر استعفا دے دیا تھا۔ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ یہ دور اندیشی نہیں سراسر خود غرضی اور مصلحت اندیشی، باطل نوازی اور بزدلی تھی، جیسا کہ خود مولوی صاحب موصوف و مرحوم کا مزاج اور ذوق انگریز پرستی تھا۔ اس وقت انھیں دراصل یہ سوچنا چاہیے تھا کہ کیا تعجب ہے کہ وہی فوج کے وہ آخری سپاہی ہوں جس کی ثابت قدمی پر فتح کا دارومدار ہوتا ہے۔ لیکن انھوں نے یہ نہیں سوچا، بلکہ میدان جنگ کو پیٹھ دکھائی تھی اور معلوم ہے کہ فوج کے قانون میں اس کی ایک سزا بھی ہوتی ہے۔ لیکن اس امر میں شک نہ کرنا چاہیے کہ ان کی موت مظلومانہ تھی۔ شاید اس وقت تک عملاً انھوں نے جنگ آزادی کے خلاف انگریزوں کی کوئی خدمت انجام نہیں دی تھی۔ اور ایسے پچاسوں لوگ وقت کے مجاہدوں کے اردگرد مسلمانوں اور ہندوؤں میں موجود تھے، جن سے عملاً درگزر کر لیا

ہوگا، اس لیے حامد حسن خان کی مظلومانہ موت کا ماتم اخلاق اور قوم پروری کے جذبے کے خلاف نہیں ہوسکتا۔

نواب غلام قادر خاں کے زمانے میں انھیں شاہ جہان پور کا نایب ناظم یا جوائنٹ گورنر مقرر کیا تھا، لیکن ان پر شبہ کیا گیا کہ وہ انقلابی حکومت کے راز برٹش حکومت کو بتا دیتے تھے، اس لیے اسی انقلابی حکومت سے انھیں قتل کروادیا تھا۔ بعض نے ان کے قتل کو اتفاقی حادثہ قرار دیا ہے۔

(۳)

خان علی خان

اقبال سحر۔کراچی

خان علی خان شاہ جہان پور کے رہنے والے تھے، وہ لکھنؤ کی تحصیل سلون (salone) کے چکلے دار بھی رہے بعدازاں سیتاپور کے نواب علی تعلقہ دار محمود آباد کے نائب ہوگئے۔ یہ ایک منجھے ہوئے اور مشاق سپہ سالار تھے۔ یہ پہلے شخص تھے جنھوں نے بغاوت میں حصہ ہی نہیں لیا بلکہ لوگوں کو بغاوت پر ابھارا اور میدان جنگ میں ان کی رہنمائی کی۔

نواب غلام قادر خان کے زمانۂ نظامت میں شاہ جہان پور میں انھیں بیگم حضرت محل، خان بہادر خان اور ''مولوی'' (سید احمد شاہ) کے ایک بھائی اور چند خواص کے طرف سے ''محمدی'' پر قبضے کے بعد، رسد کی فراہمی کے انتظامات کے لیے ایک محکمے کا سربراہ گویا کہ وزیر خوراک مقرر کیا گیا تھا اس محکمے کا دفتر سکندر آباد میں قایم ہوا تھا اور اس کی ایک شاخ گولا گوکرن ناتھ ضلع کھیری میں قایم ہوئی تھی۔

خان علی خان پہلے ''محمدی'' آئے اور شعبۂ رسد کے ڈپوؤں کے بارے میں تفتیش اور معلومات کے بعد یہ پتا چلا کہ رسد کا صدر دفتر سکندر آباد میں قایم کیا گیا تھا، جب کہ اس کا ایک ڈویژن گولا گوکرن ناتھ میں قایم ہوا تھا۔ تلاشی کے عمل میں خان علی خان کے ہمراہ غالباً ۳۰ ہزار تا ۴۰ ہزار باغیوں کا جتھ تھا جن کے پاس ۳۰ عدد بندوقیں تھیں۔ محمدی میں موجود ''مولوی'' کی املاک وغیرہ کو بہ حفاظت خان علی خان نے بیگم محل کو روانہ کردیا۔ یہ املاک میں جو اونٹوں اور ہاتھیوں پر مشتمل بہت سے چھکڑوں پر روانہ کی گئی کسی بھی طرح رسد کی ٹرین سے کم نہ تھی۔

اودھ کی بیگم نے خان علی خان کو اپنی فوجوں کا چیف کمانڈ مقرر کیا تھا۔ اس

تقرری پر مرحوم مولوی کے بھائی، خان بہادر خان اور دیگر خواص نے رضا مندی کا اظہار کیا تھا۔

خان علی خان نے انقلابیوں کی چن ہٹ (Chinhat) کی جنگ میں رہنمائی کی۔ لکھنؤ کے معرکے میں زخمی ہوئے۔

ممو خان کے مشورے اور ہدایت کے مطابق، برجیس قدر کی تاج پوشی کی رسم میں شریک ہوئے۔

خان علی خاں نے محل میں حضرت محل سے ملاقات کی۔

خان علی خان کو اودھ کی فوج کی دو پلٹنیں قایم کرنے کا حکم دیا گیا۔

۱۰ اظہور الحسین نے فیروز شاہ کے آدمیوں کی مدد سے ملولی (Milauli) کے مقام پر انگریزوں کو گھیر لیا تھا۔

۱۱۔ انگریزوں کی بڑھتی ہوئی مداخلت اوران کے انتقام کے لیے منصف علی کے ساتھ خان علی خان کو رسول آباد بھیجا گیا تھا تا کہ انگریزوں کی بڑھتی ہوئی مداخلت کو روکا جا سکے۔

۱۲۔ اس کے بعد بیگم حضرت محل کے حکم سے انھیں فوج کے ساتھ، خزانہ لانے کے لیے ''پوایاں'' بھیجا گیا تھا۔ مگر خان بہادر اسماعیل خان اور فیروز شاہ نے خزانہ دینے سے انکار کر دیا تھا، اس دوران گولیاں چلنے کی آوازیں بھی آئیں اور یہی امکان ظاہر کیا گیا کہ ان کے درمیان لڑائی ہوئی۔

خان علی خن آف شاہ جہان پور، حکومت کے چند باغیوں میں سے ایک تھا جس نے چن ہٹ میں رونما ہونے والے واقعات میں نمایاں حصہ لیا تھا اور لکھنؤ کے معرکے میں زخمی ہو گیا تھا۔ سانحہ چن ہٹ ۳۰ رجون کو وقوع پذیر ہوا ● اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا باغیوں نے ریذیڈنسی کا محاصرہ کر لیا۔ باغیوں کا ہیڈ کوارٹرز ۳۲ ویں بیرک میں قایم ہوا تھا۔

پوایاں کے علاقے میں خان علی خان کے پاس چھ ہزار افراد اور گھوڑوں پر

● یہ معرکہ لکھنؤ کے قریب موضع چن ہٹ کے مقام پر ۳۰ رجون ۱۸۵۷ء کو پیش آیا تھا۔

مشتمل فوج تھی، ان کے پاس دس عدد بندوقیں بھی تھیں۔

خان علی خان بیگم کے تحت رائل وارنٹ کا کمانڈر انچیف تھا۔ بیگم کو بانڈی میں خان بہادر خان اور غلام قادر خان اور ان کی فیملی نے مدعو کیا تا کہ پوایاں پر حملے کے لیے کمانڈ ماموری کی جا سکے۔ اس وقت خان علی خان کی فوج آٹھ ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ حیدر آباد کے کلکٹر فدا حسین جن کے پاس چھ رجمنٹیں تھیں، وہ بھی خان علی خان کے ساتھ آن ملے۔ ان کی فوجوں نے محمدی میں پوزیشن سنبھالی ہوئی تھی۔ پوایاں پر حملے کی نگرانی بیگم نے خان علی خان کے سپرد کی تھی۔

خان علی خان کی طرف سے پوایاں پر حملہ کرنے میں تاخیر ہونے کی وجہ سے بیگم نے سخت ناگواری کا اظہار کیا اور فوری طور پر خان علی خان کو کمانڈر انچیف کے عہدے سے معطل کر دیا اور ان کے جانشین کے آنے اور ان سے فوج کا چارج لینے تک، خان علی خان کو پابند رہنے کا حکم بھی جاری کر دیا۔

.....☆.....☆.....

فریڈم اسٹرگل ان اتر پردیش کی جلد پنجم میں ایک ڈاکومنٹ کے حوالے خان علی خان کو نواب قادر علی خان کے دورِ نظامت میں نائب ناظم بھی بتایا گیا ہے۔ اگر ایسا ہو تو وہ صرف چند دن کے ہوسکتا ہے۔ ان کا ذوق اور ان کا میدان عمل بالکل دوسرا تھا جس کا اندازہ اس مضمون کے مطالعے سے بہ خوبی کیا جاسکتا ہے۔

فریڈم اسٹرینگل ان اتر پردیش کی جلد۲ وجلد ۵ میں خان علی خان تذکرہ بہ کثرت آیا ہے، ان کی فوجی ذمے داریوں، ان کی جہادی کامیابیوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ فوجی کاموں کے ماہر اور مدبر تھے اور نہایت مستعد شخص تھے۔ ان کے سوانح حیات اور سیرت کی عام انداز میں تفصیلات نہیں ملتی۔ روہیل کھنڈ اور اودھ کی تاریخ تحریک آزادی کے کسی مؤرخ ومصنف نے ان کی طرف توجہ نہیں فرمائی، ہمارے کرم فرما جناب سحر اقبال (کراچی) کی عنایت سے ان کی شخصیت پہلی بار تاریخ کی روشنی میں آئی اور ان کی شخصیت کے چند پہلوؤں سے ہم آشنا ہوئے، لیکن ان پر مزید کام کی بڑی گنجایش ہے اور اصحابِ ذوق کو اس طرف توجہ کرنی

چاہیے۔اس خیال سے یہاں مذکورہ بالا فریڈم اسٹریگل.....کی دو جلدوں میں ان کے نام، کام اور خصوصیات کا جہاں ذکر آیا ہے، ان کے صفحات درج کر دیے جاتے ہیں کہ شاید اسی طرف کسی کی توجہ ہو جائے:

جلد دوم: صفحہ ۵، ۸۳، ۸۴، ۱۰۷، ۱۳۰، ۸، ۲۷۸ و ۵۵۷

جلد پنجم: صفحہ ۳۱۱، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۶۲ و ۵۶۴

اس کتاب کی چھٹی اور آخری جلد چوں کہ سلسلے کی پانچوں جلدوں کا مجموعی انڈکس ہے اس لیے ایک ہی جگہ خان علی خان کے نام کے ساتھ پانچوں جلدوں میں جن صفحات میں ان کا حوالہ آیا ہے ان کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔

خان بہادر مطیع اللہ خاں نے لکھا ہے کہ خان علی خان، حامد حسین خاں کے برادر نسبتی تھے۔نواب غلام قادر خاں، نواب خان بہادر خان سے شاہ جہان پور کی نظامت کا پروانہ لے کر لوٹے تو آتے ہی انتظام شروع کر دیا۔اس سلسلے میں صاحبِ "تاریخ شاہ جہان پور" لکھتے ہیں:

"......ظہور احمد میاں، نظام علی شہباز نگری و حامد حسن خان و خان علی خان برادر نسبتی حامد حسن خان نایب ناظم اور رؤف احمد میاں و عبدالرؤف خان افسر فوج مقرر ہوئے۔" (صفحہ ۹۲۰)

(۴)

نظام علی خاں شہباز نگری

تاریخ صبیح میں ان کا نام ''نظام علی خان آفریدی کوتوالی'' لکھا ہے۔ خاندان اور رشتوں کے تعارف میں لکھتے ہیں:

''یہ خاندان قدیم سے معزز اور نجیب الطرفین شمار ہوتا تھا، نظام علی خان عرصے تک قبل غدر کوتوال شاہ جہان پور رہے۔ مولوی سلطان احمد خان صاحب شاہ آبادی ان کے حقیقی بھانجے تھے اور ان کے بھائی احمد علی خاں کو مولوی عبدالجبار خان صاحب کی بیٹی منسوب تھیں، اور ان کے بیٹے امانت علی خاں کو مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب مشصف کی دختر منسوب ہوئی تھیں۔ اس قدیم اور معزز خاندان میں اب کوئی اولاد زکور سے نہیں ہے۔ (تاریخ صبیح: حصہ دوم، صفحہ ۲-۳۰۱)(ا۔س۔ش)

(۵)

نجیب خاں

جلال آباد کے نایب ناظم تھے اور فیصلہ طلب پڑے ہوئے معاملات کو نمٹانا ان کی ذمے داری تھی ان کی تفصیلی حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

(فریڈم اسٹریگل ان اتر پردیش: جلد پنجم، صفحہ ۳۰۸)

غلام قادر خان کے زمانہ نظامت یا گورنری میں حامد حسن خان کے نیابت کی ذمے داری سے استعفا دیا تو خان بہادر خان نے ان کی جگہ پر نجیب خان کو قومی حکومت شاہ جہان پور کا نایب ناظم بنا دیا گیا تھا۔ (ایضاً: صفحہ ۲۰۰)

ظہور احمد میاں:

خان بہادر حافظ مطیع اللہ خان نے ظہور احمد میاں کو بھی ناظم شاہ جہان پور کا نایب لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو تاریخ مطیع صفحہ ۹۲۰۔

قومی نظام حکومت شاہ جہان پور کے منصف:

مفتی مظہر کریم دریابادی

(۱)

مولانا عبدالماجد دریابادی

حقیقی دادا مفتی مظہر کریم صاحب تھے، علم دین کی سند فرنگی محل سے حاصل کی۔ شروع انگریزی کا زمانہ تھا، شاہ جہان پور میں عدالت کلکٹری میں سرشتہ دار ہو گئے۔ اور افتا کا مشغلہ بھی جاری تھا۔ اسی دوران ۱۸۵۷ء کا مشہور ہنگامہ انگریزوں کے خلاف برپا ہو گیا۔ اور اس کے خاتمے پر ان پر مقدمہ اس کا چلا کہ ان کے شہر شاہ جہان پور میں باغیوں کی کمیٹی انھیں کے مکان پر ہوتی تھی۔ ان پر مقدمہ چلا اور ۹ سال کی سزا عبور دریاے شور کی سنادی گئی۔ کالے پانی یعنی جزیرہ انڈمان جانا اس وقت گویا سفر ملک عدم کا پیش خیمہ تھا۔ بہر حال سب کو روتا پیٹتا چھوڑ کر یہ گئے اور وہاں اور بھی کئی علما کا ان کا ساتھ ہو گیا مشغلہ علمی وہاں جاری رہا۔ کسی انگریز کی فرمائش پر عربی کی مشہور لغت جغرافیہ ''مراصد الاطلاع فی اسماء الامکنۃ والبقاع'' (صفی الدین عبدالمومن) کا ترجمہ اردو میں کر ڈالا۔ شاید کچھ اس کے صلے میں اور کچھ خوش چلنی کی بنا پر اسیری کی مدت نو سال سے گھٹ کر سات ہی سال کی ہو گئی اور یہ ۱۸۶۵ء میں وطن واپس آ گئے۔ اور بقیہ عمر دریاباد ہی میں رہ کر عبادت اور فقہی فتاویٰ نویسی میں بسر کی۔ ایک ضخیم جلد ''فتاوے مظہریہ'' کے نام سے چھوڑ گئے ہیں، جو غیر مطبوعہ ہی رہی۔ اس کا قلمی مسودہ، ذرا بدخط اور خط شکست میں لکھا ہوا، ''مسایل مظہریہ'' کے نام سے ملا ہے۔ عقاید میں ہم مسلکی علما بدایوں کی ہے، مراسلت بھی ان حضرات سے رہا کرتی۔ ''غایۃ المرام فی تحقیق المولود والقیام'' کے عنوان سے ایک کتاب اپنے ایک عزیز قریب کے نام سے محفل میلاد اور اس میں قیام تعظیمی کی حمایت و جواز میں چھپوائی۔ ایک کٹا پٹا مسودہ بھی

''مناقب غوثیہ'' کے نام سے پرانے کاغذات میں ملا۔ میری نانی مرحومہ نے بڑی عمر پائی۔ اپنے بچپن میں ان کا دیکھنا یاد ہے، چلنے پھرنے سے معذور ہو کر فریش رہتی تھیں یہ قصبہ بجنور (لکھنؤ) کے خاندان شیخ زادگان صدیقی کی تھیں۔ یہ لوگ خوش حال ہونے کے ساتھ بڑے ''خوش عقیدہ'' قسم کے تھے۔ ان اثرات گوناگوں سے ہمارے خاندان دریاباد میں علم دین کے چرچے کے باوجود غالب رنگ خانقاہی و درگاہی تصوف کا تھا اور پیروی بجائے سنت کے بدعات ہی کی ہو رہی تھی۔

مذہبیت یا دین داری ایک رسمی قسم کی، اور ظواہر کی حد تک ہمارے ہاں اچھی خاصی تھی لیکن جس چیز کا نام تقویٰ قلب ہے، خصوصاً بندوں کے ادائے حقوق اور ان سے حسن معاملت کی کمی، وہ جوار کے اکثر شریف گھرانوں کی طرح ہمارے ہاں بھی نمایاں تھی۔ اونچ نیچ اور ذ تیلے اور اچھوتوں کی، پوری طرح مسلم دلوں دماغوں پر بھی مسلط ہو چکی تھی۔ اور جن کھاتے پیتے گھروں میں، زمینداری کے ساتھ کوئی حاکمانہ عہدہ مثلاً محکمۂ پولیس کا حاصل ہو جاتا وہاں کے ظلم وستم کا تو پوچھنا ہی کیا۔

دریاباد کے علاوہ ہم لوگوں کا تعلق شہر لکھنؤ سے بھی قدیمی چلا آ رہا ہے، نانا صاحب کی تو عمر ہی لکھنؤ میں گزری، وہیں پڑھا، وہیں پڑھایا، اور شہر میں صاحب اثر و رسوخ رہے۔ دادا صاحب بھی گویا نیم فرنگی محلی ہو گئے تھے۔

(۲)

ڈاکٹر تحسین فراقی

فاضل محترم ڈاکٹر تحسین فراقی پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے میں بعض تفصیلات زیادہ تھیں، قارئین گرامی مطالعہ فرمائیں۔

مولانا ماجد کے حقیقی دادا مفتی مظہر کریم زمانہ شاہی میں مفتی تھے۔ (تاریخ دریاباد از منشی برج بھوکن لال محب، نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۲۵ء: صفحہ ۴۷) حکم ان علاقوں میں جو صوبہ جات متحدہ کہلاتے ہیں، ایسٹ انڈیا کمپنی کا چل رہا تھا۔ شاہ جہان پور اس انتظام کے ماتحت

ضلع قرار پا چکا تھا۔ ایک بہت کرم خوردہ یادداشت سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی مظہر کریم صاحب ۱۸۲۹ء میں بہ سلسلۂ ملازمت انگریزی شاہ جہان پور پہنچے اور ایک ادنا عہدے سے ترقی کرتے کرتے سو روپیہ ماہ وار کے مشاہرے پر سرشتہ دار فوج داری ہو گئے۔ ۳۱؍ مئی ۱۸۵۷ء کو جب سرکاری زبان میں ''غدر'' ہوا ہے، یعنی ہندوستانی سپاہ نے بلوہ کر کے انگریز حکام کو قتل کیا ہے تو قیام شاہ جہان پور کی مدت اس وقت ۲۷ سال ہو چکی تھی۔ (صدقِ جدید، ۹؍ دسمبر ۱۹۵۵ء: صفحہ ۶)

اتنے طویل قیام سے پردیس دیس بن چکا تھا اور مسافرت میں شانِ وطن کی پیدا ہو گئی تھی۔ عمایدِ شہر سے روابط و رواسم بہت گہرے مثل عزیزوں کے قایم ہو چکے تھے اور اثر حکام و عوام پر بہت اچھا تھا۔ ایک انگریز J.F.Fanthome مقیم آگرہ نے ۱۸۹۶ء میں بنارس کے ایک مطبع سے غدرِ شاہ جہان پور کی ایک ضخیم داستان انگریزی میں شایع کی۔ اس میں بغاوت کا بڑا سرغنہ مولوی مظہر کریم صاحب ہی کو ٹھہرایا ہے اور خوب خوب انھیں جلی کٹی سنا کر اپنا دل ٹھنڈا کیا ہے۔ اس میں بھی شہر میں ان کے اثر و اقتدار کو ہر جگہ تسلیم کیا ہے۔ (ایضاً: صفحہ ۶)

اصل واقعہ کا تو اللہ ہی کو علم ہے۔ خاندان میں روایت یہ مشہور چلی آتی ہے کہ تباہی اور بھگدڑ کے وقت ایک انگریز حاکم (غالباً جائنٹ مجسٹریٹ) کو مولانا نے ترس کھا کر اپنے ہاں پناہ دی تھی۔ لکڑی کے ایک بہت بڑے بکس کے اندر چھپا دیا تھا۔ وہیں کھانا پانی پہنچا دیتے تھے۔ وقت ایسی نفسا نفسی کا تھا کہ کسی فرنگی کو پناہ دینا خود بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ وہ انگریز ان کے ہاں سے زندہ و سلامت چلا لیکن قبل اس کے کہ انگریزی لشکر تک پہنچے، راستہ میں قتل ہو گیا۔ واقعہ جو کچھ بھی ہو، دوبارہ انگریزی تسلط کے بعد مولانا پر یہ الزام لگا کہ فتویٰ جہاد پر دستخط ان کے بھی تھے۔ جرم بغاوت کا قایم ہوا اور سزا چودہ سال کی عبور دریائے شور کی ہوئی [1]۔

---

[1] ایضاً: صفحہ ۶، ''صدق'' کے اس مضمون میں دریابادی نے سزا کی مدت ۱۴ سال لکھی ہے جب کہ بعدِ وفات چھپنے والی ''آپ بیتی'' میں میعادِ سزا نو سال درج ہے۔ مالک رام نے بھی تذکرۂ معاصرین ۴ (صفحہ ۱۸۲) میں میعادِ سزا نو سال ہی بتائی ہے جب کہ ابو سلمان شاہ جہان پوری نے مولانا پر اپنے ◄

اس اسیری اور جلاوطنی میں رفاقت متعدد علماے وقت کی حاصل رہی۔ دو کے نام تو متعین طور پر معلوم ہیں۔ ایک مولانا مفتی عنایت احمد (صاحبِ تواریخ حبیب اللہ) دوسرے مشہور معقولی مولانا فضل حق خیر آبادی۔ جلاوطنی کے گیارہ بارہ سال کٹ چکے تھے کہ اپریل ۱۸۶۹ء میں گورنمنٹ کا یہ اشتہار شایع ہوا کہ مفید عام کتابوں کے ترجمے پر اہل علم کو بہ شرط پسند، حکومت سے معقول نقد انعام عطا ہوگا۔ مفتی عنایت احمد صاحب اور مولانا مظہر کریم دونوں صاحبوں نے اس اعلان سے فایدہ اُٹھا کر عربی جغرافیہ کی ایک ایک مشہور کتاب ترجمہ کے لیے انتخاب کرلی۔ مفتی صاحب نے ''تقویم البلدان'' کو لیا اور مولانا نے مراصد الاطلاع کو (1)، اور جب انعام کا وقت آیا تو بجاے کسی نقد رقم کے رہائی کو پیش کیا۔ چناں چہ بقیہ میعاد معاف ہوگئی اور مولانا غالباً شروع ۱۸۷۰ء میں وطن واپس آگئے۔ (ملاحظہ ہو پچھلے صفحے کا حاشیہ نمبر......(مقالہ ہذا)

اس کے بعد وطن ہی میں خانہ نشین رہے۔ خاموشی کے ساتھ علمی و دینی خدمات میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۰ر شعبان ۱۲۸۹ھ/۱۴ر اکتوبر ۱۸۷۲ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ (صدقِ جدید، ۹ر دسمبر ۱۹۵۵ء: صفحہ ۶)

خاص فن فنِ فقہ تھا۔ جزئیات کے گویا حافظ تھے۔ استفتا بہ کثرت آئے رہتے، بعض دور دور سے بھی۔ فتاوی ہزار ہا کی تعداد میں قلم سے نکلے ہوں گے۔ جو ضایع ہوگئے ان کا ذکر نہیں۔ جو محفوظ ہیں وہ ایک لمبی چوڑی تقطیع کے ۲۰۶ ورق یعنی ۴۱۲

➤ تعزیتی مضمون (افکار (کراچی): مارچ ۱۹۷۷ء) میں اور سخی احمد ہاشمی نے ''ادبی آئینے'' (صفحہ ۲۶۱) میں میعادِ سزا سات سال بتائی ہے۔ ماجد کی روایت کے مطابق مفتی صاحب ۱۸۶۵ء میں وطن واپس آگئے تھے (آپ بیتی: صفحہ ۲۹) اگر یہ سن درست مان لیا جائے اور ابو سلمان اور سخی احمد ہاشمی صاحبان کی بتائی ہوئی سزا بھی سات سال مان لی جائے تو پھر سزا میں تخفیف کہاں ہوئی؟ چوں کہ ماجد صاحب نے اپنی زندگی میں ''آپ بیتی'' پر متعدد بار نظر ثانی کی اس لیے اس میں بیان کردہ سنہ اور میعاد یقیناً درست ہیں۔

(1) پورا نام ''مرصد الاطلاع فی اسماء الامکنۃ والبقاع'' (صفی الدین عبد المومن) اس کا ایک قلمی نسخہ ماجد صاحب کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے۔ (بہ حوالہ فروغ اردو، عبد الماجد دریابادی نمبر: صفحہ ۱۰)

صفحات کی ضخیم جلد میں خود مولانا کے لکھے ہوئے موجود ہیں۔ مجموعے کا نام ''فتاویٰ مظہریہ'' ہے۔ (صدقِ جدید، ۹ر دسمبر ۱۹۵۵ء: صفحہ ۶)

برج بھوکن لال محبت نے کچھ اور قلمی نسخوں اور ایک مطبوعہ کتاب کی تفصیل دی ہے۔ یعنی ''مظاہر قادریہ'' (تصوف) (در حالات و مناقب حضرت غوث پاک) غیر مطبوع، ''غایتہ المرام فی تحقیق المولد والقیام'' (در فضایل آدابِ میلاد) مطبوع، اردو ''مسایل مظہریہ'' (فقہ) غیر مطبوع۔ (تاریخ دریاباد: صفحہ ۴۸)

(عبدالماجد دریابادی - احوال و آثار، لاہور ۱۹۹۳ء: صفحہ ۲۳)

نظمائے تحصیل جلال آباد:

(۱)

احمد یار خاں

احمد یار خاں جلال آباد باشندہ تھے۔ اور ایک عرصے سے جلال آباد کے تحصیل دار تھے۔ عہد انقلاب میں بھی انھوں نے اسی منصب کو پسند کیا، لیکن غلام قادر خان شاہ جہان پور کے حکمراں ہوئے تو انھیں جلال آباد کا ناظم بنا دیا گیا، لیکن ان کی عمر تحصیل داری میں گزری تھی۔ پہلے وہ کچھ عرصہ مہر آباد کے تحصیل دار تھے، پھر برٹش حکومت میں ایک عرصے سے وہ تحصیل دار تھے۔ ان کے علم، محنت اور برس ہا برس کے تجربے نے ان کے لیے اس کام کو آسان کر دیا تھا اور طبیعت اس سے بہت مانوس ہوگئی تھی، لیکن اب انتظامیہ کی ضرورت کو اس کی نگرانی اور رہنمائی کے لیے ایک صاحب نظر و تدبر اور تجربہ کار شخصیت برسر اقتدار ہو۔ چناں چہ ضلع کے ناظم نواب غلام قادر خاں نے انھیں جلال آباد کا ناظم بنا دیا، لیکن انھوں نے اس کو مناسب نہیں سمجھا اور نواب خان بہادر خاں ناظم روہیل کھنڈ سے اپنے تبادلے کو منسوخ کروا دیا۔ اور اپنے پہلے اور پسندیدہ میدان ہی کو اپنی قومی خدمات کا میدان بنائے رکھا اور تحصیل دار رہنا ہی پسند کیا۔

احمد یار خاں کا تذکرہ اسی کتاب میں دو جگہ اور آیا ہے۔ یہاں اتنا ہی کافی ہے۔

(۲)

نجیب خاں

نجیب خاں کچھ عرصہ جلال آباد کے نایب ناظم رہے لیکن کچھ عرصے بعد ہی انھیں علاقائی دارالحکومت شاہ جہان پور میں اسی منصب پر بلا لیا گیا۔ ان کا ذکر شاہ جہان پور کی نظمات کے ضمن میں آیا ہے۔

نظمائے تحصیل تلہر:

(۱)

غلام محمد خاں

تلہر کے روؤسا کی ایک نامور شخصیت تھے۔ شاہ جہان پور میں فوجی بغاوت کی خبر جوں ہی تلہر پہنچی، وہ تحصیل دار کے پاس گئے اور سخت لہجے میں اس سے کہا کہ جیل کے جن قیدیوں کو گورنمنٹ اسکول (تلہر) کی تعمیر پر لگایا گیا ہے انھیں چھوڑ دیا جائے۔ (فریڈم اسٹریگل...... جلد ۵، صفحہ ۲۰۸)

اس موقع پر وہ اپنے دوست سیف اللہ خاں سے ملے جو بریلی میں جیلر تھے۔ اور نواب خان بہادر خاں سے بہت گہرے اور قریبی تعلقات رکھتے تھے، ان کی سفارش پر ان سے اپنے تئیں تلہر کا ناظم اور کمانڈنٹ مقرر کروالیا۔

انفنٹری ٹرپس قایم کروالیے اور اس کے کمانڈنٹ بھی خود مقرر ہو گئے۔

(ایضا: صفحہ ۳۰۹ و ۳۰۹)

میرے پیش نظر جو حوالے کی چند کتابیں ہیں، ان میں حالات اور کارگزاری کی تفصیل نہیں ملتی۔

مسٹر منی مجسٹریٹ شاہ جہان پور نے لکھا ہے:

''بغاوت فوج شاہ جہان پور کی خبر ۳۱ رمئی ۱۸۵۷ء کی شام کو تلہر پہنچی۔ بااثر رئیسوں میں سے غلام محمد خاں نے تحصیل دار کو فوراً بے دخل کر دیا اور پولیس اسٹیشن پر قبضہ کر کے دفتر کو برباد کر دیا۔ تحصیل دار نے ایک پٹھان کے مکان میں پناہ لی، جہاں سے دوسرے دن باغیوں نے اس کو گرفتار کیا۔ غلام محمد خاں کو خان بہادر خاں نے ناظم اور کفایت اللہ خاں اور ان کے بھائی کو تحصیل دار مقرر کیا......فوج کی کمانڈ غلام محمد خاں کے متعلق رہی، جو ہلدوانی کی لڑائیوں تک اس کے سپرد تھی۔'' (تاریخ مطبع: صفحہ ۹۲۰)

(۲)

کفایت علی خاں

ان کے حالات اور کارگزاریوں کی کوئی تفصیل نہیں ملی۔ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق انھیں ناظم بتایا گیا ہے اور یہ بھی اندراج ہے کہ پانچ سو رُپے کی انھیں پیش کش کی گئی ہے۔(فریڈم اسٹرگل...... جلد۵،صفحہ۲۰۹)اور ایک دیگر مقام پر برٹش حکومت کی معلومات کے مطابق انھیں منصرم پیالش بیان کیا گیا ہے اور صراحت کی ہے کہ ''ان کا کیس التوا میں پڑا ہے۔'' یہ بات قومی حکومت کے مدد کے متعلق ہے۔
(ایضا:صفحہ۲۰۲)

(۳)

ہدایت علی خاں

ہدایت علی خاں ناظم اور کمانڈنٹ مقرر ہوئے اور دونوں منصوبوں کے لیے بالترتیب پانچ سو رُپے ایواڈ مقرر ہوا برٹش حکومت میں انھیں صدر آفس شاہ جہان پور میں محرر بیان کیا گیا ہے۔ان کا محمد آباد کے سابق تحصیل دار اور دیوان ہونا بھی بیان ہوا ہے۔لیکن رپورٹ میں ان کے دو بھائیوں کا ذکر آیا ہے کہ ہدایت علی اور محبّ علی، حکیم سعادت علی کے دو چھوٹے بھائی آئے اور اسلحہ کا مطالبہ کیا اور کہا کہ اس بغیر وہ اپنی ذمے داریاں پوری نہیں کر سکیں گے۔(ایضا:صفحہ۱۷۲،۲۰۲،۲۰۹،و۷۶۹)

(۴)

عبدالغفار خاں

یہ انقلابی شاہ جہان پور تحصیل تلہر کے رہنے والے انقلابی حکومت میں شریک تھے۔انھیں نظامت میں نایب ناظم مقرر اور الش دار بنا دیا گیا۔پورے انقلابی دور میں وہ انھیں منصوبوں پر کام کرتے رہے۔ان کے انجام اور حالات کی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی۔(فریڈم اسٹرگل...... جلد۵،صفحہ۳۰۹)

حصۂ پنجم

شاہ جہان پور اور ۱۸۵۷ء

تذکار

مجاہدین و شہدائے وطن

اور

دیگر شخصیات، زمیندار اور خاندان

ترتیب و تدوین

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

مجاہدین وشہداے وطن

اور دیگر شخصیات، زمیندار اور خاندان

حصہ پنجم

قاضی سرفراز علیؒ۔سید

(۱)

خان بہادر حافظ مطیع اللہ خاں

محلہ قاضی خیل میں متصل درخت انجان مکان تھا۔قاضی صاحب کے فرزند محمد حسن کا بیان یہ ہے کہ ان کے مورثوں میں شیخ اللہ داد ملک ترمذ سے بہ عہد اورنگ زیب ہندوستان آئے اور پانی پت میں قیام کیا وہاں سے قصبہ کانٹ آکر شیوخ صدیقی میں شادی کی ان بی بی کے بطن سے کئی بیٹے پیدا ہوئے جن میں سے ایک مولوی عبدالحفیظ تھے۔شیخ اللہ داد کچھ زمانے بعد پانی پت واپس گئے مگر عبدالحفیظ اپنے ننھیال میں رہے، ان کے بیٹے محمد مہدی تھے جن کے قاضی مقرر ہونے کے واقعات ہم قاضی پیر محمد صاحب کے ذکر میں بیان کر چکے ہیں۔محمد مہدی کے فرزند عبدالہادی اور ان کے بعد ان کے بیٹے سعداللہ قاضی شاہ جہان پور ہوئے۔قاضی سعداللہ کی چار بیٹیاں تھیں جن میں سے زوجہ اولیٰ مولوی محمد حسین صاحب ساکن محلہ حسین پورہ کی پھوپھی تھیں۔ان کے بطن سے امانت علی پیدا ہوئے ان کی شادی بلگرام میں منشی نیاز علی ڈپٹی کلکٹر کی بہن سے ہوئی جن کے بطن سے قاضی سرفراز علی صاحب پیدا ہوئے امانت علی اپنے والد کی حیات میں فوت ہو چکے تھے۔لہٰذا قاضی سعداللہ صاحب کے وفات پانے پر آپ قاضی قرار پائے۔

قاضی مہدی کے وقت سے اب تک اس خاندان میں منصب قضا، گو اس کی صورت وشان انقلاب زمانہ سے بدل گئی ہی، چلا آتا ہے۔۱۲۰۲ھ عہد آصف الدولہ کی دستاویزوں پر مہر قاضی عبدالہادی کی پائی جاتی ہے اور ۱۲۰۵ھ کے وثائق ودیگر کاغذات پر تصدیق قاضی سعداللہ کی نظر پڑتی ہے جس سے یہ نتیجہ صاف طور پر پیدا ہوتا ہے کہ حکومت اودھ کے زمانے میں عبدالہادی بہ قضائے الٰہی منصب قضا سے

علیحدہ ہوگئے تھے اور قاضی سعد اللہ ان کے جانشین ہوگئے تھے اور انگریزی عمل داری کے وقت وہ مسند قضا پر قابض تھے۔

قاضی سعد اللہ کا ذکر نواب محمد خان نے ''تذکرۃ الاحباب'' میں کیا ہے۔

کہتے ہیں:

مرے دوست ہیں ایک قاضی یہاں — کہ سعد اللہ ہے نام ان کا عیاں
شریعت کے خادم مطیعِ رسول — نہ رکھے خدا ان کو ہرگز ملول
اور ایک بھائی ان کے ہیں عبدالکریم — بہت خوب ہیں اور نہایت حلیم
امانت علی ان کا فرزند ہے — بہت نیک ہے اور خرد مند ہے
بہت خوب ہے اور ذی علم ہے — بہت تمکنت اس کو اور حلم ہے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امانت علی ابن قاضی سعد اللہ ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۸ء) کے بعد فوت ہوئے اور قاضی سعد اللہ کا ان کے بعد انتقال ہوا۔

قاضی سرفراز علی صاحب ۱۲۴۷ھ (۳۲-۱۸۳۱ء) میں پیدا ہوئے پہلے شاہ جہان پور کے اساتذہ سے تعلیم پائی پھر اپنے ماموں منشی نیاز علی بلگرامی کے پاس جو گوڑگاؤں میں تحصیل دار تھے چلے گئے۔ انھوں نے کچھ زمانے بعد ان کو تحصیل علم کے لیے دہلی بھیج دیا۔ وہاں کے علما و اساتذہ فارسی دان سے دنوں تک پڑھتے رہے۔ دہلی میں اس وقت غالب، مومن، صہبائی، آشفتہ، شیفتہ، ذوق موجود تھے شاعری کا چرچا زوروں پر تھا ہر طرف مشاعرے ہوا کرتے تھے قاضی صاحب کے مزرعۂ طبیعت میں فطری طور سے تخم شاعری دبا پڑا تھا جو ان صحبتوں کی آبیاری سے اُگا اور تیزی کے ساتھ اس کا نشو و نما ہونے لگا فکر سخن کرنے لگے سید تخلص قرار دیا مگر تمام اصناف سخن میں حمد و نعت و تاریخ گوئی ان کو پسند تھی اس لیے اسی میں کہتے تھے اور خوب خوب زور طبع دکھاتے تھے۔ فارسی و اردو دونوں پر قدرت حاصل تھی دونوں زبانوں میں آبکار افکار کو جلوہ نما کرتے تھے۔ تدریس کا بھی شوق تھا۔ فارسی کی دقیق کتابیں نہایت تحقیق سے پڑھاتے تھے اور عربی میں صرف و نحو و فقہ و اصول کی کتابیں شرح وقایہ نور الانوار حسامی فرایض شریعت تک پڑھاتے تھے مناظرے سے نہایت دل چسپی تھی پادریوں سے

اکثر مباحثہ کیا کرتے تھے، پادری عماد الدین کی کتاب نیاز نامہ کا نہایت چست جواب ''ہدایت شامہ'' بری قابلیت سے لکھا تھا۔ جب یہاں میلہ خدا شناسی موضع چاندا پور میں قایم ہوا تو آپ نہایت سرگرمی سے اس میں شریک ہوئے ایک مضمون جو اس جلسے میں پڑھنے کے لیے آپ نے لکھا تھا مولوی محمد قاسم صاحبؒ (1) نے اس کو بہت پسند کیا۔ صحف عہد عتیق وانجیل کے عمیق مطالعے سے مناظرہ ومباحثہ اہل کتاب کی ان میں خاصی لیاقت پیدا ہوگئی تھی جو خاص معرکوں ومناسب موقعوں پر جوش وسرگرمی کے ساتھ حمایت دین حق میں نمایاں ہوتی تھی۔

۱۸۵۷ء میں کتابِ حکومتِ انگریزی کا شیرازہ شکستہ ہوجانے پر نظم ونسق کے اوراق منتشر ہوگئے اور ہر جگہ جس نے قابو پایا حاکم بن گیا اس وقت نواب خان بہادر خان نے جو حاکم روہیل کھنڈ بن گئے تھے آپ کو منصفِ شاہ جہان پور مقرر کیا اس لیے بعد رفع غدر الزام بغاوت قایم ہوکر تحقیقات ہوئی اور چودہ سال کی قید بہ عبورِ دریائے شور حاکم نے تجویز کی جس کے بھگتنے کے لیے جزیرۂ انڈمن بھیجے گئے۔

خدا کی شان بے نیازی دیکھنے کے قابل ہے کہ جزیرۂ انڈمن جو مسکن دام و دد قدیم سے چلا آتا تھا وہ غدر کے انقلاب سے ارض العلم و بیت العزم بن گیا تھا۔ ہندوستان کے مشہور فضلا، نام ور شعرا، مستند اطبا، جادو نگار انشا پرداز، منتخب صناع اور اولوالعزم سپاہی وسردار قومی خدام وجان نثار بادۂ حبِ وطن کے مست وسرشار اسیرِ بلا ہوکر اس وحشت کدے میں مصیبت کے دن کاٹنے کے لیے بھیجے گئے۔ گویا ہندوستان کی قابلیت کا عطر اس بدنما بے ڈول شیشی میں اس غرض سے بند کر کے حبس دوام کی کاگ اس کے منہ پر لگائی گئی تھی کہ آیندہ مشامِ جانِ انسانی کو اس کی خوشبوئیں معطر نہ کرسکیں۔ يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ O (سورۂ نور:۴۴) ایسی حالت میں قاضی صاحب کے وہاں سے زندہ واپس آنے اور وطن کے خدمت کرنے کی کیا امید ہوسکتی تھی مگر مشیت ایزدی میں کچھ اور ہی تھا۔......

کرنل بروس اس وقت وہاں کے حاکم تھے ان کو اردو وفارسی سیکھنے کا شوق پیدا ہوا

(1) مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کی طرف اشارہ ہے۔

قاضی صاحب سے پڑھنے لگے اوران کی قابلیت ونیک مزاجی کے اثرات نے کرنل کی مہربانی آمیز توجہات کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا جس کی وجہ سے قاضی صاحب کی تکالیف شدیدہ میں کچھ خفت پیدا ہوئی۔ اسی زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا کہ قیدیوں نے مزدوری کم ملنے کی شکایت کر کے بلوہ کیا اور کرنل کے بنگلے پر چڑھ آئے، جس سے کرنل کو اپنی جان کا خوف پیدا ہوا۔ قاضی صاحب اس وقت کرنل کو پڑھا رہے تھے اس کی جان ضغطے میں دیکھ کر فوراً آپ بنگلے سے باہر آئے اور سرغنہ قیدیوں کو کچھ ایسی شیریں زبانی سے سمجھایا کہ ان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور وہ نرم ہو کر لوٹ گئے۔ اس خیر خواہی کے صلے میں کرنل نے ۱۸۶۱ء میں رپورٹ کر کے قاضی صاحب کی بقیہ سزا معاف کرادی اوران کو سرکاری خرچ سے وطن پہنچا دینے کی منظوری آ گئی، کرنل نے معزز عہدے کا لالچ دے کر روکنا چاہا، مگر آپ راضی نہ ہوئے اور چار برس بعد وطن واپس آ گئے اور یہاں پہنچ کر تدریس وتعلیم ومعمولی فرائض منصب قضا مثل نکاح خوانی وامامت عیدین وغیرہ انجام دینے لگے۔ جب مدرسہ عربیہ گورنمنٹ نے ہائی اسکول شاہ جہان پور کی عمارت میں کھولا تو کئی سال بعد ۱۸۷۵ء میں قاضی صاحب مدرس دوم مقرر ہوئے۔

قاضی صاحب کا خط نہایت پاکیزہ تھا نستعلیق ونسخ کے خوشنویس تھے۔ بارگاہ رسالت کے عاشق زار تھے نام محبوب خدا زبان پر آتے ہیں آب دیدہ ہو جاتے تھے۔ عشرہ محرم میں ''حدیقۃ الشہدا'' کسی شاگرد سے پڑھوا کر سنتے تھے اور زار زار روتے تھے۔ مولود شریف بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے تھے۔ صورت سے وقار وتمکنت عیاں ہوتی تھی۔ حلیم الطبع، ذہین، وجیہہ، با مروت وفیاض وخندہ پیشانی تھے اور ہر وقت مطمئن معلوم ہوتے تھے کبھی چیں بہ جبیں نہ ہوتے تھے شاگردوں سے نہایت شفقت ومحبت کرتے تھے، مولوی عبدالرحمٰن صاحب نقش بندی کے مرید تھے۔

مسوّدا وراق کو بھی ان کی شاگردی کا فخر حاصل ہے۔ پنج رقعہ، ابوالفضل، جوہر الترکیب انشائے طاہر وحید، طغرا، ظہوری، شریفیہ اور چند سبق ''قال اقول'' کے ان سے پڑھتے تھے۔

قاضی صاحب کو مرض الموت اس طرح شروع ہوا کہ مولوی عبدالغفور خان صاحب خلیفہ و نبیرہ مولوی عبدالرحمٰن صاحب نے مجلس مولود شریف منعقد کی، قاضی صاحب کو پڑھنے کے لیے مدعو کیا انھوں نے حسبِ معمول غایت ذوق وشوق سے نعت خوانی رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم شروع کی۔ اس جوش وخروش میں دل ودماغ پر کچھ ایسا اثر پہنچا کہ بہ حالت مولود خوانی محفل ہی میں فالج جانب چپ گرا، فوراً بے ہوش و بے حس ہو گئے، اور چند روز بعد اسی عارضے سے ۱۷ر جمادی الثانی ۱۲۹۳ھ (مطابق ۱۰ر جولائی ۱۸۷۶ء) کو انتقال فرمایا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ.

۶۶ سال کی عمر پائی مزار محلہ چمکنی میں ہے۔ مادۂ تاریخ وفات ''خواب گاہ سرفراز علی'' ہے۔ منشی منیر نے جو ایام اسیری انڈمن میں آپ کے رفیق تھے تاریخِ وفات حسبِ ذیل نظم کی ہے۔

وائے رفت آں قاضی شہر و سرافراز علی
زیں جہانِ بے ثبات و دارِ غم تیرہ مغاک

قاضی صاحب کا کلام اردو فارسی بہت تھا جو زیادہ ترمخمس ومسدس، ترجیع بند و ترکیب ورباعی بند کی شکل میں تھا۔ غزل بھی کہتے تھے، مگر کم! انھوں نے اپنا کلام کبھی مدون نہیں کیا۔ جب انڈمن کو جا رہے تھے تو جہاز میں ایک نظم ترکیب بند بہ طور مناجات فارسی میں کہہ کر مفتی عنایت احمد صاحب رفیق فی الطریق کو سنائی تھی جس کے چند شعر یہ ہیں:

مار از در مراں دل و جانم فدائے تو
اے مصطفیٰ تو شاہِ من و من گدائے تو
سید کہ شد اسیرِ بلا در ہوائے تو
ناز و برآں اسیری کہ باشد برائے تو
پیش تو چیست عقدہ کشائی کہ ماہ را
در کرد یک اشارۂ معجز نمائے تو

در دستِ تست داروے دارم درنگ چیست
اے منحصر رضائے خدا بر رضائے تو

کسی دوسرے موقع پر یہ رباعی کہی تھی۔

سید اگر آئے تجھے مشکل بھاری
کر جا کے مزار شہدا پر زاری
مردہ نہ سمجھ ان کو ذرا آنکھیں کھول
ان سوتوں سے ہیں فیض کے چشمے جاری

......☆......☆......

باہمہ عز و شرف اعزاز و شانِ افتخار
ساخت اہل شہر را غمگین زہجرِ درد ناک
بہر تار یخش بر آورد آہ و گفتہ ہاتفے
سوے چپ فالج گرافتد بگرداند ہلاک ❶

قاضی صاحب نے ۱۸۷۳ء میں جب کہ ہم ان سے پڑھا کرتے تھے، واقعۂ شہادت کربلا کو نظم کرنے کا ارادہ کیا اور اس کے لیے نیا مسلک اختیار کیا وہ یہ کہ پند نامہ سعدی معروف بہ کریما پر بند لگا کر اس کو مسدس کر دیا جاوے۔ فن سخن کا صحیح مذاق رکھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کس قدر دشوار کام تھا! کریما ایک اخلاقی نظم ہے۔ اس پر تاریخی مضمون اور وہ بھی واقعۂ کربلا کے سے درد انگیز داستان کو چسپاں کرنا اور خوبی وصفائی سے گرہ لگانا آسان بات نہ تھی مگر قاضی صاحب کے روزِ طبع نے اس دشوار گزار مرحلے کو نہایت آسانی سے طے کیا۔ ان کے توسنِ طبع نے اس سنگلاخ زمین میں وہ جولانیاں دکھائی ہیں کہ دیکھنے وسننے والوں کا دل بے اختیار داد دینے کے لیے بے چین ہو جاتا ہے۔ بعد اتمام قاضی صاحب نے اس مسدس کا نام ''نالۂ سید'' رکھا۔ ہنوز تمام نہ ہوا تھا کہ اس کی ہر طرف شہرت ہوگئی۔ مرثیہ خوانوں میں سے جس کے ہاتھ جس قدر بند آئے لے اڑا اور مجلس عزا کو گرمانے لگا۔ جب تمام ہوگیا تو شائقین نے اس کی

❶ متن میں دو ہی رباعیاں شامل گئی ہیں۔

نقلیں کرلیں چناں چہ اس وقت کی ایک کاپی ہمارے کتب خانہ میں بھی موجود ہے۔

قاضی صاحب کو اپنی کسی نظم ونثر کے چھپوانے یا شایع کرنے کا کبھی خیال نہ ہوا اس لیے مسدس کریما بھی عام طور سے شایع نہیں ہوا ان کی وفات کے بعد وہ گوہر بے بہا کہیں سے مولوی عبدالحکیم کے ہاتھ آ گیا ان حضرت نے مطبع اسٹار آف انڈیا۔ آرہ میں اس کو ۱۳۰۶ھ میں اپنے نام سے چھپوایا اور قانونی گرفت سے بچنے کے لیے لکھ دیا کہ بنیاد مسدس قاضی سرفراز علی شاہ جہان پوری نے ڈالی تھی۔ چند بند لکھے تھے۔ میں نے اس کو مکمل کیا ہے۔

چہ دلاور است دزدے کہ بہ کف چراغ داری

اپنے بیان کو سچ کرنے کے لیے انھوں نے چند بند اپنی طرف سے مستزاد کیے جو دوشالے میں ٹاٹ کا پیوند معلوم ہوتے ہیں۔ اب ہم قاضی صاحب کے چند بند جستہ جستہ نقل کرتے ہیں تاکہ قاضی صاحب کی قادر الکلامی کا اندازہ ہو سکے۔

مسدس کریما

نبی کے جگر دین حق کے امام　　حسین ابن حید علیہ السلام

وہ تھے گو مقدس مطہر تمام　　رہے عجز سے پر یہ کہتے مدام

کریما بہ بخشائے بر حالِ ما

کہ ہستم اسیرے کمندِ ہوا ❶

(۲)

مولوی صبیح الدین میاں خلیل شاہ جہان پوری

والد کا نام سید امانت علی محلہ قاضی خیل کے ساکن تھے اصلی وطن ترمذ تھا آپ کے مورث شیخ اللہ داد صاحب اورنگ زیب کے عہد سلطنت میں وارد ہندستان ہوئے عبدالہادی صاحب وسعد اللہ صاحب قاضی شاہ جہان پور آپ کے سلسلۂ اولاد سے تھے۔ چوں کہ سید امانت علی کا انتقال اپنے والد کے سامنے ہو گیا تھا، اس وجہ سے قاضی

❶ یہاں صرف ایک بند نقل کیا جاتا ہے۔

سعد اللہ کے بعد سید سرفراز علی قاضی شہر مقرر ہوئے آپ کی ولادت ۱۲۲۷ھ (۱۸۱۲ء) میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم شاہ جہان پور میں ہوئی، پھر ان کے ماموں منشی نیاز علی صاحب بلگرامی ڈپٹی کلکٹر نے ان کو تحصیل علم کے لیے دہلی بھیج دیا۔ وہاں کتبِ درسیہ کی تعلیم حاصل کی اس زمانے میں استاد ذوق، مومن خاں، مرزا غالب زندہ تھے ان حضرات کے فیضِ صحبت سے یہ بھی شعر کہنے لگے۔

سید تخلص اختیار کیا، شریعت کی پابندی کے سبب سے اپنی شاعری کو حمد ونعت تک محدود رکھا اردو فارسی دونوں زبانوں میں مشق سخن کرتے تھے۔ حسب روایت ''تاریخ مطیع'' مناظرے میں مہارت خوب تھی۔ پادری عماد الدین کی کتاب نیاز نامہ کا جواب نہایت معقول ہدایت شامہ لکھا تھا غدر ۱۸۵۷ء میں نواب خان بہادر خان رئیس بریلی کی طرف سے یہ شاہ جہان پور کے منصف مقرر ہوئے تھے جس کے عوض ان کو جزیرہ انڈمان کی ہوا کھانا پڑی۔ ان کی خوش قسمتی سے کرنل بروس جو وہاں کا حاکم تھا اس کو فارسی پڑھنے کا شوق ہوا اور اس نے آپ کی علمی قابلیت کا حال معلوم کر کے ان سے فارسی پڑھنا شروع کی اتفاق سے قیدیوں نے کم شرح اجرت ملنے پر بلوہ کر کے کرنل کے بنگلہ کو گھیر لیا قاضی صاحب اس وقت بنگلہ پر موجود تھے انھوں نے بلوائیوں کے سرغنوں کو سمجھا بجھا کر ہنگامہ کو فرو کر دیا۔ اس کے صلے میں کرنل نے رپورٹ کر کے سید صاحب کی رہائی کا حکم کرا دیا۔ کرنل چاہتا تھا کہ قاضی صاحب وطن نہ جاویں اس نے ایک معقول جگہ پر ان کا تقرر کرنا چاہا مگر انھوں نے وطن اور عزیزوں کی محبت میں اس کو منظور نہیں کیا اجازت لے کر وطن چلے آئے اور اپنے فرایض منصبی کے ادائیگی میں مشغول ہو گئے طلبا کو درس بھی دیتے تھے۔ ۱۸۷۵ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول میں عربی کا درجہ کھولا گیا تو یہ مدرس دوئم مقرر ہو گئے تھے قاضی صاحب کو حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے دلی عشق تھا میلاد بڑے ذوق شوق سے پڑھا کرتے تھے آپ کا کلام نعتیہ زاید ہے جب میلاد پڑھتے تو اثنائے بیان میں بے خود ہو جاتے مولوی عبد الرحمٰن صاحب نقش بندی سے بیعت تھے مولوی عبد الغفور خان صاحب نبیرہ عبد الرحمٰن صاحب نے محفل میلاد منعقد کی تھی قاضی صاحب نے بھی حسب

معمول نعت خوانی شروع کی اور بیان نعت میں کچھ ایسی بے خودانہ حالت ان پر طاری ہوئی کہ اثنائے بیان میں ان پر فالج کا اثر ہو گیا جس میں چند روز علیل رہ کر بہ تاریخ ۱۷ ر جمادی الثانی ۱۲۹۳ھ (۱۰ ر جولائی ۱۸۷۶ء) کو ۶۶ سال کی عمر میں واصل بہ حق ہوئے۔ محلہ چمکنی میں اس عاشق رسول کا مزار پر انوار ہے۔ کلام بہت تھا مگر جمع نہیں کیا تھا جب اسیر ہو کر جزیرہ انڈمان کو جا رہے تھے راستہ میں ایک مناجات موزوں کی تھی اس کے چند اشعار ملے ہیں جو درج کیے جاتے ہیں یہ اسی عشق رسول کا طفیل تھا کہ آپ تین سال بعد قید فرنگ سے چھوٹ گئے تھے۔

منشی احسان خاں مختار اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ متھراداس سرشتے دار حاکم پورٹ بلیر کی تحریک سے آپ نے جزیرہ انڈمان کی ایک مبسوط تاریخ مرتب کر کے سرشتہ دار کے نام سے مشتہر کی تھی اور اسی سرشتے دار کی وساطت سے کرنل بروس کی تعلیم پر تقرر رہوا تھا۔

نعتیہ رباعی

سید اگر آئے تجھے پیش مشکل بھاری — کر جاکر مزار شہدا پر زاری
مردہ نہ سمجھ ان کو ذرا آنکھیں کھول — ان سوتوں سے ہے فیض کا چشمہ جاری

نعت کے دو شعر

محشر میں خوف ہوگا جو رب کے عتاب کا — ہر شخص منہ تکے گا رسالت مآب کا
لب اُس کے واں کھلیں گے شفاعت کے واسطے — یارا جہاں نہ ہوگا سوال و جواب کا

غزل

جان نثار قدم جانِ جہاں ہونے دو — عاشقوں میں مجھے با نام ونشان ہونے دو
آگے اس ماہ عرب کے نہیں پانے کے فروغ — حشر میں مجمع خوبانِ جہاں ہونے دو
سید اس خانۂ دل میں نہ کرو آہ کو ضبط — در گہِ یار میں دیکھو نہ دھواں ہونے دو

قاضی صاحب نے کریما کو تضمین کیا تھا ۱۳۰۶ھ میں مولوی عبدالحکیم آروی نے اس میں برائے نام تصرف کر کے اپنے نام سے چھپوا دیا اس سے سوائے رسوائی کے اس کو کوئی فایدہ نہیں ہوا، کیوں کہ قاضی صاحب کا یہ مسدس مشہور ہو چکا تھا اور

لوگوں کے پاس اس کی کاپیاں تھیں۔ یہ بھی آپ کی حسن نیت کا نتیجہ ہے کہ وہ اس بہانے سے چھپ کر شایع ہوگیا۔

(تاریخ صبیح: صفحہ ۶۸-۲۶۶، ماخوذ از تاریخ مطبع وتاریخ احسان خاں)

(۳)

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

قاضی سرفراز علی ابن امانت علی ❶، شاہ جہان پور کے ایک قدیم خاندان کے رکن تھے۔ ابتدائی تعلیم امروہہ میں حاصل کی پھر دہلی گئے اور وہاں علمائے معروف کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں انقلابی حکومت کی طرف سے منصف مقرر ہوئے جس کے نتیجے میں حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ہوئی، جزایر انڈمان میں ایک انگریز کرنل بروس نے ان سے فارسی پڑھی، کچھ مدت کے بعد ان کی رہائی ہوگئی۔ ۱۸۷۵ میں گورنمنٹ ہائی اسکول شاہ جہان پور میں عربی کے مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۷ / جمادی الثانی ۱۲۹۳ھ م ۱۸۷۶ء کو ان کا انتقال ہوا قاضی صاحب کو شعرو شاعری کا شوق تھا۔ زیادہ تر نعت میں لکھتے تھے سید تخلص تھا۔

متھرا داس سرشتہ دار حکم پورٹ بلیر کی تحریک پر قاضی سرفراز علی نے جزایر

❶ بعض حضرات نے قاضی سرفراز علی شاہ جہان پوری اور امام المجاہدین مولوی سرفراز علی گورکھ پوری کو ایک ہی شخصیت سمجھ لیا ہے۔ اور مشارکت اسمی کی وجہ سے دھوکا کھایا ہے۔ (العلم، کراچی اپریل تا ستمبر ۱۹۵۶ء) حال آں کہ دونوں جداگانہ شخصیتیں ہیں۔ اس غلط فہمی کی شاید یہ وجہ ہو کہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے آغاز میں امام المجاہدین مولوی سرفراز علی گورکھ پوری بھی شاہ جہان پور میں انقلابی تیاریوں میں مصروف تھے۔ (تاریخ شاہ جہان پور، از مولوی صبیح الدین: صفحہ ۳۳۱)

امام المجاہدین نے جنرل بخت خان کے ساتھ مل کر دہلی میں جنگ آزادی کو کامیاب بنانے میں پوری پوری کوشش کی۔ سقوط دہلی کے بعد لکھنؤ پہنچے اور پھر نیپال کی ترائی میں چلے گئے، امام المجاہدین کے حالات تفصیل سے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے متعلقہ لٹریچر میں موجود ہیں، ان کو قاضی سرفراز علی شاہ جہان پوری سے مخلوط کرنا درست نہیں۔

انڈمان کی ایک مبسوط تاریخ لکھی تھی۔

قاضی سرفراز علی جب قید ہو کر انڈمان پہنچے تو وہاں انھوں نے ایک مناجات لکھی، جس کے چند شعر مؤلف تاریخ شاہ جہان پور نے نقل کیے ہیں جو درج ذیل ہیں:

مار از در مراں دل و جانم فدائے تو
اے مصطفیٰ تو شاہِ من و من گدائے تو
سید کہ شد اسیرِ بلا در ہوائے تو
ناز و برآں اسیری کہ باشد برائے تو
پیش تو چیست عقدہ کشائی کہ ماہ را
در کرد یک اشارۂ معجز نمائے تو
در دستِ تست داروے دارم درنگ چیست
اے منحصر رضائے خدا بر رضائے تو

ان حضرات کے علاوہ اور بھی بہت سے علما و مشائخ جزائر انڈمان ونکوبار میں اسیر ہو کر پہنچے تھے۔ ان میں شاہ بولن سیوہاروی (ف ۲ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ) مولوی احمد اللہ صادق پوری (ف ۱۲۹۸ھ م ۱۹۱۴ء تقریباً) مولوی مبارک علی الہ آبادی، مولوی امیر الدین ساکن مالدہ، مولوی تبارک علی، مولوی عبدالرحیم (ف ۱۳۴۱ھ م ۱۹۲۲ء) میاں عبدالغفور (ف ۱۵-۱۹۱۴ء تقریباً) مولوی مبارک علی، مولوی محمد ابراہیم منڈل، مولوی محمد یحییٰ علی (ف ۱۲۸۴ھ م ۱۸۶۸ء) شیخ فصاحت اللہ بدایونی، شیخ سلیم شیخ آیت اللہ بدایونی اور شیخ فضل احمد بدایونی مولوی قطب شاہ بریلوی وغیرہ کے نام خاص پر قابل ذکر ہیں اگرچہ ان بزرگوں کی کوئی تصنیف وتالیف جزائر انڈمان کے دوران قیام کی نہیں ملتی مگر ان بزرگوں کی اصلاحی تبلیغی سرگرمیاں برابر وہاں جاری رہیں۔" (جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات وشخصیات): صفحہ ۶۱-۴۵۹)

(۴)

مفتی انتظام اللہ شہابی

مولوی سرفراز علی شاہ جہان پوری علمائے وقت سے تھے۔ مولوی سید احمد شہید بریلوی کے مرید تھے۔ درس وتدریس کے ساتھ شہر بہ شہر بیعت جہاد لیتے اور فوجیوں کو بھی مرید کرتے۔ چناں چہ سلطان پور آپ جب گئے تو وہاں صوبے دار بخت خاں آپ کے مرید ہوئے اور جو کچھ انقلاب ۱۸۵۷ء میں ان کا کارنامہ ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ مولوی سرفراز علی ہی کا یہ کارنامہ تھا کہ اودھ کے علاقے میں شوقِ جہاد پیدا کیا اور ہزار ہا مجاہدین سر بہ کف میدانِ عمل میں نکل آئے۔ مولانا احمد اللہ شاہ کے بعد یہی واجب التعظیم شخصیت ہے جس نے دلی اور لکھنؤ کے لیے ہزار ہا مجاہدین تیار کر دیے چناں چہ ان کو امیر المجاہدین کا لقب دیا گیا ان کی سوانح عمری راقم سطور نے مرتب کر دی ہے جو عنقریب شایع ہونے والی ہے۔

نوٹ: مفتی انتظام اللہ شہابی کا ایک مضمون متعلق ''مفتی رسول بخش کاکوری شہید'' کے بارے میں جو العلم۔ کراچی (جنگ آزادی نمبر اپریل تا جون ۱۹۵۷ء) میں چھپا ہے، مولوی سرفراز کے بارے میں یہ اقتباس اسی سے ماخوذ ہے۔

منشی منیر

منشی منیر کہاں کے باشندہ اور کس کے خلفِ صدق تھے، لیکن یہ معلوم ہے کہ قوم پرور، محبِ وطن اور صاحبِ عزیمت شخصیت کے مالک تھے۔ جزائر انڈمان میں قاضی سرفراز علی کے رفیق تھے۔ اور شاہ جہان پور پہنچ کر بھی ان سے قریبی تعلق تھا۔ اور ۱۰ر جولائی ۱۸۷۶ء کے بعد تک وہ ضرور زندہ تھے۔ حضرت قاضی مرحوم پر ان کا قلعۂ تاریخ وفات یادگار ہے۔ خان بہادر مولوی مطیع اللہ خان نے قاضی صاحب ہی کے تذکرے میں لکھا ہے:

"منشی منیر نے جو ایامِ اسیری انڈمان میں آپ کے رفیق تھے، تاریخ وفات حسب ذیل نظم کی ہے:

وائے رفت آں قاضی شہر و سرافراز علی — زیں جہان بے ثبات و دارِ غم تیرہ مفاک
باہمہ عز و شرف اعزاز و شانِ افتخار — ساخت اہل شہر را غمگیں زہجر دردِ ناک
بہر تاریخش بر آورد آہ و گفتہ ہاتفے — سوے چپ فالج گرافتد بگرداند ہلاک

ان کے شاہ جہان پوری ہونے کا ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان کے تذکرے میں ان کا نام نمایاں اور ان کی یہ چند خصوصیات درج کردی جائیں۔ (ا۔س۔ش)

مولوی سید فضل حق شاہ جہان پوری ثم رام پوری

(۱)

حافظ احمد علی خاں شوق

سید فضل حق ولد سید عبداللہ عرف ننھے میاں از اولاد حضرت سید عبدالرزاق خلف اکبر حضرت شیخ جیلانی علیہ الرحمہ۔ رام پور میں جناب سید احمد علی خاں صاحب بہادر کے عہد میں پیدا ہوئے۔ کتب فارسی وعربی مولوی عبداللہ و مولوی عبدالرحمٰن اولاد مولانا مدن وسدن شاہ جہان پوری سے پڑھیں۔ سید شاہ سیادت علی صاحب نبیرہ سید عبدالرزاق صاحب بانسوی قدس سرہٗ سے بیعت تھے۔ بڑے پرہیزگار اور برگزیدہ تھے۔ تمام عمر کسی نے ان کے جسم کو برہنہ نہیں دیکھا۔

نواب جنت آرام گاہ کے عہد میں نایب سر رشتے دار محکمہ صدر تھے۔ پھر بریلی کی کمشنری کے سر رشتے دار ہو گئے۔

ایام غدر میں پیلی بھیت یا بہیڑی میں تحصیل دار تھے۔ اُسی زمانے میں بہ نسبت جہاد مرزا فیروز شاہ کے شریک ہو گئے۔ نواب فردوس مکاں نے ہر چند چاہا کہ رام پور چلے آئیں۔ آپ نے یہ عرض کیا کہ اب تو تمنائے شہادت ہے چناں چہ جھانسی میں شہید ہوئے کوئی اولاد ذکور نہ تھی۔ (تذکرہ کاملان رام پور: صفحہ ۳۲۰)

(۲)

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد میں تھے ان کے بزرگ ابو اسحاق ابراہیم حموی گیلانی عہد شاہ جہانی میں وارد شاہ جہان پور ہوئے وہاں یہ خاندان نہایت معزز و محترم ٹھہرا اس خاندان کے کچھ لوگ رام پور میں بھی آباد ہو گئے۔ (تاریخ شاہ جہان پور: جلد دوم، صفحہ ۷) مولوی سید فضل حق کے والد کا نام سید عبداللہ عرف ننھے میاں تھا سید فضل حق

نواب احمد علی خاں کے زمانے میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم رام پور اور شاہ جہان پور دونوں جگہ پائی۔ ان کے اساتذہ میں مولوی عبداللہ اور مولوی عبدالرحمٰن فرزندان مولوی نظام الدین ابن مولوی مدن شاہ جہان پوری نہایت ممتاز ہیں۔ مولوی نظام الدین کی ایک صاحب زادی فضل حق صاحب کے بھائی مولوی سید مبین میاں صاحب ڈپٹی کلکٹر کی والدہ تھیں۔ (ایضاً: صفحہ ۱۵۷)

سید فضل حق شاہ سیادت علی بانسوی (نبیرہ شاہ عبدالرزاقؒ) سے بیعت تھے۔ نہایت پرہیزگار اور برگزیدہ تھے تمام عمر کسی نے ان کے جسم کو برہنہ نہیں دیکھا۔ شروع میں رام پور میں نایب سرشتے دار محکمۂ صدر کی حیثیت سے ملازم تھے۔ اس کے بعد انگریزی ملازمت اختیار کر لی اور بریلی کی کمشنری میں سرشتے دار ہو گئے۔ بعد ازاں تحصیل داری کے عہدے پر مقرر ہوئے جنگ آزادی میں مردانہ وار شرکت کی۔ نواب خان بہادر خاں کی طرف سے پیلی بھیت میں تعینات رہے۔ نینی تال میں انگریزوں کے خلاف جو مہمات بھیجی گئیں ان میں سے کئی مہمات میں فضل حق صاحب نے حصہ لیا۔ انقلابی حکومت کی طرف سے محمدی میں چکلے دار رہے، سقوطِ بریلی کے بعد شاہ زادہ فیروز شاہ کا ساتھ دیا۔ تمام معرکہ آرائیوں میں حصہ لیا۔ بلکہ فوج کی افسری کے فرایض انجام دیے اور جھانسی کے کسی معرکے میں شہید ہوئے۔

(تذکرہ کاملان رام پور: صفحہ ۳۲۰)

یہاں یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ جنگ آزادی کے بعد جب علامہ فضل حق خیرآبادیؒ کا مقدمہ عدالت میں چل رہا تھا اور اس زمانے کے اخبارات علامہ فضل حق سے متعلق مختلف خبریں شایع کر رہے تھے تو ان خبروں میں روہیل کھنڈ سے متعلق مولوی سید فضل حق شاہ جہان پوری کی انقلابی و جنگی سرگرمیاں ہم نام ہونے کی وجہ سے علامہ فضل حق خیرآبادی کے سر منڈھ دی گئیں۔ ظاہر ہے اس طرح علامہ خیرآبادی کا مقدمہ اور خراب ہو رہا تھا۔ چناں چہ اس سلسلے میں علامہ (فضل حق) خیرآبادی نے نواب یوسف علی خاں رئیس رام پور کو ایک خط لکھا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں [1]:

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ماہ نامہ تحریک دہلی، اگست ۱۹۵۷ء

''فدوی رابعلت نوکری خان بہادر خاں و نظامت پیلی بھیت و چکلہ
داری محمدی وافسری لشکر باغی ماخوذ کردہ اند حال آں کہ فدوی ازیں ہر سہ
امر محض بری است ومنشاء مواخذہ آنست کہ شخصے میر فضل حق نام از سادات
شاہ جہان پور کہ قبل ازیں در سرکار ابدقرار بندگان عالی ملازم ماندہ سرشتہ
داری پیلی بھیت ماخوذ شدہ وزمانے تحصیل دار آنولہ و پیلی بھیت ماندہ بود
در ابتلاے غدر از طرف خاں علی خاں چکلے داری محمدی شدہ پس از زمانے
بافسری کدامی لشکر باغی ہمراہ فیروز شاہ آں طرف جمن فرار کرد، عزیزان
اودر سرکار کمپنی بہ عہد ہاے جلیلہ ماموراند چناں چہ برادر حقیقی اومولوی مبین
ڈپٹی کلکٹر سہارن پور بود، مہتمان اخبار خانہ خراب ناواقف ازیں تفصیل کہ
او شخصے دیگر است وفدوی از شیوخ خیر آباد شخصے دیگر در اخبار نامہا حال
نظامت پیلی بھیت ومحمدی وافسر لشکر وفرار او بافیروز شاہ آں طرف جمن
نوشتہ بعض۔

کہ برادرِ حقیقی اودر سرکار مہاراجہ پٹیالہ نوکر و برادر دیگرش در سہارن پور ڈپٹی
کلکٹر است وحاکمان اینجا باشتباہ ہمان مولوی فضل حق کہ ہم نام و در بعضے
علامات شریکِ فدوی است۔فدوی را محض بے جرم مقید کردہ اند۔''

علامہ خیر آبادی نے اپنے بیان میں بات بیان کی ہے وہ فرماتے ہیں:
فضل حق ایک اور شخص کا نام ہے مجھے اس کی جگہ گرفتار کرلیا گیا ہے وہ آج
کل (شاہ زادہ) فیروز شاہ (ابن بہادر شاہ) کے ساتھ ہے یہ (فضل حق)
سابق میں آنولہ کا تحصیل دار تھا اور اس نے خان بہادر خان اور بیگم
(حضرت محل) کی ملازمت بھی کی ہے وہ ذات کا سید اور شاہ جہان پور کا
رہنے والا ہے۔'' (ملاحظہ ہو تحریک دہلی، جون ۱۹۶۰ء: صفحہ ۱۲)

یہی بات صفائی کے گواہوں میں سے بعض نے کہی۔ (ایضا: صفحہ ۱۲) سید فضل حق
بہت اچھے خوش نویس تھے خط نستعلیق خوب لکھتے تھے۔

حکیم عبدالحی خان

مولوی محمد صبیح الدین میاں خلیل

والد کا نام حافظ مطیع اللہ خاں تھا۔ نسباً محمد زئی پٹھان تھے۔ ان کے مورث اعلا محلہ یونس خیل میں آباد تھے۔ یہ خاندان معزز اور نامور تھا۔ عبدالصمد خان سوداگر اور ان کے بیٹے اکبر علی خان اسی خاندان سے تھے ان کی ریشم کی تجارت کی کوٹھیاں ڈھاکا، بھاگل پور، کلکتہ، مرزاپور وغیرہ میں تھیں۔ اکبر علی خان نے مرزاپور میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی اولاد اب تک مرزاپور میں آباد ہے۔ یہ دونوں باپ بیٹے نہایت دین دار نامور اور امیر وکبیر تھے۔ محلہ یونس خیل میں ان کے عالی شان مکانات تھے، جو دریا برد ہوگئے۔ عبدالصمد خاں کی قبر انھیں کی تعمیر کردہ مسجد کے قریب ہے، ان کے دوسرے بھائی بہادر علی خان کی اولاد سے حکیم عبدالحی خان ومولوی عبدالقیوم خان تھے مولوی عبدالقیوم خان صاحب نے فراغ مولوی ارشاد حسین صاحب رام پوری کی خدمت میں رہ کر حاصل کیا تھا۔ یہ عابد زاہد، منکسر المزاج، کم سخن، پابندِ اوقات اور نہایت نیک نفس بزرگ تھے۔ نوجوانی میں انتقال کیا۔ عبدالرب خان وعبدالبر خاں بیٹے بقید حیات ہیں۔ ان کے والد حافظ مطیع اللہ خاں کے دادا نے بوجہ قرابت خاندان حافظ خیل کے محلہ خلیل غربی میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ بہ زمانۂ غدر اپنے پھوپی زاد بھائی عبدالرحیم خان خلف ناصر خاں کے ہمراہ بہ نیت غزا بریلی کی طرف چلے گئے۔

اور کسی لڑائی میں شہید ہوگئے۔ حافظ مطیع اللہ خان نے اپنے پھوپھا مولوی محمد امین خان صاحب ومولوی عبدالرحمٰن خان صاحب سے درسیہ کتابیں پڑھی تھیں۔

حکیم عبدالحی خان صاحب کے چچا خان علی خان ضلع بریلی میں غدر سے پہلے تحصیل دار تھے۔

غدر میں نواب خان بہادر خان بریلوی کی ملازمت کرلی تھی۔ جب انگریزی

حکومت روہیل کھنڈ میں پھر قایم ہوگئی تو اندیشہ باز پرس سے جنگل کی طرف چلے گئے اور اسی طرف انتقال ہوگیا۔ ان کے بیٹے احمد علی خان گورنمنٹ میں تحصیل دار تھے اور احمد علی خاں کے بیٹے محمد علی خاں ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ حکیم صاحب طبابت بہ طور پیشے کے کرتے تھے اور اپنے عزیزوں سے بھی فیس لے لیتے تھے۔ ان کا مقولہ تھا کہ غیر طبیب فیس لے جائے تو اپنا کیوں محروم رہے مطب میں کوئی خاص شہرت نہیں تھی۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند حج وزیارت سے مشرف ہو چکے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں لاولد انتقال کیا۔

(تاریخ صبیح: صفحہ ۸-۲۰۷)

مولوی عبدالرحمٰن

مولوی عبداللہ اور مولوی عبدالرحمٰن دونوں مولوی نظام الدین کے بیٹے اور مولوی مدن شاہ جہان پوری کے پوتے تھے۔ تاریخ مطیع کے حوالے سے مولوی محمد صبیح الدین نے اپنی تاریخ شاہ جہان پور میں لکھا ہے کہ مولوی عبداللہ اور مولوی عبدالرحمٰن۔ دونوں بیٹوں نے اپنے والد مولوی نظام الدین سے پڑھا تھا۔ اور مولوی احمد خان ولایتی کے قول کے مطابق استعداد علمی میں مولوی عبدالرحمٰن کا پایہ مولوی عبداللہ سے بہت بلند تھا۔

مولوی عبدالرحمٰن صاحب منصفی کا امتحان دے کر منصف ہو گئے تھے اور ترقی کر کے صدر الصدوری پر پہنچے تھے۔ زمانۂ غدر میں وہ کان پور میں تعینات تھے۔ نانا راؤ نے ایک محضر جو انگریزوں کے خلاف مرتب کرایا تھا، اس پر ان سے بھی دستخط کرا لیے تھے۔ جب غدر فرو ہوگیا تو یہ حاضر ہوئے کیوں کہ یہ اپنے آپ کو باغی نہیں سمجھتے تھے۔ مگر وہ زمانہ مارشل لا کا تھا۔ عذر نہیں سنا گیا اور ان کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

عبدالکریم

آپ کے دو بیٹے عبدالکریم میاں اور عبدالرحیم میاں تھے۔ عبدالکریم میاں غدر میں غازیوں کے ہم راہ شریک ہو کر کسی جنگ میں کام آئے۔ ان کی اولاد نہیں تھی۔

عبدالرحیم میاں کی اولاد میں عبدالحکیم سیف ہیں۔

(تاریخ صبیح: مولوی نظام الدین کے ذکر میں، صفحہ ۱۵۷-۱۵۶ سے ماخوذ)

عبدالکریم میاں مولوی عبدالرحمٰن کے بیٹے، مولوی نظام الدین کے پوتے اور مولوی مدن کے پڑپوتے تھے۔ ان کا ذکر مولوی عبدالرحمٰن کے ترجمے میں آیا ہے ان کے والد مولوی عبدالرحمٰن ایک محضر پر دستخط کرنے کے جرم میں جو انگریزوں کے خلاف نانا راؤ نے تیار کرایا تھا، پھانسی پر چڑھا دیے گئے تھے۔

عبدالرحمٰن کے بھی دو بیٹے عبدالکریم میاں اور عبدالرحیم میاں نامی تھے۔ عبدالکریم نے غازیوں کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف جہاد میں حصہ لیا تھا اور کسی جنگ میں کام آگئے تھے۔ (تاریخ صبیح: مولوی نظام الدین کے ذکر میں، صفحہ ۱۵۷-۱۵۶ سے ماخوذ)

(۲)

مولوی عبدالرحمٰن وعبدالکریم میاں

ابوسلمان شاہ جہان پوری

مولوی عبدالرحمٰن مولوی نظام الدین کے بیٹے اور مولوی موسوم بہ سید مجدد الدین احمد شاہ جہان پوری کے پوتے ہیں۔ مولوی مدن کے چھوٹے بھائی سعید الدین احمد عرف مولوی سدن تھے۔ مولوی عبدالرحمٰن کمپنی کی طرف سے کان پور میں صدر الصدور تھے۔ جنگ آزادی وطن میں حصہ لیا تھا اور پھانسی پر چڑھا دیے گئے تھے۔ ان کے دو بیٹے عبدالکریم میاں اور عبدالرحیم میاں تھے۔ اول الذکر نے بھی جہاد آزادی میں حصہ لیا تھا اور شہادت پائی تھی۔

ان کے خاندان کا تعلق بخارا سے تھا۔ سید ودود اللہ نے اپنی بیوی اور بیٹے سید عبدالرسول کو ساتھ لے کر ہندوستان کا سفر کیا تھا اور شاہ جہان پور کو جاے سکونت قرار دیا تھا۔ مولوی صبیح الدین میاں نے اپنی تاریخ شاہ جہان پور میں لکھا ہے کہ سید عبدالرسول ملا نظام الدین صاحب فرنگی محلی کے شاگرد اور مرید تھے اور ان کے بیٹے مولوی محمد طاہر عرف موتی میاں حاجی صبغت اللہ خیر آبادی کے تلمیذِ رشید اور دین و دیانت وتقویٰ وعبادت میں یگانۂ روزگار تھے۔

موتی میاں کے تین بیٹے مولوی منو میاں، مولوی مدن اور مولوی سدن تھے۔ تینوں بھائی بڑے نام ور عالم اور ذی وجاہت وعالی رتبہ ہوئے۔

❁ مولوی منوں میاں بعد فراغ دربار نواب عماد الملک غازی الدین خان فیروز جنگ وزیر عالم گیر ثانی بادشاہ غازی کے مصاحب ہوئے پھر کمپنی کی طرف سے مرشد آباد کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔

❁ منجھلے بیٹے مجدد الدین احمد عرف مولوی مدن جید عالم فاضل، جامع معقول ومنقول تھے۔ خصوصاً معقولات میں ان کا پایہ بہت بلند تھا اور پورے ہندوستان میں

ان کے علم و فضل کا ڈنکا بج رہا تھا۔

❁ مولوی سدن کا اصلی نام سدید الدین احمد تھا، اپنے بھائی کی طرح معقولات و منقولات میں یگانہ روزگار تھے۔

مولوی مدن کے صرف ایک بیٹے مولوی نظام الدین تھے۔ اور ان کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے مولوی عبداللہ اور مولوی عبدالرحمٰن نامی تھے۔ صبیح الدین میاں نے تاریخ مطبع کے حوالے سے لکھا ہے کہ دونوں بھائیوں نے اپنے والد سے پڑھا تھا اور استعداد علمی میں مولوی عبدالرحمٰن کا پایہ مولوی عبداللہ سے بہت بڑھا ہوا تھا۔

مولوی عبداللہ نے کمپنی کی ملازمت کرلی تھی۔ ابتدا میں ناظم کلکٹری بدایوں ہوئے پھر ترقی کر کے صدر الصدور ہوگئے تھے۔ علی گڑھ سے پنشن پا کر وطن مالوف شاہ جہان پور آگئے تھے۔ مولوی عبداللہ صدر الصدور کے دو بیٹے تھے۔

۱۔ مولوی محمد طاہر عرف موتی میاں۔ انھوں نے سرکاری ملازمت نہیں کی البتہ آنریری مجسٹریٹ کی خدمت قبول کرلی تھی۔ ان کے بیٹے کا نام صبیح الدین میاں نے نہیں لکھا، لیکن پوتے کے بارے میں لکھا ہے: محمد احمد میاں عرف منوں میاں آنریری مجسٹریٹ، موتی میاں کے پوتے ہیں۔

۲۔ مولوی عبداللہ صدر الصدور کے دوسرے بیٹے محمد اسماعیل میاں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ان کے بڑے بیٹے محمد اختر میاں تھے۔ بہ قول مولوی صبیح الدین ''لندن بغرض تعلیم گئے تھے، مگر عیش و طرب میں پڑ کر بلا تکملۂ علوم واپس آئے اور تایب ہوکر دنیا پر لات ما کر درویش ہوگئے۔ مولوی شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی سے بیعت تھے۔ وہ رانی پور ریاست خیر پور (سندھ) میں مقیم ہوگئے۔ وہاں کے لوگ آپ کے بے حد معتقد تھے۔ ..... ۲۲ر نومبر ۱۹۲۲ء کو واصل بہ حق ہوئے اور پیر محمد صالح شاہ کے آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے۔ (تاریخ شاہ جہان پور (حصہ دوم): صفحہ ۳۲-۱۳۱)

مولوی نظام الدین ابن مولوی مدن کے دوسرے بیٹے مولوی عبدالرحمٰن صدر الصدور تھے۔ مولوی صبیح الدین میاں اپنی ''تاریخ شاہ جہان پور'' میں لکھتے ہیں:

''استعداد علمی میں مولوی عبدالرحمٰن کا پایہ (اپنے بھائی) مولوی عبداللہ

سے بہت زیادہ تھا۔ مولوی عبدالرحمٰن مفتی کا امتحان دے کر منصف ہو گئے تھے اور ترقی کر کے صدر الصدوری پر پہنچے تھے۔ زمانہ غدر میں وہ کان پور میں تعینات تھے۔ نانا راؤ نے ایک محضر انگریزوں کے خلاف مرتب کرایا تھا۔ اس پر ان سے بھی دستخط کرا لیے تھے۔ جب غدر فرو ہو گیا تو یہ حاضر ہوئے کیوں یہ اپنے آپ کو باغی نہیں سمجھتے تھے۔ مگر وہ زمانہ مارشل لا کا تھا۔ عذر نہیں سنا گیا اور ان کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔"

ان کے دو بیٹے تھے؛ عبدالکریم میاں اور عبدالرحیم میاں؛

"عبدالکریم میاں غدر میں غازیوں کے ہمراہ شریک ہو کر کسی جنگ میں کام آئے۔ ان کی اولاد نہیں تھی۔"

"دوسرے بیٹے عبدالرحیم میاں کی اولاد میں عبدالحکیم میاں سیف ہیں۔"

(ایضاً: صفحہ ۱۵۷)

سیف اللہ خاں

یہ تلہر ضلع شاہ جہان پور کے باشندے تھے۔ برٹش دور میں بریلی میں جیلر تھے، نواب بہادر خان بہادر سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے اور ان ہی نے ان کو جیلوں کا سپرنٹنڈنٹ بنا دیا تھا۔ قومی حکومت کے اچھے نظام کے قیام سے خاص دل چسپی تھی۔ عوام کے ہمدرد اور بہادر خان بہادر کے اچھے مشیر تھے۔ اہل لوگوں کی سفارش اور ان کی ضمانت دیتے تھے۔ غلام محمد خان کو تلہر کا ناظم انھی نے بنوایا تھا۔ انتظامیہ وغیرہ کی ذمے داری کے انھوں نے کئی لوگوں کی ضمانت دی تھی۔ مشورے کی کانفرنسوں (میٹنگز) میں ان کی شرکت کا ذکر آیا ہے۔

(فریڈم اسٹرگل...... جلد ۵، صفحہ ۳۰۰، ۶۰۳، ۶۲۲) (ا۔س۔ش)

حکیم محمد حسین ضیا شاہ جہان پوری

مولانا امداد صابری دہلوی

حکیم محمد حسین صاحب کے جد امجد حافظ رحمت اللہ خاں والی کٹھیر تھے اور دادا نواب محبت خان تھے جو علوم عربیہ میں علمائے عصر سے سبقت لے گئے تھے۔ فارسی میں استادوں کے استاد تھے۔ نیز زبان سنسکرت میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے۔ عربی فارسی، پشتو، اور اردو میں بہ کثرت یادگار کلام تھا جو ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں تلف ہو گیا۔ ان کی ایک مثنوی اسرار محبت مشہور تھی۔ فارسی قواعد کا ایک آمد نامہ اور ایک بڑی نعت بھی ترتیب دی تھی۔ فنون سپہ گری کے ماہر تھے۔ علم موسیقی بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ اکثر نواب آصف الدولہ ان کو دور ہی سے دیکھ کر فرماتے تھے کہ ''آؤ برادر آؤ'' نواب محبت خاں وجیہہ وشکیل تھے۔ ان کی شادی تحصیل فرید پور ضلع بریلی میں عبدالستار خان کمال زئی کی صاحب زادی کے ساتھ ہوئی تھی۔ نواب محبت خان خواجہ میر درد، جرأت اور حیرت کے شاگرد تھے۔ ۵۹ سال کی عمر میں ۱۳ر صفر ۱۲۲۴ھ مطابق ۱۸۰۹ء کو لکھنؤ میں انتقال فرمایا۔ متصل باغ کشور گنج میں دفن ہوئے۔

نواب محبت خان کے اٹھارہ صاحب زادہ تھے۔ چھوٹے صاحب زادے شمس الدین خان تھے جن کے دو صاحب زادے قمر الدین خان اور حکیم محمد حسین خاں ضیا تھے۔

حکیم محمد حسین خاں مشہور طبیب تھے۔ نیک سیرت اور نیک اطوار تھے۔ حکیم مرزا محمد علی کے شاگرد رشید تھے۔ زندگی نہایت سادہ گزارتے تھے۔

حکیم محمد حسین خان ۱۸۵۷ء کے پر آشوب زمانے میں شاہ جہان پور میں قیام پذیر تھے۔ یہ ناظم شاہ جہان پور کے ہم نوا بن گئے تھے۔ ان کے ساتھ تحریک آزادی میں حصہ لیا تھا۔ آخر کسی گورے کی گولی کا نشانہ بنے۔ (قیصر التواریخ)

کافی جستجو کے بعد بھی ان کا کلام دست یاب نہ ہو سکا۔

(۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا، از امداد صابری، دہلی، ۱۹۵۹ء: صفحہ ۹۰-۲۸۷)

شیخ عبدالرشید صدیقی

تاریخ مطیع کے حوالے سے مولوی محمد صبیح الدین نے تاریخ شاہ جہان پور میں ایک قاضی خاندان کے ایک فرد قاضی پیر محمد کا ذکر کیا ہے، جن کے خاندان کے متعدد افراد شاہ جہان اور عالمگیر کے عہد میں دربار میں رسوخ رکھتے تھے اور قاضی کے عہدے پر فائز اور صاحب جاگیر رہے تھے۔ قاضی شاہ پیر محمد کے والد قاضی عبدالرحمٰن تھے ان کے خاندان سے کسی عہدوں سے کانٹ کے قاضی مقرر ہوتے آئے تھے۔ اسی لیے ان کی رہائش کانٹ میں تھی۔ قاضی پیر محمد نے شاہ جہان پور میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ لیکن خاندان کے دیگر افراد کانٹ ہی میں آباد رہے اور ان کی جائیداد میں جو بہ طور مدد معاش ان کو ملیں تھیں، موضع رحمان نگر پرگنہ کانٹ اور موضع تلوک پور میں تھیں۔ اس خاندان سے کانٹ کے آخری دور کے قاضی پیر محمد کے دادا عبدالسمیع اور والد عبدالرحمٰن نامی گزرے تھے۔ اسی خاندان کے ایک فرد جن سے خاندانی رشتے کی وضاحت نہیں کی گئی، عبدالرشید نامی نے معرکہ ۱۸۵۷ء میں حصہ لیا تھا اور بچوریا کی جنگ میں شہید ہوئے تھے۔ ان کے خاندان کو آزمایشوں سے گزرنا پڑا تھا۔ خاندان کے کچھ حالات "تاریخ شاہ جہان پور سے نقل کیے جاتے ہیں؛ مولوی محمد صبیح لکھتے ہیں:

> "(قاضی ظہیر الدین) کے چار بیٹے تھے۔ محمد واصل، عبدالحکیم، عبدالسمیع، عبداللطیف۔ قاضی ظہیر الدین کی وفات کے بعد عبدالسمیع قاضی کانٹ مقرر ہوئے۔ (ان کے دوسرے بیٹے) شیخ عبداللطیف عالم گیر بادشاہ کے مقربین میں سے تھے۔........"

اس سے آگے صاحبِ تاریخ شاہ جہان پور لکھتے ہیں:

"قاضی عبدالسمیع کی وفات پر ان کے بیٹے قاضی عبدالرحمٰن بہ عہد عالم گیر کانٹ وگولہ کے قاضی مقرر ہوئے تھے۔ ان کی تعمیر کردہ ایک مسجد ۱۰۸۶ھ کی کانٹ میں اب تک موجود ہے ۲۶ جلوس میں موضع رحمٰن نگر پرگنہ کانٹ و موضع تلوک پور پرگنہ

گولہ بہ طور مدِ معاش بہ ذریعہ فرمان شہر محرم الحرام روز شنبہ ۲۶ جلوس میں ان کو عطا ہوا تھا۔ اس خاندان پر بہ وجہ علم وفضل وحسن خدمات کے شاہانہ الطاف کی بارشیں برابر ہوتی رہیں جس سے اس خاندان کا عظمتِ وقار و تبحر علمی میں ارفع واعلا ہونا بہ خوبی ثابت ہے۔ قاضی عبدالرحمٰن نے دکن میں انتقال کیا۔ بدر میں مزار ہے قاضی عبدالرحمٰن کے تین بیٹے تھے۔ پیر محمد، وجیہہ الدین، نظام الدین، پیر محمد اپنے والد کے انتقال کے بعد قاضی مقرر ہوئے اور نظام الدین کو کانٹ کی چودھراہٹ ملی۔ چوں کہ عہد شاہ جہانی میں شاہ جہان پور روز افزوں ترقی پر چڑھ رہا تھا اور سرکاری دفتر میں بھی شاہ جہان پور صدر ہو چکا تھا تو پیر محمد نے شاہ جہان پور میں توطن اختیار کر لیا تھا۔ محلہ عقب مسجد کانچ میں آپ کی سکونت تھی۔ اس وجہ سے اس کا نام قاضی ٹولہ رکھا۔ جواب ایک مستقل محلہ ہے اس محلہ میں قاضی صاحب کا مزار املی کے درخت کے نیچے ہے۔ اب اس محلے میں اہل ہنود کی آبادی زیادہ ہے اور مسلمان برائے نام ہیں۔ ابو جعفر والی سند پر غور کرنے سے پایا جاتا ہے کہ ۲۶ جلوس عالم گیری کے بعد قاضی صاحب شاہ جہان پور میں آباد ہو گئے ہوں گے۔ بعد غدر کے ان کی اولاد نے کانٹ میں سکونت اختیار کر لی کیوں کہ اس خاندان کے ایک صاحب عبدالرشید غدر میں بچوریا کی جنگ میں کام آئے تھے۔ اس جرم میں ان کی جائیداد بہ حق سرکار ضبط کر کے مکان شاہ جہان پور کا بھی زمین کے برابر کر دیا گیا تھا۔ مؤلف تاریخ مطیع نے اس خاندان کے متعلق تحقیقات کر کے تحریر کیا ہے کہ یہ خاندان عہدۂ قضا پر امیر تیمور کے زمانے سے ممتاز چلا آتا ہے۔ قاضی کانٹ مقرر ہونے سے پہلے یہ دیگر بلاد کے قاضی رہے ہیں اور اسی توسل سے یہ ہندستان مغل بادشاہوں کے ساتھ آئے اور سلاطین تیموریہ نے ان کو جاگیریں اور معزز عہدے عطا کیے فرامین وبیع نامہ جات اس کے شاہد ہیں۔ اب اس خاندان میں تقریباً چار سو بیگہ اراضی قصبہ کانٹ میں باقی ہے یہ قدیمی اور معزز خاندان اب نکبت افلاس اور خواری وذلت کا آماج گاہ ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

یہ خاندان حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے نسبی تعلق رکھتا تھا۔

(ماخوذ از تاریخ صبیح: صفحہ ۳۷-۱۳۶)

(۲)

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

تاریخ صبیح کی معلومات کی روشنی میں شیخ عبدالرشید صدیقی پر نوٹ لکھ چکا تھا کہ اسی خانوادہ صدیقی پر تاریخ مطیع کا رجسٹر سائز کے سوا چار صفحے کا مفصل مضمون مطالعے میں آیا۔ دراصل مؤلف تاریخ صبیح کے سامنے تاریخ مطیع کا قلمی نسخہ تھا اسی سے انھوں نے اپنی تاریخ کے لیے چند ضروری معلومات کو اخذ کرلیا تھا اور اس میں بھی انھوں نے ٹھوکر کھائی کہ شیخ عبدالرشید صدیقی کے باپ دادا کا نام بھی معلوم نہ کر سکے۔

اس خاندان کے اولین شخص قاضی ظہیر الدین تھے جنھیں جہانگیر کے آخری دور یا شاہ جہان کے ابتدائی دور میں کانٹ وگوالا کا قاضی بنا کر بھیجا گیا۔ ان کے چار بیٹے محمد واصل، عبدالحکیم، عبدالسمیع اور عبداللطیف تھے۔ قاضی ظہیر الدین کے انتقال کے بعد ان کے پوتے عبدالسمیع ان کے قایم مقام مقرر ہوئے۔ ان کا زمانہ شاہ جہان کا ابتدائی یا عالم گیر کا زمانہ تھا۔ ان کے بھائی عبداللطیف کو بارگاہ عالم گیر میں تقرب حاصل تھا۔ یہ دکن میں عالم گیر کے ساتھ تھے۔ صاحب تاریخ مطیع لکھتے ہیں:

> ''عبداللطیف فاضل اجل وعارف کامل وشیخِ وقت تھے۔ دکن میں بہ مقام کان کوران کا مزار ہے۔ اورنگ زیب کو ان سے تلمذ تھا۔ ہمیشہ مخلصانہ و معتقدانہ پیش آتا تھا۔ رقعات عالم گیری میں جن میاں عبداللطیف کا نام آیا ہے، وہ یہی ہیں۔''

لیکن صاحب تاریخ مطیع نے اورنگ زیب کے ان کے تلمذ سے اختلاف اور رقعات عالم گیری کے میاں عبداللطیف سے ان کی مراد سے انکار کیا ہے۔

قاضی عبدالسمیع کے تین بیٹے عبدالقادر، عبدالرحمٰن اور ولی محمد تھے۔ قاضی عبدالسمیع کا انتقال کانٹ میں ہوا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے عبدالرحمٰن بعہد عالم گیر کانٹ وگوالا کے قاضی مقرر ہوئے۔ قاضی عبدالرحمٰن نے دکن میں وفات پائی۔ ان کا مزار شہر بدر میں ہے۔ پیر محمد، وجیہ الدین اور نظام الدین، قاضی عبدالرحمٰن کے تین بیٹے تھے۔ پیر محمد کو والد کے انتقال کے بعد منصب قضا عنایت ہوا۔ تاریخ مطیع میں اس

خانوادہ عظیم کا تذکرہ جن ''قاضی شاہ پیر محمد'' کے نام سے ہوا وہ یہی بزرگ ہیں۔

جس زمانے میں پیر محمد کو قاضی بنایا گیا تھا، تب شاہ جہان پور آباد ہونے کے بعد کانٹ پر فوقیت حاصل کر گیا تھا۔ اس لیے انھوں نے شاہ جہان پور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ قاضی پیر محمد کے چار بیٹے غلام علی، شیخ محمد، غلام حمید اور محمد توکل نامی تھے۔ محمد توکل نے فرزند غوث محمد ہوئے، جن کے تین بیٹے تھے۔ عبدالرشید وہی شخص ہیں جنھوں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں حصہ لیا تھا اور شہادت پائی تھی۔

عبدالرشید غوث محمد کے بیٹے، محمد توکل کے پوتے اور قاضی پیر محمد کے پڑپوتے تھے۔ غوث محمد کی حیات تک یہ خاندان شاہ جہان پور میں رہا، ان کے انتقال کے بعد یہ خاندان کانٹ اپنے آباو اجداد کے وطن مالوف کو لوٹ گیا تھا۔ قاضی پیر محمد کی آل اولاد کے بارے میں تاریخ مطیع کے مؤلف لکھتے ہیں:

> ''قاضی صاحب (پیر محمد) کے چار بیٹے غلام علی، شیخ محمد، غلام حمید اور محمد توکل تھے۔ محمد توکل کے فرزند غوث محمد ہوئے، جن کے تین بیٹے عبدالرشید، عبدالحمید اور غلام رسول تھے۔ غلام غوث کی حیات تک اس خاندان کا قیام شاہ جہان پور میں رہا۔ ان کے وفات پانے کے بعد غدر ۱۸۵۷ء سے کچھ پیشتر ان کی اولاد کانٹ چلی گئی۔''

غدر میں عبدالرشید نظام علی خان کے ہم راہ بچپوریا پر لڑنے گئے اور اللہ گنج میں مارے گئے۔

☆ اس الزام میں ان کی ساری املاک ضبط کر لی گئیں۔ اور

☆ شاہ جہان پور کا مکان کھود ڈالا گیا اور

☆ ان کے بھائیوں کے مکانات سود خوار مہاجنوں کے توندوں میں چلے گئے۔

کچھ رعایا اور افتادہ آراضی ہے، جس کو قاضی زادوں کا افلاس اور ہم سایہ ہنود کا تمول جلد منتقل کرنے کی تاکید کر رہا ہے۔

اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمی ماند

(تاریخ مطیع: حصہ سوم (غیر مطبوعہ): طبقہ دوم (علمائے کرام): ص ۶۰۱-۵۹۸)

منشی سید نیاز علی

مبارک شمیم شاہ جہان پوری

سید آل نبی فگار کے اجداد بلگرام کے تھے۔ ان کے والد سید نیاز علی کچہری کلکٹری میں محافظ دفتر تھے۔ اور ان کی شادی قاضی امانت علی کی بہن سے ہوگئی تھی۔ منشی آل نبی فگار کی شادی بھی شاہ جہان پور میں ہو جانے سے منشی نیاز علی نے شاہ جہان پور میں سکونت اختیار کرلی اور محلہ قاضی خیل میں آباد ہوگئے۔ منشی نیاز علی کے دو فرزند سید واجد علی اور سید آل نبی تھے۔ ان دونوں بیٹوں کو منشی نیاز علی نے غالب کا شاگرد کرادیا تھا۔ سید واجد علی تحصیل دار ہوگئے تھے، مگر تپ دق کے موذی مرض کا شکار ہوکر دہلی میں قضا کر گئے۔

منشی نیاز علی ترقی کرکے ڈپٹی کلکٹر ہوگئے۔ زمانہ غدر میں مراد آباد میں تھے۔ مشہور ہے کہ اپنے مردانے مکان میں نماز پڑھ کر سلام پھیرا تو لوگوں نے مطلع کیا کہ آج اس قدر انگریز قتل کیے گئے۔ آپ نے الحمد للہ فرمایا۔ جاسوسوں نے یہ خبر انگریزوں کو پہنچادی جس پر بغاوت کا الزام عاید کرکے پھانسی دے دی گئی اور کل جائیداد بہ حق سرکار ضبط کرلی۔

منشی نیاز علی صاحب پاکیزہ خصلت انسان تھے۔ (ان کے بیٹے) منشی آل نبی اس کے بعد ریاست گوالیار چلے گئے اور ملازمت کرلی۔ غدر فرو ہونے کے بعد گورنمنٹ کے ملازم ہوگئے۔ سب انسپکٹر پولیس رہے پھر سرشتے دار محکمہ بندوبست اور اس کے بعد سرشتے دار پولی ٹیکل ایجنٹ چھاؤنی نیا گاؤں ہوگئے۔ ریاست کدورہ میں بھی سرکاری انتظام پر کچھ مدت کام کیا۔ ملازمت سے سبک دوش ہوکر شاہ جہان پور واپس آئے اور اپنے مکانات کو قبضہ گیروں سے خرید کراز سرنو تعمیر کیا۔ کچھ ایام شاہ جہان پور رہ کر ریاست حیدر آباد چلے گئے جہاں تعلقہ دار درجہ دویم پر مقرر ہوگیا۔ دس

سال کے بعد ۱۳۱۱ھ میں حیدر آباد ہی میں آپ کا انتقال ہوگیا اور قبرستان ترب بازار میں سپرد خاک کیے گئے۔ آپ لاولد فوت ہوئے تھے۔ لوگوں نے سارا مال ومتاع سمیٹ لیا اسی افراتفری میں سارے کاغذات بھی تلف ہوگئے...... (دوسرے بیٹے) سید آل نبی فگار نہایت بااخلاق، خوش خو، آسودہ دل اور کم سخن انسان تھے۔ پتنگ بازی اور بٹیر بازی کا شوق تھا۔ لباس رنگین پہنتے تھے۔ شعروشاعری کے دلدادہ تھے۔

(سخن وران شاہ جہان پور: صفحہ ۹۴-۹۳)

ولایت علی خان

ماخوذ

ولایت علی خاں اور ان کے والد فیضیاب خاں - دونوں نواب غلام قادر خاں کے ان حمایتیوں میں شامل تھے جو قادر علی خان کی نوابی کے خلاف خان بہادر خان کے حضور بریلی گئے تھے۔ غلام قادر خان نے برسر اقتدار آنے کے بعد جو فوج کی تنظیم کی تھی۔ اس میں انفنٹری رجمنٹوں کے افسران میں پہلا نام انھیں کا آیا ہے۔ ان کا منصب رسال دار کا تھا۔ ان کی رجمنٹ فہرست میں ۶۷ پر ہے اور رسالے صرف سولہ سپاہی تھے۔

خان بہادر خان کے مقدمے میں ان کے بیٹے حیدر علی کا اس طرح ذکر آیا ہے کہ خان بہادر خاں کی گرفتاری کے بعد مقدمے کے دوران جب ان سے پوچھا گیا کہ آیا وہ اپنے دفاع میں کوئی شہادت اور ثبوت پیش کرنا چاہیں گے؟ تو انھوں نے چار شہادتیں اور تین ثبوت (مسلیں) اپنے دفاع میں پیش کی جانے کی خواہش کی تھی۔ اس میں پہلی شہادت حیدر علی خان ابن ولایت علی خان ساکن بریلی، محلہ بھورن کی تھی۔ ایک فہرست میں جو برٹش حکومت کو چھوڑ کر باغی حکومت میں چلے جانے والوں کے بارے میں ہے انھیں سکونت کے خانے میں شاہ جہان پوری اور عہدے کے بارے میں ''رسالے دار'' لکھا ہے۔

مولوی سید محمد عرف مولوی ولایتی صاحب

مولوی محمد صبیح الدین نے اپنی تاریخ میں ایک بزرگ مولوی سید محمد نامی کا ذکر کیا ہے۔ ان بزرگ نے سید احمد شہید رائے بریلویؒ کے ساتھ تحریک اصلاح و جہاد و معرکہ بالاکوٹ (۱۸۳۱ء) میں شریک رہے تھے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ۵۸-۱۸۵۷ء میں بوڑھے ہوں گے اور اس وقت کے معرکۂ جہاد میں حصہ نہ لے سکے ہوں لیکن صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ ذوق اصلاح و جہاد سے سینہ معمور تھا اور اظہار حق کے ذوق سے قلب بھی ناآشنا نہیں تھا۔ اس لیے گوارا نہیں کرسکتا کہ مجاہدین حق وملّت کے اس تذکرے کو ان کے اسم سامی کی شمولیت سے زینت نہ دی جائے۔ اور اپنے تئیں اس عمل مبارک سے دور رکھا جائے۔ صاحب تاریخ لکھتے ہیں:

"آپ سادات افغانستان سے تھے۔ سید احمد صاحب رائے بریلویؒ کے ہمراہ شریک جہاد بھی رہے تھے۔ پھر حیدرآباد میں فوجی ملازمت کرلی تھی۔ جب لوگوں کو آپ کے علم وفضل کا حال معلوم ہوگیا تو ملازمت سے کنارہ کش ہوکر پھرتے پھراتے شاہ جہان پور تشریف لائے جب اخوند احمد خاں جنھوں نے کان پور میں مولانا سے پڑھا تھا وارد شاہ جہان پور ہوئے اور انھوں نے محلہ ملاخیل میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ تو ولایتی صاحب کو بھی وہ اپنے مکان پر لوالائے اور تمام عمران کے ساتھ رہے۔ مولانا نے شادی نہیں کی تھی ترک وتجرید وگوشہ نشینی میں متوکلانہ زندگی بسر کی بہ جز نماز یا گوشت خرید کرنے کے اور کہیں باہر نہیں جاتے تھے۔ شاہ جہان پور کے لوگ آپ کا بہت ادب واحترام کرتے تھے آپ کی کرامتیں مشہور ہیں۔ ڈریمنڈ صاحب شاہ جہان پور کے جج تھے، ان کو بداعمالوں سے سخت تنفر تھا۔ ایک روز وہ مولانا کی خدمت میں آئے۔ آپ نے ان کو ایک ٹوٹے ہوئے مونڈھے پر بٹھلایا۔ جج صاحب نے کہا کہ مولانا میں مخلوق کی بداعمالیوں سے بہت تنگ ہوں۔ اس کا علاج

بتلایئے آپ نے فرمایا کہ تلوار خدا نے تمہارے ہاتھ میں دے دی ہے، اگر یہ ہمارے ہاتھ میں ہوتی تو ہم اس کا علاج کر دیتے۔ تم نے تو حدودِ شرعیہ کا اِجرا روک دیا ہے، پھر اس کا سد باب کیسے ہو؟ اب تم جانو اور دوبارہ اپنے پاس آنے سے منع کر دیا۔ آپ نے شاہ جہان پور میں درس وتدریس کا سلسلہ جاری نہیں کیا علم خوب مستحضر تھا اور فقہ پر محققانہ عبور تھا۔ جب تک جسم میں طاقت اور بصارت رہی کھانا اپنے ہاتھ سے پکاتے تھے اور ایک چھوٹے کھٹولے پر سویا کرتے تھے اس پر ٹاٹ کا فرش ہوتا تھا کسی سے نذر ونیاز نہیں لیتے تھے۔ نہ کسی کو مرید کرتے، جب اخوند احمد خان نے آپ سے بیعت کی استدعا کی تو مولوی عبدالرحمٰن صاحب سے ان کو بیعت کرنے کی ہدایت فرمائی۔ ایک مرتبہ صبح کو بغیر اطلاع چل دیے جب اہل شہر کو معلوم ہوتو انھوں نے تلاش کر کے جلال آباد کی ایک مسجد میں آپ کو مقیم پایا۔ اور بہت منت وسماجت سے واپسی کو کہا۔ آپ نے فرمایا کہ حج کو جاتا ہوں بعد ادائیگیِ فریضہ شاہ جہان پور آؤں گا۔ حسب وعدہ آیندہ سال حج وزیارت سے مشرف ہوکر واپس تشریف لائے۔ سو برس سے زاید عمر ہوئی تھی۔ ۱۲ر شعبان ۱۳۰۰ھ روز پنج شنبہ کو وصال ہوا اور مسجد ملا خیل کے جنوبی دیوار کی پاس مدفون ہوئے۔ مزار پختہ ہے۔ (تاریخ صبیح: حصہ دوم، صفحہ ۸۰-۱۷۹)

موسم علی خاں-شہید معرکہ پوایاں

شاہ جہان پور کے محلّہ ترین متصل رنگین چوپال کے ایک باشندہ ہدایت اللہ خان تھے۔ انھوں نے انٹیلی جنٹ ڈیپارٹمنٹ اودھ کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر ایڈولفس (Adolphus) کو ۱۶/ اکتوبر ۱۸۵۸ء کو ایک مفصل خط میں موسم علی خان کے بارے میں لکھا تھا:

میں اس سے پہلے آپ کو ایک تفصیلی رپورٹ پوایاں میں انقلابیوں کی سرگرمیوں کے بارے میں پیش کر چکا ہوں۔ اب اس سلسلے میں مزید تفصیلات سے مطلع کرتا ہوں پوایاں شاہ جہان پور سے ۱۲ کوس کے فاصلے پر اتر کی سمت ہے۔ ۸/ اکتوبر کو سورج نکلنے کے ایک پہر بعد تقریباً ۸ ہزار انقلابیوں نے پوایاں پر حملہ کیا۔ انھوں نے زبردست فائرنگ کی، لیکن چوں کہ راجہ جے سنگھ کی گڑھی ہے اور اس کے گرد ایک گہری خندق کھدی ہوئی ہے، جس کی وجہ سے وہ گڑھی کے اندر داخل نہیں ہو سکے۔ یہ گڑھی کے باہر ہی سے فائرنگ کرتے رہے اور گڑھی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے۔ گڑھی کے اندر چوں کہ کیپٹن ڈک کینس (Dickanus) کی نگرانی میں برٹش فوج کے ایک دستے کے علاوہ راجا کے سپاہیوں کی ایک تعداد بھی موجود تھی، دونوں نے مل کر انقلابیوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

یہ جنگ ابھی جاری تھی کہ دشمنوں کی فوج میں ایک زبردست دھماکا ہوا۔ معلوم ہوا کہ دو بندوقیں فائرنگ کرتے ہوئے پھٹ گئیں اور اس کے ساتھ ان کے کسی اہم آفیسر کا قتل ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے حملہ روک دیا اور پوایاں کے پچھم میں تقریباً تین کوس کے فاصلے پر ایک میدان میں انھوں ایک قبر کھودی اور اس میں لاش کو دفن کر کے واپس گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد کیپٹن ڈک کینس اپنا دستہ لے کر گڑھی سے باہر نکلے اور قبر سے انقلابی کی میت کو نکال لیا۔ جسے پہنچان لیا گیا ہے کہ انقلابی موضع فرخ

آباد کا ساکن موسم علی خان ہے۔

پوایاں پر جن انقلابیوں نے حملہ کیا تھا وہ تقریباً ایک ہزار افراد تھے۔ ان میں پیدل انقلابی تھے اور گھڑ سوار بھی تھے۔ ان کے پاس چار بندوقیں تھیں۔ ناکام ہوکر یہ سب موضع پس گواں کی طرف چلے گئے۔ جہاں دوسرے کئی انقلابی دستے ٹھہرے ہوئے تھے۔

۱۴/اکتوبر ۱۸۵۸ء کو راجہ جگن ناتھ سنگھ اور ان کے بھائی بلدیو سنگھ مسٹر منی کلکٹر شاہ جہان پور سے ملے اور اس سے کہا کہ پوایاں پر انقلابیوں کے حملے کا شدید خطرہ ہے، وہ کسی وقت بھی یورش کر سکتے ہیں۔ اس لیے دفاع کے لیے انھیں سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے چار Gharis دیے جائیں۔

۱۶/اکتوبر کے خط بنام انٹیلی جنس کے سپرنٹنڈنٹ میں مزید کہا گیا ہے؛

۸/اکتوبر کو ناکامی کے بعد انقلابی پڈورا (Padora) کی طرف چلے گئے۔ وہاں انھوں نے خان علی خاں سے شکایت کی کہ انھوں ان کی مدد نہیں کی! انھوں نے جواب دیا کہ انھیں رپورٹ ہے کہ وہ مقابلے سے بزدلوں کی طرح بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ اسی وقت ایک تلنگے نے ان پر (شکایت کرنے والے پر) فایر کر دیا اور گولی ان کے کاندھے کو چھیلتی ہوئی گزر گئی۔ شاہ جہان پور میں یہ افواہ بھی اڑی ہوئی ہے کہ خان علی خان کو قتل کر دیا گیا ہے اور اس کا باقاعدہ اعلان کیا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس بات میں کوئی سچائی نہیں وہ زندہ ہیں اور اس وقت پس گوان میں موجود ہے۔ (فریڈم اسٹریگل...... : جلد۲، صفحہ ۱۲-۵۱۱)

اگرچہ یہ ایک دشمن کے دوست کی انٹیلی جنس کے ایک آفیسر کو دی جانے والی اطلاع ہے، لیکن اس سے ۸/اکتوبر ۱۸۵۸ء کو پوایاں کے راجا کی گڑھی پر سرفروشانِ وطن کے ایک حملے کی روداد اور پس پائی کی افسوس ناک اطلاع ہے، لیکن اس سے موسم علی خان نامی ایک شہید وطن کا نام بھی معلوم ہو جاتا ہے، جس کا تعلق موضع فرخ آباد شاہ جہان پور سے تھا۔ (فریڈم اسٹریگل...... : جلد۲، صفحہ ۵۱۱)

شاہ جہان پور کے زمین دار

(۱)

تحصیل شاہ جہان پور:

تاریخ مطیع کے باب پنجم میں ذیلی عنوان ''مسلمانوں کے قدیم زمین داری علاقے'' کے تحت بعض جاگیروں کا ذکر صاحب تاریخ شاہ جہان پور نے کیا ہے۔ ان میں جن جاگیروں پر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ان کے مالکوں کے حصہ لینے کی وجہ سے بجلی گری تھی، صرف ان ہی کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے۔ خان بہادر حافظ مطیع اللہ خان لکھتے ہیں:

''.....شاہ جہان پور کے مشرق وجنوب ومغرب میں بہت دیہات اولاد نواب بہادر خان کی زمین داری میں تھے، جو وقتاً فوقتاً قرضے کی علت میں بیع ونیلام ہو کر بیشتر بنیوں کے پاس چلے گئے۔

غدر ۱۸۵۷ء تک اولاد نواب خان بہادر خان میں سے نواب غلام قادر خان کا ایک علاقہ بادشاہ نگر کا تھا، جس میں مواضعات بادشاہ نگر، جلال پور، دلاور پور، دیوکلی، اونٹھا، شجاعت پور، مونڈ گنواں، میاں پور وغیرہ شامل تھے۔

دوسرا علاقہ جموہی دبرنتی وغیرہ کا تھا۔

تیسرا علاقہ عزیز گنج کا تھا، جس میں عزیز گنج، اکرا، رسول پور، منڈہا، بکیاں، رم پورہ، سہوا پور، بھید پور، پرولا، احمد پور وغیرہ شامل تھے۔

چوتھا علاقہ بتیا کا تھا، جس میں بہت مواضعات تھے۔ علاوہ بریں چکا تو مواضعات شہر اور کئی بازاران کی ملکیت تھے، سب علاقے ضبط ہو کر خیر خواہوں کو دے دیے گئے۔

نواب قادر علی خان کے پاس مواضعات سسنی، پنہتی، پنچوی، سربانگ پور، کیلھا، کاکرو غیرہ اور کئی بازار تھے، ان میں سے کچھ ضبط اور کچھ بیع ونیلام ہو کر اوروں

نذیر احمد خاں شاہ جہان پوری

محمد سعید خاں شاہ جہان پوری مقیم نواب شاہ

کے قبضے میں چلے گئے۔..... تلہر کے پٹھانوں میں نصر اللہ خان و نظام علی خان کے علاقے اور شاہ جہان پور میں عبدالرؤف خان و نظام علی خان کے دیہات بغاوت ۱۸۵۷ء کے الزام میں ضبط ہو گئے اور چھوٹی چھوٹی حقیتیں یا ایک دو مواضعات ملکیت مسلمانوں کے تو اس کثرت سے ضبط سرکار یا قرضے میں منتقل ہوئے کہ ان کی تفصیل اس جگہ درج کرنے کی گنجائش نہیں۔(تاریخ مطیع: صفحہ ۳۶-۸۳۴)

(۲)
تحصیل تلہر

خانوادۂ منگل خان:

تلہر شاہ جہان پور کی ایک تحصیل ہے اور بریلی جانے والی سڑک پر بارہ میل کی مسافت پر ہے۔ یہ قصبہ شیر شاہ کے عہد میں موجود تھا اور عیسیٰ خان کو جاگیر میں ملا تھا۔ تلہر کے متصل عمر پور نامی ایک بستی ہے جسے محمد عمر خان یوسف زئی نے آباد کیا تھا۔ بانی عمر پور کا بیٹا منگل خان تھا، جو عہد حافظ رحمت خان میں تلہر کا ناظم تھا اور شجاع الدولہ سے حافظ مرحوم کی جنگ میں شہید ہو گیا تھا۔ منگل خان نے قصبے کے باہر منصور پور میں عالی شان مکان اپنے رہنے کے لیے تعمیر کیا تھا جو قلعے کے نام سے مشہور تھا۔

غدر ۱۸۵۷ء تک قلعہ ان کی اولاد کے قبضے میں رہا۔ غدر کے بعد خانوادہ منگل خان پر بغاوت کے جرم میں خاندان کی جائیداد کے ساتھ قلعہ بھی ضبط کر لیا۔ غدر سے پہلے تحصیل کے دفاتر اور تھانہ تلہر کے پرانے قلعے میں تھے جو محلہ کھتریاں میں واقع تھا، لیکن غدر کے بعد پرانے قلعے کا تمام اثاثہ بیچ ڈالا گیا اور سرکاری دفاتر منگل خان کے قلعے میں منتقل کر دیے گئے جو اب تک اسی میں موجود ہیں..... (تاریخ مطیع: صفحہ ۷۰-۹۶۹)

یہ صاحب تاریخ مطیع کے معلومات ہیں۔ یہ تاریخ ۱۹۲۰ء میں مصنف کے ملازمت سے ریٹائر ہونے سے قبل لکھی جا چکی تھی۔ ۱۹۲۵ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس بیان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ منگل خان کی اولاد نے، جو کئی افراد بھی ہو سکتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا اور ان کی جاگیر اور "عالی شان" مکان

قلعہ ضبط کرلیا گیا۔ اور ۱۹۲۵ء تک تلہر تحصیل کے دفاتر اور تھانہ ان کے قلعے میں قایم تھے۔

صاحب تاریخ صبیح لکھتے ہیں:

عمر پور جو تلہر کا ایک محلہ ہے اس کو محمد عمر خان یوسف زئی نے بسایا تھا ان کے بیٹے منگل خان عہد حافظ الملک میں ناظم تھے جو شجاع الدولہ کی جنگ میں شہید ہوگئے تھے منگل خان نے قصبہ سے جانب جنوب آبادی کے کنارہ منصور پور میں لب سڑک ایک عالی شان محل سرا اپنی سکونت کے لیے بنوائی تھی جو قلعہ کے نام سے مشہور ہے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے جہان سوز ہنگامہ میں بہ الزام بغاوت معہ دیگر جائیداد کے یہ قلعہ بھی ضبط کرلیا گیا۔ اب اس میں پولیس کا تھانہ اور تحصیل کچہری ہے۔ ۱۹۲۸ء میں از سر نو اس کی ترمیم ہوئی ہے۔ غدر نے یہاں کی افغان آبادی کو بہت نقصان پہنچایا نامی اور مشہور خاندان قطعاً برباد ہوگئے۔ اب اس کی مردم شماری پندرہ سولہ ہزار نفوس ہے۔ محلہ کچا کٹرہ میں سعید الدین میاں صاحب کی بنوائی ہوئی عالی شان مسجد ہے۔ اور اس کے صحن میں شمس الدین میاں صاحب بزرگ کا مزار پرانوار ہے۔

(تاریخ صبیح: حصہ اول، صفحہ ۶۳)

نظام علی خان تلہری:

صاحب تاریخ مطیع لکھتے ہیں:

تلہر کا بازار داتا گنج جو قصبے کے بازاروں میں سب سے زیادہ خوش نما ہے، خواجہ عین الدین ناظم نے عہد آصف الدولہ میں آباد کیا تھا، بعد میں نظام علی خان تلہری کے قبضے میں آگیا تھا اور الزام بغاوت ۱۸۵۷ء میں معہ دیگر جائیداد کے ضبط کرلیا گیا تھا۔ (ایضاً: صفحہ ۲۷، بہ حوالہ گزیٹیر شاہ جہان پور از مسٹر فشر)

قصبے کی عمومی حالت اور غدر کے اثرات کے بارے میں صاحب تاریخ مطیع لکھتے ہیں:

میونسپلٹی تلہر کی آبادی مردم شماری ۱۹۰۱ء کے وقت ۱۹۰۹۱ نفوس تھی، جن میں سے ۹۵۲۷ مسلمان تھے۔

غدر نے اس قصبے کی حالت میں نمایاں انقلاب پیدا کیا۔ پٹھان ضبطی جائیداد کی وجہ سے خستہ حال وشکستہ حال ہو گئے اور بقال ریل آنے پر تجارت کے فروغ پانے سے مالا مال ہو گئے۔ (ایضاً: صفحہ ۹۷-۱۷)

(۳)
تحصیل جلال آباد

شاہ جہان پور کی تحصیل جلال آباد، اس سے ۱۶، ۱۷ میل جنوب پچھم میں ہے۔..... اکبر کے زمانے میں جلال آباد پرگنہ شمس آباد سرکار قنوج میں شامل تھا۔ ۱۷۲۰ء میں فرخ سیر نے نواب محمد خان بنگش غضنفر جنگ کو جاگیر میں دے دیا۔ قایم جنگ کے مارے جانے کے بعد روہیلوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷۵۴ء میں وہ حافظ الملک کے حصے میں آیا.......

۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے وقت یہاں کی آبادی ۱۷۰۷ تھی، جن میں سے ۳۵۴۷ مسلمان تھے، افاغنہ کی آبادی نواب بنگش روہیلوں کی عمل داری میں یہاں زیادہ تر ہوئی۔ پرگنہ جلال آباد میں ہزاروں ٹھاکر آباد ہیں۔ مگر خاص قصبے میں ایک نہیں۔ مشہور ہے کہ جلال آباد میں ٹھاکر زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔..... جلال آباد کا رقبہ ۱۷۱۰ ایکڑ و مال گذاری ۹۷۸ روپے ہے۔

پٹھانوں کی حالت یہاں بہت خراب ہے۔ بعد غدر بہت جائیدادیں ضبط ہو گئیں اور بچی کھچی فضولی وکاہلی کی وجہ سے مہاجنوں کے قبضے میں چلی گئیں.......

(تاریخ صبیح: صفحہ ۹۸۴-۹۸۳)

(۴)
تحصیل پوایاں

جگن ناتھ سنگھ راجہ پوایاں:

پوائیں کے راجہ کا تذکرہ احمد اللہ شاہ کے تذکرے میں آ چکا ہے۔ شاہ جہان پور کی تحصیل پوایاں کی تاریخ بھی اس کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی تھی۔ خان بہادر حافظ مطیع اللہ خان لکھتے ہیں:

”.....راجہ صاحب کو اختیارات آنریری مجسٹریٹ درجہ دوم تحصیل پوایاں میں حاصل ہیں اور خطاب راجگی جو غالباً دربار اودھ سے شروع میں عطا ہوا تھا، گورنمنٹ انگریزی نے موروثی تسلیم کرلیا ہے۔ ایام غدر میں احمد اللہ شاہ کے گڑھی پوایاں پر اتفاقیہ مارے جانے سے راجہ جگن ناتھ سنگھ کو پچاس ہزار رُپے نقد جو انعام گرفتاری وقتل احمد اللہ شاہ گورنمنٹ نے مشتہر کیا تھا اور نشانات اعزازی عطا ہوئے اور جو فرو گذاشت پناہ ہی مسٹر جینکس کے سلسلے میں ہوئی تھی، وہ مجبورانہ متصور ہو کر رفع دفع ہوگئی۔“ (تاریخ مطبع: صفحہ ۹۸۲)

چند دیگر شخصیات

تفضّل حسین خاں نواب فرخ آباد:

مولانا ابوالکلام آزاد نے غلام رسول مہر مرحوم کی تالیف لطیف ''غالب'' میں مولانا مہر کے ایک بیان کی صراحت میں نواب تفضّل حسین خاں کے متعلق اپنے والد گرامی مولانا خیر الدین دہلوی سے ایک روایت بیان فرمائی تھی۔ مولانا مہر مرحوم نے اس کے مطالب کو تاریخ کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ اب یہ روایت ادب ہی کا نہیں تاریخ کا شہ پارہ بن گئی ہے۔ جو اصحاب ذوق مولانا آزاد کے حسنِ بیان سے لطف اندوز ہونا چاہیں، انھیں ''نقش آزاد'' سے رجوع کرنا چاہیے۔ (ا۔س۔ش)

نواب تفضّل حسین خاں، نواب تجمل حسین خاں کا بھتیجا اور نصرت جنگ کا بیٹا تھا۔ چوں کہ تجمل حسین خاں کے نرینہ اولاد نہ تھی، اس لیے تفضّل حسین خاں کو ریاست کا والی تسلیم کیا گیا۔ ۴ر دسمبر ۱۸۴۶ء کو مسند نشینی کی رسم ادا ہوئی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے والد ماجد مولانا خیر الدین فرماتے تھے:

> ''تفضّل حسین خاں اتنا شوقین اور خوش پوشاک رئیس تھا کہ کشمیر کے تاجر سب سے پہلے اسی کے پاس جاتے، پھر لکھنؤ کا رخ کرتے۔ یہ نواب تھا جس کے لیے ۱۸۵۷ء میں جہاد آزادی کو تقویت پہنچانے کا کام مقدر ہو چکا تھا۔''

۱۸۵۷ء:

نمبر ۱۰ رجمنٹ نے فتح گڑھ میں سرکشی اختیار کی اور نواب کو اپنا رئیس بنالیا، آغا حسین سیتا پور سے دو ہزار فوج لے آیا، احمد یار خاں اور محسن علی خاں مجاہدین فرخ آباد کے رئیس تھے۔ میلی سن نے دسمبر ۱۸۵۷ء کی ایک لڑائی کا ذکر کیا ہے جس میں

فرخ آباد کے پشتنی کمانداز ''حکیم'' صاحب کا ذکر بہ طور خاص کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''حکیم'' پٹیالی میں شہید ہوا۔ اس کے ہاتھی نقرئی ہودے اور تلوار پر قبضہ کرلیا گیا۔ (میلی سن: جلد چہارم، صفحہ ۲۰۵) اگست ۱۸۵۷ء میں نواب کے پاس کم وبیش تیس ہزار کا لشکر فراہم ہوگیا تھا۔ (ایضاً: جلد سوم، صفحہ ۳۴۷)

مفتی انتظام اللہ نے لکھا ہے کہ غداروں نے ہر جگہ دھوکے دیے اور پانسا اُلٹا پڑا۔ (ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما: صفحہ ۸۹) نواب نے انجام کار اپنے آپ کو جاں بخشی کے وعدے پر انگریزوں کے حوالے کو دیا۔

میل سن کہتا ہے:

''حکومت اپنے ایک افسر کے حتمی وعدے سے پھر نہ سکتی تھی۔ اگر چہ نواب کو زندگی کی مہلت مل گئی لیکن وہ اپنے تمام منصوبوں کا کامل تباہی دیکھنے کے لیے زندہ رہا۔'' (میلی سن: جلد سوم، صفحہ ۳۴۴)

وہ منصوبے کیا تھے؟ انگریزوں کا اخراج! انگریزوں کا اخراج ۱۸۵۷ء میں بے شک نہ ہوا لیکن نواب کی عظمت سعی وکوشش میں تھی نہ کہ منصوبے کی تکمیل میں! میلی سن زندہ ہوتا تو ہم بتاتے کہ انگریز نہ صرف ہندستان سے نکلے بلکہ جس عظمت پر وہ فخر کررہے تھے اسے ہر جگہ رسوا ہونا پڑا۔

فارسٹ کا بیان ہے کہ کالن کیمبل نے اودھ کی مہم ختم کی تو حضرت محل اور نانا نیپال چلے گئے۔ جن لوگوں نے جاں بخشی کے وعدے پر اپنے آپ کو حوالے کیا، ان میں سے ایک مہدی حسین تھا اور دوسرا تفضل حسین خاں والی فرخ آباد یہ یکم جنوری ۱۸۵۹ء کا واقعہ ہے۔ (فارسٹ: جلد سوم، صفحہ ۵۲۸)

نواب سے کہا گیا کہ جہاں جانا چاہو بھیج دیا جائے گا۔ اس نے مکہ معظمہ کو منتخب کیا۔ چناں چہ اُسے جہاز پر سوار کرا کے عدن پہنچا دیا گیا۔

جلاوطنی کی زندگی:

مولانا ابوالکلام آزاد کے والد ماجد مکہ معظمہ پہنچے تو دیکھا، جس نواب کی خوش

پوشاکی کا کوئی مقابلہ نہ کر سکتا تھا اس کا یہ حال تھا کہ چھینٹ کا ایک میلا کچیلا انگرکھا جسم پر تھا یہ دیکھتے ہی ان کی آنکھوں سے آنسو آ گئے۔ فرماتے ہیں:

"میں نے ہر چند کوشش کی کہ نواب کی ضروریات کا انتظام کر دوں، مگر انھوں نے قبول نہ کیا۔ وہ کہتے تھے، میں آپ کے خاندان سے ارادت رکھتا ہوں۔ میری جگہ نذر پیش کرنے کی ہے، نہ کہ لینے کی۔"

مولانا کے والد نے نواب کی ملاقات شریف مکہ سے بھی کرا دی۔ بے نوائی کی حالت میں بھی اس نے گوارا نہ کیا کہ تحفے کے بغیر ملے۔ ایک قیمتی تسبیح اس کے پاس رہ گئی تھی، وہی بہ طور تحفے کے پیش کر دی۔

پھر شاہ جہاں بیگم والیۂ بھوپال نے نواب کے لیے ایک رقم مقرر کر دی۔

معمول یہ تھا کہ وہ ظہر کے اول وقت حرم شریف میں آتا اور عشا پڑھ کر گھر جاتا۔

۱۸۸۴ء میں وفات پائی اور مکہ کی خاک مقدس میں آسودۂ خواب ابدی ہے۔

(نقش آزاد، از غلام رسول مہر، لاہور، ۱۹۵۹ء: صفحہ ۲۹-۳۲۸)

شیخ امیر علی شاہ جہان پوری

فرشوری شیخ، سادات جلال بخاری جلیسر کے خاندان میں سیدہ سعید النساء سے شادی ہوئی خاندان کا پتا چلنا صدر جہاں تک معلوم ہوا ہے۔ شیخ امیر علی نے پہلے لڑکے پڑھانے کی مکتب میں نوکری کی پھر جیل خانہ میں معمولی ملازمت حاصل کر کے داروغہ جیل ہوئے۔ فطرت نے قابل جوہر عطا کیا تھا تحصیل دار ہوئے۔ اسی حال میں ۱۸۵۷ء کا غدر ہوا پیلی بھیت میں تھے نگاہ دوربیں نے دیکھ لیا کہ سرکار برطانیہ کا عمل قایم رہے گا۔ خزانہ تحصیل پیلی بھیت عبداللہ خان رام پوری کوتوال کے سپرد کیا اور خود مسٹر کارڑ مائیکل اور یورپین پارٹی کو ساتھ لے کر حفاظت سے نینی تال پہنچایا، جہاں خود بھی مقیم رہے اور باغیوں سے دامن کوہ میں جنگ کر کے انھیں پسپا کر دیا۔ اس دوران میں بیوی بچے پیلی بھیت میں ملک عبدالرحمٰن خاں صاحب کی حفاظت میں چھوڑ دیے گئے تھے۔ غدر قریب فرو ہو رہا تھا کہ پیلی بھیت واپس آئے اور ایسے حکیمانہ اور مدبرانہ طریقہ سے سرکار برطانہ کی نیابت کی کہ تمامی مال گذاری وصول کر کے امن کا دور قایم کر دیا اس زمانے میں کوئی سرکاری فوج یا یورپین افسر شیخ امیر علی کی امداد کو موجود نہ تھا۔ غدر فرو ہونے پر باغیوں کی داروگیر شروع ہوئی لیکن جتنے گرفتار یا مشتبہ شیخ امیر علی نے پھانسی ہونے سے بچالیے شاہ جہان پور کا کوئی سردار اس کام میں شیخ صاحب سے دوسرے نمبر پر بھی جگہ پانے کا مستحق نہیں۔ پیلی بھیت میں گورنمنٹ کے افسر وہی کرتے تھے جو شیخ صاحب کہہ دیتے تھے چناں چہ اس خیر خواہی کے صلے میں وہ ڈپٹی کلکٹر بنائے گئے۔ خلعت معہ تلوار اور طلائی گھڑی کے عطا ہوا اور ضلع شاہ جہان پور اور پیلی بھیت میں جاگیر عطا کی گئی۔ ۱۸۷۴ء میں رحلت کی اور اپنے پختہ باغ میں مدفون ہوئے۔ اخلاق، فیاضی، سیر چشمی، وطن پرستی کا یہ حال تھا کہ شاہ جہان پوریوں کا ایک گروہ جاں نثار ہمیشہ پیلی بھیت میں ساتھ رہا۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ جہان

پوریوں کا اگر کتا مل جاتا تو محبت سے گلے میں پٹہ ڈال دیتے۔ پیلی بھیت میں اپنا گھر تعمیر نہ کیا۔ کرایہ کی حویلیوں میں رہے۔ جو مکان بنائے وہ اپنے وطن شاہ جہان پور میں بنائے، جو آج موجود ہیں، جب شاہ جہان پور آتے پہلے خود تمامی ملکوں کے سلام کو ان کے گھر حاضر ہوتے ادب کا یہ حال تھا کہ نواب غلام حسین خاں کا پیلی بھیت میں تمامی رؤسائے شہر کو ساتھ لے کر استقبال کرتے اور ہاتھی پر نواب صاحب مغفور کو اپنے پختہ باغ سے اپنے گھر لاتے ہفتوں نہایت ادب واحترام سے میزبانی کرتے اور رخصت کے وقت مخفی طریقے سے گراں بہا نذرانہ پیش کرتے۔ نواب صاحب کے ایک اشارے پر اپنا ''ساٹھا باغ'' نواب صاحب کو ان کے تا حیات آم کھانے کو دے دیا۔ شاہ جہان پور میں نواب صاحب کی پالکی کے ایک کہار خود ہوتے اور تین کہاروں کی مدد سے پکے پل کے مشرقی کھمبے تک لاتے اور یہاں نذرانہ کی نقدی کی گٹھری نواب صاحب کی خدمت میں پیش کر کے انھیں رخصت کرتے۔ حیرت ہے کہ اتنی بڑی جائیداد آمدنی اور ڈپٹی کلکٹری کی تنخواہ ان کی مصارف کو کافی نہ ہوتی تھی اور اپنی رحلت کے وقت وہ مقروض تھے۔ ان کے باغات کے آم یا اناس ان کے لیے کافی تھی۔ کیوں کہ یہ پھل مزید ہمیشہ خریدے بھی جاتے تھے۔ ہفتہ میں تعطیل کے دن اپنے باغ میں رہتے جہاں دو تین سو شر ، ں دونوں وقت پر تکلف دعوت ہوتی۔ ایک پورا موضع دیو کلی خیراتی کاموں کے لیے وقف کر گئے۔ یہ خیرات آج تک جاری ہے۔

سر سید احمد خاں بہادر نے غدر کے بعد جو مسلم خیر خواہان سرکار کی تاریخی کتاب لکھی ہے [1] اس میں شیخ امیر علی کو نہایت ممتاز جگہ دی ہے اور مسٹر ای وایٹ ڈایریکٹر سر رشتہ تعلیم ممالک متحدہ آگرہ واودھ نے جو دو کتابیں انگریزی میں لکھیں اور ولایت سے شایع کیں، اس میں شیخ امیر علی کو دارولر آف مین یعنی ''آدمیوں کا فرمانروا'' لکھا ہے اور یہ دونوں کتابیں شیخ امیر علی کے نام ہی ڈیڈی کیٹ یعنی معنون کی ہیں سرکاری

---

[1] سر سید کا مشہور رسالہ ''خیر خواہ مسلمانان'' انگریزی میں ''لایل محمڈنز آف انڈیا'' کے نام سے چھپا ہے۔ اس کی طرف اشارہ ہے۔ اس کی عکسی اشاعت ''خدا بخش اورینٹل پبلک لایبریری۔ پٹنہ (انڈیا) سے شایع ہوئی ہے۔

مراسلات میں تو تعریف میں بہت کچھ لکھا گیا ہے مسٹر لو نے تو یہ لکھا ہے کہ

"ایسی دیانت، جرأت اخلاق اور تدبر کا شخص جیسے شیخ امیر علی ہیں تمامی ہندوستان میں میں نے ایک بھی نہ پایا۔"

ای وایٹ کی دونوں انگریزی کتابوں کا نام "دی ہارٹ آف ہندوستان"، اور "بجلی دی ڈانسر" ہے۔

شیخ صاحب نے اپنے پیچھے چار بیٹے چھوڑے۔ حافظ شوکت علی عربی کے علامہ بائیس برس آنریری مجسٹریٹ رہے اور ہمیشہ اجلاس اپنے دیوان خانے میں کیا سب جائیداد حافظ صاحب کی آج موجود ہے حافظ شوکت علی کی حیات میں منوں غلہ روزانہ بعد مغرب اندھیرے میں خیرات ہوتا تھا جس سے پردہ نشین مستورات زیادہ حصہ پاتی تھیں بڑے باعمل مسلم تھے اور آپ کے منجھلے بیٹے حافظ عبدالجلیل پیلی بھیت میں آنریری مجسٹریٹ اور ممبر بورڈ ہیں۔

شیخ صاحب کے سنجھلے بیٹے منشی رفعت علی شاہ جہان پوری [1] تھے جن پر ہم نے جدا نوٹ اس کتاب میں دیا ہے۔

شیخ صاحب کے چھوٹے بیٹے خان بہادر منشی عبدالحق تھے۔ آخر زمانے میں پیلی بھیت میں کوٹھی تعمیر کر کے وہیں مستقل سکونت اختیار کی۔ قیصر ہند کا تمغہ پایا، خان بہادری کا خطاب ملا، رفاہ عام کے کاموں میں پچیس پچیس ہزار کا چندہ دے دیا۔ آپ کے بڑے بیٹے خان بہادر آصف زماں ڈپٹی کلکٹر اور علی گڑھ کالج کے گریجویٹ ہیں۔

شیخ امیر علی کی وہ شخصیت تھی جس نے اپنی ذاتی قابلیت سے اپنا راستہ آپ بنایا اور جس قدر ترقیاں کرتے گئے اسی قدر خاکساری اور فروتنی اختیار کرتے گئے۔ اسی سے ان کی عزت بڑھتی چلی گئی۔ "قطع امید از دنیا۔" پر ان کا پورا عمل تھا۔ درویشوں سے خاص عقیدت تھی پکے باعمل مسلم تھے۔

(تاریخ شاہ جہان پور، از مولوی صبیح الدین: صفحہ ۱۰-۳۰۸)

---

[1] صاحب تاریخ شاہ جہان پور نے منشی رفعت علی رفعت کا ذکر زمرۂ شعرا میں کیا ہے۔ (صفحہ ۳-۲۷۴)

حصہ ششم

چند خانوادہ ہائے شہدا و مجاہدین

(ماضی و حال)

ترتیب و تدوین

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

چند خانوادہ ہائے شہداو مجاہدین

(ماضی وحال)

حصہ ششم

خانوادۂ

نواب قادر علی خان و نواب غلام قادر خان

قادر علی خان ابن بختور بہادر خان جو ۱۸۵۷ء کے عہد انقلاب میں شاہ جہان پور کے پہلے ناظم ہوئے تھے۔ اگر ان کے منصب کے دورانیے کو دیکھا جائے تو اس کی مدت ایک ماہ کے شب و روز سے آگے نہیں بڑھتی، لیکن اس کے ذمے داری کا وزن معلوم کرنے کا ارادہ کیا جائے تو اس کے لیے کوئی ترازو میسر نہ آئے گا۔ ان کی قومی ہمدردی اور وطن دوستی کا شمار بے مثال لوگوں میں کیا جائے گا۔ انھوں نے ایک اہم قومی خدمت کا بیڑا اُٹھایا تھا اور اس پر عمل پیرا ہوئے، ابھی چند ہی دن ہوئے تھے کہ انھیں یہ منصب کسی اور کے لیے چھوڑ دینا پڑا۔ یہ ان کے لیے سخت آزمایش تھی، جس سے وہ نہایت بلند ہمتی اور فراغ قلبی کے ساتھ سبک دوش ہو گئے۔ اگر اس موقعے پر فیصلہ کرنے یا اقتدار و ریاست چھوڑنے میں ذرا سی تاخیر ہوتی تو مخلصین قوم و وطن کے لیے کئی مسایل پیدا ہو سکتے تھے۔ انھوں نے اپنے ذوق وطن سے ثابت کر دیا کہ ایک بڑے باپ کے بیٹے اور خود بھی بڑے ہیں۔

قادر علی خان کا شجرۂ نسب اپنے جداعلیٰ نواب بہادر خان چغتا بانی شاہ جہان پور سے ساتویں پشت میں مل جاتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

> "نواب قادر علی خان ابن نواب بختور بہادر خان ابن نواب مظفر خان ابن نواب سعد اللہ خان ابن نواب عبداللہ خان المخاطب بہ نواب زین الدین خان بہادر صولت جنگ ابن زین الدین خان عرف زین خان ابن نواب غیرت خان چغتا المخاطب بہ دلاور خان ابن نواب بہادر خان بانی شاہ جہان پور ابن دریا خان......"

شاہ جہان پور کے دوسرے ناظم نواب غلام قادر خان بھی اس خانوادۂ تیغ و

تفنگ سے تھا، جس کا ایک ایک فرد اپنی بہادری، بے جگری، بے خوفی اور تاج وتخت سے اپنی وفاداری میں مثال تھا۔ ان کے والد گرامی کا نام نامی نواب احمد خان تھا۔ نواب بہادر خان بانی شاہ جہان پور سے ان کا شجرۂ نسب بھی چوتھی پشت میں نواب عبداللہ خان المخاطب بہ نواب زین الدین خان سے اور ساتویں پشت نواب بہادر خان چغتا بانی شاہ جہان پور سے مل جاتا ہے۔ نواب عبداللہ خان تک شجرۂ نسب اس طرح ہے:

> ''نواب غلام قادر خان ابن نواب احمد خان ابن نواب مصطفیٰ خان عرف حاجی میاں ابن نواب فیض اللہ خان بہادر ابن نواب عبداللہ خان المخاطب بہ نواب زین الدین خان بہادر صولت جنگ ابن نواب زین الدین خان......''

نواب عبداللہ خان سے دونوں بزرگوں کا شجرۂ نسب ایک ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ نواب قادر علی خان کے شجرے میں مذکور ہوا ہے۔

نواب قادر علی خان جب نظامت سے الگ ہو گئے تو پھر انھوں نے انقلابی حکومت کے کسی فیصلے اور کسی معاملے میں کوئی دخل نہیں دیا، لیکن حالات بدلے تو ردّ عمل کے اثرات سے وہ اور اُن کا خاندان بھی نہ بچ سکا۔ انھیں گرفتار کر کے جزائر انڈمان میں پورٹ بلیر بھیج دیا گیا۔ ۱۸۸۵ء میں بعض کوششوں کے نتیجے میں انھیں رہا کر دیا گیا تھا۔ پورٹ بلیر میں انھوں نے ایک شادی کر لی تھی۔ اس کی اولاد بھی تھی، لیکن خاندان کے بزرگوں نے جو شجرہ مرتب کیا، اس میں ان کا ذکر نہیں آسکا۔

نواب بختور بہادر خان کے دو بیٹے تھے۔ شاہ جہان خان بڑے اور قادر علی خان چھوٹے تھے۔ شاہ جہان خان کا انتقال والد کی حیات میں ہو گیا تھا۔ ان کے ایک بیٹے عبداللہ خان کا ذکر ''تاریخ مطیع'' میں آیا ہے اور ان کے بیٹے اکبر حسین خان (وفات ۲؍مارچ ۱۹۳۰ء) اور پوتے اصغر علی خان کا ذکر ''تاریخ صبیح'' میں آیا ہے۔

نواب قادر علی خان کی اولاد کے خاندانی شجرے میں حیدر علی خان، جعفر علی خان اور اصغر علی خان تین بیٹوں کا ذکر ملتا ہے۔ مذکورہ تینوں بھائیوں کے تین بیٹے

مشبر علی خان، کوثر علی خان اور اطہر علی خان تھے۔ ان میں سے کوثر علی خان والد مرحوم کے گہرے تعلقات تھے۔ ان کی تین نرینہ اولادوں سے میں بہ ذات خود واقف ہوں۔ ان میں بڑے حزبر علی خان عرف للو خان، منجھلے مظہر علی خان عرف نواب علی خان اور چھوٹے تصور علی خان تھے۔ تینوں پاکستان آگئے تھے۔ بڑے بھائی کراچی میں اور دوسرے دونوں بھائی سندھ میں آباد ہو گئے تھے۔ للو خان لیاقت آباد نمبر ۵ میں رہتے تھے۔ میرے بڑے بھائی احمد حسین خان سے دوستی تھی، اکثر آتے رہتے تھے اور چوں کہ ہماری ننھیال کی طرف سے دور کا کوئی خاندانی رشتہ تھا، میں دیکھتا تھا کہ عمر میں بھیا سے بڑے ہونے کے باوجود ان سے بہت احترام سے ملتے تھے۔ ان کے انتقال کی خبر سنی تھی۔ نواب علی خان مدرسہ سعیدیہ جامع مسجد شاہ جہان پور میں میرے ساتھ پڑھتے اور اس کے بورڈنگ ہاؤس میں ساتھ رہتے تھے۔ انھیں کے ساتھ تصور علی خان بھی تھے۔ انھیں کے ساتھ ایک اور لڑکے تصور علی کی عمر کے تھے جو شاید ان کے چچا شبیر علی خان کے بیٹے تھے۔ ان کا نام اور رشتہ یاد نہیں۔

اصغر علی خان ابن قادر علی خان کے بیٹے اطہر علی خان تھے۔ ان کی صرف ایک بیٹی تھیں۔ اور پھر ان کے ایک بیٹے ہیں جو اپنے باپ دادا کے اخلاق و روایات کے امین ہیں۔

......☆......☆......☆......

نواب قادر علی خان کے ایک بیٹے ضمیر حسن خان تحصیل دار کا ذکر مطیع اللہ خان نے "تاریخ مطیع" میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "نواب صاحب کے کئی بیٹے ہیں، جن میں سے ضمیر حسن خان تحصیل دار ہوئے۔ اب پنشن پاتے ہیں۔ نہایت خلیق و ملن سار فی زمانتا۔
>
> (صفحہ ۴۲۶)

صاحب "تاریخ صبیح" نے اس پر یہ عبارت اضافہ کی ہے:

> "......تحصیل دار پنشنر بقید حیات ہیں، جو نہایت خلیق، ملن سار اور اپنے آبائے تہذیب و اخلاق کی عمدہ یادگار ہیں۔"

مقبرہ احمد علی خان میں نشست ہے۔ اسی کے متصل سکونتی مکانات ہیں،
صاحب اولاد ہیں۔" (صفحہ ۱۳۲)

افسوس کہ دونوں مؤرخوں نے نواب صاحب کی دوسری بیوی کی اولاد کے ذکر کو چھوڑ دیا، صرف ایک تحصیل دار ہی کو لائق اعتنا اور قابل ذکر سمجھا۔

تاریخ مطیع کی تاریخ تکمیل تالیف ۱۳۴۰ھ (۱۹۲۲ء) کو ہے۔ ضمیر حسن خان اس وقت ملازمت سے سبک دوش ہو کر پنشن پا چکے تھے۔ اس کے دس سال بعد جب دسمبر ۱۹۳۲ء میں مولوی صبیح الدین نے اپنی تاریخ صبیح شایع کی تھی تو وہ اس وقت بقید حیات تھے۔ اور عمر ۷۰ سال سے یقیناً زیادہ ہو چکی تھی۔ اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی پیدایش ۱۸۵۸ء اور ۱۸۸۵ء کے عرصہ قیام پورٹ بلیر میں ہوئی ہو گی۔ اور بھائیوں میں وہ یقیناً سب سے چھوٹے ہوں گے۔

قادر علی خان کے تیسرے بیٹے اصغر علی خان تھے۔ ان کے ایک بیٹے اطہر علی خان تھے اور ان کی صرف ایک بیٹی تھیں اور ان کی بیٹی کے ایک ہی بیٹے تھے۔ جن کا نام .... ہے۔ پاکستان ٹی وی کراچی سینٹر میں کسی عہدے پر فایز تھے۔ تقریباً بیس سال ہوئے۔ جب ان سے ملاقات ہوئی تھی اور طبیعت نہایت مسرور ہوئی تھی۔ شاعر ہیں اور نہایت مہذب اور خوش خلق۔ لیکن اتفاق دیکھیے کہ ایسے عزیز اور فخر خاندان سے اس مدت میں پھر ایک بار بھی ملنے کا اتفاق نہ ہوا۔

نواب غلام قادر خان کی اولاد میں ان کے واحد بیٹے غلام محمد خان کا نام تواریخ مطیع و صبیح میں ملتا ہے۔ اور ان کے ایک بیٹے اور پوتے کا ذکر گزیٹیر ضلع شاہ جہان پور میں اس کے مرتب ایچ آر نیول نے کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"ان کے لڑکے محمد خان کا انتقال ۱۸۷۸ء میں ہوا۔ ان کے لڑکے منظور احمد خان شاہ آباد ضلع ہردوئی میں رہتے ہیں۔

یہ سطریں لکھ کر مجھے خیال آیا کہ یہ محمد خان تاریخ مطیع و صبیح کے غلام محمد خان ہی تو نہیں؟

حالات کی کوئی تفصیل نہیں۔ بچی کھچی جائیداد میں حصہ پانے والوں میں

نواب صاحب کے دو بھتیجوں، احمد اللہ خان اور حامد علی خان کے نام ملتے ہیں۔ انھوں نے انگریزی سرکار کی کوئی خدمت انجام دی تھی۔ اس کے صلے میں ضبط ہونے والی جائیداد میں بھتیجوں کا نصف حصہ تھا اس کا عشر عشیر لوٹا کر یہ احسان کیا گیا تھا۔ ان کے خاندان کے باقیات کا سراغ نہیں ملتا۔ اس بارے میں مطیع اللہ خان کے لیے ایک عذر کی گنجایش ہے۔ خان بہادر مطیع اللہ خان نے ان کے اخلاف میں سے بھی کسی فرد کا ذکر شاید ہی کیا ہو۔ دونوں کا انداز فکر یہ تھا کہ کسی مجاہد و شہید کا اس طرح ذکر کیا جائے جو اس کے خاندان کے باقیات کے حق میں مشکلات کا موجب نہ ہو۔ اس باب میں مطیع اللہ خان کو ایک حد تک طریق مستقیم پر سمجھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی تاریخ ڈپٹی کلکٹری کے زمانے میں لکھی تھی اور ریٹائر منٹ کے زمانے میں تحریک خلافت اور ترک موالات کے خاتمے اور ردِّ عمل کے نتائج آنے سے پہلے مقدمہ اور وجہ تالیف لکھ کر فارغ ہو چکے تھے، لیکن مولوی صبیح الدین میاں کا عذر قبول نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے ٹھیک اس دور میں قلم اُٹھایا تھا جب تحریک خلافت اور ترک موالات نے انگریز کو خوف زدہ اور اس کے نظام کو درہم برہم اور عوام کو حکومت کے مقابلے میں جری اور بے خوف بنا دیا اور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء تک سول نافرمانی کی تحریک کے کئی دور گزر چکے تھے اور عوام کے دلوں سے خوف بالکل نکل گیا تھا۔ لیکن میاں صاحب کو اس وقت بھی سچ بات لکھنے، حقیقت بیان کرنے اور مظلوم افراد و خاندانوں سے ہمدردی کے اظہار کی توفیق نصیب نہ ہوئی بلکہ توہین آمیز اسلوب میں ان کا ذکر کیا ہے۔ اور ان سے ایسی توقعات کا ذکر کیا ہے جو شرم ناک ہے۔ نواب غلام قادر خان اور ان کی اولاد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "........ (غلام قادر علی خان کی) اولاد موجود ہے، جو نان شبینہ کو محتاج ہے۔ یہ نتیجہ تھا (نواب صاحب کی) اس کوتاہ اندیشی کا اور "بدعقلوں" کی صحبت کا! اگر نواب مرحوم "سنجیدگی" اور "عقل مندی" سے کام لیتے تو اس خاندان کے عروج کا اتفاق سے ایک نادر موقع ہاتھ آ گیا تھا، جس کو ضایع کر کے اپنے گھر کے ساتھ، شہر کو بھی تباہ اور بدنام کرا دیا۔"

میرے جد امجد:

فتح محمد خان عرف فتح خان

نواب بہادر خان کے چھٹے بیٹے فتح خان تھے۔ ان کی والدہ کا نام معلوم نہیں صاحب تاریخ مطیع نے نواب احمد خان صاحب انہار البحر کے حوالے سے لکھا ہے:

"فتح خان نام مادر معلوم نیست۔"

نواب مرحوم کے بیٹوں میں یہی بزرگ خاک سار تصدق حسین خان موسوم بہ ابوسلمان شاہ جہان پوری کے جد امجد ہیں۔ ڈپٹی کلکٹر مولوی مطیع اللہ خان نے ان کا تذکرہ ان الفاظ میں لکھا ہے:

"عہد شاہ جہانی میں بوجہ کم عمری مختصر منصب یا یومیہ ملا تھا۔ جوان ہونے پر حسب بیان نواب احمد خان عہد اورنگ زیب میں ملازم ہوئے اور ترقی پا کر صوبے دار لاہور مقرر ہوئے اور اسی جگہ وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ مگر عالم گیر نامے سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ عہد اورنگ زیب میں ملازم تھے اور جنگ اجمیر میں دارا شکوہ پر غلبہ پالینے کے بعد اورنگ زیب نے ان کو خلعت و شمشیر عنایت کر کے وطن جانے کی اجازت دی تھی۔ اس دور کے کسی مؤرخ کی زبان سے ہم ان کا ذکر نہیں سنتے ہیں۔ (عالم گیر نامہ: صفحہ ۴۳۰)

فتح خان قوم و وطن میں نیک نام نہ تھے۔ ان کے مزاج میں ظلم و جبر بہت تھا۔ مکرندرائے صوبیدار کشمیر سے موافقت کر کے ۱۰۷۹ھ (۶۹-۱۶۶۸ء) میں انھوں نے اپنے بھائی نواب عزیز خان اور اپنے ہم وطنوں کو بہت پریشان کیا تھا، جس کا پتا یادداشت شیخ عثمان صاحب متانی سے چلتا ہے۔ جس کو ہم آگے چل کر محل مناسب پر نقل کریں گے۔

سنہ وفات ان کا معلوم نہیں، مگر وہ عہد اورنگ زیب کا واقعہ ہے۔ گاڑی

پورہ میں محلہ فتح پور انھیں کے نام سے آباد ہے۔ اسی میں ان کی اور ان کی اولاد کی سکونت تھی، جن میں سے اب کوئی باقی نہیں ہے۔ خان زادگان فتح پور اپنے آپ کو ان ہی کی نسل سے بتاتے ہیں۔" واللہ اعلم

(تاریخ مطیع: صفحہ ۳۸۳) (انہار البحراز نواب احمد خان و زبانی روایات)

تاریخ صبیح میں فتح خان کے انھیں حالات کا خلاصہ کر دیا گیا ہے اس میں ایک جملہ بھی تو ایسا نہیں جس کا حوالہ دیا جائے۔

تاریخ مطیع میں ضمناً نواب عبدالعزیز خان عرف عزیز خان کے تذکرے میں ان کا نام آیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"رجب ۱۰۸۱ھ (مطابق نومبر ۱۶۷۰ء) میں ان کا (یعنی عزیز خان کا) شاہ جہان پور میں ہونا اور اپنے بھائی فتح خان و مکرندرائے صوبے دار کے مظالم سے حیران و پریشان ہونا مترشح ہوتا ہے۔" (صفحہ ۳۸۷)

مطیع اللہ خان مرحوم نے یہ بات شیخ عثمان متائی کی یادداشت کے حوالے سے لکھی ہے جو ان کی نظر سے گزری ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"۱۰۷۹ھ ختم بواسطہ دفع شر شریران از کافر مکرند و ظالم فتح خان ازیں بلدہ شد۔"

دوسری جگہ تحریر فرمایا ہے:

"ختم یوم الجمعہ برائے تحصیل مراد دلیر خان ۱۰۸۰ھ۔"

تیسری جگہ مرقوم ہے:

"۱۰۸۱ھ ۲۱ر رجب بواسطہ مہربان شدن بادشاہ اسلام ایں مسلمانان ملکی الخصوص بر عبدالعزیز خان حیران۔"

چوتھی جگہ لکھا ہے:

۲۸ر رجب ۱۰۸۱ھ بواسطہ دفع ایں بلا و مہربانی بادشاہ بر اہل ایں بلدہ۔"

ان یادداشتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بدر جہاں پہانوی کی سرکشی میں فتح خان کی امداد سے مکرندرائے نے نواب عزیز خان و دیگر معززین شاہ جہان پور کو بادشاہ کی

نظر میں متہم کیا تھا، جس کی وجہ سے وہ اپنی جان ومال کو ضغطے میں پا کر پریشان تھے اور فتح خان مشیر مکرند رائے غالباً (غالباً نہیں یقیناً) عزیز خان کے بھائی تھے۔ باہمی مخالفت اور خاندانی مناقشوں کی وجہ سے ان کا فوج دار کے ساتھ در خور ہونا عزیز خان اور شہر والوں کے لیے باعث تردد ہورہا تھا۔ (تاریخ مطیع: صفحہ ۹۶-۴۹۵)

(۲)

اورنگ زیب اس حقیقت کو کیسے نظر انداز کرسکتا تھا کہ نواب بہادر خان اور ان کا پورا خاندان اس کی حکومت کے استحکام و وسعت کے لیے اپنی جانوں کو ہتھیلی پر رکھے میدان جنگ میں کھڑا رہا ہے۔ بہادر خان کی وفاداری کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے اپنے والد دریا خان کی اور دوسرے عزیزوں کی پروا بھی نہ کی تھی۔ گھر کی عیش وراحت اور اپنے بیوی بچوں اور خاندان کے چھوٹوں بڑوں کی صحبتوں کے لطف بھی نہ اٹھا سکے تھے۔ ان کے دکھ درد کی خبر اور ان کی تعلیم وتربیت کی فکر سے بھی زندگی بھر دور ہی رہے تھے۔ ان کی زندگی میں بارہا یہ مواقع آئے تھے کہ شاہ جہان کے بیٹے ان کی معیت میں عہد شاہ جہانی میں سلطنت کے دشمنوں کے خلاف اور بغاوتوں کے استیصال میں بہادری کے جوہر دکھائے تھے اور جان کے نذرانے پیش کیے اور کئی معرکوں میں انھوں نے شہزادوں کی رائے اور ان کی خوشنودی کی بھی پروا نہ کی تھی۔ شہزادے کی خاطر بادشاہ کی ناراضگی کو مول لیا تھا، اپنی جائیداد ضبط کرائی تھی۔ شہزادوں کی تربیت میں ان کا حصہ تھا وہ ان کے ناز اٹھاتے تھے۔ بہادر خان اور ان کا خاندان شہزادوں کے نمک کے ذائقے سے نا آشنا تھا، ان کا پیر و مرشد صاحبِ قران شہزادے کی قید میں تھا اور اپنے بڑے اور چھوٹے تین بھائیوں کے مقابل معرکۂ کارزار میں تھا۔ اورنگ زیب ایک ذہین، منتظم اور مدبر حاکم تھا، وہ خوب جانتا تھا کہ باپ اس کی قید میں ہے، بھائی اس کی شمشیر کی نوک پر ہیں۔ خانوادۂ بہادر خان حالات پر حیرت زدہ ہے اور بیشتر اس ہنگامۂ قتل وخون سے الگ تھلگ ہیں، پھر کیا انھیں اس عالم حیرت ہی میں چھوڑ دیا جائے، نہ ان سے باپ اور بھائیوں کے خلاف کسی امداد کی توقع رکھی جائے اور نہ

انھیں چھیڑا جائے؟

البتہ خوانین شاہ جہان پور اور خصوصاً خانوادۂ نواب بہادر خان کے جن افراد نے اورنگ زیب کا ساتھ دیا تھا، ان کی اس نے سرپرستی کی۔ ان میں فتح محمد خان عرف فتح خان بھی ہے۔ اس بات کا اس نے اس درجے خیال رکھا تھا۔ اسے مکرندرائے کی نظامت بریلی پر تقرری کے فوراً بعد خوانین شاہ جہان پور کی ناراضگی کا علم ہوگیا تھا۔ اسی وقت سے وہ موقع کے انتظار میں تھا چناں چہ جوں ہی اسے موقع ملا اس نے مکرندرائے کو بنگالہ میں نظامت کے لیے بھیج دیا۔ وہاں چوں کہ فتح خان کی مشاورت کی ضرورت نہ تھی۔ فتح خان کو موقع ملتے اور ضرورت پڑتے ہی لاہور کی گورنری پر بھیج دیا۔ وہیں اس کا انتقال ہوا اور وہیں کی مٹی میں مل گیا۔

(۳)

فتح محمد خان عرف فتح خان کی جس حالت کی طرف شیخ عثمان متانی نے اشارہ کیا ہے اور صاحب تاریخ مطیع نے اسے بے تکلف نقل کردیا ہے، وہ فتح خان کی کسی کمزوری سے زیادہ مکرندرائے کا نظامت بریلی سے تعلق کا شاخسانہ ہے۔ مطیع اللہ خان نے فتح خان کا ترجمہ ''واللہ اعلم'' پر ختم کیا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس کی صحت کا انھیں خود یقین نہیں۔ وہ اس بیان کی صحت کے ذمے دار نہیں!

۱۶۵۷ء میں اورنگ زیب عالم گیر نے بھائیوں کو شکست دینے کے بعد زمام اقتدار ہاتھ میں لی اور نظام حکومت کو درست اور مستحکم کرنے کی طرف توجہ دی تو راجہ مانک چند کھتری دہلوی کے بیٹے مکرندرائے کو بریلی کا ناظم بنایا اور فتح خان کو اس کا مشیر مقرر کیا۔ مکرندرائے کا ناظم بریلی مقرر کیا جانا علاقے کے خوانین کو پسند نہ تھا۔ انھیں یقین تھا کہ شاہ جہان پور وغیرہ میں صاحبِ کمال، باصلاحیت اور مغلیہ سلطنت کے وفادار موجود تھے، لیکن اورنگ زیب اس حقیقت کو کیوں کر نظر انداز کرسکتا تھا کہ پٹھانوں نے مغلیہ حکومت خصوصاً شاہ جہاں کی حکومت کے دفاع، استحکام اور وسعت

دینے میں اپنی جانیں قربان کی تھیں۔ وہ اس حقیقت کو بھی کیوں کر فراموش کر سکتا تھا کہ ان ہی کے باپ، چچا، بھائی اور عزیز رشتے دار کچھ نہ کچھ تو اس کے مخالفین۔ بھائیوں کے ساتھ بھی تھے انھوں نے ہر سہ برادران سے اپنی وفاداری نبھانے کے لیے اپنے جسموں میں زخم کھائے تھے اور سر کٹوائے تھے، شیخ عثمانی متانی کے بہ قول ان کی باہمی مخالفت اور خاندانی مناقشات اپنی جگہ لیکن انھیں ایک ہوتے کیا دیر لگتی!

اورنگ زیب نے مکرند رائے کو بریلی کا ناظم بنایا تھا تو اس لیے اس کا باپ راجہ مانک چند کھتری دہلوی اس سے پہلے اس علاقے کا ناظم تھا اور اس کی وفاداری کو آزما چکا تھا، اس کا بیٹا نظامت کی تربیت پا چکا تھا اور اس کی ضمانت کے طور پر مانک چند کھتری دہلوی آگرے میں موجود تھا۔ شاہ جہان پور کے پٹھانوں میں کسی کو اپنے قبیلے کی پشت پناہی حاصل تھی نہ کسی کے پاس مکرند رائے جیسی ضمانت موجود تھی۔ نواب بہادر خان کے خاندان میں تو پھوٹ پڑی ہوئی تھی اور یہ بات کچھ اسی وقت نہ پیدا ہوگئی تھی بلکہ نواب بہادر خان نواب دلیر خان کی زندگی میں حالات کی سمت یہ تھی کہ بہادر خان کے بیٹوں نے چچا دلیر خان کو برداشت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ دلیر خان کی سمجھ داری تھی کہ وہ صورت حال کو بھانپ کر فساد کا چشمہ پھوٹ پڑنے سے پہلے شاہ آباد چلے گئے تھے۔ اور اگر کھل کر اختلافات کا اظہار نہ ہو سکا تھا لیکن تاریخ شاہ آباد نامہ مظفری کے صفحات تو ان تذکار سے خالی نہ رہے۔ اور بعد میں خانوادۂ بہادر خان کے افراد گروہوں اور جتھوں میں بٹ گئے اور کوئی کسی کا پرسان حال نہ رہا تھا۔

(۴)

شاہ جہان پور اس وقت نظامت بریلی میں شامل تھا۔ راجہ مانک چند کھتری دہلوی کے دور نظامت میں اور اس کے فوراً بعد مکرند رائے کے زمانہ نظامت میں بھی شاہ جہان پور بریلی کے دائرۂ نظامت میں رہا۔ شاہ جہان پور کے خوانین کا غصہ کم نہیں ہوا تھا بلکہ بڑھ گیا تھا لیکن فتح خاں کا مشیر قرار پانا جلتی پر تیل ثابت ہوا۔

عجیب بات ہے کہ بدر جہاں پھانوی فوج دار کی اورنگ زیب سے سرکشی کے

مکرندرائے اور فتح خان کے بھائی عزیز خان دونوں خلاف تھے، لیکن مکرندرائے ناظم بریلی کو ہونے اور اپنے والد کی وجہ سے دربار شاہی میں زیادہ رسوخ حاصل تھا۔ دربار میں یہ رسوخ واثر عزیز خان کے لیے ناقابل برداشت تو تھا ہی فتح خان کی مشاورت نے اسے اس حد تک سخت بنادیا تھا کہ ان کی جان و مال کے لیے خطرات پیدا ہو گئے۔ ان ہی خطرات نے انھیں دعا کے لیے شیخ عثمان متانی تک پہنچا دیا۔ اس موقعے پر حضرت شیخ کو عزیز خان نے اس درجے اپنا ہمدرد و شفیق بنالیا کہ وہ نہ صرف مکرندرائے کے، فتح خان کے بھی دشمن بن گئے، پھر بھی عزیز خان کی زبان سے تو بھائی کے خلاف کوئی جملہ کسی نے نقل نہیں کیا لیکن شیخ عثمان متانی کی یادداشتوں میں فتح خان کو اُن کی سخت مزاجی اور جبر و ظلم سے ضرور متہم کر دیا گیا۔ حال آں کہ حضرت شیخ کا نہ ان کے خاندان سے تعلق تھا، نہ وہ سیاست کا ذوق رکھتے تھے، نہ انھیں بدر جہاں پہانوی کی بغاوت سے اور اورنگ زیب عالم گیر کے اچھے برے سے کوئی تعلق تھا۔

(۵)

نواب فتح خان کے بارے میں تاریخ کے مطالعے سے ان کی یہ خصوصیات سامنے آتی ہیں:

۱۔ عہد شاہ جہانی میں پیدا ہوئے اور کم عمری ہی میں مختصر منصب پر فایز ہوئے یا ان کا یومیہ مقرر ہوا۔

۲۔ اورنگ زیب عالم گیر کے عہد حکومت کے آغاز ہی میں راجہ مکرندرائے قسمت بریلی کے ناظم مقرر ہوئے تو بہ حیثیت ان کے مشیر کے فتح خان کا تقرر عمل میں آیا اور کئی سال تک وہ اس منصب پر فایز رہے۔ تا آں کہ مکرندرائے کو اسی منصب پر بنگالہ بھیج دیا گیا۔

۳۔ اورنگ کے خلاف بدر جہاں پہانوی نے بغاوت کی تو اس کے استیصال کے لیے فتح خان مکرندرائے ناظم بریلی کے مشیران کے ساتھ دفع بغاوت کی جنگ میں شریک رہے۔

۴۔اورنگ زیب کی ان کے بھائیوں داراشکوہ، شجاع اور مراد بخش سے جنگوں میں مکرند رائے ناظم بریلی کے ساتھ شریک رہے۔اورنگ زیب کے غالب آنے پر دوسرے امرا اور نوابین کی طرح فتح خان بھی بادشاہ کی خوشنودی اور خلعت و شمشیر کے سزاوار قرار پائے۔

۵۔بدر جہاں کی سرکشی کے دفیعے اور برادران اورنگ زیب پر غلبہ پالینے کے بعد جب مکرند رائے کو بنگالہ کا ناظم بنا کر مشرق کو روانہ کیا گیا تو فتح خان کو لاہور کا گورنر بنا کر شمال مغرب میں بھیجا اور خود دکن کے حالات کی درستگی کے نکل کھڑا ہوا۔

۶۔فتح خان کا انتقال لاہور میں خدمات کی انجام دہی کے زمانے میں ہوا اور وہیں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

(۶)

فتح خان کی کارگزاری کا پورا دور چوں کہ اورنگ زیب کی فتوحات کے ظہور کے ساتھ گزرا تھا اور اسی کے دور میں ختم ہو گیا تھا۔اس لیے شاہ جہان، اورنگ زیب اور اس کے بھائیوں کی چند تواریخ درج کی جاتی ہیں۔

۱۔شاہ جہاں: جون ۱۶۵۸ء (رمضان ۱۰۶۸ھ) میں جب کہ شاہ جہان بیمار تھا، اسے قلعۂ آگرہ میں قید کر دیا گیا۔سات سال نو ماہ کے دکھ جھیلنے کے بعد ۲۳ر جنوری ۱۶۶۶ء (۲۶ر رجب ۱۰۷۶ھ) کو پیر کی شب میں شاہ جہان کا انتقال ہو گیا۔

۲۔اورنگ زیب عالم گیر نے ۲۱ر فروری ۱۷۰۷ء (۳ر ذی قعدہ ۱۱۱۸ھ) کو جمعے کے روز احمد نگر (دکن) میں جب کہ اس کی عمر نوے برس سترہ دن تھی، انتقال کیا اور وہیں (احمد نگر) میں دفن کیا گیا۔

۳۔داراشکوہ نے اورنگ زیب کے مقابلے میں شکست کھائی۔اسے زنجیروں میں جکڑ کو اورنگ زیب کے پاس لایا گیا، اسے قدیم دہلی کے ایک قید خانے میں مقید کر دیا گیا، چند دن کے بعد ۲۹ر اگست ۱۶۵۹ء (۲۱ر ذی قعدہ ۱۰۶۹ھ) کی شب کو اورنگ زیب کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔

۴۔شجاع: شاہ جہاں نے شجاع کو بنگال کا گورنر بنایا تھا۔۱۶۵۸ء تک اس نے نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے فرایض انجام دیے تھے۔۵/جنوری ۱۶۵۹ء (۱۹/ربیع الثانی ۱۰۶۹ھ) کو اس نے الہ آباد کے مغرب میں تقریباً تیس میل کے فاصلے پر کھجوا (Khajua) کے مقام پر اورنگ زیب کی فوج سے شکست کھائی۔میر جملہ اور اورنگ زیب کے بڑے بیٹے سلطان محمد نے اس کا تعاقب کیا۔جب کہ وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ دریا عبور کر رہا تھا۔ان دونوں کے حکم پر اسے مع اہل خانہ و سروسامان کے غرق کر دیا گیا۔

۵۔مراد بخش: شاہ جہان نے اپنے چھوٹے بیٹے مراد بخش کو گجرات، ٹھٹھہ، بھکر میں گورنر مقرر کیا تھا۔داراشکوہ کے ساتھ اورنگ زیب نے اسے بھی گرفتار کر کے گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا تھا۔۱۶۶۲ء/۱۰۷۲ھ میں اورنگ زیب کے اشارے پر اسے قتل کر دیا گیا اور اسی قلعے میں اسے دفن کر دیا۔

میرے پردادا:

مجو خان اور امان خان دو بھائی

ایک شہید ایک مجاہد

میں نے اپنے والد مرحوم کی زبانی خاندان کے جن بزرگ کا تذکرہ بار بار سب سے زیادہ اور نہایت فخر کے ساتھ سنا، وہ میرے پردادا مجو خان تھے جو ۲۸ر اپریل ۱۸۵۸ء کو بچوریا (تلفظ: بِچ پُریا) کے معرکے میں شہید ہوئے تھے۔ ان کے ذکر میں حالات کی وسعت نہ تھی لیکن انھیں اپنے دادا سے ایسا عشق تھا کہ وہ ان کا ذکر بار بار کرتے ہوئے تھکتے نہ تھے۔ یہ ذکر ہمیشہ تحریک آزادی وطن اور انقلاب ۱۸۵۷ء کی جنگ کے حوالے سے آتا تھا۔ اس لیے ان کے ذکر میں ان کے چھوٹے بھائی امان خان کا ذکر بھی ضرور آجاتا تھا۔

امان خان میرے پردادا مجو خان کے چھوٹے بھائی تھے۔ دونوں بچوریا کے معرکے میں شریک تھے۔ دونوں کا تعلق توپ خانے سے تھا۔ یہ معرکہ تحصیل جلال آباد سے جنوب میں تقریباً تین میل کے فاصلے پیش آیا تھا یہ شاہ جہان پور میں آخری معرکہ تھا جس نے اس کی قسمت کا فیصلہ کر دیا تھا۔ جب کامیابی اور فتح یابی کی امید معدوم نظر آنے لگی تو مجو خان نے امان خان اپنے چھوٹے بھائی سے کہا کہ اب جو انجام ہے صاف نظر آرہا ہے۔ اب تم جاؤ اور خاندان کو بچانے کی فکر کرو۔ یہی بات امان خان نے اپنے بڑے بھائی سے کہی کہ آپ گھر جائیں میں یہاں اپنا فرض ادا کروں گا۔ دونوں بھائی ایک ہی بات مصر تھے۔ بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کو سمجھایا، ڈانٹا، قسمیں دیں اور بہ جبر انھیں خاندان کی نگہ داشت کے لیے شہر بھیج دیا، لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ان کا عالی شان مکان ویران تھا اور اہل خانہ کا پتا نہ تھا۔ اب وہ تمام لوگ جنھیں جنگ آزادی سے اختلاف تھا یا اپنی کمزوری یا بزدلی کی وجہ سے جنگ میں شریک نہ تھے، یا اب انھیں اپنے پکڑے جانے کا خطرہ تھا، انگریز کے مخبر بن چکے

تھے۔ بچپوریا کے میدان جنگ سے امان خان کا شاہ جہان پور شہر تک کا ۱۹، ۲۰ میل کا سفر ہی خطرات سے پُر تھا، وہ خدا خدا کر کے طے ہوا تو اہل خانہ کو تلاش کرنا ناممکن تھا، نہ دن کے اجالے میں خاندان کے افراد کا نام لے کر کسی سے پوچھ سکتے تھے اور نہ اپنا نام اور خاندان سے اپنے رشتے کا اظہار کر سکتے تھے۔ قدم قدم پر خطرات تھے۔ خاندان کی تلاش میں وقت لگا لیکن کسی پر اپنے آپ کو ظاہر کیے بغیر چھپتے چھپاتے خاندان کا سراغ پالیا، لیکن اس وقت تک سب کچھ تباہ ہو چکا تھا اور خاندان کے کئی افراد کا پھر بھی پتا نہ چل سکا کہ انھیں آسمان نے اچک لیا یا زمین نے اپنے دامن میں چھپالیا۔

اب یہ خاندان ایسے مقام پر ایسی حالت میں تھا کہ کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ یہ نواب بہادر خان بانی شاہ جہان پور کے اخلاف ہیں۔

والد گرامی محمد حسین خان ابن خادم حسن خان ابن مجو خان شہید وطن، نے ان کے عالی شان مکان کا کھنڈر ۱۹۴۷ء میں دکھلا دیا تھا، یہ مکان محلہ بی بی زئی میں تھا، محلہ پختہ تالاب سے اگر مغرب کی طرف نالے کے کنارے چلیں تو یہ نالا آبادی سے باہر تک چلا جاتا ہے۔ پختہ تالاب سے تھوڑا سا آگے بڑھنے کے بعد یہ نالا ٹھیک اس سڑک کے برابر آجاتا جو لال املی کے چوراہے سے مغرب کی طرف آبادی کے باہر تک جاتی ہے اور پھر داہنی طرف مڑ جاتی ہے اور پھر مغرب میں چلی جاتی ہے اور اس کی ایک شاخ ریلوے لائن سے گزر کر محلہ جلال نگر کے مغرب میں کسی مقام پر نکل جاتی ہے۔

پختہ تالاب سے تھوڑا آگے جائیں تو نالے کے بائیں کنارے پر خاک سار کے پردادا کا آبائی مکان آتا ہے۔ جب ۱۹۴۷ء میں والد مرحوم نے دکھایا تھا تو صرف ایک بلند دروازہ بغیر کواڑوں کے دائیں بائیں کی خستہ حال دیواروں کے ساتھ موجود تھا۔ دروازے کی بلندی سے مکان کی وسعت اور شان کا اندازہ کیا جا سکتا تھا لیکن اس کی تعمیرات مسمار اور بے نشان ہو چکی تھی۔ ان کی جگہ کھیتوں نے لے لی تھی، جن میں کاچھی سبزیاں پیدا کرتے تھے۔

اس مقام سے تھوڑا سا آگے بڑھیں تو ایک راستہ شمال میں محلہ مہمند جلال نگر سے آتا ہے اور جنوب میں محلہ عیدگاہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اگر اس مقام سے سیدھے کو مڑ جائیں تو لال املی کے چوراہے سے مغرب میں جانے والی سڑک جو یہاں تک پہنچتے پہنچتے نالے کے متوازی ہو جاتی ہے۔ اسے پار کر کے ہم مہمند جلال نگر میں داخل ہو جاتے ہیں۔ چند مکانوں کے بعد سیدھے ہاتھ کو مولانا عبدالہادی خان کا مکان ہے اور اس سے ملحق روشن علی خان کا مکان ہے۔ عبدالہادی خان اور روشن علی خان کے مکانوں کے دروازے مشرقی سمت میں ہیں۔ سامنے ایک کنواں ہے اور مشرقی سمت میں چند کھیت ہیں جن میں کاشت کاری ہوتی ہے اور سبزیاں اُگائی جاتی ہیں۔ ان مکانوں کے بالمقابل گلی کی دوسری طرف (مغربی سمت) ایک مکان کا کھنڈر ہے جس کے احاطے کی دیواریں ۱۹۴۷ء تک مسمار ہو گئی تھیں۔ صحن کی جگہ بیریوں کے کئی درخت کھڑے تھے لیکن کوٹھریاں محفوظ تھیں اس لیے کہ ان پر کھپریل پڑی ہوئی تھی۔ البتہ ان کے دروازے کواڑوں سے محروم ہو گئے تھے۔ یہ مکان مئی ۱۹۵۰ء میں میرے پاکستان آنے تک اسی حالت میں موجود تھا۔ البتہ ۱۹۶۲ء میں جب میں پہلی بار پاکستان سے شاہ جہان پور گیا تو دیکھا کہ کوٹھریوں پر پڑی ہوئی کھپریل ٹوٹ کر اندر گر گئی تھی۔ ان کی دیواریں بالکل مسمار تو نہ ہو گئی تھیں برسوں کی بارش میں ان کی مٹی بہہ بہہ کر زمین پر پھیل چکی تھی۔ یہ وہ مکان تھا جو بیسویں صدی کے شروع میں میرے دادا خادم حسین خان نے اپنی رہائش کے لیے بنایا تھا۔ مکان سے ساٹھ ستر فٹ آگے مسجد ہے اور مکان و مسجد کے درمیان کوئی اور مکان نہ تھا۔ ۱۹۸۸ء میں جب دوسری بار ہندوستان گیا تو دیکھا کہ کھنڈر کی مٹی سے مکان کے نشان کا پتا چلتا تھا۔ اب تو یقیناً وہ نشان بھی مٹ چکا ہوگا۔

اب ذرا پھر پیچھے کو لوٹیے۔ ہم پختہ تالاب سے مغرب کی جانب نالے کے کنارے چلے تھے۔ تھوڑے سے فاصلے پر نالے کے بائیں کنارے پر ایک شکستہ حال بلند دروازے کا ذکر آیا تھا۔ میں نے بتایا تھا کہ یہ میرے پردادا مجو خان اور ان کے بھائی امان خان کا آبائی مکان تھا جو ۱۸۵۷ء کے انقلابی حالات میں مسمار کر دیا گیا

تھا۔ اس سے تھوڑا آگے بڑھ کر ہم داہنی طرف کو مڑنے کے بعد ہم مہند جلال نگر میں داخل ہو گئے تھے، اگر نالے کے کنارے چلتے ہوئے مہند جلال نگر کی طرف مڑنے کے بجائے الٹے ہاتھ کو (جنوب کی جانب) کچے راستے پر مڑ جایا جائے تو عید گاہ اور اسی نام کا محلہ آ جاتا ہے۔ عید گاہ کا بلند فرش راستہ روک لیتا ہے اور راستہ محرابِ عید گاہ کے پیچھے سے مڑ کر پھر ایک میدان کے کنارے سے آگے بڑھتا ہے۔ یہی وہ میدان ہے جس میں چنور کا میلہ لگتا ہے۔

شمال کی جانب سے کچے راستے سے آکر ہمارے سامنے عید گاہ کا بلند فرش نمودار ہوتا ہے۔ اگر ہم محراب کے پیچھے سے گزر کر پختہ راستہ اختیار نہ کریں تو عید گاہ کے فرش پر پہنچنے کے لیے چند سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے داہنی طرف ایک قبر کا پختہ چبوترا ہے جو عید گاہ کے فرش سے تھوڑا سا نیچا ہے جس کے برابر میں ایک نیم کا درخت ہے جو اس پر سایہ کرتا ہے۔

جس زمانے میں مدرسہ سعیدیہ جامع مسجد (شاہ جہان پور) پڑھنے جایا کرتا تھا میں نے دیکھا کہ میرے والد کے چچیرے بھائی خورشید حسن خان عرف قشا خان جن کا مکان محلہ رنگین چوپال میں حاجی محمد سعید خان سوداگر کے مکان سے ملحق تھا۔ ہفتے میں دو تین بار ضرور آتے تھے اور مذکورہ قبر پر جھاڑو دیتے اور فاتحہ پڑھتے تھے۔ میں جب تک مراد آباد نہیں گیا تھا، مہینوں تک میں ان کا یہ معمول دیکھتا رہا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ صبح کے وقت میں مدرسے جا رہا ہوتا تھا اور وہ رنگین چوپال کی طرف سے نکل کر محلہ عید گاہ کی سڑک پر سائیکل پر آتے ہوئے دور سے نظر آتے تھے اور میں سلام کرنے کے لیے مستعد ہو جاتا تھا۔ وہ پاس آکر زمین پر پاؤں ٹکا کر سائیکل روکتے، سلام کا جواب دیتے خیریت پوچھتے اور آگے بڑھ جاتے، کئی بار ایسا بھی ہوا کہ میں انھیں دیکھ نہیں سکا اور انھوں نے پاس آکر سائیکل روکی اور کہا السلام علیکم، اور میں ایک دم چونک پڑا، وہ میری اس حالت سے لطف اندوز ہوتے اور مسکراتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔

میں شاید سال یا دو سال پہلے والد اور والدہ کے ساتھ ایک مرتبہ ان کے گھر گیا

تھا اور اب میں نے انھیں پہچان لیا تھا کہ یہ میرے چچا قشا خان ہیں لیکن وہ مجھے پہچان نہیں سکے تھے۔ اس لیے میں ان کے لیے مدرسے کا ایک اجنبی طالب علم ہی رہا۔ چند ماہ کے بعد میں گھر (جمنیاں دولت پور جو میری ننھیال تھی) گیا اور والد مرحوم سے ذکر آیا میں نے انھیں بتایا کہ ہفتے میں دو تین باران کا سامنا اور سلام دعا ہو جاتی ہے۔ وہ عید گاہ کے داہنی طرف سیڑھیوں کے پاس ایک قبر کی صفائی اور فاتحہ کے لیے آتے ہیں۔ تب والد مرحوم نے بتایا کہ وہ قبر میرے دادا اور تمہارے پردادا مجو خان کی ہے جو ۱۸۵۷ء میں بچپوریا کے معرکے میں شہید ہوئے تھے۔ یہ معلوم ہو کر مجھے بڑی خوشی ہوئی اور پھر میں بھی وہاں سے گزرتے ہوئے ہمیشہ فاتحہ پڑھتا ہوا گزرتا تھا۔ افسوس کہ پھر ان سے سرِ راہ کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ ایک مرتبہ جب میں مولانا عبدالہادی خاں کے ساتھ لال املی کے چوراہے پر مسجد سے جمعے کی نماز پڑھ کر نکلا تو ان پر نظر پڑی وہ مولوی عبدالہادی خاں میرے مربی اور استاد اور بعد میں ہونے والے میرے پھوپا خسر سے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے ان کے ساتھ دیکھ کر انھیں تعجب ہوا اور پوچھا یہ آپ کے.....؟ لیکن جملہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ مولانا عبدالہادی نے کہا ہاں یہ..... جملہ ان کا بھی مکمل نہیں ہوا۔ میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مجھے یاد ہے کہ انھوں نے مولانا موصوف کی والدہ کی خیریت اور حالت خاص طور پر پوچھی تھی۔ یہ دونوں بزرگ آپس میں کوئی خاندانی رشتہ ضرور رکھتے تھے لیکن مجھے حقیقتِ رشتہ کا کوئی علم نہیں ہو سکا۔

میرے دادا:

خادم حسین خاں

مجھے اپنے دادا خادم حسین خاں کے سوانح حیات کی تفصیلات معلوم نہیں لیکن یہ جانتا ہوں کہ وہ شہید آزادی وطن مجو خاں کی واحد اولاد تھے اور فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں ان کا پوتا ہوں، ان کا آبائی مکان بی بی زئی محلے میں تھا۔ ۱۸۵۷ء میں خاندان کے قبضے سے نکل گیا تھا۔ ۱۹۵۰ء تک میں نے دیکھا تھا کہ اس کے بلند دروازے کا نشان باقی تھا اور مکان کی جگہ پر کاچھی سبزیوں کی کاشت کرتے تھے۔ جب دادا نے متاہل زندگی شروع کی تھی تو مہمند جلال نگر میں مکان بنالیا تھا۔

دادا کی شادی عنایت پور (نزد نگوہی) کے ایک روہیلے خاندان میں ہوئی تھی۔ مجھے اپنی دادی کے باپ کا نام معلوم نہیں، لیکن دادی کے چھوٹے بھائی حاجی محمد ولی خاں کو دیکھا تھا۔ ان کے واحد بیٹے احمد ولی خاں اور دو بیٹیاں احمدی بیگم اور صفیہ بیگم تھیں۔ احمد ولی خاں اور صفیہ بیگم کا خاندان اب بھی عنایت پور اور تلہر میں آباد ہے۔

احمدی بیگم اپنے شوہر حافظ حمید الدین اور بچوں کے ساتھ پاکستان آگئی تھی۔ وہ خود اور ان کی اولاد معین الدین، زاہدہ بیگم، مریم بیگم، ضیاء الدین، قمر الدین اور نصیر الدین کا تو انتقال ہوگیا ہے اور ان کی اولاد کراچی، سانگھڑ، مردان، راولپنڈی، اسلام آباد وغیرہ میں پھیلی ہوئی ہے۔

دادا کی اولاد:

دادا کی اولاد میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ سب سے بڑی بیٹی تھیں جو نمو کے نام سے پکاری جاتی تھیں، ان سے چھوٹے میرے والد محمد حسین خاں تھے، ان سے چھوٹی میری دوسری پھوپھی تھیں، لیکن ان کا نام مجھے یاد نہیں یا یہ کہ ان کے نام کا کبھی کسی گفتگو میں ذکر ہی نہ آیا تھا۔ ان سے چھوٹے میرے چچا عابد حسین خان

عرف ابی خاں تھا۔ ان کا جوانی میں بہ مقام کوئٹہ انتقال ہوا تھا۔ انھیں زہر دے کر ہلاک کیا گیا تھا، لیکن یہ خاندان والوں کا قیاس ہے۔ چوں کہ خاندان کی ایک شاخ سے جھگڑا پیدا ہوگیا تھا، اور اس شاخ کے ایک صاحب انھیں اپنے ساتھ کوئٹہ لے گئے تھے۔ زہر سے موت واقع ہو جانے کی خبر گھر پہنچی تھی اور ان کی صحت کو دیکھتے اور ہمت بلند کو جانتے ہوئے خوش کشی کا گمان عقل سے بعید تھا۔ ان باتوں اور شبہات نے ذہنوں میں زہر دے کر انھیں ہلاک کرنے کی بات دلوں میں بٹھا دی تھی۔ ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔

میری پھوپیاں:

میری دو پھوپیاں تھیں۔ دونوں کی شادی قریبی گاؤں ''منڈیا آس'' میں ہوئی تھی۔ دونوں صاحب اولاد ہوئیں۔ ان کی نسل باقی ہے۔

بڑی پھوپی جن کا نام نموتھا؛ منڈیا کے اکبر علی خاں عرف اکو خاں سے بیاہی گئی تھیں۔ اکو خاں کے والد کا نام ننھے خاں تھا۔ ان کے بڑے بھائی جمعہ خاں اور چھوٹے پیرا خاں تھے۔ ان کا ذکر بھی آیندہ سطروں میں آرہا ہے۔

میری بڑی پھوپی کو خدا نے تین اولادیں دی تھیں:

۱۔ بڑی بیٹی تھی جس کا نام اسلامی بیگم تھا۔ ان کی شادی شاہ جہان پور کے محلے احمد پورہ میں غلام حسن خاں کے بیٹے اسرار حسن خاں سے ہوئی تھی۔ ان کے بطن سے اشفاق حسین خاں عرف منو خاں اور زاہد حسین خاں ہیں۔ یہ خاندان شاہ جہان پور کے محلے احمد پورہ میں آباد ہے۔ دونوں بھائی صاحبِ اولاد ہیں۔

۲۔ انوار خاں پاکستان آگئے تھے۔ کچھ عرصہ انھوں نے نواب شاہ میں گزارا تھا، پھر کراچی آگئے، ان کا انتقال ہوگیا۔ ۲۰۱۰ء میں ان کی ''خاتون'' نامی بیوہ بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ امتیاز اور انصار نامی ان کی دو بیٹیاں ہیں۔ دونوں کی شادی ہوگئی اور دونوں صاحبِ اولاد ہیں۔

۳۔ چھوٹی بیٹی کا نام ''دختری'' تھا۔ جلال آباد (شاہ جہان پور) میں اس کی

شادی ہوئی۔حالات کا علم نہیں۔

میری دوسری پھوپی:

ابا کی دوسری بہن اکبر علی خاں عرف اکو خاں کے چھوٹے بھائی پیرا خاں کو بیاہی تھیں۔ان کا نام یاد نہیں۔ان کی ایک بیٹی رحمانی نامی تھیں۔ان کی شادی محبوب علی خاں سے ہوئی تھی رحمانی کا انتقال کراچی میں ہوا۔اللہ تعالیٰ نے انھیں چار اولادیں عطا فرمائی تھیں۔ان کی ترتیب یہ ہے؛

۱۔مزمل خاتون منڈیا آس کے احمد اللہ خاں کو بیاہی گئی تھیں۔نواب شاہ (سندھ) میں میاں بیوی دونوں کا انتقال ہوگیا۔عائشہ عرف مُنّن کی شادی عبدالغفور عرف حشمت سے ہوئی۔حشمت کا انتقال ہوگیا۔اس کا بیٹا محمد رفیق ان کی نشانی اور صاحبِ اولاد ہے۔کراچی کے علاقہ اورنگی ٹاؤن سیکٹر ۱۲ میں اپنی ماں اور بیوی بچوں کے ساتھ سکونت پذیر ہے۔

۲۔میری پھوپی زاد بہن (رحمانی) کی دوسری اولاد ایوب علی خاں عرف ایوب خاں تھے۔ان کی شادی ہوگئی تھی بھرپور جوانی میں دونوں کا انتقال ہوگیا۔اولاد نہیں ہوئی تھی۔

۳۔ایوب خاں سے ان کے چھوٹے بھائی محمود علی خاں عرف محمود خاں تھا۔ شادی سے پہلے جوانی میں ان کا بھی انتقال ہوگیا۔

۴۔رحمانی کی اولاد میں سب سے چھوٹی کوثر خاتون تھی۔منڈیا آس ہی کے ہدایت علی خاں سے اس کی شادی ہوئی تھی۔اللہ تعالیٰ نے اسے امتیاز علی خاں عرف امتیاز خالق نامی بیٹا دیا تھا۔امتیاز سے میری بیٹی ماریہ صالحہ کا عقد ہوا تھا۔ہدایت علی خاں کا انتقال نواب شاہ میں پہلے ہوگیا۔۱۹۹۲ء میں کوثر کا اور ۱۹۹۷ء میں امتیاز کا بھی انتقال ہوگیا۔اپنی بیوی کو سوگوار اور پانچ بچوں کو اپنی یادگار چھوڑا۔

ان کی ترتیب یہ ہے؛

۱۔جہان زیب، ۲۔اورنگ زیب، ۳۔صلاح، ۴۔امباز حیدر، ۵۔فلاح

ان کا مکان نواب شاہ میں ہے، لیکن امتیاز علی خان کے انتقال کے بعد ماریہ صالحہ بچوں کو لے کر کراچی آگئی۔ دونوں بڑے بیٹے ملازمت کرتے ہیں۔ صلاح کی شادی شاہ جہان پور کے ایک سید خاندان کے نوجوان سید ناصر علی ابن سید عاشق حسین سے ہوگئی ہے، سید علی نامی ان کا ایک بیٹا ہے۔ امباز حیدر اور فلاح دونوں زیر تعلیم ہیں۔

اکبر علی خاں عرف اکو خاں کے بڑے بھائی جمعہ خاں ابن ننھے خاں تھے۔ ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔

بیٹی کا نام کِھلّا خاتون تھی۔ شادی کے بعد جوانی میں انتقال ہوا کوئی اولاد نہیں۔

بڑے بیٹے غلام نبی خاں تھے جو اپنے موضع کے مکھیا بھی تھے احمد نبی خاں ان کے بیٹے تھے۔ ارشاد علی خاں اور روبینہ کے نام سے احمد نبی خاں کا ایک بیٹا اور بیٹی تھی۔ ارشاد علی خاں ذہنی طور پر معذور ہیں۔ شادی نہیں ہوئی۔

غلام نبی خاں کے چھوٹے بھائی محمد شفیع خاں تھے۔ ان کی بیٹی نیاز بانو (شوہر ظہیر حسن خاں) اور بیٹا محمد نبی ہے۔

نیاز بانو کی اولاد بہ ترتیب یہ ہے: ۱۔ نکہت (شادی شدہ - لاولد)، ۲۔ توقیر حسن خاں (زوجہ عظمیٰ)، ۳۔ تنویر حسن خاں (زوجہ ثمرین) اور طاہر حسن خاں (زوجہ فرحت)۔ توقیر اور تنویر صاحب اولاد ہیں۔

محمد نبی خان کی اولاد بہ ترتیب یہ ہے: ۱۔ آل نبی خاں، ۲۔ وارث علی خاں، ۳۔ عرفان علی خاں، ۴۔ رضوان علی خاں، ۵۔ سلمہ (زوجہ طاہر خاں)، ۶۔ نائمہ (زوجہ رفیق خاں)۔ محمد نبی خاں کی تمام اولاد ذکور و اناث صاحب اولاد ہے۔

مذکورہ بالا دونوں خاندان علاقہ لانڈھی (کراچی) میں مقیم ہیں۔

منڈیا آس میں اسی خاندان کی ایک شاخ اور تھی جس کے سربراہ مصاحب علی خاں تھے۔ ان کے بیٹے واحد علی خان اور ان کے بیٹے ہدایت علی خان، جن سے محبوب علی خاں کی بیٹی کوثر خاتون جو میرے پھوپا کی نواسی تھی، بیاہی گئی تھی اور میری بیٹی ماریہ صالحہ ان کی (ہدایت علی خاں) بہو بنی۔

ماں کی طرف سے ہدایت علی خاں کا خاندان، اسی خاندان کی ایک اور شاخ سے، جس کے سربراہ للاّ (لل لا) خاں تھے، تعلق رکھتا تھا، للاّ خاں کی تین اولادیں تھیں: ۱۔ محمد حسین خاں عرف کھنو خاں، ۲۔ محمد بدل خاں اور ۳۔ صغریٰ بیگم ہدایت علی خاں کی والدہ تھیں۔ صغریٰ بیگم مصاحب علی خاں کے بیٹے واحد علی خاں سے بیاہی گئی تھیں۔ للاّ خاں کے بڑے بیٹے محمد حسین خاں عرف کھنو خاں کی پہلی شادی منڈو خاں کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ اس کے بطن سے احمد حسین خاں نامی بیٹے تھے، دوسری زوجہ سے بھی ان کی اولاد تھی۔ اب پاکستان میں ان کی تفصیل بتانے والا کوئی نہیں۔

میرے والد:

محمد حسین خان

دادا کے انتقال کے بعد جب ابا شہر کی سکونت چھوڑ دینے پر مجبور ہوئے تو ان کی عمر ایسی نہیں تھی کہ وہ زندگی کا بوجھ اٹھا سکیں۔ شاہ جہان پور میں زندگی کے چار پانچ برس مکتب میں گزارے تھے اور جب وہ اپنے خالو کے پاس جمنیاں دولت پور میں پہنچے تو وہاں خاندان اور گاؤں کے بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لیے ایک ملاجی مقرر تھے، لیکن ابا نے شاہ جہان پور اور جمنیاں میں کس سے کیا پڑھا تھا۔ اس کی تفصیل معلوم نہیں لیکن یہ اندازہ کرنا کوئی مشکل نہیں کہ وہ ابتدائی کتابوں کی تحصیل سے ضرور گزر چکے تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنی گفتگو اور نصیحت کی باتوں میں فارسی کے اشعار بے تکلف استعمال کرتے تھے۔ خصوصاً کریما، خالق باری، مامقیما وغیرہ تو انھیں گویا از بر یاد تھا اور حضرت شیخ سعدیؒ کی حکایات تو بے تکلف سناتے تھے۔ ان کی گفتگو میں روانی اور برجستگی ہوتی تھی۔ بڑے بھیا (احمد حسین خاں) جب جونا گڑھ رسالے میں ملازمت کے لیے چلے گئے تھے اور ان کا خط آتا تھا تو وہ اسے خود ہی پڑھتے تھے اور والدہ کو بتاتے تھے کہ خط میں کیا لکھا ہے۔ زمین کے کاغذات کا مطالعہ خود کرتے تھے اور مقدمات کی تیاری اور پیروی وہ خود کرتے تھے۔ لیکن مجھے یہ یاد نہیں کہ میں نے انھیں کبھی کچھ لکھتے ہوئے دیکھا ہو۔

جمنیاں میں سکونت کی وجہ:

والد مرحوم کے جمنیاں دولت پور جانے اور پھر ہمیشہ کے لیے وہیں کے ہو جانے کے کئی وجوہ تھے:

پہلی وجہ تو یہ تھی کہ دادا کے انتقال کو زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ دادی کی چھوٹی بہن کا جو جمنیاں کے حافظ جمعہ خاں کو بیاہی تھیں، انتقال ہو گیا تھا، خاندان کے لوگوں

نے مناسب سمجھا کہ بیوہ کا نکاح ان کے بہنوئی سے کرا دیا جائے۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔

دوسری وجہ یہ ہوئی کہ میری دو پھوپیوں کی شادی پڑوسی موضع میں منڈیا آس ہوئی اور پھر والد کا نکاح بھی ان کی خالہ زاد رقیہ بیگم سے ہو گیا تو پیروں میں مزید بیڑیاں پڑ گئیں۔

شادی کے بعد سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ اپنا گھر الگ بنایا جائے۔ گھر بنایا تو گویا یہ قید کی زنجیر کی آخری میخ تھی جس کے گرد گھوما جا سکتا تھا اس سے دور نہیں جایا جا سکتا تھا۔ شہر میں گھر ہوتے ہوئے بھی اسے آباد نہیں کیا جا سکا۔ اور اسباب بھی ہوں گے، جنھوں نے گاؤں کی رہائش کے لیے مجبور کر دیا تھا۔

میرے بھائی بہن:

۱۔ احمد حسین خاں: میرے بڑے بھائی تھے۔ ریاست جوناگڑھ میں رسالے میں ملازم تھے۔ ۱۹۴۵ء میں ملازمت سے فارغ ہو کر گھر آ گئے تھے اور پولیس میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ۱۹۵۰ء کے ابتدائی مہینوں میں استعفیٰ دے دیا تھا اور ہم سب بہن اور بھائیوں کو لے کر مئی ۱۹۵۰ء میں پاکستان آ گئے تھے۔ ان کی شادی شاہ جہان پور محلہ احمد پورہ میں مقصود حسن خاں کی بیٹی حسیبہ بیگم عرف منّا سے ہوئی تھی۔ ان کے کوئی اولاد نہیں۔ کراچی میں انتقال ہوا۔ ان کے انتقال کے چند سال بعد بھیا کا بھی انتقال ہو گیا۔

مقصود حسن خاں شاہ جہان پوری کے ایک بیٹے محبوب حسن خاں اپنی بہن سے بڑے تھے۔ صاحب اولاد تھے۔ ان کا خاندان اب بھی شاہ جہان پور (محلہ احمد پورہ) میں آباد ہے۔

۲۔ تجمل حسین خاں: میرے منجھلے بھائی تھے۔ کچھ عرصہ انھوں نے بھی جوناگڑھ کے رسالے میں ملازمت کی تھی جنگ عظیم دوم کے خاتمے کے بعد انھیں ملازمت سے سبک دوش کر دیا گیا۔ گھر آ کر کاشت کاری میں مصروف ہو گئے تھے۔

۱۹۵۰ء میں خاندان کے ساتھ وہ بھی پاکستان آ گئے تھے۔ ان کی شادی مہمند جنگلے کے حامد حسین خاں عرف عبدالرحیم خاں ابن منگل خاں ابن غلام حسین خان کی بڑی بیٹی اُمت بیگم سے ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بیٹی کے انعام سے نوازا تھا۔ شگفتہ بیگم اس کا نام ہے اور الہ آباد کے ایک مغل خاندان میں مرزا ہارون بیگ ابن مرزا سمیع بیگ سے ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے سعید و صالح سات اولادوں سے نوازا ہے جن کی ترتیب یہ ہے:

۱۔ مرزا وصی بیگ، ۲۔ مصباح، ۳۔ صباح، ۴۔ از کیہ ۵۔ ہدیٰ،
۶۔ مرزا ذکی بیگ، اور ۷۔ مرزا محتشم بیگ۔

۳۔ میں (ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری) اپنے والد کی تیسری اولاد ہوں۔ دو بھائی مجھ سے بڑے اور دو بھائی چھوٹے ہیں۔ منجھلے بھائی کی بیوی کی چھوٹی بہن نعمت جہاں میرے حبالۂ عقد میں آئی۔ اللہ تعالیٰ نے پانچ بیٹیاں اور ایک بیٹا عطا فرمایا۔

☆ رضیہ سعدیہ: میری بڑی بیٹی ہے، پہلے شوہر سے شایستہ نامی ایک بیٹی ہے۔ خاندان کے ایک عزیز نوجوان محمد خالد ابرار سے اس کی شادی ہوگئی محمد معز اور محمد حمزہ اس کے دو بیٹے ہیں۔ رضیہ کی دوسری شادی حیدر آباد دکن کے ایک سید خاندان میں سید غوث الدین مجاہد ابن سید زین الدین ابن سید خواجہ ابوالحسن علیہما الرحمہ سے ہوئی۔ ۱۹۴۸ء میں یہ خاندان پاکستان آ گیا تھا۔ سید غوث الدین سے خدا نے اسے تین اولادیں عنایت فرمائیں۔ بڑی ثوبیہ ہے جس کی شادی خاندان ننھیال کے ایک نوجوان فرید احمد کے ساتھ ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے عائشہ، عالیان اور علیشا تین اولادوں سے نوازا ہے، ثوبیہ سے چھوٹا بیٹا سید قادر معین بابر ہے اور حصول تعلیم کے دور سے گزر رہا ہے، اس سے چھوٹی نجم السحر ہے جس کی شادی حیدر آباد دکن کے ایک معزز خاندان میں محمد سلطان ابن محمد کامران سے ہوئی ہے۔

☆ ماریہ صالحہ: میری دوسری بیٹی ہے، جس کی شادی میری پھوپی کے خاندان کے ایک نوجوان امتیاز علی خان ابن ہدایت علی خان۔ ان کی اولاد کا ذکر میری دوسری

پھوپی زوجہ پیرا خان کی اولاد کے ضمن میں آچکا ہے۔

☆ فوزیہ عالیہ: میری تیسری بیٹی پروفیسر منور خاں کو بیاہی گئی ہے۔ ان کے والد مرحوم کا نام عمر خاں اور دادا کا نام صاحب خاں تھا۔ لودھی خاندان کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے جو جونا گڑھ میں کبھی جا بسی تھی اور رفتہ رفتہ سوسایٹی میں اپنا مقام اور حکومت میں اپنا رسوخ پیدا کر لیا تھا، لیکن ملک کی آزادی کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد پاکستان آجانا پڑا۔ منور خاں ❶ کو اللہ تعالیٰ نے پانچ اولادیں ذکور واناث عطا فرمائیں۔ ترتیب وتفصیل یہ ہے: ۱۔ انیقہ، ۲۔ جواد خاں، ۳۔ فائزہ، ۴۔ حماد خاں اور ۵۔ وردہ

انیقہ اور جواد دونوں قرآن مجید کے حافظ ہیں اور اب سب بچے روایتی تعلیم میں مصروف ہیں۔ حماد اور وردہ توام ہیں۔

☆ عرشیہ عظمیٰ: بی اے کے بعد ہمدرد طبی کالج سے سند حاصل کر لی تھی۔ ازدواجی زندگی میں ناکامی کے بعد اپنی بیٹی طیبہ کی تعلیم وتربیت کو زندگی کا مقصد بنالیا اور طبابت کے شغل میں زندگی کے سکون کی تلاش میں ہے۔ طیبہ نے اس سال میٹرک کا امتحان دیا ہے۔

☆ توصیف: میری سب سے چھوٹی بیٹی ہے۔ گویجویٹ ہے اور طیبہ بھی۔ ایجوکیشن سروس سندھ اس کا شغل اور اعلیٰ تعلیم کا حصول شوق ہے۔ میرے بھتیجے عارف حسین خاں کی شریک حیات ہے۔

---

❶ پروفیسر منور خاں کی دو بہنیں اور ایک بھائی یہ ہیں:

۱۔ مہر النساء بڑی بہن ہیں: محمد یوسف خاں مرحوم اپنے تایازاد سے منسوب تھیں۔ اولاد یہ ہے:

(۱) شاذیہ: شوہر محمد اعظم چانیا (میمن) بچے، غانیا، محمد طٰہٰ، صایم، ثانیہ، (۲) ہارون: بیوی روبی، بچے: مزمل اور عریشہ، (۳) فوزیہ: شوہر محمد اعظم، بچے: اسرار، وہاج اور سعد، (۴) آصف: بیوی شمع، بچے: شیزہ اور بلال، (۵) عمران اور حنا کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔

۲۔ سلیم خاں: بیوی شاہینہ

۳۔ نفیسہ: شوہر محمد رمضان، بچے: کائنات (بیٹی)، انس (بیٹا)

☆ شاہد حسین خاں: یہ میری اولاد میں دوسرے نمبر پر ہیں۔ ایم اے ہیں اور ہمدرد دواخانہ پاکستان (وقف) میں شعبۂ تصنیف و تالیف سے وابستہ ہیں، خالہ زاد بہن مبینہ سے شادی ہوئی تھی۔ محمد فیضان نبیل، محمد عدنان، اور فضیلہ ان کی بیٹی اور بیٹے ہیں۔ افسوس! بیوی سے قطع تعلق ہوگیا تھا اور شاہینہ نامی ایک لڑکی سے نکاح کرلیا تھا۔ افسوس! اب ۱۸ر مارچ ۲۰۱۱ء کی شام کو خود شاہد اللہ کو پیارے ہوگئے۔

۴۔ سارا بیگم: میرے والد مرحوم کی ایک بیٹی اور ہم پانچ بھائیوں کی ایک بہن تھی۔ مجھ سے چھوٹی تھی۔

شاہ جہان پور کے غلام مجتبیٰ خاں عرف للوخاں کی تین اولادیں تھیں، زیب النساء عرف منیا سرتاج خاں اور سردار خاں۔ تینوں صاحب اولاد ہوئیں۔

سارا بیگم کی شادی سرتاج خاں سے ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے تین بیٹوں اور دو بیٹیوں سے نوازا۔ تفصیل یہ ہے:

☆ سلمیٰ خاتون: اقبال الزماں خاں آفریدی سے ان شادی ہوئی، وقاص الزماں خاں آفریدی ان کا ہونہار پوت ہے۔

☆ خالد خاں: دہلی کے ایک خاندان کی شریف زادی مہ جبیں بیگم ان کی بیوی اور دونوں کا چہیتا محمد عمر نامی ان کا بیٹا ہے۔

☆ راشد علی: ان کی بیوی کا نام شاذیہ عظیم ہے۔ ایک بیٹا ہے، جس کا نام محمد حسن علی ہے۔

☆ طارق علی: بیوی کا نام عارفہ ہے اور محمد عالیان عباد خاں اور چشمان بیٹا اور ایک بیٹی ہیں۔

☆ ملکہ شاذیہ: اپنی بہن اور بھائیوں میں سارا بیگم مرحومہ کی سب سے چھوٹی اولاد ہے۔ کاشف شوکت نامی ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ سے شاذیہ کی شادی ہوئی ہے اور قدرت نے شاذیہ و کاشف کی زندگی کو مسرتوں سے بھر دینے کے لیے عریشان بیٹا اور سارا بیٹی عنایت کی ہے۔

۵۔ تفضل حسین خاں: حضرت والد ماجد کی پانچویں اولاد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے

مولوی عبدالہادی خان

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

انھیں آٹھ بیٹیوں اور ایک بیٹے سے نوازا ہے۔ ان کی ترتیب و تفصیل یہ ہے؛

۱۔ آفتاب بیگم (شادی شدہ)

۲۔ نایاب (زوجہ محمد امین عباسی)، بچے: صبا، ضیا، خنسا، رجا، سیف اللہ

۳۔ حاجرہ عرف شاذیہ (زوجہ محمد اعجاز خاں جے پوری ابن نور محمد خاں غوری)، بچے: محمد کاوش، عنبر، محمد کاشان

۴۔ کہکشاں عرف چندا (زوجہ ذوالفقار علی)، بچے: حارث علی، عمر۔

۵۔ محمد نسیم خاں (بیوی شازیہ)، بچے: بصرہ، معاذ خاں، ابیرہ

۶۔ نسیم (زوجہ محمد عمران خاں برادر محمد اعجاز خاں)، بچے: شاہ میر، شہیر، فلک

۷۔ ستارہ عرف فرح (زوجہ رضوان حسن)، بیٹا: اسد حسن

۸۔ ثنا بنت تفضل (غیر شادی شدہ)

۶۔ یوسف حسین خاں: یوسف ہم پانچ بھائیوں اور ایک بہن میں سب سے چھوٹے تھے۔ اس وجہ سے ہم سب کو بہت پیارے تھے۔ ان کی شادی ماموں حمید الدین کی چھوٹی بیٹی فضہ سے ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں چار بیٹے عنایت کیے تھے۔ چاروں کے نام یہ ہیں؛

☆ محمد یاسین حسین خاں: ان کی بیوی محمد غوث انصاری علاقہ ممبئی کے ایک مقام کرلا کے باشندے کی بیٹی شمایلہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں تین اولادیں، محمد زبیر، حفصہ، اور محمد صہیب عطا فرمائی ہیں۔

☆ محمد عابد حسین خاں: ان کی بیوی آسیہ ماموں حمید الدین کی پوتی اور ان کی اولاد میں ان کے سب سے چھوٹے بیٹے نصیر الدین کی بڑی بیٹی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک بیٹی عطا فرمائی ہے جس کا نام ام حبیبہ ہے۔

☆ محمد عارف حسین خاں: یہ یوسف کے تیسرے بیٹے ہیں اور میری بیٹی توصیف سے ان کی شادی ہوئی ہے۔

☆ محمد زاہد حسین خاں: یہ یوسف کے چھوٹے بیٹے ہیں۔ نصیر الدین مرحوم کی چھوٹی بیٹی صائمہ کے ساتھ ان کی شادی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک بیٹی عطا

فرمائی ہے جو ربیکہ کے اسم سے مسمّٰی ہے۔

۲۶/اگست ۱۹۸۶ء میں یوسف کی بیوی فضہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ ۱۹۸۹ء کے آغاز میں بڑے بھیا اور یوسف کو عزیز و اقارب سے ملنے کے لیے شاہ جہان پور (ہندوستان) کے سفر کا اتفاق ہوا۔ اس موقع پر عزیزوں نے، بڑے بھیا کے مشورے اور یوسف کی رضامندی سے احمد پورہ کے ایک قریبی رشتے دار خاندان کی لڑکی انیس فاطمہ بیگم بنت یعقوب حسن خان سے ان کی شادی کرادی تھی۔ مجلسِ عقد مسنون کا انعقاد یکم مارچ ۱۹۸۹ء روز چہار شنبہ (بدھ) کو ہوا تھا۔ یوسف مرحوم کے انتقال کے بعد ان کی سوگوار اپنی بیوگی کے دن اسی گھر اور اسی خاندان میں گزار رہی ہیں۔

خانوادۂ خان سعد اللہ خان:

مولانا عبد الہادی خاں اور ان کے جد امجد

مولانا عبد الہادی خاں کے دادا خان سعد اللہ خان نظام علی خاں فوج کے کمانڈر کے ساتھ تھے اور اغلب خیال یہ ہے کہ بچپوریا کے معرکے میں ۲۸/اپریل ۱۸۵۸ء کو ان کے ساتھ ہی شہید ہو گئے تھے۔ کئی حویلیوں اور گاؤں کے مالک تھے۔ ان کی جاگیر سے ان کے خاندان ہی کی ایک شاخ کو نوازا گیا تھا جس کے بعض افراد نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا اور حویلیوں کو ڈھا دیا گیا تھا یا دوسروں نے قبضہ کر لیا تھا جن کی بازیابی کی کوشش پر خاموشی اور بے نیازی کو ترجیح دی گئی تھی۔ ان کے والد کا نام تو معلوم نہیں ہو سکا۔ ان کے بیٹے عبد الغفار خاں متخلص بہ جوہر شاعر تھے اور ان کا دیوان یادگار ہے، جس میں انھوں نے اپنے کئی چچازادوں، ان کی اولاد، اپنی والدہ ماجدہ اور اپنے ایک بھائی کی تواریخ انتقال وولادت کا ذکر کیا ہے۔ اس لیے ان کے خاندان کے بعض افراد کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً

۱۔ قطعۂ تاریخِ ولادت برخوردار محمد عبد الہادی تاریخ دہم ماہ ذی قعدہ ۱۳۱۱ھ (مطابق ۱۶/مئی ۱۸۹۳ء) بیٹے کی ولادت پر ۲۶ شعروں پر مشتمل چھ قطعات تاریخِ ولادت تحریر فرمائے۔

۲۔ قطعۂ تاریخِ ارتحال پر ملال جناب والدہ ماجدہ کہ بہ تاریخِ ہجدہم ربیع الاول ۱۳۱۲ھ (مطابق ۱۹/ستمبر ۱۸۹۴ء) سات اشعار پر مشتمل قطعۂ تاریخ۔

۳۔ تاریخِ وفات دختر مصنف، سال وفات ۱۳۱۲ھ (دورانیہ مطابق سنہ عیسوی جولائی ۱۸۹۴ء تا جون ۱۸۹۵ء) سات اشعار پر مشتمل قطعۂ تاریخِ وفات۔

۴۔ محمد نور الحسن خاں (چچازاد بھائی) سال وفات ۱۳۱۳ھ سات اشعار پر مشتمل قطعۂ تاریخِ وفات۔

۵۔ قطعۂ تاریخِ ارتحال دختر کلاں اخوی محمد نور الحسن خان رسالدار، ۱۳۱۳ھ

سات اشعار پر مشتمل۔

۶۔ قطعۂ تاریخِ وفات عبدالغنی خان برادرِ عموزادِ مصنف ۱۳۱۳ھ

۷۔ قطعۂ تاریخِ ولادتِ فرزندِ دل بند برادر ممتاز علی خان۔ ہم نام وہم تاریخ از مصنف دیوان ہذا، ممتاز علی خاں مصنف کے سگے چھوٹے بھائی ہیں۔ انھیں اشعار میں ''برادر''، ''میرے بھائی'' اور ''عزیز از جان'' سے مخاطب کیا گیا ہے۔ نومولود بھتیجے کا نام محمد ظہور علی تجویز کیا ہے جس ۱۳۱۳ھ سنہ ہجری نکلتا ہے۔

اپنے بیٹے (عبدالہادی خاں) کی پیدائش پر ۲۶ شعروں پر مشتمل چھ قطعے تحریر کیے تھے۔ اور ۶ سنہ ہجری (۱۳۱۱ھ) اور ایک عیسوی (۱۸۹۴ء) تاریخ نکالی تھی۔ بھتیجے کی پیدائش پر ۴ قطعات میں ۳۴ شعر تھے، جن میں ۴ ہجری، ۲ فصلی اور ایک عیسوی تواریخ تھیں۔ عیسوی کلینڈر کے مطابق پیدائش کا دورانیہ یکم جنوری تا ۱۱ر جون ۱۸۹۶ء قرار پاتا ہے۔ اشعار میں بھائی کا نہایت ''مؤدب'' اور ''وفادار خاندان'' ہونا بیان کیا ہے اور بھتیجے کی ولادت پر نہایت مسرت اور محبت کا اظہار کیا ہے۔

ان قطعات سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالہادی خاں کی تاریخ پیدائش ۱۰ر ذی قعدہ ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۶ر مئی ۱۸۹۴ء تھا، مصنف کی والدہ یعنی خان سعد اللہ خان شہیدِ وطن کی بیوہ کا انتقال ۱۰ر ربیع الاول ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۹ر ستمبر ۱۸۹۴ء کو ہوا تھا۔ عبدالہادی خاں کی پیدائش کے بعد ۱۳۱۲ھ میں ان کی (عبدالغفار خاں کی) ایک بیٹی کا انتقال ہوا تھا، محمد نورالحسن خاں ان کے چچازاد بھائی تھے ان کا انتقال ۱۳۱۲ھ (مطابق ۱۸۹۴ء ۱۸۹۵ء) میں اور اگلے سال ۱۳۱۳ھ میں ان کی بڑی بیٹی کا انتقال ہوگیا۔ ۱۹۱۲ء میں ان کے چچازاد عبدالغنی کا انتقال ہوا تھا اور ۱۳۱۳ھ میں ان کے اپنے سگے چھوٹے بھائی ممتاز علی خاں کے گھر میں بیٹا پیدا ہوا تھا، جس کا تاریخی نام ''محمد ظہور علی'' تھا۔

خان شہید کے بھتیجے:

جیسا کہ اوپر کی سطروں سے واضح ہوا کہ محمد نورالحسن خان اور عبدالغنی خان، عبدالغفار خاں جوہر مصنف دیوان کے چچازاد بھائی تھے، لیکن ان کے والد جو خان

سعد اللہ خان کے بھائی ہوتے ہیں ان کا نام معلوم نہیں۔

خان سعد اللہ خان کے اور ان کے خاندان کے حالات کی تفصیل سے ہم بالکل ناواقف ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ایک طویل دور ایسا گزرا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے مجاہدین اور شہدا سے نسبت اور رشتے کا ذکر کرتے لوگ گھبراتے تھے۔ بہت رجال کار کے اخلاف چوں کہ انگریزی گورنمنٹ کی ملازمت میں آگئے تھے۔ اس لیے وہ اپنے اسلاف کا نام لیتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی نئی مصیبت نہ کھڑی جائے اور خاندان کی گزر بسر کی جو صورت پیدا ہوئی ہے اس سے محروم ہو جانا پڑے۔ اس صورت حال نے براعظم ہند پاکستان کی قومی تاریخ کو بہت نقصان پہنچایا۔

خان سعد اللہ خان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہ ایک بڑے خاندان کے فرد تھے، اس خاندان کی کئی شاخیں تھیں، ان میں سیکڑوں، ہزاروں افراد تھے، لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد یہ خاندان ایسا تباہ اور منتشر ہوا کہ خان مرحوم کے باپ، دادا اور ان کے بھائیوں کا پتا چلانا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ اگر ان کے بیٹے خان عبدالغفار کو شاعری اور تاریخ نگاری کا شوق نہ ہوتا تو آں شہیدِ وطن کی بیوہ کی تاریخ انتقال اور ان کے بیٹے (ممتاز علی خاں) کے انتقال اور پوتے (محمد ظہور علی) کی ولادت اور دو بھتیجوں (نور الحسن خان اور عبدالغنی خان) میں سے ایک کی بیٹی (بنت نور الحسن) کی تواریخ انتقال کا بھی ہرگز پتا نہ چل سکتا تھا۔ یہ جو کچھ باقی رہا تھا۔ شاعری کی ایک صنف (تاریخ نگاری) کے ذوق کی بنا پر باقی رہ گیا تھا۔ تاریخ نویسی کے فن کے واسطے سے محفوظ نہیں۔ روہیل کھنڈ کے اودھ سے کئی معرکوں کے حالات نظم و نثر میں ۱۸۵۷ء کے قریبی زمانے کے مل جاتے ہیں ۱۸۵۷ء میں اسی علاقے میں برٹش استعمار کے ساتھ پیش آنے والے کسی معرکے کی تفصیلات ڈھونڈے نہیں ملتیں۔ تاریخ اور شجرہ نویسی کے فن کو زوال آیا تو جنگ کے میدان میں رقم کی جانے والی قومی تاریخ اور شجروں کی صورت میں مرتب کی جانے والی نسبتوں اور رشتوں کی معلومات مستحکم کرنے والی روایات بھی ختم ہونے لگیں حتیٰ کہ زبانی اور سینہ بہ سینہ چلنے والا علم بھی زوال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ اس کی مثال بھی اسی خاندان میں مل جاتی ہے۔

مولانا عبد الہادی خاں عبد الغفار خاں جوہر صاحب دیوان کے بیٹے اور شہید وطن خان سعد اللہ خان کے پوتے تھے۔ ان کے بالمقابل ان کے دادا کے بھائی جن کا نام اس شاخ کے اخلاف کے حافظے نے محفوظ نہیں رکھا۔ ان کی اولاد میں اسرار حسن خاں ابن ابوالحسن خاں ایک عالم و مصنف گزرے ہیں۔ میں آں مرحوم سے صرف واقف ہی نہیں، ان سے ملا اور ان کی مجلس میں شریک ہوا، مولانا عبد الہادی خان کے نہایت قریبی عزیز اور ایک پردادا شہید کے بھائی کی اولاد میں نامور شخصیت تھے اور دونوں بزرگ محبت کے رشتے میں بندھے، ایک دوسرے پر جان چھڑکتے اور ذوق فدائیت سے سرشار تھے۔

عبد الہادی:

عبد الہادی خاں کو اللہ تعالیٰ نے عمر دراز عطا فرمائی۔ مدرسۂ امینیہ دہلی کے فارغ التحصیل اور مفتی اعظم محمد کفایت اللہ شاہ جہان پوری ثم دہلویؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ ایک طویل مدت دہلی میں گزاری تھی۔ اینگلو عربک اسکول میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ۲۷-۱۹۲۶ء میں مولانا محمد علی کے اخبار ہمدرد سے وہ کچھ عرصہ اعزازی طور پر وابستہ رہے تھے۔ انھوں نے بتایا تھا کہ ان کا ایک مقالہ جو ادارتی صفحے پر چھپا تھا، مولانا محمد علی کو بہت پسند آیا اور انھوں نے اپنا لیا تھا۔ شاعری کا شوق والد گرامی سے ورثے میں ملا تھا۔ قیس تخلص اختیار کیا تھا۔ دیوان مرتب کر لیا تھا لیکن آخری عمر میں شاعری سے دل چسپی ختم ہو گئی تھی اور دیوان ضایع کر دیا تھا۔ مجھے ان کی دو غزلیں ہمدرد کے صفحہ اول پر ۵ر مارچ اور ۲ر جون ۱۹۲۶ء میں ''شعر و سخن'' کے کالم میں مطبوعہ ملیں۔ میں نے انھیں تبرک سمجھ کر اپنے ذخیرے میں محفوظ کر لیا۔ عربی کی تعلیم کے لیے مرقاۃ العربیہ کے نام سے تین حصوں میں ایک نہایت مفید کتاب لکھی تھی اور صرف ونحو میں دو کتابیں تالیف فرمائیں۔ میں نے مرقاۃ العربیہ کی تعلیم کے لیے آں مرحوم کے حضور زانوے تلمذ تہ کیے تھے۔ حضرت مفتی اعظم سے انھیں بہت عقیدت تھی۔ کفایت المفتی کے بہت سے فتووں میں اور بعض فتوے جو الگ کتابی شکل میں چھپے تھے، ان پر عبد الہادی خاں کے دستخط نظر سے گزرے ہیں۔

جب ان کے چھوٹے بھائی کا انتقال ہوگیا، والد گرامی کا انتقال پہلے ہوگیا تھا، والدہ ماجدہ اکیلی رہ گئیں تو وہ دہلی کی ملازمت اور دیگر تمام مصروفیات ختم کر کے شاہ جہان پور تشریف لے آئے تھے۔ ذریعۂ معاش کے طور پر بہادر گنج میں کتابوں کی دکان کھول لی تھی۔ ساتھ ہی اسلامیہ اسکول میں عربی زبان اور اسلامیات کی دو کلاسیں کوئی تنخواہ لیے بغیر پڑھانے کی ذمے داری قبول کر لی تھی۔ صبح کو پہلے اسکول جاتے پھر دکان پر آتے۔ اس مشغلے کے ساتھ حاجی محمد سعید مرحوم کے یادگار مدرسۂ سعیدیہ جامع مسجد کے مہتمم بھی قرار پائے تھے۔ ایک مدت تک یہ خدمات انجام دیتے رہے۔

سیاست سے دل چسپی تھی نیشنلسٹ خیالات رکھتے تھے۔ جمعیت علمائے ہند سے ان کا قوی رشتہ تھا اور علمائے دیوبند اور موجود دور کے علما میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے خاص عقیدت رکھتے تھے۔ سیاسی خیالات کی بنا پر اہل شہر سے جو لیگ کے ہنگاموں اور نعروں سے متاثر اور نہایت پر جوش تھے، بہت ہفوات و دشنام سنیں اور تکلیفیں اٹھائیں۔ لیکن اپنے موقف پر مضبوطی کے ساتھ قایم رہے۔ ۷۳ سال ۵ ماہ ۱۹ دن کی زندگی گزار کر ۲۴ر دسمبر ۱۹۶۷ء بہ روز بدھ اپنے خالق حقیقی اور الرفیق الاعلیٰ سے جا ملے تھے۔

مولانا عبدالہادی خاں اپنے باپ کے بڑے بیٹے تھے۔ ان کی شادی محلہ مہمند جنگلے کے حاجی منگل خان کی بیٹی اسرارن سے ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں دنیا میں اولاد کی نعمت کے بجائے آخرت کی زندگی میں اپنی نوازشیں اُن کے نصیب میں لکھ دی تھیں۔ پھر بھی خدا کی نعمت سے محروم نہ تھے۔ اپنی بھتیجی نعمت کو اپنی سرپرستی اور کفالت میں لے لیا تھا۔ اولاد سے محرومی کا غم نہ تھا۔ مشیتِ الٰہی سے یہ نعمت ''نعمت جہاں'' کی صورت میں میرے نصیب میں آئی اور میرے گھر کو خوشیوں سے بھر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی مغفرت اور بے پایاں نوازشوں سے نوازے۔

عبدالغفار جوہر حولدار کے دوسرے بیٹے عبدالباری خان تھے۔ قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ درس نظامی کی ابتدائی کتابوں کے دور سے گزر رہے تھے کہ وقت موعود آ پہنچا اور اللہ کو پیارے ہوگئے۔ وہ ماں کے لاڈلے ہی نہیں ماں کے خدمت گزار بھی تھے۔

ابوالحسن خاں اوران کا خاندان

اسرارحسن خاں:

ابوالحسن خاں خان سعد اللہ خان کے بھائی کی اولاد تھے اوراس رشتے سے ان کے بیٹے اسرارحسن خاں مولانا عبدالہادی خاں کے چچازاد ہوئے۔ وہ انھی کے ہم عمر بھی تھے۔ اسرارحسن خاں کا ۱۹۶۱ء میں اور عبدالہادی خاں کا ۱۹۶۷ء میں انتقال ہوا۔ اسرارحسن خاں نے دہلی میں ملازم کرلی تھی، وہیں سکونت اختیار کرلی تھی۔ وہیں ان کے بچوں نے تعلیم پائی اور ذرایع معاش اختیار کیے۔ ان کے دو بڑے بیٹوں کی کل اولاد اب بھی دہلی میں آباد ہے۔

۱۹۴۷ء میں دہلی کے حالات بگڑے تو ان کے لیے بھی بڑی مشکلات اور خطرات پیدا ہوگئے تھے۔ عبدالہادی خان کے نام ان کے مفصل اور باریک قلم سے لکھے ہوئے خطوط آتے تھے۔ میں نے انھیں سنا ہے۔ سیرت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں بچوں کے لیے ان کی ایک کتاب میں نے اسی زمانے میں پڑھی تھی۔ یہ میرے مطالعۂ سیرت میں آنے والی پہلی کتاب تھی اور مجھے بہت اچھی لگی تھی۔

دسمبر ۱۹۴۷ء میں اسرارحسن خاں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ شاہ جہان پور آئے تھے۔ اسی موقعے پر میں ان کے دو بیٹوں عبدالودود خاں اور عبدالسلام خاں سے ملا تھا۔ عبدالودود خاں مجھ سے بڑے اور عبدالسلام خاں میرے ہم عمر تھے۔ میں اس زمانے میں قرآن مجید حفظ کررہا تھا۔ عبدالودود خاں نے مجھ سے کہا تھا: حفظ کرنے کے بعد دماغ کسی اور کام کا نہیں رہتا۔ مجھ سے کوئی بات نہ بن پڑی نہ میں انھیں کوئی جواب دے سکا۔ ہمیشہ یہی سوچا کرتا کہ آیا واقعی ایسا ہوتا ہے؟ میرے دل میں رفتہ رفتہ یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ مجھے تو زندگی میں جو کچھ ملا ہے وہ قرآن کی برکت ہی سے ملا ہے۔ اللہ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور بلند درجات سے نوازے۔

اسی دسمبر ۱۹۴۷ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں ہونے والے آل انڈیا مسلم پارٹیز کانفرنس لکھنؤ میں ہم دونوں شریک ہوئے۔ میں اپنے مربی و سرپرست مولانا عبدالہادی خاں کے ساتھ فرنگی محل کے کسی ہائی اسکول میں ٹھہرا تھا اور وہ دہلی کے اپنے دوستوں کے ساتھ کسی اور جگہ ٹھہرے تھے۔

اسرار حسن خاں نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی شاہ جہان پور سے تعلق رکھتی تھیں ان سے عبدالودود خاں اور عبدالسلام خاں تھے۔ دوسری بیوی کا تعلق دہلی سے تھا۔ ان کے بطن سے اللہ تعالیٰ نے انھیں سلطان حسن خاں اور طارق حسن خاں دو بیٹے عنایت فرمائے تھے۔ اول الذکر دونوں بھائی دہلی میں سکونت رکھتے تھے اور ان کی اولاد اب بھی وہیں آباد ہے۔ آخر الذکر نے عین جوانی میں شادی سے پہلے انتقال کیا۔ سلطان حسن خاں پاکستان آگئے، وہ اپنے بچوں اور بیوی کے ساتھ کراچی میں آباد ہیں۔

عبدالودود خاں:

پورا خاندان تعلیم یافتہ اور دین دار ہے۔ قیام پاکستان کے بعد دونوں ممالک کی سیاست میں خاندان کا کوئی فرد سرگرم نظر نہیں آتا۔ البتہ اسرار حسن خاں فکر کے اعتبار سے پکے نیشنلسٹ تھے اور جمعیت علمائے ہند کے بزرگوں سے مسلکاً تعلق رکھتے تھے۔ البتہ ان کے بڑے بیٹے آزادی کے بعد وطنی سیاست میں حصہ لینے لگے تھے۔ سنی مجلس اوقاف (دہلی وقف بورڈ) کے سرگرم رکن تھے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی سرگرمیوں سے بھی ہمیشہ تعلق رہا اور ۱۹۸۴ء و ۱۹۹۰ء کے دوران اتر پردیس لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوگئے تھے۔ ان دائروں میں انھوں نے بیش قیمت خدمات انجام دیں۔

مطالعے کے شوقین تھے۔ ان کی دو تالیفات نظر سے گزری ہیں؛

ا۔ مولانا ابوالکلام آزاد- تحریک آزادی و یک جہتی (ناشر کتاب والا ۲۷۹۴، پہاڑی بھوجلہ، دہلی، اگست ۱۹۸۳ء، صفحات ۱۱۲)

۲۔ جنگ آزادی میں ممتاز علمائے وقت اور مسلم خواتین کا حصہ (ناشر مکتبہ الیوم، بلی ماران، دہلی، اگست ۲۰۰۷ء، صفحات ۱۴۴)

۳۔ سہ ماہی فکر و تحقیق۔ نئی دہلی کے شمارہ جولائی تا ستمبر ۱۹۹۸ء میں مولانا برکت اللہ بھوپالی کی شخصیت اور افکار و خدمات کے تعارف میں ایک مفصل تحقیقی مقالہ بھی نظر سے گزرا ہے۔

۲۹ر جولائی ۲۰۰۹ء کو دہلی میں انتقال ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

اسرار حسن خاں ابن ابوالحسن خاں کی اولاد کی تفصیل

زوجہ اول سے:

زوجہ اول سے اسرار حسن خاں کے عبدالودود خاں اور عبدالسلام خاں نامی دو بیٹے تھے جن کی اولاد یہ ہے:

عبدالودود خاں (ف ۲۰۰۹ء) (زوجہ: عابدہ بیگم)، اولاد: محمد طاہر، محمد شاہد، محمد زاہد، محمد عابد، نجم السحر، عادل سعید اور رفا کہہ۔

عبدالسلام خاں (ف ۲۰۱۰ء) (زوجہ آرام جہاں بنت عجائب خاں ابن خان روشن خان)، اولاد: ناصر اقبال، عامر اقبال، جاوید اقبال، صبا اور روحی۔

خاندان کی یہ شاخ دہلی میں آباد ہے۔

زوجہ ثانی سے:

زوجہ ثانی سے اسرار حسن خاں کے سلطان حسن خاں اور طارق حسن خاں دو بیٹے ہوئے۔ چھوٹے بیٹے کا عین جوانی میں شادی سے پہلے ۱۹۷۵ء میں انتقال ہو گیا۔ سلطان حسن خاں پاکستان آ گئے تھے اور گلشن اقبال (کراچی) میں اپنے خاندان کے ساتھ رہائش پذیر ہیں۔ سلطان حسن خاں (زوجہ: رخسانہ پروین)

اولاد:

۱۔ عمران حسن خاں (زوجہ: ارم فاطمہ) اولاد: عبدالرافع، عائشہ، خدیجہ

۲۔ کامران حسن خاں (زوجہ: مایہ کامران) اولاد: زجاجہ، علیشا، عبدالرحمٰن

۳۔ عدنان حسن خاں (زوجہ: زنیرہ) اولاد: عریشہ

۴۔ جبران حسن خاں غیر شادی شدہ۔

غلام حسین خان اور ان کا خاندان

میں شاہ جہان پور کے محلہ مہند ہدف کے ایک خاندان کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا، جن کے ایک بزرگ نے جہادِ آزادی ۱۸۵۷ء میں حصہ لیا، لیکن میدانِ جہاد میں یا تو شہید ہوئے اور جوارِ رحمت الٰہی میں پہنچ گئے یا پھر شکست کی صورت میں دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہونے سے بچ کر کسی طرف نکل گئے اور پھر اپنے گھر بار کی طرف لوٹنے کا ارادہ نہ کیا۔ خوانین کے خاندانوں میں تو عام طور پر یہ روایت تھی کہ جب وہ کسی قومی یا دینی جنگ کے لیے نکلتے تھے تو ماں، بیوی سے رخصت ہوتے تھے تو خواتین انھیں کامیابی کے لیے دعا دیتی تھیں۔ سرخ رو ہو کر لوٹنے کی تمنا کرتی تھیں اور تاکید کرتی تھیں کہ دشمن کو پیٹھ نہ دکھانا اور شکست کھایا تمہارا منہ نہ دیکھوں۔ یہ بڑی سخت ایک قسم ہوتی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خواتین کے ذہنوں میں بھی فتح یا شہادت کے سوا کوئی تیسرا خیال نہ آتا تھا۔ اس لیے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کتنے ہی لوگوں نے میدان جنگ میں شکست کے بعد اپنے خاندان کو منہ دکھانے کے قابل ہی نہ سمجھا ہوگا اور شرمندگی کے ساتھ کسی طرف نکل گئے ہوں گے اور گم نامی میں پوری زندگی گزاری ہوگی۔ خاندان کے باقیات نے ان کی شہادت کا گمان کر کے صبر کر لیا اور ان کا سراغ لگانے سے بھی بے فکر ہو گئے۔ تاریخ ایسے واقعات کے تذکار سے خالی نہیں اور کامل مایوسی کے بعد کامیابی کے ساتھ ان کے ظہور کی داستانیں بھی موجود ہیں۔ جنگ آزادی ہند بھی ایسے وقوعات کے ظہور سے خالی نہیں ہو سکتی۔

مولانا محمد عبدالہادی خان جنھیں اللہ تعالیٰ نے میرا مربی، استاد اور سرپرست بنایا تھا اور جن کی تعلیم و تربیت اور صحبت نے مجھے کسی قابل بنایا۔ اس قسم کے وقوعات پر کامل یقین رکھتے تھے۔ ان کا محض تصور ہی نہیں یقین تھا کہ خوانین شاہ جہان پور کا کوئی خاندان ایسا نہ تھا جس کے دور نزدیک کا کوئی نوجوان، بوڑھا شخص اپنے شہر سے لے کر

اودھ اور روہیل کھنڈ، فرخ آباد اور دہلی کے جنگی محاذوں تک وطن کی آزادی اور انگریزی استعمار اور غاصب و قابض لعین کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کے لیے سرگرم عمل نہ رہا ہوا۔ یہ بات حیرت انگیز تھی اس ضلع کی تاریخ ایک ہزار مجاہدین و شہدا کی تعداد پیش کرنے سے قاصر رہی!!! مولانا عبدالہادی خان کے بیان کے مطابق محبینِ وطن کی ایسی خاص تعداد تھی جو حالات سے مجبور اور فضا کو اپنے لیے ناسازگار سمجھ کر حیدر آباد دکن، بھوپال اور غیر مسلم رجواڑوں کی طرف نکل گئے تھے، گم نامی کی زندگی پر قناعت کر لی اور ہمیشہ کے لیے بے نام ونشان ہو گئے۔

خاک سار نے پچھلے صفحے میں مولانا عبدالہادی خان کے حوالے سے جن دو جاں نثاران ومحبین وطن کا حوالہ دیا ہے، ان میں ایک تو خود ان کے دادا خان سعد اللہ خان تھے اور دوسرے غلام حسین خان عرف اُمی خان تھے۔ اپنے دادا کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ بچھوریا کے معرکے میں شہادت پا گئے تھے لیکن ان کی نعش کا پتا نہیں چل سکا تھا اور اگر وہ بچ کر نکل گئے تھے تو پھر ان کا سراغ نہیں ملا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا انجام کیا ہوا۔ ان کا خاندان ان کے پوتے عبدالہادی خاں کی وفات پر ختم ہو گیا۔ خان سعد اللہ خان کے بھائیوں کی اولاد کا شمار اگرچہ ان کی نسل میں نہیں ہوتا لیکن انھیں خاندان سے نکال بھی نہیں دیا جا سکتا۔ سعد اللہ خان کی وجہ سے بھائیوں اور ان کی اولاد پر جو مصیبتیں آئی تھیں اور جن مشکلات اور مصیبتوں سے انھیں گزرنا اور جس طرح گھر سے بے گھر اور خاندانی جاگیر سے محروم ہونا پڑا تھا۔ اُس بنا پر بھائیوں کی اولاد کا بھی جس حد تک پتا چلا ان کا مختصر ذکر کر دیا ہے۔

غلام حسین خان جن کی عرفیت امی خان اب تک خاندان میں مشہور ہے۔ ان کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ قومی حکومت کی کسی ذمے داری کے سلسلے میں پیلی بھیت گئے تھے۔ ان کے حالات اور زندگی کے انجام پر آج تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ البتہ شاہ جہان پور کے مجسٹریٹ وکلکٹر مسٹر جی پی منی کے ایک خط بنام کمشنر روہیل کھنڈ مسٹر آر الیگزینڈر مورخہ ۹ ستمبر ۱۸۵۸ء مشمولہ فریڈم اسٹریگل اِن اتر پردیش جلد پنجم صفحہ ۳۱۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام حسین خان پیلی بھیت میں داروغہ تھے۔ اس سے

زیادہ مسٹر منی کے خط سے بھی ان کے حالات پر روشنی نہیں پڑتی۔ اس لیے خیال یہی ہوتا ہے کہ وہ یا تو جنگ آزادی کے کسی معرکے میں شہید ہو گئے یا بچ بچا کر جنگل میں نکل گئے اور وہیں مر کھپ گئے!

پیلی بھیت کے شمال میں ہمالیہ پہاڑ کی ترائی کی ایک چوڑی پٹی کی شکل میں شمال سے مشرق میں نیپال و بھوٹان تک ہزاروں میل کے رقبے میں جنگل پھیلا ہوا ہے جو اودھ و روہیل کھنڈ سے لے کر صوبہ متحدہ کے شمال اضلاع اور سقوط دہلی تک کے بہت سے بقیۃ السیف کے بہ شمول بلا مبالغہ ہزاروں شکستہ حال مجاہدین وطن کی پناہ گاہ بن گیا تھا۔ ہمالیہ کے دامن کے جنگلات میں پناہ لینے والے مجاہدین وطن کا اندازہ ساٹھ ہزار تا ایک لاکھ لگایا گیا ہے۔

(تاریخ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (سید خورشید مصطفی)، ۲۰۰۷ء، لاہور: صفحہ ۶۵۳)

غلام حسین خاں عرف امی خاں محلہ مہند ہدف شاہ جہان پور کے ساکن تھے۔ ان کے آبائی مکان کا کھنڈر مدرسہ سعیدیہ (جامع مسجد) جاتے ہوئے روز دیکھتا تھا۔ اس کے کھنڈر کا مشاہدہ اس کی شان اور عظمت کے اندازے کے لیے کافی تھا۔ ۱۹۶۲ء میں جب میں پاکستان سے پہلی بار شاہ جہان پور گیا اور اُدھر سے گزرا تو دیکھا کہ اب وہاں پر زمین ہموار ہو چکی تھی۔ مکان کے در و دیوار کا کوئی نام و نشان باقی نہ تھا۔

غلام حسین خاں کی اولاد یادگار تھی۔ ان کے تذکرے سنے تھے۔ شاہ جہان پور کو چھوڑے ہوئے ساٹھ سال ہو گئے۔ بزرگ مر کھپ گئے اور نوجوان اِدھر اُدھر ہو گئے۔ اکثر پاکستان آ گئے۔ بہت ساروں کی تفصیل کا تو ذکر ہی کیا، نام تک ذہن سے نکل گئے، لیکن ولی حسین خان عرف منگل خان کو کبھی بھلا نہیں سکتا۔ بچپن میں انھیں دیکھا تھا۔ مدرسہ سعیدیہ جاتے ہوئے چوں کہ ان کے دروازے پر سے گزرتا تھا تو اکثر وہ نظر آ جاتے تھے۔ انھیں سلام کر کے ہی قدم آگے بڑھاتا تھا۔ انھوں نے بڑی لمبی عمر پائی تھی۔ آخر حیات میں بہت کم زور اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ ۱۹۵۵ء کے آخر میں یا ۱۹۵۶ء کے بالکل اوایل میں ان کا انتقال ہوا۔

ولی حسین خان جو منگل خان کے عرفیت سے گرد و پیش سے لے کر دور تک

حاجی منگل خان کے نام سے مشہور تھے۔ غلام حسین خان عرف اُمی خان کی اولاد میں واحد بزرگ تھے، جن سے میں واقف تھا۔ میں انھیں بھلا نہیں سکتا! اس لیے کہ بعد میں مجھے اس خانوادۂ عظیم و نیک نام کا داماد بننے کا فخر حاصل ہوا۔ بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ! اس لیے کہ آں بزرگ کی دو پوتیاں اُمت اور نعمت بناتِ حامد حسین خاں، مجھ سے بڑے بھائی تجمل حسین خان اور میرے حبالۂ عقد میں آئیں۔

غلام حسین خان کی قومی و وطنی خدمات اور وطن سے ان کی محبت اور جاں نثاری کا نقش اگرچہ تاریخ میں نمایاں اور روشن نہیں، لیکن تاریخ سے ان کے نام کا مٹ نہ جانا یہ پتا ضرور دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وطن سے ان کی محبت اور جذبۂ خدمت کو قبول کرلیا ہے اور یہ بھی خدا کا فضل ہے کہ باقیات کے لیے ایک فخر مہیا ہوگیا ہے۔ ان کے باقیات کی تفصیل بعد مشورۂ افرادِ خاندان یہ ہے:

حامد حسین خان ابن ولی حسین خان عرف حاجی منگل خان کی اولاد میں عابد حسین خان، زاہد حسین خان دو بیٹے اور امت بیگم، نعمت جہاں، رحمت بیگم اور آسیہ خانوں چار بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے نعمت اور آسیہ اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ ان کی اولاد باقی ہے، جن کا ذکر و مناسب جگہ پر آیا ہے۔ اولاد ذکور کے خاندان یہ ہیں؛

(۱) عابد حسین خاں کی شادی نسیم بیگم بنت عبدالجلیل خاں سے ہوئی۔ نسیم بیگم کی والدہ عطیہ بیگم مجاہد وطن مطیع خان کی نواسی ہیں۔ اس لیے عابد حسین خاں نہ صرف اپنے پردادا غلام حسین خان، اپنے جد امجد کی طرف سے بلکہ اپنی سسرالی رشتے سے کہ ان کی زوجہ نسیم بیگم بنت عطیہ بنت مولوی ریاست علی خان ابن خان مطیع اللہ خان کی طرف سے بھی ایک وطن دوست اور قوم پرور خاندان سے نسبت رکھتے ہیں۔ اور یہی فخر ان کی زوجہ نسیم بیگم کو بھی حاصل ہے کہ وہ اپنے میکے اور سسرال، ہر دو طرف سے قوم و وطن کے جاں نثار خانوادوں کی بیٹی اور بہو ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں فیصل و سلطان دو بیٹے اور فریدہ یاسمین عرف سین اور نورین دو بیٹیاں عطا فرمائیں۔ تفصیل یہ ہے؛

ا۔ فیصل عابد خان (زوجہ ثوبیہ)، اولاد: مہک، شہریار، ایشل،

۲۔ سلطان عابد خان (زوجہ سمیرا)، اولاد: شہیر، ضحیٰ،
۳۔ فریدہ یاسمین زوجہ مبشر احمد خان ابن اسرار حسن خان،
۴۔ نورمین بیگم زوجہ محمد عمران ابن ممتاز علی گوالیاری (مرحوم)
عابد حسین خاں کے بیٹوں اور بیٹیوں کو اللہ تعالیٰ نے صاحب اولاد بنایا ہے۔

(۲) زاہد حسین خاں، حامد حسین خاں کے چھوٹے بیٹے ہیں۔ ان کی شادی عبدالجلیل خاں کی بیٹی توحید فاطمہ سے ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں تین بیٹے اور دو بیٹیاں عطا فرمائیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ جاوید احمد (زوجہ نوشینہ) بیٹا ارمان جاوید، ۲۔ نعمان احمد (زوجہ ماہرہ) بیٹا مناہل، ۳۔ فرحان احمد (زوجہ مہوش) بیٹا تیمور، ۴۔ صدف زاہد (غیر شادی شدہ)، ۵۔ شفاء (زوجہ ذیشان شکیل) بیٹی سوہا۔

زاہد حسین خاں کی شادی عبدالجمیل خان ابن عبدالجلیل خاں کی بیٹی توحید فاطمہ سے ہوئی ہے۔ یہ خاندان بھی انھیں نام وروں کی اولاد میں سے جن کے تذکار میں زیر نظر کتاب تالیف کی گئی ہے۔ اگرچہ ان پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ اور اب کسی مؤرخ کے لیے ان حقایق سے پردہ اٹھانا مشکل ہو گیا لیکن اس مقام پر پہنچ کر عبدالجلیل خاں کے خاندان کے باقیات کو اس درجے نظر انداز کر دیا جائے کہ ان کے سر پر سہرہ باندھنے کے بجائے ان کے نام بھی نہ درج کروں میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ اس لیے میں اس خاندان کے اخلاف کے چند نام درج کر دیتا ہوں۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ ۱۹۵۰ء میں شاہ جہان پور سے پاکستان میں پہنچنے تک میں نے اپنے بھائیوں کے ساتھ عبدالجمیل خاں کے بیوی بچوں کے ساتھ سفر کیا تھا اور میری بیوی نعمت جہاں اور بھاوج اُمت بیگم بر بنائے رشتہ عبدالجمیل خاں کو پھوپا اور ان کی زوجہ مسرور فاطمہ کو پھوپی کہتی تھیں اور یہی رشتہ تخاطب و کلام کے لیے میں نے اختیار کر لیا تھا اور آں مرحومہ بھی ہم سے اسی طرح کا برتاؤ کرتی تھیں جیسے کہ سگے بھانجوں بھتیجوں اور دامادوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ میں نے بھی مذکورہ بزرگ میاں بیوی سے اور ان کی اولاد سے ویسی ہی محبت کی ہے جیسی کہ مجھے کرنی چاہیے تھی۔ اسی خاندان کے چند

قریبی اخلاف جو پاکستان میں موجود ہیں، یہ ہیں:

اولاد: عبدالجلیل خاں:

خورشید فاطمہ (شوہر عبدالوحید خان)، محمد عقیل خان (زوجہ بتول فاطمہ)، محمد کفیل خان (زوجہ معروف تبسم)، محمد شکیل خان (زوجہ قدسیہ خاتون)، محمد خلیل خان (زوجہ رضوانہ خاتون)، توحید فاطمہ (شوہر زاہد حسین خان) اور ناہید فاطمہ (شوہر شیخ کلیم الدین)، عبدالجمیل خاں کے تمام بیٹے اور بیٹیاں ماشاءاللہ! صاحب اولاد ہیں۔

مطیع اللہ خاں اور ان کا خاندان

شاہ جہان پور کے محاذ جنگ آزادی کے ایک نام ور مجاہد خان مطیع اللہ خان تھے تاریخ شاہ جہان پور میں اگر چہ وہ جگہ نہ پا سکے، لیکن ان کے نصیب کی یاوری تھی کہ شہرت نے ان کے قدم چومے اور جنگ آزادی کی تاریخ شاہ جہان پور کے صفحات ان کے تذکرے سے محروم نہ رہے۔

مطیع اللہ خاں محلہ خلیل غربی کے ساکن اور نسباً افغان تھے۔ جنگ آزادی کا نعرہ بلند ہوا تو ان کا آغازِ شباب تھا۔ دل جوش و جذبات قومی سے معمور تھا۔ انھی دنوں ان کی شادی ہوئی تھی، دل خلوت کی لذت اور صحبت کے عیش و مسرت سے بے گانہ نہ تھا، لیکن وطن کی محبت اور اس کو آزاد کرانے کا جذبہ فزوں تر تھا۔ بے تابانہ میدان جہاد کا رخ کیا اور کئی محاذوں پر جنگ آزادی وطن میں مردانہ وار حصہ لیا۔

خاندان کے بزرگوں کی روایت ہے کہ ایک معرکے میں گرفتار ہو گئے تھے۔ لیکن قدرت نے اس صاحب ہمت نوجوان کو گرفتار ہو کر بے بسی کی قید میں گھٹ کر مرجانے کے لیے پیدا نہیں کیا تھا۔ گرفتار کنندگان کی ایک لمحے کی غفلت سے اس نے فایدہ اٹھایا آناً فاناً ان کی قید سے نکل بھاگا۔ اس لمحے کے گزرنے کے بعد دشمنانِ دین و وطن کی کوئی تگ و دو اس صاحبِ عزم مجاہد کو دوبارہ گرفتار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

خاندان کے پس ماندگان تو معرکہ دغا میں ان کے کام آجانے کا تصور کر کے مایوس ہو چکے تھے کہ کرشمۂ قدرت کا ظہور ہوا اور دکن سے ایک خط مثلِ پیراہن یوسف شاہ جہان پور پہنچا اور ایک نیم مردہ بیوہ کو حیرت انگیز طور پر خوشیوں اور مسرتوں سے بے خود کر دیا۔ اسے اپنے سہاگن بن جانے ہی کی خوشی نہ تھی بلکہ اپنے لخت جگر کی خوش نصیبی کی مسرت بھی تھی، جو باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم تھا۔ حیدر آباد دکن سے آئے ہوئے اس خط نے ایک غم زدہ ماں اور اس کے بیٹے کے لیے گھر کو خوشیوں سے

بھر دیا تھا اور پورے خاندان اور محلے میں یوم عید کا ہنگامہ برپا تھا۔

عجیب بات یہ تھی کہ جن دنوں جنگ آزادی وطن کا شعلہ بھڑکا تھا، ان ہی دنوں نوجوان مطیع اللہ خاں کی شادی ہوئی تھی اور ٹھیک ان ایام میں جب وہ اپنے گرفتار کنندگان کو چکمادے کر تاریخ کی اسکرین سے غائب ہوئے تھے۔ خدا نے انھیں چاند سا بیٹا دیا تھا، لیکن باپ نے نہ بیٹے کو دیکھا تھا نہ بیٹے کی ولادت کی خوش خبری نے کانوں میں رس گھولا تھا۔ ان نومولود کا نام ریاست علی رکھا گیا جس نے مولوی ریاست علی خان کے نام سے شہرت پائی اور نیک نام ہوا۔

ریاست علی خان ۱۸۵۸ء میں پیدا ہوئے تھے۔ تاریخ صبیح میں ان کے اساتذہ میں مولانا ارشاد حسین رام پوری کا نام لکھا ہے۔ اس سے واضح ہوگیا کہ ابتدائی تعلیم شاہ جہاں پور میں تحصیل کے بعد انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے رام پور کا سفر کیا ہوگا اور مولانا ارشاد حسین رام پوری سے شرف تلمذ حاصل کیا ہوگا۔ ان کی اپنی زندگی شاہ جہاں پور میں درس و تدریس میں گزری۔ واعظ اور متعدد تالیفات علمیہ و فقیہہ یادگار ہیں۔ ۱۶؍ ستمبر ۱۹۳۰ء کو بہ عارضہ ہیضہ ان کا انتقال ہوا اور مکان کے قریب کی مسجد محلہ خلیل غربی میں تدفین ہوئی۔ اسی مسجد میں انھوں نے مدرسہ بحرالعلوم قایم کرلیا تھا۔ اسی میں پڑھاتے ہوئے زندگی بسر ہوئی تھی۔

خان مطیع اللہ خاں نے حیدرآباد دکن میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ متاہل زندگی گزارتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اولاد سے بھی نوازا تھا۔ حیدرآباد میں زندگی کی مصروفیات اور حالات کا علم نہیں ہوا۔ شاہ جہان پور وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے۔ شاہ جہان پور والی بیوی اور بیٹے سے رابطے کے بعد ان کی خبر گیری سے کبھی غفلت نہیں برتی۔

مولوی ریاست علی خان کو اللہ تعالیٰ نے اولاد ذکور و اناث سے نوازا تھا، تفصیل یہ ہے:

۱۔ عبدالمنتقم خان، ۲۔ عبدالمہیمن خان، ۳۔ صفیہ بیگم، ۴۔ عبدالمومن کامران خان، ۵۔ عبدالباری خان، ۶۔ عطیہ بیگم۔ ریاست علی خان کی سب اولاد اللہ کو پیاری

ہوگئی۔ البتہ ان میں سے بعض کی اولاد اور اولاد کی اولاد یادگار ہے۔

عبدالمنتقم خان کی ایک بیٹی سعیدہ بیگم یادگار ہیں۔ صاحب اولاد اور کراچی میں رہائش ہے۔

عبدالمہیمن خان لاولد تھے۔ کراچی میں انتقال ہوا۔

صفیہ بیگم کا انتقال بھی کراچی میں ہوا۔ لاولد تھیں۔

عبدالمومن کامران خان کو اللہ تعالیٰ چار بیٹیوں اور ایک بیٹے سے نوازا۔ تیسری بیٹی اللہ کو پیاری ہوگئی۔ بیٹیوں کے نام یہ ہیں:

نسرین، ناصحہ اور تمثیلہ شادیاں ہوگئیں ہیں اور صاحب اولاد ہیں۔

ان کے واحد صاحب زادے محسن کامران خان ہیں اور امریکا میں مقیم ہیں۔

عبدالمومن کامران خان کی بیوی حیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں تادیر سلامت رکھے۔

عبدالباری خاں مرحوم کی دو بیٹیاں راحیلہ اور اسما اور فرید و مسعود دو بیٹے ان کی یادگار رصالح ہیں۔ سب شادی شدہ اور صاحب اولاد ہیں۔ عبدالباری خان سے آسیہ بیگم بنت حامد حسین خان بیاہی گئی تھیں۔ دونوں میاں بیوی کا انتقال ہوگیا۔

عطیہ بیگم مولانا ریاست علی خان کی سب سے چھوٹی بیٹی تھیں۔ عبدالخلیل خان سے ان کی شادی ہوئی تھی، دونوں کا انتقال ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو چار نیک بخت بیٹوں شاہد، راشد، زاہد، خالد اور ایک بیٹی نسیم بیگم عطا کی۔ نسیم بیگم کی شادی عابد حسین خان ابن حامد حسین خان سے ہوئی ہے۔ عطیہ بیگم کی تمام اولاد کراچی میں آباد ہے۔

ضمیمہ

(۱)

تواریخ شاہ جہان پوری (یوپی)

پر

تنقید اور تبصرے کی نگاہ میں

(۲)

تاریخ شاہ جہان پور نامۂ اعجازی المعروف بہ تاریخ صبیح

مولوی محمد صبیح الدین میاں خلیل شاہ جہان پوری

تاریخ شاہ جہان پور موسومۂ تاریخ مطیع

خان بہادر حافظ مطیع اللہ خاں خلیل (ڈپٹی کلکٹر)

ترتیب وتدوین

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

تواریخ شاہ جہان پور

پر تنقید اور تبصرے کی نگاہ

صفحہ	عنوانات
۵۷۷	میرا وطن....................................
۵۷۹	ا۔ضمیمہ: تواریخ شاہ جہان پور (یوپی) پر تنقید اور تبصرے کی نگاہ
۵۷۹	ا۔بہادر نامہ....................................
۵۸۱	۲۔بہادر خانی....................................
۵۸۳	۳۔دلیر نامہ....................................
۵۸۴	۴۔اخبار محبت....................................
۵۸۴	۵۔انساب قبایل افغانی....................................
۵۸۵	۶۔تذکرۃ الاحباب (منظوم)....................................
۵۸۶	۷۔انہار البحر....................................
۵۸۷	۸۔لیکچر تاریخ شاہ جہان پور....................................
۵۸۸	۹۔گزیٹیر شاہ جہان پور....................................
۵۸۸	۱۰۔تاریخ شاہ جہان پور....................................
۵۸۹	۱۱۔جغرافیہ ضلع شاہ جہان پور....................................
۵۹۰	۱۲۔تاریخ احسانی....................................
۵۹۱	۱۳و۱۴۔تاریخ صبیح اور تاریخ مطلع....................................
۵۹۱	۱۵و۱۶۔"شعرائے عجم و ہند" اور "سخن وران شاہ جہان پور"....................................
۵۹۳	الف: شعرائے عجم و ہند....................................
۵۹۳	ب: سخن وران شاہ جہان پور....................................
۵۹۴	چند ضمنی مآخذ
۵۹۴	۱۷۔فریڈم اسٹریگل ان اتر پردیش....................................

میرا وطن

شاہ جہان پور صوبہ متحدہ کا ایک اہم ضلع اور اس کا شہر ہے۔ اس کا رقبہ ساڑھے چار ہزار مربع کلومیٹر میں پھیلا ہوا ہے۔ اگر آپ اس ضلع کے نقشے پر شمال سے مشرقی اور جنوب سے مغربی سمت میں نظر ڈالیں تو آپ کو پیلی بھیت، کھیری، ہردوئی، فرخ آباد، بدایوں اور بریلی کے اضلاع کی سنہری زنجیر میں گھرا، طول میں شمال مشرق سے جنوب مغرب میں ۱۲۰ کلومیٹر لمبا اور عرض کے بالائی حصے میں کھیری اور پیلی بھیت کے بالمقابل ایک مقام پر صرف سولہ کلومیٹر اور ہردوئی اور بریلی کے بالمقابل ایک مقام پر ۶۲ کلومیٹر چوڑی ایک شاداب سرزمین نظر آئے گی، بس یہی شاہ جہان پور ہے۔ میں اسے بھول نہیں سکتا کہ کبھی یہی "میرا وطن" تھا۔

شاہ جہان پور کی طویل تاریخ ہے، جو بے شمار نشیب و فراز سے گزری ہے۔ لیکن اس نے قدیم دور سے آزادی کی منزل تک اور اس کے بعد گزرنے والے ساٹھ برسوں میں تاریخ کے ہر دور اور معرکۂ حیات کی ہر آزمائش میں کامیابی سے اس کا سر فخر سے بلند رہا ہے۔

اس کا پانی شیریں، آب و ہوا معتدل اور زمین زرخیز ہے۔ اس کے موسم قدرت کی تقسیم کے عین مطابق اور خوش گوار ہیں۔ اس کی ہواؤں میں خوش بو بسی ہوئی ہے اور اس کی فضائیں محبت کے نغموں سے معمور ہیں۔ شاہ جہان پور کی اپنی قابل فخر تاریخ ہے۔ اس کی اپنی تہذیب اور اپنا طرزِ تمدن ہے۔ اس میں بسنے والی اقوام کے اوصاف و خصایص میں، اخلاق و عادات میں، ذوق و مزاج میں بڑی یکسانیت اور یک رنگی ہے اور جہاں تضاد و تباین ہے اسے تحمل و مروّت نے ایک دوسرے کے لیے گوارا بنا دیا ہے۔ اس کے عوام کی زبان ہندی یا اردو ہے۔ اس کی اپنی شان ہے، ان کے طرز بیان اور اسلوب تحریر میں ایک ندرت ہے، شاہ جہان پور کی اردو، اردو ہو کر بھی

نہ صرف لکھنؤ و دہلی کی اردو سے بلکہ اپنے پڑوسی اضلاع سے بھی جدا لہجہ اور الگ انداز رکھتی ہے۔

شاہ جہان پور بڑا مردم خیز شہر ہے۔ اس کی تاریخ کا ہر شعبۂ حیات اور دائرۂ علم وفن ناموروں سے بھرا ہوا ہے۔ اس کے امتیازات و خصوصیات بے شمار ہیں۔ شاہ جہان پور میں وہ سب کچھ ہے جو ایک محبِّ وطن کی خوشی کا موجب ہو سکتا ہے۔

شاہ جہان پور پر مختلف نوعیت کی چھوٹی بڑی اکیس تالیفات کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، جو میرے علم میں اور بعض میرے مطالعے میں آئیں۔ ان میں سے پانچ کتابیں ضمنی نوعیت کی بھی شامل ہیں۔ ان میں بیشتر تالیفات مخطوطات کی صورت میں تھیں لیکن اب شاید ان کا بھی وجود مٹ چکا ہے۔ صرف تاریخ میں ان کے نام اور خصوصیات کا تذکرہ ہی یادگار رہ گیا ہے۔ اگر اس تعداد میں میری تالیف کا شمار بھی کر لیا جائے، جو مکمل ہو گئی ہے اور کمپوزنگ کے آخری مرحلے میں ہے اور وہ وقت دور نہیں کہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر دی جائے تو تعداد بائیس تک پہنچ جاتی ہے۔

(ا۔س۔ش)

ضمیمہ:

(۱)

تواریخ شاہ جہان پور

پر

تنقید اور تبصرے کی نگاہ

۱۔ بہادر نامہ:

اس تالیف کا موضوع، اس کے نام سے ظاہر ہے کہ نواب بہادر خاں کے حالات میں ہے اور جیسا کہ اس موضوع میں پھیلاؤ کی گنجائش ہے کہ اس میں ان کے خاندان کے افراد کے متعلق واقعات بھی درج ہوں گے۔ چناں چہ مطیع اللہ خاں نے بعض ارکان نواب بہادر خاں کے خاندان کا ذکر بھی کیا ہے لیکن اس تالیف کے مصنف کا نام ڈھونڈے نہیں ملا۔ اگرچہ میں نے مصنف کی تلاش میں کوتاہی نہیں کی پھر بھی اس کا امکان ہے کہ میری نظر ادراک سے قاصر رہی ہو! بہ ہر حال کتاب کے تعارف کے لیے اس کے چند اقتباسات کا نقل کرنا ضروری ہے۔ جناب مطیع اللہ خاں نے بہادر نامے کو نواب بہادر خاں کی اولاد و احفاد کی تصنیفات میں شمار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''نواب بہادر خاں کی ماموری قندھار اور وفات و وجہِ وفات کے بیان میں بہادر خانی، انہار البحر و اخبار محبت و بہادر نامہ میں جو ان کی اولاد و احفاد کی تصنیف ہے کھلی ہوئی غلطیاں موجود ہیں۔ نواب مرتضیٰ خان نے بہادر خانی میں مہم قندھار ۱۰۵۸ھ و ۲۲ جلوس کا واقعہ اور وفات بہادر خاں ۱۹/ جمادی الثانی سنہ مذکور کا سانحہ لکھا ہے اور ایسا ہی نواب احمد خاں کا بیان ہے، جو کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔'' (تاریخ مطیع: جلد اول، صفحہ ۳۲۱-۳۲۲)

بہادر خان سے چھوٹے اور دلیر خاں سے بڑے ان کے ایک بھائی عنایت خاں تھے۔ ان کے اور ان کے بیٹوں کے بارے میں مطیع اللہ خاں مرحوم لکھتے ہیں:

> ''عنایت خاں کے پانچ بیٹے تھے، کام گار خاں، نام دار خاں، نیک نام

خاں، معمور خاں، عظمت خاں۔ ان میں سے (اول الذکر تین) عہد
نواب عزیز خاں میں شاہ جہان پور چلے آئے تھے۔ (ان) تینوں بھائیوں
سے نواب عزیز خاں نے اپنی بیٹیاں بیاہ دی تھیں۔"
نیک نام خاں کے بیٹے جہان خاں تھے، جن کو بھابی بی (ان کے چچا)
کام گار خاں کی بیٹی منسوب تھیں، جو محلہ بکسریاں کے چھوٹے قلعے میں،
جو بھابی بی کا قلعہ بعد میں مشہور ہوا، رہتی تھیں۔ عظمت خاں بھی آخر میں
شاہ جہان پور میں آبسے تھے۔ ان کی اولاد شاہ جہان پور میں موجود ہے۔"
(ایضاً: صفحہ ۳۴۴ بہ حوالہ اخبارِ محبت۔ انہار البحر و بہادر نامہ)

بہادر نامہ کا حوالہ نواب مظفر خاں ابن نواب بہادر خاں کے تذکرے میں بھی
آیا ہے۔ صاحبِ تاریخ مطیع لکھتے ہیں:

"شاہ جہان نے بعد وفاتِ بہادر خان کے ان کو مختصر منصب پر بہ وجہ خورد
سالی مقرر کیا تھا۔ عہد اورنگ زیب میں جوان ہو کر قابل بجا آوری
خدمات ہوئے اور......قلعۂ پرینڈا کی جنگ میں کارہائے نمایاں کیے.....
ان کی زوجہ کا نام تاج بی بی تھا، جو نواب دلیر خان کی بیٹی تھیں۔ ان کے بطن
سے ایک بیٹے شجاعت خان تھے۔ جن کے نام سے موضع شجاعت پور
قریب بادشاہ نگر آباد ہے۔ ان کے لاولد انتقال کرنے پر نسل کا خاتمہ
ہوگیا۔ شجاعت خاں نے (موضع بادشاہ نگر کے پختہ باغ میں) باپ کا
مقبرہ بنایا تھا، اسی میں ان کا بھی مزار ہے۔" (ایضاً: صفحہ ۸۳-۳۸۲)

عبداللہ خان ابن نواب تاج الدین خاں نواب بہادر خان کے پوتے نواب
زین الدین خان ابن غیرت خان کے پوتے تھے بہ قول تاریخ مطیع:

عبداللہ خان کی چار بیویاں تھیں، جن کے بطن سے پانچ بیٹے تھے۔ فیض
اللہ خان، مستجاب خان، معین الدین خان، سعد اللہ خان، شہباز خان۔
بہادر نامہ میں ان کے پانچ بیٹے بیان کر کے، دو کا نام احمد خان و مصری
خان لکھا ہے اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ انھوں نے باپ سے بغاوت کی تھی

اور لڑائی میں قتل ہوئے۔ مگر انہار البحر میں جو ستر برس پہلے کی تصنیف ہے،
اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس لیے ہم اس کو صحیح نہیں سمجھتے ہیں۔ الفضل
للمتقدم!'' (تاریخ مطیع: جلد اول، صفحہ ۴۱۳)

اس بیان سے معلوم ہوا کہ بہادر نامہ، انہار البحر کی تالیف (۱۲۵۵ھ) کے ستر برس بعد تقریباً ۱۳۲۵ھ (۱۹۰۷ء) میں خوانین کے کسی صاحبِ ذوق نے مرتب کیا تھا۔

دلاور خان ابن نواب بہادر خان کے تذکرے میں لکھا ہے کہ ان کا انتقال کابل میں ہوا تھا، لاش کو شاہ جہان پور لا کر باپ کے مقبرے میں دفن کیا گیا تھا۔ تاریخ مطیع کا بیان یہ ہے:

''لاش ان کی کابل سے شاہ جہان پور لا کر ان کے والد کے مقبرے میں
دفن کی گئی۔'' (ایضاً: صفحہ ۳۸۲)

یہ بات مطیع اللہ خاں نے صرف ''بہادر نامہ'' کے حوالے سے لکھی ہے۔

۲۔ بہادر خانی:

بہادر خانی کے مؤلف نواب مرتضیٰ خاں عرف جمعہ میاں نواب بہادر خان کے پڑپوتے نواب تاج الدین خان کے پڑپوتے اور نواب مصطفیٰ خاں عرف حاجی میاں کے برادر خرد تھے۔

تاریخ شاہ جہان پور کے مؤلف خان بہادر مطیع اللہ خاں لکھتے ہیں:

''نواب مرتضیٰ خاں کے قلم کا کھینچا ہوا نقش بہادر خانی جو ۱۲۰۰ھ کا ہے۔
[اس میں] صرف یہ ڈھائی سطریں شاہ جہان پور کے متعلق ہیں:
''در اواخر برائے وطن بہ حضور بادشاہ دیں پناہ عرض کردہ چند دیہات پرگنہ
کانث را بنام خویش التمغا کنانیدہ شہرے را جنگل بریدہ۔ بہ سمت شرقی
بریلی و تلمر آباد ساختہ بہ شاہ جہان پور گردانیدہ۔''
باقی جو کچھ ہے، وہ بانی شاہ جہان پور کے کارناموں کے بیان میں ہے۔
اور لطف یہ کہ مکمل نہیں۔'' (تاریخ مطیع: جلد اول، صفحہ ۳۶)

اسی تاریخ میں ایک دوسرے مقام پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

''نواب مرتضٰی خاں (ابن فیض اللہ خاں) ذی علم وصاحب استعداد تھے۔ ۱۲۰۰ھ میں ''بہادر خانی'' تصنیف کی۔ مگر اختصار پسندی نے تاریخ شاہ جہان پور کو تاریکی سے روشنی میں لانے کی اجازت نہ دی۔ حال آں کہ اس وقت فرامین شاہی وخانگی تحریریں وضروری یادداشتیں ان کے پاس اوران کے خاندان میں موجود تھیں اور وہ لوگ اب بھی زندہ تھے جن کے سینے خازن روایات زبانی تھے اور مفصل تاریخ جمع کرنا نہایت آسان تھا۔ ۲۱ رذی الحجہ ۱۲۲۷ھ (۲۶ ردسمبر ۱۸۱۲ء بہ روز ہفتہ) کو بادیہ پیمائے عدم ہوئے۔''

احمد خاں نے تاریخ کہی:

مرتضٰی خاں بود عموی بندہ — بود نواب اعظم و اکرم
گفتم احمد چو سال تاریخش — شد بجنت مقیم دریک دم

ان کی شادی نواب ذوالفقار علی خاں نبیرہ نواب محمد خاں بنگش کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ (انہار البحر) جن کے بطن سے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ بڑے بیٹے محمد خاں عرف جمعہ میاں تھے، جن کو ان کی پھوپھی زوجہ نواب اعزاز خان شاہ آبادی نے متبنٰی کر کے تمام املاک کا مالک کر دیا تھا۔ اس لیے شاہ آباد میں رہا کرتے تھے۔

(ایضاً: صفحہ ۴۱۷)

صاحب تاریخ صبیح نے بہادر خانی پر بہ ایں الفاظ تبصرہ کیا ہے:

''نواب مرتضٰی خان: یہ نواب فیض اللہ خان ابن نواب عبداللہ خان کے بیٹے تھے۔ ذی علم وصاحبِ استعداد تھے۔ تاریخ دانی کا بہت شوق تھا۔ ۱۲۰۰ھ میں انھوں نے ''بہادر خانی'' لکھی مگر نہایت اختصار سے کام لیا۔ اگر وضاحت سے لکھتے تو ایک مبسوط اور مفصل شاہ جہان پور کی تاریخ ہوتی۔ ۲۱ رذی الحجہ ۱۲۲۷ھ کو راہی ملک عدم ہوئے۔ نواب احمد خاں نے تاریخ کہی۔ قطعہ:

مرتضٰی خاں بود عموی بندہ — بود نواب اعظم و اکرم
گفتم احمد چو سال تاریخش — شد بجنت مقیم دریک دم

ان کے بڑے بیٹے محمد خاں عرف جمعہ میاں تھے۔ زوجہ نواب اعزاز خاں
شاہ آبادی ان کی پھوپھی نے متبنیٰ کر کے اپنی کل جائیداد کا مالک بنا دیا
تھا۔ اسی باعث یہ شاہ آباد میں مستقل طور سے مقیم ہو گئے تھے۔"

(تاریخ صبیح: حصہ اول، صفحہ ۱۲۸-۱۲۷)

اس بات سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ جناب مولوی صبیح الدین نے حوالہ تو بہادر خانی کا ضرور دیا ہے لیکن مضمون "تاریخ مطیع" سے نقل کیا ہے۔

۳۔ دلیر نامہ:

نواب عبداللہ خاں کی ایک تالیف کا ذکر جس کا سرِ عنوان نہیں۔ تاریخ شاہ آباد موسوم بہ نامۂ مظفری کے مولف منشی محمد مظفر حسین خان سلیمانی نے کیا ہے۔ دلیر نامہ اس کا نام موضوع کی مناسبت سے میں نے (راقم این سطور ا۔س۔ش) رکھ لیا ہے۔ اس کتاب کا موضوع نواب دلیر خاں کی شجاعت بتایا گیا ہے۔ صاحب نامۂ مظفری لکھتے ہیں:

"دلیر خان کی شجاعت کے متعلق نواب عبداللہ خان شاہ جہان پوری نے
ایک تاریخ لکھی ہے۔"

اس کے بعد دو جملوں میں کہا گیا ہے:

"اس میں تحریر کیا ہے کہ نواب دلیر خان بڑے تنگ توش کے جوان تھے۔
زور و قوت میں یکتائے روزگار تھے۔"

یہ گویا کہ موضوع کی مزید وضاحت کر دی گئی ہے۔ اس کے بعد کے جملے سے اس کی تالیف کا زمانہ بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"تاریخ انہار البحر کے حوالے سے [نواب عبداللہ خان] لکھتے ہیں۔"

اور اس سے آگے اس جملے کی تائید میں دکن کے معرکے میں ایک قلعے کی تسخیر میں قلعے کا دروازہ توڑ دینے کا واقعہ تحریر کیا ہے کہ کس طرح اسے توڑ کر فوج کے قلعے میں داخل ہو جانے کے لیے رکاوٹ دور کر دی تھی۔ اور دیگر واقعات کے بیان سے

نواب دلیر خان کی شجاعت اور طاقت پر استدلال کیا ہے۔ یہ متعدد واقعات مذکورہ تالیف سے نامہ مظفری کی جلد اول کے صفحہ ۲۱۴ تا ۲۱۸ پر بیان کیے گئے ہیں۔
انہار البحر چوں کہ نواب احمد خاں نے ۱۲۵۵ھ میں لکھی تھی۔ اب اگر صرف یہی اس تاریخ کا ماخذ ہو تب بھی اس کا زمانہ تالیف ۱۲۵۵ھ کے بعد کا ثابت ہوتا ہے۔
(تاریخِ شاہ آباد موسوم بہ نامہ مظفری (حصہ اول) لکھنؤ، مطبع مجتبائی، ۱۹۱۷ء: صفحہ ۲۸۸ و حصہ دوم، صفحہ ۱۸۵)

۴۔ اخبار محبت:

"جو نواب محبت خان کی تصنیف ہے۔ وہ دراصل سلاطین تیموریہ کی تاریخوں کا اقتباس ہے۔ جس میں جستہ جستہ مختصر طور سے حالاتِ شاہ جہان پور بھی کسی قدر بیان کیے ہیں۔ مگر ان میں غلطیوں کی آمیزش زیادہ ہے۔" (تاریخ مطیع: صفحہ ۳۷)

مولوی فصیح الدین نے اپنی تاریخ میں اس کا نام "محبت خانی" لکھا ہے۔ (صفحہ ۲)

۵۔ انساب قبایل افغانی:

اس تالیف کو نواب محبت خان کی تالیف "اخبار محبت" کا تتمہ یا تصحیح و تفصیل سمجھنا چاہیے۔ اس کے موضوع اور خصوصیت کے بارے میں، اس کے مؤلف خان بہادر مطیع اللہ خان صاحب مرحوم فرماتے ہیں:

"نواب محبت خان ان سب خیلوں کو جو افغانستان سے آکر یہاں آباد ہوئیں۔ سڑبنی نسل سے بتاتے ہیں، جو شجرۂ انساب کے خلاف ہے۔ مگر اس میں شبہ نہیں ہے کہ ان میں اکثر سڑبنی اور سڑبنی میں سب سے زیادہ غوریا خیل تھے، جن کے قبایل کے ناموں سے دو ٹکٹ کے قریب محلے منسوب ہیں اور ایک ٹکٹ میں بیٹی، غرغشتی، متی اور وصلی ہیں۔ اگر اس کی تفصیل معلوم کرنے کا شوق ہو تو ہماری کتاب "انساب قبایل افغانی" پر نظر ڈالو۔" (تاریخ مطیع: جلد اول، صفحہ ۱۴۵)

چوں کہ یہ کتاب ''اخبارِ محبت'' کے شجرہ جات کی وضاحت یا تصحیح کے سلسلے میں ہے۔اس لیے اس حوالے کا اندراج ''اخبارِ محبت'' کے بعد ہی مناسب معلوم ہوا۔حال آں کہ اس کتاب کا زمانہ تالیف بیسویں صدی کی پہلی دو دھائیوں کا کوئی عرصہ ہے۔

۶۔تذکرۃ الاحباب (منظوم):

نواب محمد خاں متخلص بہ احمد نواب بہادر خاں کے پڑپوتے نواب تاج الدین خان کے پڑپوتے تھے۔اور نواب مصطفیٰ خاں عرف حاجی میاں (برادر خرد نواب مرتضیٰ خاں عرف جمعہ میاں) کے بڑے بیٹے تھے۔شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کے شاگرد تھے۔تذکرۃ الاحباب میں فرماتے ہیں:

وہ تھے شاہ اسحٰق جو دہلوی
وہ تھے میرے استاذ اور تھے ولی

نواب صاحب ۱۲۵۵ھ (۱۸۴۰ء) تک ضرور زندہ تھے۔صاحبِ تاریخ مطیع نے ان کی آٹھ تالیفات نظم ونثر کا ذکر کیا ہے۔''تذکرۃ الاحباب'' ان کی آخری تصنیف گمان کی گئی ہے۔لکھتے ہیں:

> ''نواب صاحب کی تصانیف میں ''مناقب رزاقیہ'' جو ۱۲۳۰ھ میں لکھی گئی ہے، ابتدائی اور ''تذکرۃ الاحباب'' جو ۱۲۵۲ھ میں تالیف کیا ہے، سب سے آخری تصنیف معلوم ہوتی ہے۔'' (تاریخ مطیع: ص ۴۲۰)

تذکرۃ الاحباب کے بارے میں مولوی صبیح الدین فرماتے ہیں:

> ''ان کی کتابیں غدر میں تلف ہو گئیں۔صرف ''تذکرۃ الاحباب'' رہ گئی، جس کا حوالہ اس کتاب (تاریخ صبیح) میں اکثر جگہ آیا ہے۔ان کا طرز تحریر بالکل نرالا اور سیدھا سادہ ہے۔اگر یہ کتاب نہ مل جاتی تو بہت سے نام و اصحاب کا پتا نہ چلتا......اپنے عزیز واحباب کا حال نظم میں لکھا ہے، ان کی خوبیوں کو سراہا ہے، ان کے مرنے پر ایک ایک کا ماتم کیا ہے اور ان کی تاریخ وفات کے قطعے لکھے ہیں۔'' (تاریخِ صبیح: جلد اول، صفحہ ۱۲۸-۲۹)

۷۔انہار البحر:

جو نواب احمد خاں نے ۱۲۵۵ھ میں لکھی ہے، یہ دراصل شجرہ نسب خاندان نواب دریا خان کا ہے، جن کی شاخوں میں دو چار پھول کھلائے ہوئے تاریخ شاہ جہان پور کے بھی دکھائی دیتے ہیں، جن میں نہ رنگ ہے نہ بو! اور اس پر طرہ یہ ہے کہ اس میں اور اخبارِ محبت میں تباین و تضاد ہے:

ایک سب آگ ایک سب پانی
دل و دیدہ عذاب ہیں دونوں

(تاریخ مطیع: صفحہ ۳۷)

نواب احمد خاں ابن حاجی میاں، نواب محمد خاں سے عمر میں چھوٹے مگر خوش خصالی و ملنساری و ہر دل عزیزی میں ان کے ہم سر تھے۔ علمی مذاق بھی طبیعت میں موجود تھا۔ شاعر بھی تھے۔ انہار البحران کی تصنیف ہے جو ۱۲۵۵ھ (۴۱-۱۸۴۰ء) میں لکھی ہے۔

اس کتاب میں تاریخی روایات کے بیان میں تو بہت سے تسامحات نظر پڑتے ہیں۔ مگر شجرۂ نسب خاندانی عہد نواب بہادر سے اپنے زمانے تک بے کم و کاست پوست کندہ لکھا ہے اور کسی جگہ ان کے صاف گو قلم کی زبان کو لغزش نہیں ہوئی ہے، جس سے ان کی راست بازی و اخلاقی جرأت کا اظہار ہوتا ہے، ان کی صاف گوئی نے اس کتاب کو چھپا ڈالنے پر ان لوگوں کو مایل کیا ہے جن کے نسب کی اس میں پردہ دری کی گئی ہے۔ (تاریخ مطیع: صفحہ ۴۲۱)

تاریخ صبیح کے مؤلف کی نظر سے تو انہار البحر ضرور گزری ہے لیکن اس کے بارے میں ان کی رائے وہی ہے جو صاحب تاریخ مطیع نے اپنی ظاہر کی تھی۔ ان کا بیان یہ ہے:

"انہار البحر...... میں احباب شاہ جہان پور اور اپنے خاندان کے حالات بے کم و کاست قلم بند کر دیے اور اپنے خاندانی حالات کو ذرہ برابر نہیں چھپایا۔ انتہائی اخلاقی جرأت و ہمت سے کام لے کر نسب نامے صاف

صاف تحریر کردیے۔" (تاریخ صبیح: جلد اول، صفحہ ۱۲۹)

مولوی صبیح الدین میاں کا یہ بیان ان کے انہار البحر کے مطالعے کا نتیجہ نہیں۔ ان کے سامنے تاریخ مطیع تھی۔ اسی کے مضمون کی انھوں نے تلخیص کردی ہے اور حوالہ انہار البحر کا دے کر ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے سامنے انہار البحر تھی۔

۸۔ لیکچر تاریخ شاہ جہان پور:

خان بہادر مولوی مطیع اللہ خان نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

"جو ایک وکیل جی شاہ جہان پور ساکن مراد آباد نے اجلاس ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ شاہ جہان پور ۱۸۹۵ء میں پڑھا تھا۔ ماخذ اس کا خود لیکچرار کو معلوم نہ تھا۔ ایک شخص نے ان سے بیان کیا، وہ قلم بند کر کے اجلاس میں سنا دیا اور وقتی مقصد حاصل ہوگیا۔ تنقید و تحیص قطعاً نہیں کی گئی۔ نہ اس کی ان کو ضرورت تھی۔ اس میں اکثر روایتیں بے اصل اور کذب بھی ہیں۔" (تاریخ مطیع: صفحہ ۴۷)

رسم یہ پڑگئی ہے کہ جہاں اس قسم کی انجمنوں کے جلسے ہوتے ہیں، عام طور پر استقبالیہ کی جانب سے اس شہر اور علاقے کی بعض خصوصیات بیان کی جاتی ہیں اور شہر کی تاریخ بیان کی جاتی ہے۔ تحقیقات اور علمی مقالات پیش کرنے کا یہ مناسب موقع نہیں ہوتا۔ محمد اسماعیل ایڈوکیٹ مراد آبادی نے جو مضمون پڑھا یا لیکچر دیا، وہ اسی رسم کی ادائیگی کے سلسلے میں ہے۔ اس میں واقعی کمزوریاں اور غلطیاں اور سنی سنائی باتیں تھیں۔ جن کی گرفت تاریخ شاہ آباد کے مصنف منشی محمد مظفر حسین خاں سلیمانی نے بھی کی اور مولوی مطیع اللہ خاں نے بھی لیکچرار کی خبر لی۔ لیکن اس لیکچر کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ شاہ جہان پور کی تاریخ میں پہلا مقالہ ہے یا اوّلین مقالات میں سے ایک ہے۔ چوں کہ وہ ۱۸۹۵ء میں لکھا تھا اس لیے اس کی قدامت میں تو کوئی شبہ ہی نہیں۔

ایجوکیشنل کانفرنس کا مذکورہ بالا اجلاس نواب محسن الملک مولوی مہدی علی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ سر سید احمد خان، ان کے بیٹے سید محمود، ڈپٹی نذیر احمد

دہلوی، علامہ شبلی نعمانی، مسٹر بیک (پرنسپل علی گڑھ کالج)، پروفیسر آرنلڈ، پروفیسر تھیوڈر ماریسن، کالج کے ٹرسٹی اور دیگر عمایدین ہند اس اجلاس میں شریک ہوئے تھے۔

۹۔ گزیٹر شاہ جہان پور:

مولوی مطیع اللہ خان صاحب لکھتے ہیں:

جہاں تک انگریزی عہد سے اس کا تعلق ہے، مکمل و مفصل ہے۔ مگر قدیم تاریخ سے اس کی زنبیل بالکل خالی ہے۔ مؤلف نے قدیم تاریخ صرف چند صفحوں میں ختم کی ہے اور کٹھیریوں کے موافق نتائج نکالنے کے ارادے سے واقعات کو اس قدر توڑا مروڑا ہے کہ ان کی صورت بالکل مسخ ہوگئی ہے۔ (تاریخ مطیع: صفحہ ۴۷)

شاہ جہان پور ضلع کے ایک گزیٹر ایچ آر نیول کا مرتبہ، مطبوعہ (۱۹۱۰ء) الہ آباد میرے سامنے ہے۔ معلوم نہیں صاحب تاریخ مطیع کے سامنے کون سی اشاعت تھی؟ لیکن کوئی بھی ہو جو حادثہ (۱۸۵۷ء) پیش آچکا تھا۔ اس کے بارے میں گورنمنٹ کے نقطۂ نظر، معلومات، ان کے حوالہ جات اور ان کے مآخذ و مصادر اور ان سے استدلالات میں تو ہرگز فرق نہ پڑا ہوگا۔ اس میں جو کچھ بیان کیا گیا ہوگا، وہ برٹش اقتدار کے مصالح اور مفادات ہی میں ہوگا۔ برِ اعظم ہند پاکستان کے باشندوں کے نقطۂ نظر سے اور ان کے مفاد میں تو ہرگز نہیں ہوسکتا ہے۔ پھر بھی کسی نہ کسی پہلو سے اور کسی نہ کسی رائے میں سچائی معلوم ضرور کرلی جاسکتی ہے اور اصحابِ فکر اور اہل نظر و تدبر سے حقیقت چھپی نہیں رہ سکتی!

۱۰۔ تاریخ شاہ جہان پور:

> ”صرف چند اوراق کا ایک رسالہ ہے، جو کسی اسکول ماسٹر نے دیہاتی اسکولوں میں پڑھانے کے لیے کسی وقت میں لکھا تھا۔ وہ ایک بے ربط افسانہ ہے۔ جس کو تاریخ کہنا، تاریخ کو شرمانا ہے:
>
> برعکس نہند نام زنگی کافور!“
>
> (تاریخ مطیع: صفحہ ۴۷)

۱۱۔ جغرافیہ ضلع شاہ جہان پور:

چوتھی جماعت میں سماجی مضامین کی ۳۲ صفحے کی ایک درسی کتاب ''جغرافیۂ ضلع شاہ جہان پور'' کے نام سے برکت اللہ نامی ایک مدرس مدرسہ فیض عام شاہ جہان پور کی لکھی ہوئی میرے سامنے ہے۔ اس میں ضلع کے محل وقوع، رقبہ، آبادی، قدرتی اور انتظامی تقسیم، تحصیلیں، پرگنے، ریل، سڑکیں، ندیاں، نالے، نہریں، زراعت، صنعت وحرفت، پیداوار وغیرہ وغیرہ کے بارے میں معلومات ہیں۔ اس میں ایک حصہ تاریخ کا بھی ہے۔ جس میں ضلع کا صدر مقام اور مختلف قصبات ومقامات کی بنا، تاریخ، آثار قدیمہ اور مختلف خصوصیات بھی بیان کی گئی ہیں۔

اس قسم کی درسی کتابیں ہر ضلع میں علاقائی وصوبائی اور ذریعۂ تعلیم کی زبانوں میں مثلاً یوپی میں انگریزی، ہندی، اردو زبانوں میں مرتب کی جاتی ہیں۔ ان میں اضلاع کے بارے میں نہایت قیمتی اور صحیح معلومات ہوتی ہیں۔ ان کی زبان عام طور پر سہل بول چال کی اور ہر درجے کے طلبہ کی ذہنی سطح کے مطابق ہوتی ہے۔ ان کی تدریس لازمی ہوتی ہے۔ عام لوگوں کو ان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، نہ ان سے دل چسپی ہوتی ہے۔ مؤرخین ان کی اہمیت سے ناآشنا نہیں ہوسکتے لیکن کتاب کے کتابی حیثیت میں ان کی نظر میں جچنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ کتابیں نہایت ذمے داری سے مرتب کی جاتی ہیں اور ہر سال کلاس کی تبدیلی کے ساتھ صوبے اور ملک کی تاریخ اور جغرافیے کی تعلیمی سطح بھی بلند ہوجاتی ہے۔ جیسے چوتھی جماعت میں ضلع کی اور پانچویں جماعت میں صوبے کی تاریخ و جغرافیہ اور معاشرتی حالات پڑھائے جاتے ہیں اور اس کے اوپر ملک کی تاریخ و جغرافیہ اور معاشرتی علوم کی سطح بلند ہوجاتی ہے۔ ابتدائی درجات کی کتابوں کی زبان عالمانہ اور انشا پردازانہ نہیں ہوتی۔ اس فن کی اعلیٰ تصنیفات کی علمی اور ادبی خصوصیات ان ابتدائی درسی کتابوں میں ڈھونڈنا درست نہیں۔ ان کتابوں میں فن تاریخ اور علم جغرافیہ نہیں پڑھایا جاتا۔ طلبہ کو معلومات سے واقف کرایا جاتا ہے اور ذوق پیدا کیا جاتا ہے۔

۱۲۔ تاریخ احسانی:

مولوی محمد صبیح الدین میاں نے لکھا ہے کہ منشی احسان علی خاں احسان نے بھی شاہ جہان پور کی تاریخ لکھی تھی اور نہایت ضخیم تھی۔ انھوں نے یہ تاریخ دیکھی بھی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مجھ کو معلوم ہوا کہ منشی احسان علی خان مختار اور خان بہادر مولوی مطیع اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر مرحوم شاہ جہان پور کی تاریخ لکھ رہے ہیں...... (مگر) ......دونوں مؤلف یکے بعد دیگرے پیوند خاک ہو گئے۔ حسن اتفاق سے مجھ کو یہ دونوں کتابیں دیکھنے کو مل گئیں۔ میں نے ان کو اول سے آخر تک بالاستیعاب پڑھا۔ یہ دونوں تاریخیں تین تین، چار چار ضخیم جلدوں میں تھیں۔ مختار صاحب نے اپنی کتاب میں صحت روایات اور تاریخی واقعات میں انھوں نے اصولِ روایت و درایت سے کوئی سروکار نہ رکھا۔''
>
> (تاریخ صبیح: جلد اول، صفحہ ۲)

سخنوران شاہ جہان پور کے مصنف مبارک شمیم نے اسے ''تاریخ احسانی'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ تین جلدوں میں تھی۔ اس کی پہلی اور تیسری جلد کا پتا نہیں چلا دوسری جلد انھوں نے دیکھی اور اس سے ''سخنوران شاہ جہان پور'' کی تالیف میں فایدہ اٹھایا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''(منشی احسان علی خاں احسان نے) شاہ جہان پور کی تاریخ بھی لکھی تھی، جو ناتمام رہ گئی۔ شاہ جہان پور کی تاریخ کی ابتدا پیدائش حضرت آدم سے کی گئی تھی اور بہت تفصیل سے معلومات تحریر کی تھیں۔'' (صفحہ ۱۲۲)

صاحبِ ''تاریخ صبیح'' نے اس کی ناتمامی کا ذکر نہیں کیا۔ اگر شاہ جہان پور کی تاریخ میں یہ کتاب تین چار جلدوں میں ہونے کے بعد بھی ناتمام ہوتی تو یہ بات قابل ذکر ٹھہرتی۔ اور چوں کہ انھوں نے اسے دیکھا تھا اور بہ قول ان کے بالاستیعاب اسے پڑھا بھی تھا تو گویا کہ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ تک کتاب کا مسودہ موجود و محفوظ تھا۔ اس کے ضایع ہونے کا حادثہ بعد میں پیش آیا۔

احسان کا آبائی وطن بریلی تھا۔ ۱۸۵۷ء میں ان کے والد منشی قاسم علی خاں کسی ابتلا میں مبتلا ہو کر گھر بار چھوڑ کر اپنے خاندان کو لے کر شاہ جہان پور آ گئے تھے۔ احسان کی تعلیم شاہ جہان پور میں ہوئی۔ کلکٹری میں مختار تھے۔ یہیں ان کی شادی ہوئی، اولاد ہوئی یہیں پوری زندگی بسر ہوئی، یہیں وفات پائی اور یہیں سپرد خاک کر دیے گئے۔ شاعری کا شوق تھا۔ اساتذہ میں شمار ہوتا تھا اور تلامذہ کا ایک وسیع حلقہ ان کے گرد جمع ہو گیا تھا۔ مبارک شمیم صاحب نے لکھا ہے کہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں (یعنی سنہ انیس سو میں ۲۱ تا ۲۹ کے دوران) ان کا انتقال ہوا۔

۱۳ و ۱۴۔ تاریخ صبیح اور تاریخ مطیع:

ان دونوں تالیفات کا تعارف بہ ایں سبب کہ دونوں کے تقابلے مطالعے اور ان پر تنقید نے مضمون کی صنفی حیثیت اور تالیفی نوعیت کو قدرے بدل دیا ہے، اس تسلسل میں ان کے ذکر اور ان پر بحث و نظر کو الگ کر دیا ہے۔ لیکن ان کا سلسلہ نمبر ڈال دیا ہے، تاکہ ترتیب میں ان کی جگہ کی نشان دہی ہو جائے۔ اور تواریخ شاہ جہان پور کے شمار میں یہ دونوں تالیفات نظر انداز نہ ہو جائیں۔

۱۵ و ۱۶۔ ''شعرائے عجم و ہند'' اور ''سخن وران شاہ جہان پور''

اس سے پہلے کہ میں شعراء کے دو تذکروں کو تاریخی کتب کی حیثیت سے پیش کروں۔ یہ عرض کروں گا کہ جناب مولوی صبیح الدین میاں نے ہت پرشاد سرور کے تذکرے ''شعرائے عجم و ہند'' کو بہ ایں اظہار کہ ''اپنی'' تاریخ صبیح میں چند شعرائے شاہ جہان پور کے تراجم نقل کیے ہیں اور ان کا نمونۂ کلام درج کیا ہے، یا مولوی مطیع اللہ خان نے اپنی تاریخ میں ''انہار البحر'' کو جو نواب دریا خاں کے خاندان کا شجرۂ نسب ہے یا ''بہادر خانی'' کو بہ ایں اعتراف کہ اس میں شاہ جہان پور کے لیے صرف ڈھائی سطریں ہیں، باقی جو کچھ ہے وہ بانی شاہ جہان پور کے کارناموں کے بیان میں ہے۔ اسی طرح نواب مصطفیٰ خاں کی تالیف ''تذکرۃ الاحباب'' جس میں انھوں نے اپنے

اعزہ واحباب کا حال نظم میں لکھا ہے اور صبیح و مطیع دونوں مؤرخوں نے اپنی تالیفات میں ان سے استفادہ کیا ہے اور کتبِ تواریخ میں ان کا شمار کیا ہے۔

میری رائے ہے کہ تذکروں، مثنویوں، سوانح عمریوں میں تاریخ کا بہترین مواد موجود ہوتا ہے، تاریخ کی کتابوں میں ان سے بیش بہا مواد حاصل کیا جاتا ہے۔ ملکوں اور شہروں کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ادب، شاعری، تہذیب، اصحاب علوم وفنون کے تذکار ہوتے ہیں جن کے ذکر کے بغیر تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ اس کے باوجود یہ لٹریچر تاریخ اور اس کے مؤلفین مؤرخ قرار نہیں دیے جاتے۔ ان کے تراجم اور ان کی خدمات کے دائرے تاریخ کے حدود سے باہر، ان کی تالیفات کے فنون کے ضمن ہی میں شمار ہوں گے۔

میں نے مذکورہ شاہ جہان پور کے دونوں مورخوں کے احترام میں شعرا کے تذکروں، اعزہ واحباب کے نوحہ و ماتم اور قطعات وفات اور شجرہ جات کے مجموعوں اور ان کے مؤلفین کو تاریخ اور مؤرخین ہی میں شمار کیا ہے اور انھیں کے اصول کے مطابق "سخن وران شاہ جہان پور" اور اس کے مصنف مبارک شمیم مرحوم کو بھی تاریخ و مؤرخین میں شامل کیا ہے۔ لیکن میں یہ بھی عرض کردوں کہ "سخنوران شاہ جہان پور" پر شمیم صاحب کا مقدمہ تاریخ کے زمرے میں ایک تاریخی شہ پارہ شمار ہوگا۔ لیکن میری رائے یہی ہے کہ اس قسم کی کتب کو تاریخی لٹریچر میں اور ان کے مؤلفین کو مورخین میں شمار نہیں کیا جانا چاہیے۔ اگر اس بارے میں رعایت کی گئی تو ہر صاحبِ دیوان، مثنوی نگار اور شجرہ نویس اس کا متمنی ہوگا کہ اس کا ذکر مورخین میں اور اس کے کارنامہ فن کا بیان تاریخ میں کیا جائے! مجھے اعتراف ہے کہ ہت پرشاد سرور کا تذکرہ شعرائے عجم و ہند اگر اس کا کوئی وجود اب بھی ہے تو وہ لٹریچر کی بہت قیمتی متاع اور شاہ جہان پور کے حوالے سے اس میں چند شاعروں کا ذکر بھی بہت اہم ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں اور تاریخ کے دائرے میں "سخنوران شاہ جہان پور" کا مقدمہ اس سے بہت زیادہ قیمتی ہے اور اس کا حق ہے اس کا اعتراف کیا جائے۔ آئیے اب سرور و شمیم کے تذکروں کا صبیح و مطیع کی روایت کی روشنی میں مطالعہ کرتے ہیں۔

الف: شعرائے عجم و ہند:

یہ ہت پرشاد متخلص بہ سرور نامی شاہ جہان پور کا مرتبہ عجم و ہند کے فارسی شعرا کا تذکرہ ہے۔ تاریخ صبیح کے مؤلف نے انھیں ایک کہنہ مشق، یگانۂ روزگار اور زبردست شاعر لکھا ہے۔ وہ اردو اور فارسی زبان میں شاعری کرتے تھے۔ ان کے والد دیوان دولت رائے مبتہج (وفات ۱۲۱۵ھ) بھی اردو اور فارسی کے خوش گو اور فصیح شاعر تھے اور دادا لالہ سکھ رائے مسرور (وفات ۱۱۷۴ھ) فارسی اور ہندی کے شاعر تھے۔ گویا کہ سرور خاندانی شاعر تھے اور ذوق شاعری ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ مولوی صبیح الدین میاں کو ان کے مرتبہ تذکرہ شعرائے عجم و ہند کے کچھ اوراق دیکھنے اور اپنی تاریخ میں ان سے استفادے کا موقع ملا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''(سرور) علاوہ ایک زبردست شاعر ہونے کے صاحب تصنیف و تالیف بھی تھے۔ شعرائے عجم و ہند فارسی میں ان کی بیش بہا تالیفات سے ایک بیش بہا یادگار ہے، جس میں شعرائے شاہ جہان پور کا بھی ذکر کیا ہے۔ سرور نے یہ ایک بڑا احسان اپنے شہر پر کیا۔ اگر یہ کتاب نہ ہوتی تو آج بہت سے نامور شعرائے شاہ جہان پور کے حالات سے کوئی واقف نہ ہوتا۔ سرور نے شعرائے حال کا حال بھی لکھا ہے، صاحب کمال احباب کے مرنے کا غم کیا ہے اور ان کی جدائی میں خون کے آنسوؤں سے روئے ہیں۔ ان کے نوحے اور قطعات وفات موزوں کر کے یادگار چھوڑے ہیں۔'' (تاریخِ صبیح: صفحہ ۲۲۳)

ب: سخن ورانِ شاہ جہان پور:

شاہ جہان پور کے شاعروں کا یہ تذکرہ مبارک شمیم صاحب (مرحوم) کی کاوش علمی اور صدیوں تک یادگار رہنے والی تالیف ہے۔ وہ اس کا مواد جمع کرنے کے سلسلے میں برسوں شہر شہر پھرے ہیں تب کہیں یہ بیش بہا تذکرہ مرتب ہوا۔ اس میں ۲۲۸ شعراء کے تراجم، ان کے نمونۂ کلام مع اس پر نقد و تبصرہ کے ہیں۔ یہ ایک بیش بہا

سرمایہ ہے۔ لیکن اس پر جو مقدمہ مبارک شمیم مرحوم نے لکھا ہے وہ نہایت قیمتی تحریر ہے اور اس کا تعلق شاہ جہان پور کی علمی، ادبی، تہذیبی تاریخ ہی سے نہیں، جیسا کہ ان کی تالیف کے نام اور اس کے موضوع سے ظاہر ہوتا ہے۔ بلکہ ایک تاریخی شہر کی تاریخ بِنا، اس کے عروج، اس کی تہذیبی حیثیت، اس کے نامور بانی، اس کے خاندان اس کے اخلاف کے تذکرے۔ خوانین کے طرزِ حیات، شاہ جہان پور کی خصوصیات سے ہے اور اس میں بے شمار علمی و تاریخی معلومات ہیں۔ غرضے کہ یہ ایک نادر و یادگار تحریر ہے جو شاہ جہان پور کی تہذیب اور تاریخ — ہر دو اعتبار سے یاد رکھی جائے گی۔

چند ضمنی مآخذ

ابھی آپ نے جن کتابوں پر تبصرہ مطالعہ فرمایا۔ ان کا شاہ جہان پور سے راست تعلق تھا۔ خواہ ان کی تصنیفی و موضوعی نوعیت کچھ ہو اور ان کا افادی پہلو بھی کسی درجے کا ہو۔ اس پہلو پر ہم نے توجہ بھی نہیں کی کہ ان کا پایۂ استناد کیا ہے۔ یہ بحث ہمارے موضوع ہی سے باہر تھی۔ ان تالیفات کے علاوہ کچھ مؤلفات و مرتبات اور بھی ہیں جن کا راست تعلق اگرچہ شاہ جہان پور سے نہیں، لیکن اگر تاریخی و سیاسی نقطۂ نظر سے کسی صاحب ذوق کا موضوع ہو تو وہ ذیل کے مجلدات اور مرتبات و مؤلفات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

۱۷۔ فریڈم اسٹریگل اِن اتر پردیش:

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے متعلق جو لٹریچر ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر تک مرتب اور غیر مرتب کسی شکل میں بھی منتشر تھا، یو پی گورنمنٹ کے زیر اہتمام مرتب کر کے شائع کر دیا گیا ہے۔ یہ لٹریچر چھ ضخیم جلدوں میں ۴۸۳۴ صفحات پر محیط ہے۔ اس کے علاوہ پچاسوں صفحات پر مشتمل اشخاص، تاریخی عمارات و مقامات کی تصویریں، دستاویزات کے عکس، اضلاع کے نقشے، مہریں، مختلف قسم کے گوشوارے وغیرہ مجلدات کے مجموعی صفحات پر مستزاد ہیں۔ ہر جلد کے آخر میں اشخاص، مقامات،

شہر و قصبات، اخباروں، کتابوں، تحریکوں وغیرہا کا انڈکس شامل کیا ہے اور چوں کہ چھٹی جلد بھی پانچ جلدوں کے مجموعی انڈکس پر مشتمل ہے، اس لیے کوئی چیز ہو اور اس کا صوبہ یوپی کے کسی ضلعے سے تعلق ہو، ایک منٹ سے پہلے نظروں کی گرفت میں آجاتی ہے۔ اور ان مجلدات کے مضامین کی غیر سائنٹیفک تدوین نہ ہونے کی وجہ سے جو الجھن ایک مصنف محسوس کرتا ہے وہ یک دم دور ہو جاتی ہے۔

ہندوستان کے صوبہ متحدہ میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے متعلق سیاسی و تاریخی مواد کا اتنا بڑا اور اہم ذخیرہ کوئی دوسرا نہیں۔ یہ تاریخ سیاسیات ہند پاکستان کی عظیم الشان خدمت ہے جو آزاد ہندوستان میں صوبہ یوپی کی حکومت نے انجام دی ہے۔ تاریخ کا یہ بیش بہا سرمایہ جو ہمارے سامنے غیر مرتب صورت میں چھ جلدوں میں محفوظ ہو گیا ہے۔ اس نے یہ ضرورت پیدا کر دی ہے کہ اب اس پر علاقہ وار تحقیق و تدوین کے امور انجام دے جائیں۔ تاریخ کے پچاسوں موضوعات ایسے سامنے آتے ہیں، جن کا تعلق براعظم ہندو پاکستان کے کسی ایک صوبہ و ریاست سے نہیں بلکہ پورے براعظم کے مفاد سے ہے، ان پر توجہ کی جائے۔

۱۸۔ تاریخ جنگ آزادی ہند ۱۸۵۷ء:

روہیل کھنڈ یا اس کے کسی ضلعے کی کوئی تاریخ ایسی نہیں، جس میں ''شاہ جہان پور'' نے اپنا مقام نہ پایا ہو! اس سلسلے میں ۱۸۵۷ء کی تحریک حریت کے حوالے سے چند تالیفات ایسی ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سید خورشید مصطفیٰ رضوی کی کتاب ''جنگ آزادی ہند ۱۸۵۷ء'' ایک اہم تالیف ہے۔ جو جنگ آزادی کی سو سالہ یادگار منانے کے موقع پر ۱۹۵۷ء میں شایع ہوئی تھی۔ اسی موقع پر ''فریڈم اسٹرگل ان اتر پردیش'' کی اشاعت کا آغاز ہوا تھا، لیکن رضوی صاحب اپنی تالیف میں اس سے استفادہ نہیں کر سکے تھے۔ اس لیے کہ فریڈم اسٹرگل ان اتر پردیش کی تیسری، پانچویں جلدوں میں خاص طور پر شاہ جہان پور میں تحریک کی سرگرمیوں کا ذکر آیا تھا اور وہ جلدیں ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۱ء میں شایع ہوئی تھیں۔ البتہ انھوں نے اپنی تالیف کے

دوسرے ایڈیشن میں ان سے خوب فایدہ اٹھایا اور اس میں شاہ جہان پور نے بھی اپنا حصہ پایا۔ میرے سامنے اس کی لاہور اشاعت ہے، جو ۲۰۰۷ء میں جنگ آزادی کے ڈیڑھ سو سالہ جشن کے موقع پر شایع ہوئی۔ زیر نظر اشاعت کی اطلاع کے مطابق جو ایڈیشن ۱۹۹۸ء میں نظر ثانی و اضافہ شدہ رام پور سے شایع ہوا تھا، یہ اس کی نقل ہے۔

۱۹۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات):

یہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری کی تالیف ہے جو ۱۹۷۶ء میں کراچی سے شایع ہوئی تھی۔ فاضل مؤلف کا تعلق چوں کہ آنولہ ضلع بریلی سے تھا۔ اس لیے ملک کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں بریلی اور روہیل کھنڈ کے دیگر اضلاع میں انقلابی سرگرمیوں کے تذکرے نے اس تالیف میں زیادہ جگہ پائی اس میں شاہ جہان پور بھی ہے۔ اور وہاں پیش آنے والے واقعات اور مجاہدین اور ان کی خدمات کا ذکر آیا ہے۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے ان کے مقام اور ان کی قربانیوں اور ایثار جان و مال کے اعتراف سے گریز نہیں کیا۔

۲۰۔ قومی محاذ آزادی اور یوپی کے مسلمان:

اس کتاب کی فاضل مؤلفہ ڈاکٹر عابدہ سمیع (علی گڑھ) ہیں۔ ان کے سامنے چوں کہ اسی موضوع پر رضوی و قادری صاحبان کی ہر دو تالیفات کے علاوہ فریڈم اسٹرگل کا نہایت قیمتی ذخیرہ بھی تھا، جس سے انھوں نے اپنی تالیف میں استفادہ کیا تھا۔ اس لیے ان کی تالیف میں ترتیبِ مضامین و تالیف مباحث کا زیادہ سلیقہ اور حسنِ پیش کش پایا جاتا ہے۔ یہ کتاب ۲۰۰۴ء میں دہلی سے شایع ہوئی تھی۔

شاہ جہان پور کے تذکرے سے اس کے صفحات مزین ہیں۔

خاک سار ابو سلمان نے ان تالیفات سے اپنی تالیف ''شاہ جہان پور۔ تاریخ اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء'' میں استفادہ کیا ہے۔ میں ان کا شکر گذار ہوں۔

۲۱۔ مریم کی ڈائری:

مریم کی ڈائری یا غدر کی کہانی کی حیثیت سے ایک کتاب کا کئی جگہ ذکر آیا ہے، اس کا پورا نام "A Story of the Indian Mutiny of 1857" ہے۔ یہ کتاب مئی ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں دیسی سپاہیوں پر مشتمل افواج کی اپنے انگریز حکام کے خلاف بغاوت کے موضوع پر، جو چند ہی دن میں ملک کی آزادی کی عظیم الشان جنگ بن گئی تھی، یہ ایک طویل ناول ہے، جس کے بنیادی کردار زینت بنت نواب غلام قادر خان اور فرحت ابن قادر علی خاں ہیں۔ لیکن حقیقت کا اس سے کوئی تعلق نہیں، شاید ان دونوں کو رسوا کرنے کے لیے ان کے خاندانوں اور ان کی اولاد کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس میں اور بھی بہت سا رطب و یابس ہونے کے باوجود شاہ جہان پور کے حوالے سے یہ ناول تاریخی معلومات کا ایک خزانہ ہے۔

اس ناول کا بنیادی میٹریل جیل کے ایک سابق محرر لالہ رام جی مل کے معلومات و مشاہدات سے اخذ کیا گیا ہے۔ اسے مریم نامی ایک انگریز خاتون مسز لیویٹر (Laveter) نے جمع کر لیا تھا۔ مسودے کے ابتدائی سوا سو ڈیڑھ سو صفحات کا اردو ترجمہ میرے سامنے ہے۔ اس کا اسلوب یہ ہے کہ مختلف واقعات و معلومات کو اپنی بیٹی مس لیویٹر کا بیان کہہ کر پیش کیا ہے۔ یہ مسودہ کسی طرح مسٹر فینتھوم (J. F Fanthome) کے ہاتھ لگا اور اس نے اسے مرتب کر کے ۱۸۹۶ء میں بنارس سے چھپوا دیا، جو ۵۸۹ صفحات پر مشتمل ہے۔

کوئی ناول کذب بیانی اور مبالغہ آمیزئی کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ خاک سار راقم الحروف نے اس کا لحاظ کرتے ہوئے اس کے متن سے ۱۸۵۷ء کے واقعات، حادثات اور شخصیات کو چن لیا اور فریڈم اسٹریگل اِن اتر پردیش کے مجلدات اور تاریخ کی دیگر کتب و مقالات سے موازنہ کرنے کے بعد اپنی تالیف شاہ جہان اور ۱۸۵۷ء کے تین مقالوں میں سے مرتب کر دیا ہے۔

یہ کتاب نایاب ہے لیکن اب اس کا سراغ مل گیا ہے اور امید ہے کہ جلد ہی دستیاب بھی ہو جائے گی۔

(۲)

شاہ جہان پور کی دو تاریخیں

تنقید و تبصرے کی نگاہ میں

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

①

تاریخِ شاہ جہان پور نامۂ اعجازی المعروف بہ تاریخِ صبیح

آپ نے تاریخ شاہ جہان پور کا پورا نام مطالعہ فرمایا۔ اس کے فاضل مؤلف کا نام اس طرح ہے ''عالی جناب مولوی محمد صبیح الدین میاں صاحب خلیل شاہ جہان پوری (اسپیشل مجسٹریٹ)'' مؤلف نے اس کی تالیف کے لیے اپنے استاد مولوی حکیم محمد صاحب کو محرک قرار دیا ہے۔ ان کے اصرار سے مجبور ہو کر انھوں نے بیڑا اٹھالیا تھا اور ادھر ادھر سے چند کتابیں حاصل کر کے مطالعہ بھی شروع کر دیا تھا اور بعض ثقہ حضرات سے حالات کی تفتیش بھی شروع کر دی تھی۔ مگر مولانا موصوف کی ناگہانی وفات نے ان کی ہمت کو پست کر دیا اور اس وقت تک جو کچھ انھوں نے جمع کیا تھا، اٹھا کر الماری میں رکھ دیا۔ پھر اسی زمانے میں جب انھیں معلوم ہوا کہ تاریخ شاہ جہان پور کے موضوع ہی پر منشی احسان علی خاں احسان اور خان بہادر مولوی مطیع اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر تاریخ لکھ رہے ہیں تو قطعاً اپنا ارادہ بدل دیا۔ مگر یکے بعد دیگر دونوں مورخوں کے انتقال نے ان کی آخری امید پر بھی پانی پھیر دیا۔ پھر اچانک ان کے ذہن میں ایک خیال آیا اور حسن اتفاق سے ان کو دونوں مذکورہ تاریخیں دیکھنے کو مل گئیں اور بہ قول آں موصوف کے:

> ''میں نے ان کو اول سے آخر تک بالاستیعاب پڑھا۔ یہ دونوں تاریخیں تین تین، چار چار جلدوں میں تھیں۔''

اس کے بعد انھوں نے نقاد کا قلم اٹھایا اور دونوں پر تنقید لکھ ڈالی۔ جہاں تک کہ آخر الذکر کے مؤلف کی کم نصیبی کا ماتم کر کے اور ان کے ورثا کو عدم توجہی کا مورد الزام قرار دے دیا۔ فرماتے ہیں:

"اور یہ کس درجے افسوس ناک امر ہے کہ مؤلف کتاب کی دیرینہ آرزو تمام عمر کی محنت اور ایک بہترین یادگار ان کے ورثا کی عدم توجہی سے بلاطبع کے رہ گئی، شعر

حسرت پہ اس مسافر بے کس کے روئیے
جو رہ گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے!

(تاریخ صبیح: صفحہ ۳)

بہ ہر حال مذکورہ مورخ کی قسمت کچھ بھی ہو اور اس کے ورثا بہ جرم عدم توجہ کسی بھی سزا کے مستحق ٹھہریں مولوی محمد صبیح الدین کی قسمت جاگ اٹھی اور لکھتے ہیں:

"ان ہر دو قلمی نسخوں کے مطالعے سے یکایک میرا پرانا شوق تازہ ہو گیا اور چوں کہ میرے پاس بھی سرمایہ ایک حد تک کافی تھا، میں نے خدا تعالیٰ پر بھروسا کر کے کام شروع کر دیا۔" (ایضاً)

یہ موقع تھا کہ انھیں مولوی مطیع اللہ خاں صاحب تاریخ مطیع کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا کہ ان کی تاریخ سے انھوں نے استفادہ کیا تھا۔ لیکن شکریہ ادا کیا انھوں نے ایک ڈپٹی کلکٹر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی قدر دانی اور ہمت افزائی کا۔

یہ کتاب دو حصوں میں ہے۔ پہلا حصہ تمدن و سیاست، تہذیب، سماجی حالات وغیرہ کے مضامین اور شاہ جہان پور کے بانیوں اور ان کے خاندانوں کے تذکار و حالات میں ہے۔ دوسرا حصہ اہلیان ضلع و شہر کے مختلف طبقات کے بیان میں ہے۔ مثلاً علما و مشائخ، ادیب و شاعر، اطباء اور ڈاکٹر، قراء، اصحاب فنون لطیفہ وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ آخر میں ایک تتمہ ہے جس میں بعض بیرونی مشاہیر جن میں علمائے دین، مشائخ، بادشاہ، شہزادوں وغیرہ کے تذکار ہیں۔

کتاب کے شروع میں شاہ جہان پور کے ایک معروف اہل قلم سید معین الدین

کا مقدمہ ہے۔ اس میں کتاب کی خصوصیات اور اس کے مؤلف کی شخصیت اور سیرت وخدمات کی بات کہی گئی ہے۔ مؤلف کی شخصیت، اس کی سیرت وکردار اور اس کی تالیف کی واقعی نوعیت اور اس کیمعیار سے بہت بلند ہے۔

مولوی صبیح الدین نے خود لکھا ہے کہ تاریخ شاہ جہان پور لکھنے کی ترغیب انھیں ان کے استاد مولوی حافظ حکیم محمد مرحوم نے دی تھی اور بار بار کے اصرار سے وہ اس پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اور نواب عبداللہ خاں مرحوم نے انھیں محبت خانی (اخبار محبت از نواب محبت خان) تلاش کر کے منگوا بھی دی تھی اور ان کے ایک محلے دار عباس علی خاں نے تذکرۃ الاحباب (از نواب محمد خاں متخلص بہ احمد) اور انہار البحر (از نواب احمد خاں) عنایت کردی تھی۔ ابتدا میں انھیں یہی تین کتابیں ہاتھ لگی تھیں۔ ان تینوں کتابوں کی نوعیت یہ تھی:

① اخبارِ محبت کے بارے میں مؤرخ تاریخِ مطیع لکھتے ہیں: وہ دراصل سلاطین تیموریہ کی تاریخوں کا اقتباس ہے جس میں جستہ جستہ حالات شاہ جہان پور بھی کسی قدر بیان کیے ہیں۔ مگر ان میں غلطیوں کی آمیزش زیادہ ہے۔

② تذکرۃ الاحباب کے بارے میں صبیح الدین خاں نے لکھا ہے کہ اس کے مصنف نے اپنے عزیز واحباب کا حال نظم میں لکھا ہے، ان کی خوبیوں کو سراہا اور ان کی وفات پر ماتم کیا ہے۔

③ انہار البحر کے بارے میں بھی مولوی صبیح الدین نے لکھا ہے اس میں مصنف نے اپنے احباب اور اپنے خاندان کے حالات تحریر کیے ہیں۔ مولوی مطیع اللہ خاں نے لکھا ہے کہ ”یہ دراصل شجرۂ نسبِ خاندان نواب دریا خاں کا ہے۔“ اس کی مزید صفت یہ بیان کی ہے کہ اس میں اور اخبار محبت میں تباین وتضاد ہے۔

معلوم ہوا کہ ایک کتاب تو اریخ سلاطین تیموریہ کے اقتباسات کا مجموعہ ہے اور کہیں کوئی بات شاہ جہان پور کی آبادی کے بارے میں آگئی ہے۔ دوسری کتاب نظم میں احباب واعزہ کا تذکرہ ہے اور تیسری کتاب دریا خاں کے خاندان کے بعض افراد کا تذکرہ اور شجرۂ نسب کی کتاب ہے۔ ان تینوں کتابوں میں تاریخ شاہ جہان پور کے

لیے اس کے سال بنیاد ۱۶۳۹ء سے "تاریخ صبیح" کے زمانۂ تکمیل، ۱۹۳۱ء تک کوئی مواد موجود نہیں تھا۔ اور نمبر ۲ و ۳ کے بعض بیانات و معلومات میں جو تضاد تھا اس کی کوئی بحث کہ ان میں کیا صحیح اور کیا غلط ہے؟ مولوی صبیح الدین کی تاریخ میں موجود نہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ تینوں کتابیں ان کی دسترس میں تھیں۔ انھوں نے پڑھا بھی ہوگا لیکن ان سے استفادے کا پتا نہیں چلتا۔ نواب بہادر خاں اور نواب دلیر خاں کے اخلاف کی چند اور کتابوں کا پتا بھی چلتا ہے لیکن ان سے بھی استفادے اور ان کی معلومات سے کتاب کے مباحث کی زینت کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ لیکن اس کے باوجود وہ لکھتے ہیں:

"ان کتب کے مل جانے سے مجھ کو ایک گونہ تقویت حاصل ہوئی۔"

بلاشبہ ان کے حصول سے انھیں تقویت حاصل ہوئی ہوگی، لیکن ان کی تاریخ شاہ جہان پور کی تالیف میں جو میٹریل استعمال ہوا ہے، وہ تو ان کی فراہم کردہ کتابوں میں موجود ہی نہیں! اور جو میٹریل ہی موجود نہ ہو، اس سے کسی عمارت کی تعمیر کا دعویٰ کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے؟

اس کے بعد وہ تحقیق کے دوسرے مرحلے میں داخل ہوئے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

"اور میں نے ثقہ اور معمر حضرات سے گزشتہ حالات و واقعات کی جانچ شروع کر دی اور جن کتب و رسالہ جات میں یہاں کے حالات کا پتا چلا، ان کو منگا کر ورق گردانی میں مشغول ہو گیا۔"

تحقیق و تفتیش کے اس مرحلے میں انھوں نے کسی ایک ثقہ اور معمر شخص کا بھی نہ نام لیا اور نہ کسی کتاب و رسالے کی نشان دہی کی، جس سے انھوں نے کوئی معلومات حاصل کی ہوں۔ یہ ایسا مسئلہ تھا ہی نہیں کہ وہ ثقہ اور معمر لوگوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہوں اور معلوم کر آئے ہوں کہ صورتِ واقعہ کیا ہے اور نہ تاریخ شاہ جہان پور اس کے بانیانِ کرام کے بارے میں کتابیں اور رسالے کسی کتب فروش کی دکان پر دستیاب تھے اور نہ کوئی لائبریری تھی جس میں یہ ذخیرہ موجود ہوتا۔ ان کا یہ بیان ہرگز

قابلِ قبول نہیں، اس کی کوئی حقیقت نہیں! یہاں ضرورت کسی معمر اور ثقہ بزرگ کی نہیں کسی مؤرخ اور محقق کی تھی، جو تاریخ شاہ جہان پور کے ذوق و عشق سے سرشار ہوتا، لیکن ان صفات کا حامل کوئی بزرگ تھا ہی نہیں، وہ کوئی نام کیوں کر لے سکتے تھے!
بات یہ ہے کہ مولوی مطیع اللہ خاں اور منشی احسان علی خاں کے انتقال کے بعد ان کے کام اور تاریخ شاہ جہان پور کی تصنیف و تالیف کے مساعی و مشاغل کی جو شہرت ہوئی اور ان سے مولوی صبیح الدین میاں کو استفادے کے جو مواقع اتفاقاً حاصل ہو گئے تھے، اس کے بعد انھوں نے جو منصوبہ بنایا تھا اور جس میں سو فیصد وہ کامیاب بھی ہوئے تھے۔ اس کے لیے زمین ہموار یا فضا تیار کر رہے تھے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ مذکورۃ الصدر سہ تصانیف کے حصول کے بعد بھی مایوس ہوئے تھے کہ ان میں تاریخ شاہ جہان پور کے لیے کوئی مواد موجود نہیں تھا۔ اور یہ محسوس کر کے انھوں نے ہمت ہار دی اور اس کے لیے بہانہ اپنے استاذ کی موت کا تراشہ تھا۔

اوپر کے بیان کے تسلسل میں لکھتے ہیں:

> ”مگر مولانا (حافظ حکیم محمد صاحب) موصوف کی ناگہانی وفات سے میں کچھ ایسا شکستہ خاطر ہو گیا کہ ان مسودات کو الماری میں بند کر دیا۔“

یہاں تک پہنچتے پہنچتے انھوں نے گریز کی راہ ڈھونڈ لی، فرماتے ہیں:

> ”اسی زمانے میں مجھ کو معلوم ہوا کہ منشی احسان علی خاں مختار اور خان بہادر مولوی مطیع اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر مرحوم شاہ جہان پور کی تاریخ لکھ رہے ہیں۔ مجھ کو اطمینان ہو گیا اور میں نے قطعاً اپنا ارادہ بدل دیا!........ مگر یہ امید بھی پوری نہ ہوئی اور دونوں مؤلف یکے بعد دیگرے پیوند خاک ہو گئے۔“

مگر دیکھیے کہ قسمت کی یاوری نے کیا گل کھلایا کہ

> ”حسن اتفاق سے مجھ کو یہ دونوں کتابیں دیکھنے کو مل گئیں! میں نے ان کو اول سے آخر تک بالاستیعاب پڑھا۔ یہ دونوں تاریخیں تین تین، چار چار جلدوں میں تھیں۔“

مولوی صبیح الدین میاں کے لیے یہ ''حسن اتفاق'' ایسا ہی تھا جیسے بغیر تعمیہ و تخرجہ کے کسی نومولود باسعادت کی تاریخ ولادت نکل آئے۔ اپنی اسی تاریخ مطیع میں مولوی مطیع اللہ خاں کے ترجمے میں دیگر بے شمار محاسن کے اعتراف کے ساتھ مؤلف کی محنت وجاں کاہی اور اس کی تاریخ سے استفادے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مولانا (مطیع اللہ خاں) مرحوم نماز روزے کے پابند، نہایت وضع دار، مستقل مزاج، دور اندیش اور مدبر تھے۔ شاہ جہان پور کے دولت منداور مقتدر اصحاب میں شمار تھا۔ تصنیف وتالیف کا شغل برابر رہتا تھا۔ شاہ جہان پور کی تاریخ مطیع نہایت محنت اور جاں کاہی سے تالیف کی تھی۔ مگر وہ اس کو روزانہ کی کانٹ چھانٹ کی وجہ سے طبع نہ کرا سکے۔ میں نے (اپنی) اس کتاب (تاریخِ مطیع) میں زیادہ حالات آپ کی تاریخ سے لیے ہیں۔'' (تاریخ صبیح: حصہ دوم، صفحہ ۸۸-۱۸۷)

اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھا تھا کہ روزانہ کانٹ چھانٹ کے وہم سے وہ اس کو مکمل نہ کر سکے تھے۔ یہاں تکمیل سے انکار نہیں صرف کانٹ چھانٹ کی وجہ سے طبع نہ کرا سکنے کا بیان ہے، لیکن میں قارئین کرام کی توجہ ان کے اس اعتراف کی طرف دلاؤں گا کہ انھوں نے ''اپنی کتاب میں زیادہ حالات تاریخ مطیع سے لیے ہیں۔'' اس بیان میں انھوں نے ''زیادہ حالات'' اخذ کر لینے کی کوئی حد مقرر نہیں کی! اور میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس میں کچھ بھی ان کی تحقیق کا نتیجہ نہیں۔

خان بہادر مطیع اللہ خاں ایک صاحب فکر مؤرخ تھے انھوں نے تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ انھیں ہندوستان کی قدیم و جدید تاریخ پر عبور تھا۔ انھیں قدیم تاریخ نویسی کے خصوصیات اور جدید طرز تاریخ نویسی اور اس کے تقاضوں کا بہ خوبی علم تھا۔ ملازمت کے دوران مختلف اضلاع کی سیر و گردش، حالات کے مشاہدے، عوام کی زندگی اور ان کے مسایل کے مطالعے اور تجربات نے ان کی فکر کو پختہ اور بصیرت کو فزوں کر دیا تھا۔ انھوں نے قدیم تاریخ نویسی پر جو تبصرہ کیا ہے اور جدید طرز تاریخ نویسی پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے ان کی بلند خیالی، تاریخ میں ان کی گہری نظر اور دقت

کے تقاضوں اور تاریخ نویسی کی موجودہ ضرورتوں اور ان کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے اسی فلسفۂ تاریخ کے مطابق شاہ جہان پور کی تاریخ کا خاکہ تیار کیا تھا۔ اور پہلی جلد اگرچہ اپنے پہلے مسودے کی صورت میں ہمارے سامنے آگئی ہے۔ لیکن اس کے مباحث کے پھیلاؤ، ان کی ترتیب اور ان کے مضامین دیکھ کر خان بہادر مرحوم کی قابلیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ آں مرحوم نے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا تھا؛

❁ اس کا پہلا حصہ انھی کے الفاظ میں ''بنیانِ شاہ جہان پور'' ہے۔ اس میں شاہ جہان پور اور ضلع شاہ جہان پور کی قدیم و جدید تاریخ اور خاندانِ بانی شاہ جہان پور کے حالات ہیں۔ یہ رجسٹر سائز کے ۹۸۸ صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔

❁ دوسرا حصہ ''اعیان شاہ جہان پور'' کے عنوان سے ارباب کمال اور خوانین کے تراجم پر مشتمل ہے اور

❁ تیسرا حصہ ان لوگوں کے تذکار میں ہے جو مختلف اقوام و علاقہ جات کے لوگ تھے۔ شاہ جہان پور میں آکر آباد ہو گئے تھے اور شاہ جہان پور کی ترقی، علوم و فنون کی ترویج و اشاعت ایک نئی تہذیب و طرزِ زندگی کو جنم دینے کا موجب اور شاہ جہان پور کو زینت دینے اور اس کی شان و شوکت میں اضافے اور قدیم و جدید کا ایک حسین سنگم بنانے میں جن کا تہذیبی ذوق اور طرزِ زندگی کام آیا تھا۔ یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ شاہ جہان پور نے الگ حیثیت میں، روہیل کھنڈ کا حصہ بن کر، اودھ میں شامل ہو کر اور کمپنی کے زیرِ انتظام آکر۔ تمام مختلف حالات میں اپنے امتیاز کو باقی رکھا۔ محترم جمیل احسن خان شاہ جہان پوری حفیدِ رشید حضرت مولوی مطیع اللہ خاں، جن کے صرفِ ہمت نے پہلی جلد کو اہل نظر اور اصحابِ ذوق سے روشناس کرایا ہے، آں موصوف کا خیال ہے کہ اس کا بقیہ حصہ ایک ہزار صفحات کی ضخامت رکھتا ہے۔ اگر ان تینوں حصوں کے مواد کو جمع کر دیا جائے تو رجسٹر سائز کے پورے دو ہزار صفحات اور تاریخ صبیح کے مطبوعہ صفحات و سائز میں پونے تین ہزار صفحات بنیں گے۔ جب کہ مولوی صبیح کے تمام مضامین و مباحث دونوں حصوں کے پانچ سو صفحات میں سما گئے ہیں۔

ایسا کیوں کر ممکن ہوا؟ صرف اس لیے کہ مولوی صبیح الدین میاں نے اصل ماٰخذ تک رسائی حاصل نہیں کی، نہ ان کے پاس تاریخ شاہ جہان پور کے لیے ضروری مواد تھا، نہ انھیں اس کے مطالعے کی ضرورت پیش آئی، نہ ان میں تاریخ نویسی کی صلاحیت تھی، نہ شوق نے مہمیز لگائی، نہ ذوق نے رہنمائی کی۔ ان کے سامنے مولوی مطیع اللہ کی اعلا درجے کی جزئیات وکلیات پر حاوی مکمل ومستند تاریخ شاہ جہان پور کی تین چار جلدیں اور منشی احسان علی خاں احسان کا کل سرمایۂ تاریخ موجود تھا۔ ان سے ضروری اور اپنے ذوق کے مطابق مواد اخذ کرلیا اور ''تاریخ صبیح'' مکمل ہوگئی۔

منشی احسان علی کی تاریخ میں نے نہیں دیکھی، مولوی مطیع اللہ خاں کی تاریخ میرے سامنے اور تاریخ صبیح سے اس کے بہت سے مضامین ومباحث کا تقابلی مطالعہ کیا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں؛

① انھوں نے ان تمام مباحث سے صرف نظر کرلی جو تاریخ کے اہم مباحث تھے اور مولوی مطیع اللہ خاں نے ان میں اپنی جان کھپائی تھی، لیکن مولوی صبیح الدین میاں کا ذوق ان سے آشنا نہ تھا اور نہ وہ انھیں تاریخ میں اہمیت ہی دیتے تھے۔ ان کے لیے انھوں نے یہی فیصلہ کیا کہ ان مباحث کو جو پچاسوں نہیں سیکڑوں صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں، چھوڑ دیا جائے۔

② پچاسوں مقامات پر انھوں نے متن میں مرحوم مطیع اللہ خاں کا حوالہ دیا ہے کہ ''وہ یہ لکھتے ہیں'' اور حصہ اول میں تقریباً بیس مقام مختلف مضامین میں اور حصہ دوم میں ساٹھ سے زیادہ تراجم میں استفادے کا اعتراف کیا ہے۔

③ پچاسوں مقامات پر مضمون کو بغیر حوالے کے نقل کرلیا ہے۔ حال آں کہ وہ مضمون زبان اور لفظوں کی یکسانیت اور جملوں کی ساخت اور ترتیب میں تاریخ مطیع میں موجود ہے۔

④ اور یہ جو انھوں نے لکھا ہے کہ اخبار محبت، تذکرۃ الاحباب اور انہار البحر کے مل جانے سے انھیں ایک گونہ تقویت حاصل ہوئی اور انھوں نے ثقہ اور معمر لوگوں سے گزشتہ حالات وواقعات کی تلاش شروع کردی اور جن کتب ورسالہ جات میں

یہاں کے حالات کا پتا چلا ان کو منگا کر ورق گردانی میں مشغول ہوگیا۔ اگر انھوں نے ایسا کیا تھا تو اس کا کوئی ثبوت بھی ہونا چاہیے۔ لیکن اس قسم کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔

الف: زبانی روایت کے صرف دو حوالے ہیں، وہ بھی کسی حوالے کی تائید میں! اس طرح ثقہ اور معمر حضرات سے استفادے کا تو مسئلہ یوں صاف ہوگیا۔

ب: مذکورہ بالا تینوں کتابوں کے تمام حوالے ٹھیک انھیں مسایل و مباحث میں ہیں جن میں مولوی مطیع اللہ خاں نے ان کا حوالہ دیا ہے۔

ج: ان کے علاوہ پوری تاریخ صبیح میں کسی نادر کتاب یا رسالے کا حوالہ کسی اہم بحث کے تصفیے یا کسی خاص بیان کی تائید و توثیق یا کسی دعوے کے استدلال یا اثبات میں نظر سے نہیں گزرا۔

⑤ متعدد مقامات پر طویل طویل عبارتوں کے بعد لکھ دیا ہے: "تاریخ مطیع ملخصاً" کسی علمی بحث میں کسی صاحب قلم کی تحقیق سے استفادے کا یہ انداز ہرگز پسندیدہ نہیں! ایسے تمام مواقع پر محقق کی کاوش کا پورا پورا اعتراف کرنا چاہیے تھا!

⑥ بالآخر نہایت ضبط و تحمل کے باوجود ان کے قلم سے اس درجے تو وضاحت ہو ہی گئی اور اعتراف کر لیا کہ

> "میں نے اپنی اس کتاب (یعنی تاریخ صبیح) میں زیادہ حالات آپ کی تاریخ (تاریخ مطیع) سے لے ہیں۔"

(۲)

تاریخ شاہ جہاں پور موسومہ تاریخ مطیع

مولوی مطیع اللہ خاں نے شاہ جہاں پور کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا تھا، تو یہ فیصلہ انھوں نے بے سوچے سمجھے نہیں کیا تھا۔ نہ وہ کسی کی نقل کر رہے تھے، نہ انھیں اپنی نام وری اور شہرت مقصود تھی اور نہ انھیں کسی نے مصنف بننے کی ترغیب دی تھی۔ انھوں نے شاہ جہاں پور کی تاریخ کو وقت کی ایک ضرورت سمجھ کر تاریخ کا ایک خلا پر کرنے کے لیے قوم و ملّت کی رہنمائی کے لیے، ذہن و فکر کی تربیت کی غرض سے، قوموں کی صف میں امتیاز پیدا کرنے اور اپنا صحیح مقام پانے کے لیے اور زندگی کی پستیوں سے نکالنے اور ایک کامیاب اور باعزت زندگی کے حصول کے لیے، مختصر یہ کہ ایک معرکۂ حیات فتح کرنے کے لیے، وہ شاہ جہاں پور کے ماضی کی سیر کرانی چاہتے تھے۔ تاکہ فکر و بصیرت کی روشنی میں، تجربات کی پختہ بنیادوں پر مستقبل کی تعمیر ہو سکے۔ ان کے ذہن میں تاریخ نویسی کا ایک اہم مقصد اور جامع خاکہ تھا۔

ان کی اس بات پر بھی گہری نظر تھی کہ قدیم طرز تاریخ نویسی میں جو باتیں تاریخ کی اہم خصوصیات سمجھی جاتی تھیں اب وہ تاریخ میں جگہ پانے کی لائق نہیں سمجھی جاتیں اور جن باتوں کو تاریخ کی خصوصیات کے خلاف سمجھا جاتا تھا اب انھیں کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ مولوی مطیع اللہ خاں لکھتے ہیں کہ اب ان مضامین کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔

> ''جن کو پرانے مؤرخ خشک و بدمزہ سمجھ کر ہاتھ تک نہیں لگاتے یعنی تعلیم و تمدن، اقتصادیات و زراعت، صنعت و حرفت، تجارت و رفاہِ عامہ، صحتِ عوام، ملک کا امن و خوش حالی، اخلاقی و دماغی ترقی، قوانین سلطنت و معدلت گستری وغیرہ کی مشرح کیفیت۔''

مؤلف تاریخ مطیع کے یہ نہایت بلند خیالات تھے۔ چناں چہ انھوں نے نہ

صرف پٹھانوں کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا بلکہ شاہ جہان پور کے شہر و قصبات سے دیہات تک اور نہ صرف سیاسی بلکہ علمی، تعلیمی، تہذیبی، اقتصادی، معاشرتی، تمدنی اور حکومت کے نظم و نسق کے دور دراز گوشوں تک پھیلی ہوئی تاریخ کا خاکہ تیار کیا، آخر میں انھوں نے اس تاریخ کے مقصد کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

"یہ کام صرف قوم و وطن کی محبت اور بزرگوں کے کارناموں کی حفاظت اور آیندہ نسل کی واقفیت کی امید سے کیا گیا ہے۔ اس کے سوا اس کا اور کوئی مقصد نہیں۔"

اس کے بعد مؤلف نے کتاب کے نام اور اس کے مضامین کی تقسیم کی صراحت کی ہے۔ انھوں نے کتاب کے تمام مضامین کو تین عنوانات کے تحت مرتب کیا ہے۔ مناسب ہوگا کہ اس تذکرے کو فاضل مرتب ہی کے الفاظ میں بیان کر دیا جائے۔ مؤلف مرحوم لکھتے ہیں:

نام اس کا "تاریخ مطیع" ہے، جس سے سال ختم تالیف ۱۳۴۰ ہجری بلا تعمیہ و تخرجہ و نامِ مصنف بہ طور براعۃ الاستہلال ظاہر ہوتا ہے:

رباعی

از عنایاتِ خداوندِ رفیع
یافت اتمام چو ایں نقشِ بدیع
سالِ تالیف بجستم ز خرد
کرد ارشاد کہ "تاریخ مطیع"

۱۳۴۰ھ

(۱۳۴۰ھ ہجری سال کے مطابق شمسی کلینڈر کا سال ۱۹۲۲ء ہوتا ہے۔)

مضامین کے لحاظ سے اس کے تین حصے ہیں:

پہلے حصے کا نام: "بنیانِ شاہ جہان پور" ہے۔ اس میں شاہ جہان پور و ضلع شاہ جہان پور، قدیم و جدید تاریخ اور خاندانِ بانی شاہ جہان پور کے حالات ہیں۔

دوسرے حصے کا نام "اعیانِ شاہ جہان پور" ہے۔ اس میں اربابِ کمال و

خوانینِ شاہ جہان پور کے تراجم ہیں اور

تیسرے حصے کا نام ''واردانِ شاہ جہان پور'' ہے اس میں ارباب فضایل و معززین واردین کے تذکرے ہیں۔

فاضل مؤلف نے اس پر ایک نہایت عالمانہ اور جامع مقدمہ تحریر فرمایا ہے، جو بذاتہ تاریخ اور فلسفۂ تاریخ پر ایک بلند پایہ ومحققانہ، نہایت فکر انگیز ومفید اور لایق مطالعہ مقالہ ہے۔ اس کے مطابق اُن کے اپنے فلسفہ واصول تاریخ نویسی میں درجہ کامیابی کا فیصلہ تو اسی وقت کیا جا سکے گا جب کہ اس کی تینوں جلدیں سامنے ہوں۔ اب تک چوں کہ اس کا پہلا حصہ ہی شایع ہو سکا ہے اور وہی ہمارے سامنے ہے اور جو کچھ ہے بہت خوب ہے۔ اس کی کوئی مثال نہیں۔

خدا کرے اس کے بقیہ دونوں حصوں کی اشاعت کا سروسامان بھی ہو جائے!

مولوی صبیح الدین کی تنقید اور اس کا پس منظر:

صاحب تاریخ مطیع ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ تعلیم کے آغاز سے لے کر کتبِ وسطیٰ تک کی تحصیل شاہ جہان پور میں کر لی تھی۔ تکمیل کے لیے مدرسۂ عالیہ رام پور کا سفر اختیار کیا اور ایک مدت قیام کر کے تکمیل علوم کی۔ پرائیوٹ طور پر انگریزی سیکھی اور قابلیت پیدا کی۔ ۱۸۹۳ء میں ڈپٹی کلکٹر کے منصب سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۲۰ء میں سرکاری ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔

مولوی مطیع اللہ خاں نہایت ذہین شخص تھے۔ مطالعے اور تصنیف وتالیف کا شوق تھا اور ایک عمدہ کتب خانہ اپنی زندگی میں جمع کر لیا تھا اور کئی تصانیف بھی یادگار چھوڑی تھیں۔ یہ کتب خانہ ربع صدی تک خان بہادر مرحوم کے اخلاف نے سنبھال کر رکھا اور ۱۹۴۷ء کے بعد جب شاہ جہان پور میں ''گاندھی فیض عام کالج'' کا قیام عمل میں آیا تو اس کے حوالے کر دیا۔ ۱۸ر جون ۱۹۲۵ء کو جب کہ ان کی عمر تقریباً ۶۵ برس کی تھی، ان کا انتقال ہو گیا۔ اور ان کا وطن مالوف اور مولد ومنشائے طفولیت ہی ان کا مدفن قرار پایا۔ ان کی زندگی کا وہ دور جو ۱۸۹۳ء میں ان کی ملازمت سے شروع ہوا تھا اور

ریٹائرمنٹ کے بعد تقریباً ۵ برس کے شب و روز پر محیط تھا، نہایت شان اور وقار کے ساتھ بسر کیا۔ وہ اپنی زندگی میں نیک نام تھے اور اپنے پیچھے نیک نامی کی شہرت چھوڑ گئے۔

ان کی یادگاروں میں ان کی نیک نہاد اور نیک نام اولاد اور چند کتب ہیں۔ ان کی اولاد میں ملک محمد احسن اللہ خان اور محمد اطیع اللہ خان اور ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ تین فرد تھے۔ اطیع اللہ خان کا جوانی میں انتقال ہو گیا تھا۔ بڑے بیٹے اور بیٹی کو اللہ تعالیٰ نے نیک اور سعادت مند اولاد سے نوازا...... ملک محمد احسن اللہ خان کے بیٹے بیٹی ابھی بچپن کے دور سے نہ گزرے تھے کہ باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے۔ صاحبِ تاریخ مطیع کے سوانح نگار جمیل احسن خان نے جو اُن کے پوتے ہیں، اپنی ایک پھوپی اور ان کے دو بیٹوں (شاہد علی خاں اور زاہد علی خاں) کا ذکر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خان بہادر حافظ مطیع اللہ خان کی ایک بیٹی بھی تھی۔

خان بہادر مرحوم کے آثار میں چند تالیفات بھی ہیں۔ اس میں معرکہ آرا تالیف ''تاریخ شاہ جہان پور موسومہ تاریخ مطیع'' ان کا بہت بڑا اور یادگار کارنامہ ہے اس کے علاوہ دیگر دو تالیفات میں ایک تالیف ''انسابِ قبایل افغانی'' ہے۔ اس کا الگ تعارف میں نے ایک مضمون میں کیا ہے۔ ان کی دوسری تالیف ''سالار مسعود غازی اور ان کے ایک غزوے'' کے بارے میں ہے، جو شاہ جہان پور سے شمال میں پانچ چھ میل کے فاصلے پر ''پیرنالہ'' کے مقام پر پیش آیا تھا۔

فاضل مؤلف نے مذکورۂ بالا دونوں تصانیف کا ذکر خود اپنے قلم سے اپنی ''تاریخ مطیع'' میں صفحہ ۴۶-۱۴۵ اور صفحہ ۸۰-۸۷۹ پر کیا ہے اور چوں کہ انھوں نے قارئین تاریخ مطیع کو دونوں کتابوں کے موضوعات کے تفصیلی مطالعے کی دعوت دی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دونوں کتابیں شایع بھی ہوئی تھیں۔ ان کی معرکہ آرا تالیف ''تاریخ شاہ جہان پور موسومۂ تاریخ مطیع'' ہے۔ یہ تاریخ لکھ کر انھوں نے اپنے وطن دوست، صاحب علم و ذوق اور ایک قابل مؤرخ ہونے کا نہ صرف ثبوت دیا ہے بلکہ ایک اہم فرض ادا کیا ہے۔ انھوں نے اہل شاہ جہان پور کا سر

بلند کر دیا ہے۔ انھوں نے موجودہ زمانے کے تاریخ نویسی کے تصور کے مطابق ایک بلند پایہ اور جامع تاریخ شاہ جہان پور لکھ کر ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔ اپنی ملازمت کے زمانے میں انھوں نے قوم و وطن کی جو خدمات انجام دیں وہ اپنی جگہ لیکن ٹھیک ٹھیک اسی دوران (۱۸۹۳ء تا ۱۹۲۰ء میں) انھوں نے اپنے مطالعہ وعلم، اپنے مشاہدے اور تجربات سے جو فایدہ اٹھایا اور تاریخ لکھ دی وہ ایک زندہ جاوید یادگار ہے۔ جس نے ان کے نام اور ان کے وطن مالوف کا نام تاریخ میں ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا۔ یہ تاریخ تین ضخیم جلدوں میں ہے اور اس وقت تک اس کا پہلا حصہ شایع ہوا ہے۔

اگر چہ اس کی اشاعت پر ایک سال سے زیادہ وقت گزر چکا ہے۔ اہل علم ونظر اور اصحاب ذوق کے حلقوں میں اس کی شہرت ابھی تک عام نہیں ہوسکی۔ اس بات کو میں اس طرح محسوس کرتا ہوں کہ ابھی تک کسی صاحب قلم نے اس پر نقد وتبصرہ کا قلم نہیں اٹھایا۔ البتہ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ جب مولوی محمد صبیح الدین شاہ جہان پوری نے اپنی تاریخ کی تکمیل کے لیے اس سے استفادہ کیا تھا تو تاریخ صبیح میں اس کی خصوصیات پر تبصرہ بھی کیا تھا۔

وہ اپنی تاریخ کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> ''مؤلف تاریخ مطیع نے انتہائی کوشش اور جاں کاہی سے مؤلف کتاب کی ذمے داری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پوری تحقیقات اور صحت سے واقعات اور حالات کو جمع کیا۔'' (صفحہ ۲)

اس کے بعد وہ اس کی کسی خوبی کے بیان سے گریز کر کے اس کی خامیوں کے بیان پر توجہ کرتے اور ہمت صرف فرماتے ہیں لکھتے ہیں:

> ❁ ''مگر روزانہ کانٹ چھانٹ کے وہم سے وہ اس کو مکمل نہ کر سکے اور
>
> ❁ انھوں نے اپنی کتاب میں ان واقعات اور ان مشاہیر کے حالات کو بھی سمیٹ لیا۔ جو اتفاقیہ طور پر شاہ جہان پور میں آئے تھے اور جن کا شاہ جہان پور سے کوئی خاص تعلق یا واسطہ نہ تھا اس سے کتاب کی ضخامت تو

بہت زیادہ ہوگئی مگر

❁ مقامی بزرگوں کے بہت نام چھوٹ گئے۔

الف: اس کی یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ ڈپٹی صاحب کا بیشتر حصہ عمر سرکاری ملازمت کی وجہ سے باہر گزرا تھا۔ اور دوران ملازمت ہی آپ نے اس کو ترتیب دیا تھا اس وجہ سے وہ یہاں کے مشائخین واہل فن حضرات کے حالات جمع کرنے سے قاصر رہے۔

ب: جس طرح انھوں نے کتابی معلومات حاصل کرنے میں کوشش ومحنت کی ویسی ہی مقامی حالات کی فراہمی میں ایک حد تک سہل انگاری سے کام لیا۔ اور نیز

❁ اپنے زمانے کے حکما وشعرا واہل فن حضرات کو قطعاً قلم زد کردیا، جس کی وجہ خاص سمجھنے سے قاصر ہوں کہ

❁ گوان کی تاریخ میں معلومات کا ایک ذخیرہ ہے۔ مگر

❁ اس کو بجائے شاہ جہان پور کی تاریخ کے تاریخ روہیل کھنڈ، اودھ یا تاریخ مشاہیر ہند کہنا زیادہ موزوں اور مناسب ہوگا۔ مگر پھر بھی

❁ معلومات کے اعتبار سے یہ کتاب بہت مفید وکارآمد تھی۔ کاش وہ طبع ہوجاتی۔ اور۔

❁ یہ کس درجہ افسوس ناک امر ہے کہ مؤلف کتاب کی دیرینہ آرزو اور تمام عمر کی محنت اور ایک بہترین یادگاران کے ورثا کی عدم توجہی سے بلاطبع کے رہ گئی۔ شعر

حسرت پہ اُس مسافر بے کس کے رویئے

جو رہ گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے"

یہ تاریخ صبیح کے پیش لفظ کے صفحہ ایک ودو کی مسلسل عبارت ہے۔ اسے مکمل جملوں میں تقسیم کردیا ہے تاکہ جواب کے نکات واضح رہیں اور تفہیم میں سہولت ہو۔ اوپر کے اقتباس میں پیدا ہونے والے سوالات کے جواب ملاحظہ ہوں۔

① مرحوم مطیع اللہ خان کی تین جلدوں پر مشتمل تصنیف کی یہ پہلی جلد ہے جو ۹۸۸ صفحات پر محیط ہے، اس میں ''کانٹ چھانٹ'' کا کوئی عمل ہی نہیں ہوا۔ اس کی صورت یہ ہے:

الف: مسودے کی ریڈنگ کے دوران بعض چھوٹے ہوئے الفاظ بڑھائے گئے ہیں۔

ب: بعض جگہوں پر جملوں کا اضافہ کیا گیا ہے اور صاف محسوس ہوتا کہ اس مقام یہ جملہ ہی چھوٹ گیا تھا۔ یا عبارت کی وضاحت کے لیے اس جملے کے اضافے کی ضرورت ناگزیر تھی۔

ج: ایک آدھ لفظ کو تبدیل کر دیا گیا ہے۔

یہ تینوں صورتیں ایسی ہیں جن پر کانٹ چھانٹ کے عمل کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ فاضل مصنف کو اپنے علمی اور تاریخی مضمون پر اور تحریر کی زبان (اردو) اور اسلوب نگارش پر اتنا عبور ہے کہ اس کے قلم سے جو جملہ نکلتا ہے وہ ایسا مکمل اور اتنا جامع ہوتا ہے کہ اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ پھر جو بھی عمل ہوا ہے اتنا کم ہوا ہے کہ بڑے سائز کے ۹۸۸ صفحے کی کتاب میں اسے کم سے کم پیمانے پر بھی وقوع کے بجائے عدم وقوع پر محمول کیا جائے گا۔ پھر یہ بھی واضح رہے کہ کتاب کا یہ پہلا مسودہ ہے۔ اسی صورت سے اس کے چربے اٹھا کر چھاپ دیا گیا ہے۔

مولوی صبیح الدین مرحوم نے ''کانٹ چھانٹ'' کے عمل اور اس کی حد تکمیل کو ان کے وہم کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ حال آں کہ اگر کسی کو وہم میں مبتلا قرار دیا جائے یا کسی کو مراق سے منسوب کہا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے اسے اپنے اوپر اعتماد نہیں، وہ شخص پختہ فکر، مستقل مزاج اور صائب الرائے نہیں بلکہ ناقابلِ اعتماد اور فاتر العقل ہے! میرا خیال یہ ہے کہ یہ میاں صاحب کی سخت زیادتی ہے۔ خاں صاحب ہرگز کسی وہم میں مبتلا تھے نہ انھیں کوئی مراق تھا۔ نہ وہ بے اعتمادی کے شکار تھے۔ ان کے سامنے تاریخ کا ایک خاکہ تھا اسے انھوں نے تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ اسی کے مطابق انھوں نے اسے مکمل کیا تھا اور تکمیل کے بعد بھی وہ اس میں رنگ بھرتے اور

خوب سے خوب تر کی تلاش میں بہ قایمیِ ہوش و حواس مصروف رہے تھے۔ میاں صاحب نے چوں کہ ان کی تاریخ کو نقل کرلیا تھا اس لیے وہ ہمیشہ ڈرتے اور لرزتے رہے کہ مردہ زندہ ہوکر کہیں ان کی خلاف استغاثہ نہ دایر کردے۔ معین الدین نامی مترجم اورنگ زیب و نپولین سے اپنی کتاب پر مقدمہ لکھوانا بھی درحقیقت پیشگی شہادت کے انتظام اور تحریک ردِّ استغاثہ کے سروسامان سے تعلق رکھتا ہے۔

(۲) ہر تالیف میں مذکورات و مندرجات کے دو درجے ہوتے ہیں، ایک لازمی دوسرے ضمنی! کسی داستان کی تکمیل ان دونوں قسم کے کیریکٹروں کے بغیر نہیں ہوتی۔ یہ مصنف کا اختیار ہوتا ہے کہ وہ ثانوی کیریکٹر یا ضمنی واقعے کو متن میں شامل کرے، حاشیے میں اسے جگہ دے یا ضمیمہ واستدراک کے ذریعے تصنیف میں حسن پیدا کرے اور تکمیل کا کارنامہ انجام دے۔ مصنف کے اِس اختیار کو اُس سے چھینا نہیں جاسکتا۔ البتہ اس کے طریق استعمال پر حسن و قبح کی بحث کی جاسکتی ہے۔ لیکن یہاں تو صورت یہ ہے کہ کسی ایسے شخص کا تذکرہ ہی نہیں کیا گیا ہے جس کا شاہ جہان پور سے کوئی خاص تعلق اور واسطہ نہ رہا ہو! پھر اگر کسی درجے میں یہ بات اصول تصنیف کے خلاف بھی ہو تو اگر اس کا حق صاحبِ تاریخ صبیح کو حاصل ہے تو کم از کم اس حد تک تو صاحبِ ''تاریخِ مطیع'' کو بھی حاصل ہونا چاہیے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ مولوی صبیح الدین صاحب نے اپنی ۳۵۸ صفحے کی تاریخ میں ۳۳ صفحات کا ضمیمہ غیر متعلق شخصیات کے بارے میں شامل کیا ہے۔ اگر وہ اسے شامل نہ کرتے تو ان کی کتاب کے حسن کو ہر گز بٹّا نہ لگتا! مولوی مطیع اللہ خاں کو اسی اصول و نظیر کے مطابق ۹۸۸ صفحات کی تاریخ میں اسی سایز میں سو صفحے کا ضمیمہ شامل کرنے کا حق تھا۔ بلا شبہ انھوں نے اپنی تاریخ کے آخر میں مُلّا عبدالقادر بدایونی کا مفصل تذکرہ لکھا ہے لیکن شاہ جہان پور، کانٹ اور اس علاقے سے اس کا بہت گہرا تعلق رہا تھا، اسے بے فایدہ اور لاحاصل ہر گز نہیں کہا جاسکتا۔

(۳) یہ کہنا کہ غیر متعلق حضرات کے تذکرے نے جگہ گھیر لی۔ اس کی وجہ سے ''مقامی بزرگوں کے بہت نام چھوٹ گئے۔'' درحقیقت اس اعتراض سے پہلے انھیں

چند بزرگوں کے نام گنا کر یہ ثابت کرنا چاہیے تھا کہ وہ بزرگ اس شان کے تھے کہ ان کے تذکرے سے تاریخ شاہ جہان پور کی عزت کو چار چاند لگ جاتے۔

آخر صبیح الدین میاں نے مشائخ، شعرا، اطبا وغیرہ میں ایسے حضرات کو شامل کر کے جن کے نام تاریخ صبیح کے سوا کہیں اور ڈھونڈے نہ ملیں گے۔ شامل کر کے شاہ جہان پور کی عظمت کو کون سے چار چاند لگا دیے ہیں؟

الف: یہ بات کہ ملازمت کی وجہ سے ان کا زیادہ وقت شاہ جہان پور سے باہر گزرا تھا اور وہ مشائخ سے واقف نہ تھے اور

ب: مقامی حالات کی فراہمی میں انھوں نے سہل انگاری سے کام لیا تھا۔

یہ دونوں باتیں نہایت لغو، نا قابل تسلیم اور کذب و افترا کی حد تک قابل نفرت ہیں۔

یہ کہنا چاہیے کہ شخصیات کے انتخاب میں ان کا معیار بہت بلند تھا اور ان کی کسوٹی پر جو شخصیت پوری نہیں اتری، اسے انھوں نے اپنی تاریخ میں شامل نہیں کیا۔

④ مولوی صبیح الدین صاحب نے یہ کیا فرمایا کہ انھوں نے اپنے زمانے کے حکما اور شعرا کو بالکل قطعاً قلم زد فرما دیا۔ یہ آں مرحوم پر مولوی صبیح الدین میاں آنریری مجسٹریٹ درجہ اول کا محض بہتان ہے۔ ان کی تاریخ کا پورا تیسرا حصہ شاہ جہان پور کے اعیان، ارباب کمال اور خوانین و مشاہیر کے تذکار میں تھا۔ جس کا انھوں نے صرف لکھنے کا عزم ہی نہیں کیا تھا، بلکہ اسے مکمل کر کے اپنی یادگار چھوڑ گئے تھے، جو ان کے اخلاف کے پاس ان کے عظیم الشان تاریخی ورثے کے طور پر محفوظ ہے۔ بالفرض اگر کسی درجے میں اس میں کوئی صداقت بھی ہو کہ انھوں نے اپنے زمانے کے بعض حکما و شعرا کو چھوڑ دیا ہے تو اس کی مناسب توجیہ یہ ہوگی کہ اپنے معاصرین کے کمالات و فضایل کے ادراک میں اکثر معاصر تذکرہ نگاروں اور مورخوں نے ٹھوکر کھائی ہے اور قدما کے فضل و کمال کے اعتراف میں فراخ دلی کے اظہار۔ سے قاصر رہے۔

⑤ اور یہ بات جو انھوں نے کہی کہ ''اس کو بجائے شاہ جہان پور کی تاریخ کے تاریخ روہیل کھنڈ، اودھ یا تاریخ مشاہیر ہند کہنا زیادہ موزوں اور مناسب ہوگا۔'' یہ

بات انھوں نے درحقیقت مولوی مطیع اللہ خاں کی تاریخ کی تیسری جلد کے ردّ میں کہی ہے۔ درحقیقت شاہ جہان پور کا تعلق روہیل کھنڈ، اودھ دونوں سے کچھ ایسا رہا ہے کہ اودھ اور روہیل کھنڈ کو نظر انداز کر کے شاہ جہان پور کی تاریخ لکھی ہی نہیں جا سکتی! شاہ جہان پور کی خصوصیات خواہ کتنی ہی نادر ہوں لیکن وہ روہیل کھنڈ اور اودھ سے الگ نہیں ہیں۔

فاضل مؤرخ مولوی مطیع اللہ خاں کی تاریخی تالیف کا تیسرا حصہ ہی ان ناموران کے تذکرے میں ہے جو ملک اور بیرون ملک سے آ کر شاہ جہان پور میں آباد ہو گئے تھے اور جن کی عزت وشان، جن کے کارنامے اور جن کی شہرت اور نیک نامی شاہ جہان پور کی عزت و نیک نامی کا موجب ہوئی تھی۔ اور مرنے کے بعد بھی انھوں نے شاہ جہان پور سے اپنا رشتہ نہیں توڑا، اسی کی مٹی میں دفن ہوئے تھے۔ تیسرے حصے کے تعارف میں مولوی مطیع اللہ خاں کے الفاظ یہ ہیں:

> تیسرے حصے کا نام "واردین شاہ جہاں پور" ہے۔ اس میں ارباب فضایل ومعززین واردین کے تذکرے ہیں۔"

کیا میاں صاحب کو یہ بات پسند نہیں کہ کوئی شخص صاحب کمال و ہنر ہو اور علم و فضل اور عزت و بزرگی میں ان سے بڑا ہو، باہر سے آ کر شاہ جہان پور میں آباد ہو جائے اور تاریخ میں شاہ جہان پور کا نام روشن کرے؟

⑥ اس کے باوجود کہ میاں صاحب کو تاریخ مطیع ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ اس کے حسن وخوبی کے اعتراف پر وہ مجبور ہوئے۔ انھیں یہ اعتراف کرنا ہی پڑا کہ

> "ان کی تاریخ معلومات کا ایک ذخیرہ ہے۔"

اس سے آگے وہ پھر لکھتے ہیں:

> "پھر.... معلومات کے اعتبار سے یہ کتاب بہت مفید و کارآمد تھی۔ کاش وہ طبع ہو جاتی!"

⑦ اس کی عدم اشاعت پر حسرت کا اظہار کر کے وہ ایک دودھارا خنجر صاحبِ "تاریخ مطیع" کے اخلاف کے سینے بھی بھونک دیتے ہیں۔ جب وہ کہتے ہیں:

''اور یہ کس درجے افسوس ناک امر ہے کہ مؤلف کتاب کی دیرینہ آرزو اور تمام عمر کی محنت اور ایک بہترین یادگار ان کے ورثا کی عدم توجہی سے بلاطبع کے رہ گئی۔''

میں تو میاں صاحب کے اس نقد و تبصرے کے بعد ان کے ذوق و مسرت کا اندازہ کر کے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس تاریخ کا نہ چھپنا اور مورخ مرحوم کے اخلاف کا اس کی اشاعت کی فکر سے غافل رہنا میاں صاحب کی خوش نصیبی کا موجب ہوا اور ان کی غفلت کی بہ دولت ۵۷ برس تک ان کی چوری پر پردہ پڑا رہا۔ میرے خیال میں فاضل مؤرخ کو نامراد قرار دینا اور ان کے اخلاف کی مجبوریوں اور حالات کی عدم مساعدت کو ان کی عدم توجہی کا عنوان قرار دینا میاں صاحب کے احساس افسوس ناکی سے کہیں زیادہ شرم ناک ہے۔

آخر میں اس تبصرے کو انھوں نے اس شعر پر ختم کیا ہے:

حسرت پہ اُس مسافر بے کس کے رویئے
جو رہ گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے!

ہمیں بھی اس جہالت اور بد ذوقی پر افسوس اور نہایت شرم ناک افسوس ہے کہ میاں صاحب کو نہ شاعر کا نام معلوم ہے نہ شاعری کے فن سے آشنا ہیں نہ وزن و بحر کی انھیں خبر ہے اور نہ انھوں نے یہ شعر اس کے صحیح محل میں استعمال کیا ہے۔ انھیں مطیع اللہ خاں کے ورثا کی عدم توجہی سے شکوہ ہے اور شعر میں مسافر کی مقصد میں ناکامی، حسرت زدگی اور بد نصیبی کا افسوس ہے! کاش! انھوں نے اس شعر کا استعمال ہی نہ کیا ہوتا۔

یہ شعر مصحفی امروہوی کا ہے۔

البتہ تاریخ صبیح کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر دایرۂ فن کی قریب العہد بلکہ مولوی صبیح الدین میاں کی ہم عصر شخصیات جو بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے خاتمے تک نمایاں ہوئی تھیں اور ۱۹۲۲ء میں جب مولوی مطیع اللہ خاں نے اپنی تاریخ کا مقدمہ لکھ کر قلم رکھا تھا، اس وقت ان کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ پھر اس حقیقت سے بھی

انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مطیع اللہ خاں کے انتخاب کا معیار بہت بلند تھا۔ ان کی کسوٹی پر یہ تمام شخصیات ہرگز پوری نہیں اتر سکتی تھیں۔ مولوی صبیح الدین صاحب کے پیمانۂ انتخاب کا اندازہ اس سے لگائیے کہ انھوں نے مولوی حافظ حکیم محمد صاحب کا تذکرہ لکھا ہے۔ جو ان کے استاد تھے اور انھیں کے اصرار پر مولوی صبیح الدین میاں نے تاریخ لکھنے کا عزم کیا تھا، ان کے تذکرے کے ساتھ ان کے والد گرامی مولوی کفایت اللہ کا ترجمہ بھی لکھا ہے۔ ان کی خوبی علمی فضایل یا درس و تدریس کے کمالات و شہرت نہیں ان کا بھولا ہونا اور سیدھے پن کی شہرت تھی۔ اور ان کے دو بیٹوں مولوی عبداللہ اور منشی فضل احمد کے ذکر کا اصل سبب یہ تھا کہ دونوں ان کے استاد کے چھوٹے بھائی تھے۔ یا مستقبل کی اس توقع پر لکھا تھا کہ دونوں کا انتقال عمر طبعی کو پہنچنے سے پہلے ہو گیا اور صاحبِ تاریخ صبیح کو توقع تھی کہ اگر یہ دونوں بھائی عمر طبعی کو پہنچتے تو اس صوبے میں بہ اعتبار علم و فضل نہایت ممتاز اور یگانۂ عصر ہوتے۔ اور اگرچہ ابھی ان کے علم و فضل کا ظہور نہیں ہوا تھا اور نہ کوئی کارنامہ انجام پایا تھا کہ لیکن صاحب تاریخ نے محسوس کر لیا تھا کہ ''یہ دونوں بھائی دنیا سے کیا گئے کہ علم ہی شاہ جہان پور سے رخصت ہو گیا۔'' اس پر ستم یہ کہ اپنے استاد کے بھانجے منشی عبدالسلام کے تذکرۂ خیر سے بھی قلم کو روک نہیں سکے کہ انھوں نے میاں صاحب کی تاریخ صبیح کی نہایت کوشش اور ''ہمدردی'' سے کتابت کا کام انجام دیا تھا۔ میرے خیال میں یہ موقع ان کی توجہ اور قابلیت کے اظہار کا تھا۔ لیکن کوشش تو محض بے محل لفظ ہے اور ''ہمدردی'' کا جواز شاید اس طرح ثابت کیا جا سکے کہ انھوں نے کتابت کی اجرت میں کوئی خاص رعایت کر دی ہو یا شاید بالکل ہی نہ لی ہو! ان کی تعریف میں یہ بھی لکھا کہ ''ان کا ایک دو دواخانہ رفیق الملک'' ہے جو گورنمنٹ آف انڈیا سے رجسٹری شدہ شاہ جہان پور میں ہے۔ جس میں دواؤں کا بہت اعلا انتظام ہے۔'' اس اظہار نے ثابت کر دیا کہ وہ حکیم نہیں عطار ''دواخانہ رفیق الملک'' کے مالک تھے اور وہ بھی چلتا نہیں تھا۔ اس کی دو وجہیں ہیں:

❁ ایک یہ کہ اس وقت کوئی حکیم اپنے مطب یا دواخانے کو رجسٹرڈ کرانے کا

ننگ گوارا نہیں کرتا تھا۔ اس کا بھی ثبوت یہ ہے کہ حکیم اجمل خاں و حکیم محمود خاں اور مومن خاں کے باپ چچا کے تراجم میں ان کے مطبوں کے رجسٹریشن کا ذکر نہیں آیا۔

❁ اور نہ خود صاحب تاریخ صبیح نے اپنے استاد مولوی حکیم محمد کی طبابت کے رجسٹریشن کی خوبی کا ذکر کیا ہے، نہ دیگر اطبا کے تراجم میں کہیں رجسٹریشن کا نام آیا ہے۔

❁ اگر منشی عبدالسلام بھی طبیب ہوتے تو ان کی طبابت اور حذاقت کا ذکر آتا ، نہ کہ دواؤں کے اعلا انتظام کا! طبقۂ علما میں اس مقام پر ایک خاندان کے پانچ افراد کا ذکر آیا ہے۔ حال آں کہ ان میں سے ایک کے سوا کوئی عالم نہ تھا اور اس لیے اس صف میں شرکت کی عزت کا سزاوار بھی نہ تھا۔ اگر خدا نے میاں صاحب کو ذوق سے نواز ہوتا تو وہ اسی خاندان کے دو افراد منشی فضل اللہ جو میاں صاحب ہی کے بہ قول ''اعلا درجے کے خوش نویس تھے'' اور ان کے بھانجے منشی عبدالسلام جو خوش نویسی کے فن میں ان کے شاگرد تھے، دونوں کا ترجمہ فنون لطیفہ کے ضمن میں کر دیتے تو ''تاریخ صبیح'' دو صاحبِ فن ''خوش نویسوں'' کا بھی اضافہ ہو جاتا۔

میاں صاحب نے شکوہ کیا ہے بلکہ تاریخ مطیع کے نقص کی طرف اشارہ کیا ہے کہ صاحب تاریخ مطیع ''اہل فن کے حالات جمع کرنے سے قاصر رہے۔'' اور یہ کہ انھوں نے ''اہل فن حضرات کو قطعاً قلم زد کر دیا، جس کی وجہ خاص سمجھنے سے قاصر ہوں۔'' لیکن اگر شاہ جہان پور کی تاریخ میں میاں صاحب کے ذوق و تحقیق کے مطابق صرف ایک تعزیہ بنانے والا، ایک چابک سوار، ایک قوال، ایک نواب رام پور کے دربار میں مجری اور دو ''سرودی'' ہی لائق تذکرہ تھے تو صاحبِ تاریخ مطیع نے ان کا یا ان میں سے کسی ایک کا بھی ذکر نہ کر کے اپنے ذوقِ لطیف کا عمدہ ثبوت دیا ہے۔

خان بہادر مولوی مطیع اللہ خاں کی تاریخ اس قسم کے رطب و یابس اور فضولیات سے پاک ہے اور یہ اس کی بہت بڑی خوبی ہے۔

غرضے کہ خان بہادر مطیع اللہ خان نے اپنی تاریخ کے دائرے کو اتنا وسیع اور بلند کر دیا تھا جس کا ثبوت تین ضخیم جلدوں میں ہمارے سامنے ہے۔ اس کی مجموعی

ضخامت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اس کی پہلی جلد جو شایع ہوئی ہے، وہ رجسٹر سایز کے ۹۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ جو چیز ہمارے سامنے آچکی ہے اس میں کسی عطار کو حکیم، کاتب کو مصنف و مورخ، کسی فاتر العقل کو ولی، کسی فاتحہ خواں کو عالم دین نہیں کہا گیا۔ انتخابِ شخصیات کے معاملے میں ان کے ذوق کا پیمانہ اتنا بلند ہے کہ ہر کہ ومہہ ان کی تاریخ میں جگہ نہیں پا سکا۔ جس کا طعنہ صاحب تاریخ صبیح نے انھیں شہر کے حالات واشخاص سے دوری اور عدم واقفیت کا دیا ہے۔ خان بہادر مطیع اللہ خان زندگی بھر ڈپٹی کلکٹر رہے اور اعلیٰ انگریز حکام کا قرب وصحبت انھیں میسر رہی لیکن پوری کتاب میں اس کی خوش بو میں بسا ایک جملہ بھی موجود نہیں۔ بڑے سایز کے چالیس صفحات پر مقدمہ اور وجہِ تالیف بیان کی ہے۔ اس میں نہ کسی اعلیٰ حاکم کا شکریہ ہے نہ ہی کسی انگریز بہادر کے نام اسے ڈیڈیکیٹ کیا ہے۔ انھوں نے جو کچھ کیا، اپنے ذوق، اپنی معلومات وتحقیقات اور اپنے ہی خیالات کے مطابق جو سچ سمجھا وہی لکھا، نہ کسی کی خوشامد کی اور نہ کسی پر طنز وتعریض سے کام لیا۔ انھوں نے نہ اپنی نہ اپنی تصنیف وتاریخ کی کسی سے تعریف وتقریظ لکھوائی۔ ان کی زندگی کا ایک انداز اور اخلاق کا ایک معیار تھا۔ ان کی زندگی اور ان کے کارنامۂ تاریخ سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ میاں صاحب کے حیالات کی پستی کے بیان کے لیے ان کی تاریخ کے مبصر ومقدمہ نگار کی تحریرات اور حود ان کا اپنا پیش لفظ کافی ہے۔ قارئین کرام میں سے جو صاحبِ ذوق چاہیں وہ دونوں مؤرخوں کے ایک موضوع کے دو مضامین جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بارے میں ہیں، پڑھ کر دیکھ لیں میاں صاحب کے اخلاق، ان کا ذوق وانداز فکر اور انگریز حکمرانوں سے ان کی عقیدت کا راز کھل جائے گا۔ مطیع اللہ خاں کے مضمون کا عنوان ہے 'فوج کی سرکشی' اور صبیح الدین میاں کے مضمون کا عنوان ہے "واقعۂ غدر ۱۸۵۷ء"

ان عنوانات کے انتخاب ہی سے ذوق وفکر کے کئی نکات واضح ہو جاتے ہیں یہاں میاں صاحب کی فکری اور نفسیاتی کیفیت کے اظہار کے لیے نواب غلام قادر خاں کے ترجمے سے چند سطریں نقل کرتا ہوں۔ میاں صاحب فرماتے ہیں:

"......اولاد موجود ہے جونان شبینہ کو محتاج ہے۔ یہ نتیجہ تھا (نواب صاحب کی) اس "کوتاہ اندیشی" اور "بدعقلوں" کی صحبت کا! اگر نواب مرحوم "سنجیدگی اور عقل مندی" سے کام لیتے تو اس خاندان کے عروج کا اتفاق سے ایک نادر موقعہ ہاتھ آگیا تھا جس کو ضایع کر کے اپنے گھر کے ساتھ شہر کو بھی تباہ اور بدنام کرادیا۔ (تاریخ صبیح: ص ۳۰-۱۲۹)

وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ نواب صاحب انگریز کی غلامی پر قانع رہتے، محبینِ وطن اور قوم پروروں اور حریت پسندوں کا ساتھ نہ دیتے اور غداری و زمانہ سازی سے کام لیتے اور اپنے کنبے کے ساتھ وطن سے غداری کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا ہوتا تو شاہ جہان پور تباہی اور بدنامی کی تہمت سے بچ جاتا اور میں بھی! اس خاندان کے نوجوان نان شبینہ سے محتاج نہ ہوتے اور میں بھی ان کا ایک یادگار قصیدہ لکھتا! تم میرے قلم کی روانی سے تو واقف ہو ہی نا!!!

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

ایک سیاسی مطالعہ

مرتبہ
ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری

مجلس یادگار شیخ الاسلام پاکستان کراچی

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز

کی

سیاسی ڈائری

بصورت

اخبار و افکار کی روشنی میں

عطا فرمودہ

صاحبزادہ محترم حضرت مولانا سید محمد ارشد مدنی مدظلہ العالی

استاذ الحدیث ازہر الہند دارالعلوم دیوبند (انڈیا)

تالیف و تدوین

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

مجلس یادگار شیخ الاسلام پاکستان کراچی

مجلس یادگار شیخ الاسلام پاکستان کراچی